

وَمَنْ يُؤْتِ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا  
البقرہ (۲۶۹)

جسے حکمت و دانائی عطا ہوئی اسے بہت بڑی بھلائی مل گئی

## تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند

آٹھویں جلد

اُردو ادب (سوم)

(۱۸۰۳ء — ۱۸۵۷ء)

مدیرِ خصوصی کروپ کیشن سید فیاض محمود



پنجاب یونیورسٹی ، لاہور

جملہ حقوق بحق پنجاب یونیورسٹی محفوظ ہیں

طبع اول :	۱۹۷۱ء
تعداد :	ایک ہزار
طابع :	پنجاب یونیورسٹی
ناشر :	گروپ کمیٹن سید فیاض محمود
مطبع :	حبیب پرنس ، ۳۴ مزنگ روڈ - لاہور

پاکستان و ہند  
کے  
اسلامی تہذیب  
کے  
نام

## اراکینِ مجلسِ منتظمہ

صدر مجلسِ منتظمہ	پروفیسر علاء الدین صدیقی
ممبر	حسٹس ایس اے رحمان
ممبر	ڈاکٹر سیخ محمد اکرام
ممبر	کرنل مجید ملک
ممبر	سیکرٹری وزارتِ تعلیم حکومت پاکستان
ممبر	سیکرٹری فنانس صوبہ پنجاب
ممبر	گروپ کیپٹن سید فیاض محمود

## مجلسِ ادارت

مدیرِ اعلیٰ	پروفیسر علاء الدین صدیقی
مدیرِ عمومی	گروپ کیپٹن سید فیاض محمود

مقدمہ	پہلی جلد	مدرسہ
سید فیاض محمود	دوسری جلد	مدیرِ خصوصی
پروفیسر عبدالقیوم	تیسری جلد	مدیرِ خصوصی
ڈاکٹر وحید مرزا	چوتھی جلد	مدیرِ خصوصی
پروفیسر مرزا مقبول بیگ بدخشان	پانچویں جلد	مدیرِ خصوصی
پروفیسر وزیر الحسن عابدی	چھٹی جلد	مدیرِ خصوصی
ڈاکٹر وحید قریشی	ساتویں جلد	مدیرِ خصوصی
پروفیسر سید وفار عظیم	آٹھویں جلد	مدیرِ خصوصی
سید فیاض محمود	نویں جلد	مدیرِ خصوصی
ڈاکٹر عبادت ہریلوی	دسویں جلد	مدیرِ خصوصی
سید فیاض محمود	گیارہویں جلد	مدیرِ خصوصی
ڈاکٹر سید علی اشرف	بارہویں جلد	مدیرِ خصوصی
ڈاکٹر سید علی اشرف	تیرہویں جلد	مدیرِ خصوصی
سید فیاض محمود	چودھویں جلد	مدیرِ خصوصی
سید فیاض محمود	پندرہویں جلد	مدیرِ خصوصی
سید فیاض محمود	سولہویں جلد	مدیرِ خصوصی
سید فیاض محمود	ادبیات در انگریزی	مدیرِ خصوصی



## تاریخ ادبیاتِ مسلمانِ پاکستان و ہند

آٹھویں جلد - اردو ادب (سوم) (۱۸۰۳ء - ۱۸۵۷ء)

### فہرستِ مضامین

صفحہ	مقالہ نگار	مقالہ	نمبر	ناب
	پروفیسر علاء الدین صدیقی	پیش لفظ		
الف	مدیرِ عمومی	عارف		
۱	ڈاکٹر شمس الدین صدیقی	سیاسی، فکری، معاشرتی اور تہذیبی پس منظر	۱	پہلا
۴۰	ڈاکٹر شمس الدین صدیقی	ادبی منظر	۲	دوسرا
۶۵	ممتاز مگھوری	تیسرا (الف) فورٹ ولیم کالج کے مصنفین	۳	
۸۶	ممتاز مگھوری	(ب) دہلی کالج کی علمی خدمات	۴	
۹۸	پروفیسر سید وقار عظیم	چوتھا (الف) اس دور کی نثر (رجب علی بگ سرور)	۵	
۱۰۹	خواجہ محمد زکریا	(ب) اس دور کی نثر (سرسید وغیرہ)	۶	
۱۴۲	ڈاکٹر شمس الدین صدیقی	پانچواں (الف) شاہ نصیر دہلوی	۷	
۱۵۲	راحت افزا بخاری	(ب) شیخ ابراہیم ذوی	۸	
	ہاشمیراک نادرہ زیدی			
۱۶۸	نادرہ زیدی	(ج) بہادر شاہ ظفر	۹	
۱۷۷	ڈاکٹر اسلم فرخی	(د) تلامذہ ذوی	۱۰	
۱۹۱	ڈاکٹر عبادت بریلوی	چھٹا (الف) حکیم مومن خاں مومن دہلوی	۱۱	
۲۱۶	ڈاکٹر شمس الدین صدیقی	(ب) نواب مصطفیٰ خان شیفتہ	۱۲	
۲۲۶	ڈاکٹر ناظر حسن زیدی	(ج) تلامذہ مومن	۱۳	
۲۴۳	پروفیسر موسیٰ خان کلیم	ساتواں مرزا اسد اللہ خاں غالب	۱۴	
۲۷۵	ڈاکٹر ناظر حسن زیدی	آٹھواں (الف) اس دور کے دیگر شعراء	۱۵	
۲۸۴	ڈاکٹر ناظر حسن زیدی	(ب) اس دور کے دیگر شعراء (تلامذہ غالب)	۱۶	
۲۸۹	ڈاکٹر ناظر حسن زیدی	(ج) ” ” ” ” (دہلی کے دیگر شعراء)	۱۷	
۳۰۵	ڈاکٹر ناظر حسن زیدی	نواں (الف) میر ببر علی ایس	۱۸	
۳۲۳	ڈاکٹر ناظر حسن زیدی	(ب) مرزا سلامت علی دبیر	۱۹	
۳۳۱	ڈاکٹر ناظر حسن زیدی	(ج) مرثیہ نگاری انیس کے بعد	۲۰	

۴۳۵ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

۴۵۶ خواجہ محمد زکریا

۴۷۵ ڈاکٹر ابوالث صدیقی

۴۰۰ ڈاکٹر اسد اریب

۴۰۹ نادرہ ریڈی

۴۲۵ ڈا ڈٹر سد ساء علی ناشراک

ڈا ڈٹر عدالعی

۴۳۴ سد ویاض محمود

۱۲ - دسوان صحافت

۲۲ - گیارهوان تذکرے

۲۳ - نارھوان لسانی خصوصیات

۲۴ - تیرھوان (الف) متفرق نثر (بحوں کا ادب)

۲۵ - (ب) متفرق نثر (عورتوں کا ادب)

۲۶ - (ح) متفرق نثر (سوانح عمریاں)

۲۷ - چودھوان اس دور کے ادب کا مجموعی جائزہ

# پیش لفظ

تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ ان فکری عوامل اور شعائر زندگی کی نشاندہی کی جائے جس سے اس برصغیر کے مسلمانوں کی ثقافتی زندگی اور معاشرتی اقدار کی تعمیر ہوئی۔ ادب سے مراد یہاں ان خیالات و جذباتِ عالیہ کا موثر اظہار ہے جن سے قلب و نظر کی جلا ہوتی ہے اور جن سے انسانی زندگی بامعنی بنتی ہے۔ ایسے خیالات و تصورات جہاں ہمیں ادراک کی منتہیات کا راستہ دکھاتے ہیں وہاں رومانی تسکین کا باعث بھی ہوتے ہیں۔ ان سے ہمارے آیام بھی روشن ہوتے ہیں اور ہمارے لمحات بامراد۔ ادب میں مذہب، تصوف، فلسفہ، اخلاقیات، تاریخ، لسانیات، شاعری، افسانے، انشائیات، مکتوبات، ہر چیز شامل ہے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ جس جس زبان میں برصغیر کے مسلمانوں نے اپنے رنج و مسرت، اپنی فکرو نظر، اپنی اُمنگوں اور عزائم کو مجسم کیا ہے، ان کے شاہپاروں اور ان کے مصنفین سے اپنے ہم وطنوں اور باہر کی دنیا کو روشناس کرایا جائے۔ تاکہ ہم پہچان سکیں کہ ہماری زندگی کس قسم کی تہذیبِ ثقافت پر استوار ہے اور ہمیں اس بات کا متعلق احساس ہو جائے کہ مسلمانانِ پاکستان و ہند خواہ وہ مشرق میں ہوں یا مغرب میں، شمال میں ہوں یا جنوب میں، ایک ہی ثقافتی رشتہ میں منسلک ہیں اور ایک ہی تہذیبی روایت کے علمبردار ہیں۔

محمد علاء الدین صدیقی

(پروفیسر علاء الدین صدیقی مدیر اعلیٰ)

# تعارف

مسلمانوں کو اس برصغیر میں آئے ہوئے سواتیہ سو سال ہو چکے ہیں یہ اس لئے درست ہے کہ مکران  
۳۳۳ء میں فتح ہو گیا تھا۔ اس طویل عرصے کو ہم چار ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ دور جو سلطان محمود  
غزنوی کی فتوحات پر ختم ہوا۔ یہ کوئی پورے چار سو سال کی مدت ہے۔ اس عرصے میں برصغیر کے شمال مغربی  
علاقوں پر عربی زبان و ادب اور عربی تہذیب و تمدن کا تسلط رہا۔ دوسرا دور کوئی پانچ سو سال کا ہے، جو  
غزنوی عہد اور 'عہدِ سلطین' پر مشتمل ہے۔ اس دور میں برصغیر "دارالسلام" کہلایا اور تہذیبی طور پر ملتِ اسلامیہ  
کی عالمی وحدت کا رکن رہا۔ پانچ سو سالوں کے اس دور میں، جس کا آغاز محمود غزنوی کے دور سے ہوتا  
ہے، فارسی ادب کا رواج ہوا اور فارسی زبان اظہار کا ذریعہ رہی۔ ویسے مغربی پاکستان کی سرزمین میں فارسی  
زبان اس عہد سے بھی پہلے پہنچ چکی تھی، بلکہ ملتان کے علاقے میں عام تکلمی زبان کی حیثیت حاصل کر چکی تھی۔  
پھر تیسرا دور مغلیہ عہد ہے، جو ۱۵۱۹ء سے ۱۸۵۷ء تک کی مدت پر محیط ہے۔ اس میں ملتِ اسلامیہ  
پاکستان و ہندوستان تہذیبی اثرات سے روشناس ہوئی اور معاشرے میں فکری تدوین کا رواج رہا۔  
اس دور میں افکار اور خیالات میں وسعت پیدا ہوئی، اور اگرچہ متفاوتات میں ایک حد تک تزلزل کے آثار  
نمایاں ہوئے، لیکن تخریب اور انتشار کے ساتھ ساتھ تعمیر کا عمل بھی جاری رہا۔ اس پوری مدت میں فارسی

کی ادبی اقدار ہماری تہذیبی زندگی کا محرک اور غالب عنصر تھیں۔ اس کے بعد مغربی تہذیب، اس کے اصول زندگی اور اس کے معاشی، سماجی اور معاشرتی افکار کی اشاعت ہوئی۔ چونکہ یہ دور نشر و اشاعت کا دور ہے، اور اس میں بعض وسائل فراہم ہونے سے تعلیم عوام تک پھیل گئی، اس لئے خیالات میں انقلاب پیدا ہونے لگا۔ اس ذہنی انقلاب نے کئی نئی صورتیں اختیار کیں اور اس کے نتائج آجکل ہماری خانگی، اجتماعی، سیاسی اور مذہبی زندگی میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ گزشتہ تین چار سو سال کی مدت میں اردو، بنگلہ اور دیگر زبانوں اور بولیوں کا علاقائی ادب بھی فتنی پختگی کے ساتھ ساتھ حسن اظہار کا وصف پیدا کر چکا ہے۔

ادب میں معاشرتی اور تعلیمی عوامل منعکس ہوتے ہیں۔ زندگی کے تقاضے، اظہار، احتجاج، طنز، شکاریہ دھار یا الحاح کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اس تاریخ ادبیات کا مقصد یہ ہے کہ ادب کو معاشرے کے ایک تقاضے کے طور پر پیش کیا جائے، تاکہ زندگی کے ہر رخ، قلب انسانی کی ہر کیفیت، روح کائنات کے ہر پرتو میں ہم اپنی نظر آئے اور مسلمانان برصغیر کی پوری زندگی اور ان کی تہذیب کا جامع عکس، ملی وحدت کا مکمل ثبوت، ہر اس زبان اور اس کے ادب میں یقین آفریں انداز میں پیش ہو، جو یہاں بولی جاتی رہی ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ ہم جس تہذیبی ورثے کے مالک ہیں، وہ کتنا پائیدار ہے اور اس میں کتنی توانائی اور استقامت موجود ہے۔

اس تاریخ کی تدوین میں دو تین باتیں خاص طور پر ملحوظ خاطر رکھی گئی ہیں۔ اول یہ کہ کسی قوم کی تہذیبی اور ادبی تاریخ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی، جب تک اس قوم کی لسانی، ادبی اور معاشرتی سرگرمیوں کا پوری طرح اور ہمدردانہ انداز سے محاسبہ نہ کیا جائے۔ اس لئے ہم نے کوشش کی ہے کہ عربی، فارسی، ترکی، اردو، بنگلہ، پشتو، پنجابی، سندھی، کشمیری، بلتی، شینا، بروشمکی، کھوار، ہندکو، سرائیکی، بلوچی اور برہوی، غرض ہر اس زبان کے معاشرتی اور منکری پس منظر کی نشاندہی کی جائے، جو پاکستان میں بولی گئی ہے یا بولی جاتی ہے، اور جو ادبی تخلیقات اس ماحول سے ابھرتی ہیں، خواہ وہ ضرب الامثال ہوں یا لوک کہانیاں، گیت ہوں یا لہریاں، ان میں نظم، قصوف، فکر اور عینیت جذبات کی ترجمانی ہو یا محض

تفصیل طبع کا سامان، سبھی کا تاریخی اور تنقیدی جائزہ لے کر اپنی قوم کی ادبی تاریخ مرتب کی جائے۔ چنانچہ ہم نے زندگی کے ہر پہلو، زبان کے ہر انداز اور فکر کی ہر جہت کی ترجمانی کرنے کی کوشش کی ہے اس طرح یہ تاریخ کامل طور پر اور صحیح معنوں میں ہماری ثقافت کی آئینہ دار ہو جاتی ہے۔

علاقائی ادبیات میں خاص طور پر لوک ادب کا مقام بہت بلند ہے۔ اور ہم نے اسے ادب عالیہ کا ایک رکن تصور کیا ہے، اس لئے کہ ہر قوم کی ادبی تاریخ میں، لوک ادب ایک معنی خیز کردار ادا کرتا ہے۔ اکثر لوگوں کی زندگیاں اسی ادب کی اقدار سے متاثر ہوتی ہیں، اور اسی کے کردار علامت بن کر ان کے محرک بنتے ہیں اور ان کے استعمال کا جواز پیش کرتے ہیں۔ اس لئے ادبی تاریخ میں اس کا ذکر ضروری ہے۔

یہی حال ان مصنفین کا ہے، جو عام طور پر دوسرے درجے کے، یا بالفاظ دیگر چھوٹے مصنف شمار ہوتے ہیں۔ یہ تو بدیہی امر ہے کہ کسی قوم کی رفعت فکر اور اسکی جذباتی بلندی صرف انہی مصنفین کے کلام یا تصانیف میں نظر آئے گی، جن کی نگاہ وسعت، بلندی اور گہرائی کے لحاظ سے مدقرہ کے تجربات کے حدود میں مقید نہ ہو، اس لئے کہ چھوٹے شاعر یا افسانہ نگار یا ناول نویس یا نثر لکھنے والے اپنے اپنے تجربے اور فنی کوشش کے دائرے میں محدود اور محصور ہوتے ہیں۔ مگر یہاں یہ بات نظر انداز نہیں ہونی چاہیئے کہ اس دائرے سے اچھی طرح واقف ہونے کے باعث وہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو، جن سے عام لوگوں کی زندگی عبارت ہوتی ہے، زیادہ توجہ سے قلم بند کرتے ہیں۔ ان کی نظر وسیع نہیں ہوتی مگر وہ مدقرہ کے تقاضوں اور زندگی کے عام مشاغل اور قلبی واردات کے سطحی تاثرات کو صاف طور پر بیان کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کے ہاں عام زندگی کی عکاسی عظیم شعراء یا مصنفین کی نسبت بہتر طریقے سے ہوتی ہے۔ اس لئے کسی قوم کی تہذیبی تاریخ مرتب کرتے وقت ان چھوٹے اہل قلم کی تخلیقات کا جائزہ لینا بھی اسی قدر ضروری ہوتا ہے جتنا ادبی علماء کا۔ چنانچہ اس تاریخ میں یہ پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ اس طرح ہمارا خیال ہے کہ یہ تاریخ مسلمانان پاکستان دہند کی پوری ادبی زندگی کی ترجمان بن گئی ہے۔

مذکورہ مطالب کے حصول کے لئے ہر ادب کا ذکر کرنے سے پہلے اس کے سیاسی اور معاشرتی پس منظر کو سامنے لایا گیا ہے ، تاکہ قارئین کو معلوم ہو سکے کہ جن لوگوں کے تاثرات اور خیالاتِ عالیہ کی ہم عکاسی کر رہے ہیں ، وہ اپنی اجتماعی زندگی کن ضوابط ، کن پابندیوں اور کن اصولوں کے تحت بسر کرتے تھے ۔ اس بنا پر اس تاریخِ ادبیات کو دراصل ملتِ اسلامیہ پاکستان و ہند کی تہذیبی تاریخ تصور کرنا چاہیئے ۔

سید نیاز محمد

گروپ کیپٹن شید قیاض محمود  
مدیر عمومی

## پہلا باب

سیاسی ، فکری ، معاشرتی اور تہذیبی پس منظر  
(۱۸۰۳ء تا ۱۸۵۷ء)

انسویں صدی کے آغاز سے کچھ ہی پہلے برطانوی امداد ہندوستان کے مسرق صوبوں کے علاوہ بعض دوسرے علاقوں میں بھی قائم ہو چکا تھا۔ برطانوی فوجیں مسور ، حیدر آباد اور اودھ کی ریاستوں میں معین ہو چکی تھیں اور اس طرح بالواسطہ یا بلا واسطہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط میں ہندوستان کے بہت سے علاقے آ چکے تھے۔ البتہ وسطی ہند میں مرہٹے انگریزوں کے سیاسی نظام کا جزو ابھی نہیں بنے تھے اور پنجاب میں سکھ اپنی طاقت مستحکم کر رہے تھے۔ شمال مغرب میں افغانوں کی حکومت ابھی قائم تھی اور سندھ میں امران سندھ کی فرمانروائی تھی۔

ویلزلی جو آسٹ انڈیا کمپنی کا گورنر جنرل بن کر ۱۷۹۸ء میں ہندوستان آیا ، بحار کے بحائے ملوکیت کا دلدادہ تھا ، حناحہ موقع ناے ہی اس نے ریاست حیدر آباد کو ۱۷۹۸ء میں حلفہٴ معاونت میں حکم لیا۔ حلفہٴ معاونت کا مطلب تھا انگریزوں کی سادب قبول کر لینا ، کیونکہ اس کی رو سے دیسی ریاستوں کو ناسد کیا جانا تھا کہ انگریزوں کے مسورے کے بعد صلح و جنگ نہ کریں ، کسی دوسری یورپی قوم کے آدمی کو نوکر نہ رکھیں اور ایک انگریزی فوج اپنے خرچ سے ریاست میں مقرر کریں۔ پھر ویلزلی نے بڑی تدبیروں سے مسور میں ٹپو سلطان کو ۱۷۹۹ء میں سکست دی اور اس کے بعد نمجور ، سورب اور کرناٹک پر قبضہ کیا۔ ۱۸۰۱ء میں اودھ کا آدھا ملک براہ راست کمپنی کے زیر انتظام لے لیا گیا اور اس کے بعد مرہٹوں کو زیر کرنے کی تدبیریں شروع کر دی گئیں۔ اس وقت مرہٹہ سرداروں کے آس میں تعلقات اچھے نہیں تھے۔ پونا میں ہشوا ، گوالیار میں سندھیا ، اندور میں ہلکر ، بڑودہ میں گائیکواڑ اور ناگپور میں بھونسلہ کی حکمرانی تھی اور ہر ایک خاصے وسیع علاقے پر حاکم تھا۔ مہاراجہ سندھیا نے ریاست گوالیار کی طاقت میں بہت اضافہ کر لیا تھا ، دہلی اور اس کے نواح کا علاقہ بھی اسی کے قبضے میں تھا اور ناہیا مغل ناساہ ساہ عالم کی حشمت سندھیا کے پروردہ کی تھی۔

پونا کے ہشوا ناجی راؤ ناں نے سندھیا کو ساہ ملا کر ہلکر کی موت بوڑنی چاہی لیکن سکست کھاٹی اور انگریزوں سے طالب امداد ہوا۔ ویلزلی نے موقع عنمت جان کر



بشوا سے عہد نامہ سین بر دستخط کروا لیے (دسمبر ۱۸۰۲ء<sup>(۱)</sup>)۔ ناگپور کے راجا بھوسلہ اور سدھائے سسوا کے اس عہد نامے سے اختلاف نہا اور اسی فوجیں ملا کر حیدر آباد کا رخ نہا ، ہلکر لا علی رہا لیکن ڈنکوار نے انگریزوں سے اتحاد کر نہا۔ انگریزی فوجیں دو حصوں میں نہت نہر بھوسلہ اور سدھائے کا مقابلہ کرے لگیں۔ گورنر جنرل ویلرلی کے بھائی جنرل آر تھپر ویلرلی کی سرکردگی میں دکن میں اور جنرل لک کے تحت سہال میں۔ مرہٹوں کو دکن میں آئنی اور اڑکڑوں کے مقامات پر سکست ہوئی اور سدھائے کی افواج کو سہال میں ڈول ، دکن ، آکرہ اور لیسواڑی کے مقامات پر (سپتمبر تا نومبر ۱۸۰۳ء<sup>(۲)</sup>)۔ سدھائے اور بھوسلہ انگریزوں سے دہ کر صلح کرنے پر مجبور ہوئے جس کی رو سے ان کا سب سے علاوہ براہ راست انگریزوں کے زیر انتظام آگیا۔ سب سے بڑی بات نہت نہر دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہوا اور محل بادشاہ شاہ عالم انگریزوں کے دست نگر ہو گیا۔ مرہٹہ سرداروں میں سے اب صرف ہلکر کو رہ کر نہا ناں بھا۔ انگریزوں کی اس سے بھی لٹی لڑائیاں ہوئیں جن میں ایک آدھ بار ہلکر کا بلہ بھاری رہا ، لیکن آخر کار حوری ۱۸۰۶ء میں ہلکر نے معاہدہ صلح کر نہا ، جس کی رو سے اسی تناسب کا حصہ اسے انگریزوں کو دنا پڑا۔ حصہ سارے بدوساں میں اب انگریزوں کی ٹکر کی کوئی طاقت نہ رہی۔

آئندہ محاس سالوں میں برطانوی حملہ امداد میں برابر اضافہ ہونا رہا۔ بدوساں کے مختلف حصوں کی ریاستیں اور حکومتیں رور رور زور زور ہوئی اور اپنی سیاسی آزادی کھوئی چلی گئیں۔ عرصہ نہت نہر ۱۸۱۸ء کے حاتمے تک درنائے صلح کے خوب کا سارا علاوہ انگریزوں کے زیر نگیں آگیا بھا۔

پنجاب میں سکھ سردار رنجیت سنگھ کی حکومت بھی اور سندھ میں باج امیروں کی ، افغانستان پر روسی تسلط کے اندیسے نے انگریزوں سے افغانستان پر بھی چڑھائی کردی (۱۸۳۸ء) اور اگرچہ اس مہم میں انہیں کامیابی نہیں ہوئی لیکن اس کا ایک نتیجہ نہت ہوا کہ ۱۸۴۳ء میں سندھ کا سارا علاوہ برطانوی حکومت میں شامل کر لیا گیا۔ پنجاب میں رنجیت سنگھ کی وفات (۱۸۳۹ء) پر مختلف سکھ سرداروں میں اقتدار کی کشمکش شروع ہو گئی۔ بعض سردار انگریزوں سے الحاق پڑے اور اس طرح انگریزوں کو پنجاب پر بھی مکمل قبضہ کر لینے کا موقع مل گیا (۱۸۴۹ء)۔ ادھر مشرق میں برما کے راجا کو شکست دے کر اس سے اراکان و آسام ۱۸۲۶ء ہی میں حاصل کر لیے گئے تھے ، ۱۸۵۲ء میں جنوبی برما پر بھی قبضہ جا لیا گیا۔

(۱) محمد آر۔ سی اور دیگر مصنفین ”ہندوستان کی اعلیٰ سطحی تاریخ“ (انگریزی) ص۔ ۷۰۰

(۲) ایضاً ص۔ ۷۰۲

گورنر جنرل ڈلہوزی (۱۸۳۸ تا ۱۸۵۶ء) ملوکیت سیدی میں ویلرلی سے کچھ کم نہ تھا۔ اس نے اپنے دورِ حکومت میں نہ صرف پنجاب، جنوبی برما اور سکیم کو بزورِ سمسٹر برطانوی علاقے میں شامل کیا، بلکہ ایک نئے قانون کے ذریعے جسے قانونِ اسفراض یا قانونِ نارگنسٹ کا نام دیا گیا ہے، ستارا، ناگپور، جھانسی، حمت پور، سنہل وغیرہ ریاستوں کو ضم کر دیا اور معزول شہنشاہی راؤ کے سوا کو معزورہ وطنی سے محروم کر دیا۔ قانونِ اسفراض کا مطلب یہ تھا کہ جو رئیس یا راجا لا ولد فوب ہو جائے اس کی ریاست کی وارث انسٹ انڈیا کمپنی ہوگی، حاتمہ ڈلہوزی نے فوجی مصارف کی تکمیل کے لئے ریاست حیدر آباد سے صوبہ ہرار علیحدہ کر کے کمپنی کی راہِ راست بحوالہ میں لے لیا (۱۸۵۳ء)۔ اس کے بعد ۱۸۵۶ء میں والٹی اودہ واجد علی شاہ کو معزول کر کے ریاست اودہ ۵ بھی الحاق کر لیا گیا۔ ڈلہوزی کی ہر دراز دسی کی کمپنی بلکہ حکومتِ برطانیہ نائڈ و نیو ٹری رہی۔“ حب ڈلہوزی انی مدب پوری کر کے واپس گیا تو سارے ملک میں یہ نادر چھوڑ گیا کہ انگریز نام دیسی ریاستوں کا حاتمہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور سارے ہندوستان پر براہِ راست بلا سرکٹ حکومت کرنا چاہتے ہیں۔

۱۸۳۲ء تک انسٹ انڈیا کمپنی حکومت اور تجارت دونوں کام کرتی تھی۔ باہروں کو زر دسی سے اولس سروکار ہونا ہے۔ حاتمہ کمپنی بھی اسی کو مقدم جانی رہی۔ ملک کے کاروبار پر مصد ہو جانے کے علاوہ مختلف دیسی ریاستوں یا ان کے وسیع حصوں پر بھی کمپنی کا مصد ہو گیا تھا۔ چونکہ اب کمپنی کی افواج پر ریاست یا راجدھانی میں موجود نہیں اس لئے ریاستوں کی افواج ہر طرف تر دی گئیں۔ جس کے نتیجے میں سیکڑوں زمیندار اور ہزاروں سپاہی اور ملازم روز در ہو گئے اور انہوں نے مجبور ہو کر لوٹ مار کا سہہ احساہ کر لیا۔ یہ لوگ ہمارے کھلائے تھے۔ ہندوؤں کی اصطلاح کسی خاص قوم یا گروہ سے مخصوص نہ تھی بلکہ اس میں ہندو مسلمان اور سہی علاقوں کے لوگ سر یک تھے جو اصل میں مرہٹوں کی بے فائدہ فوج میں یا رفاہ میں لوٹ مار کی مشق کرتے رہتے تھے۔ حب مرہٹہ سرگروہوں نے مستقل ریاستیں بنائیں نو ہندوؤں کے ہت سے سرگروہوں کو بھی جاگیریں اور زمینداریاں ملیں۔ پھر بھی ہزاروں بے روزگار رہ گئے اور انہوں نے فزاق کو ذریعہٴ معاش بنا لیا۔ انگریزوں کا تسلط وسطی ہند میں بڑھنے لگا تو اور بھی بے روزگاری بھلی اور ہندوؤں کی تعداد اور سرگروہوں میں اضافہ ہو گیا۔ حب تک ہندوؤں نے براہِ راست برطانوی حکومت کے زیرِ انتظام علاقوں میں شورش ندا نہیں کی، اس وقت تک ان کی روک تھام کی کوئی مدب انگریز حکام نے نہ کی، البتہ جب ہندوؤں نے سالی سرکار کے برطانوی علاقے میں بھی لوٹ مار کی نولارڈ ہسٹنگز نے

جو آس رہا ہے۔ سر کوربر حمرل تھا ، (۱۸۱۳ تا ۱۸۱۸ء) ایک لاکھ سے زیادہ ووج جمع کر کے ان کا قلع قمع کرنے کی ٹھانی ۔ اس مہم کے دوران میں دورِ لا نظمی کی مرہون طامش بنی مہا ہو گئیں ۔ پورے طور پر برطانوی سلط و انتظام میں آ گئیں ۔ ۱۸۱۸ء کے آخر تک ہنداروں کی آف بھی حم ہو گئی ۔

ہنداروں سے مختلف مجرمانہ سرگرمیوں میں مصروف ایک اور گروہ ٹھکوں کا تھا ۔ یہ لوگ ہندو دیوتوں کا لی ۔ درد یا بھوانی کو بوجے تھے اور جن افراد کو اپنا سکا رہا ہے تھے ان کے سر ان دیوتوں کے قدموں میں قربانی کے طور پر لا کر دالے تھے اور اسے ایک مذہبی رخصت سمجھے تھے ۔ مرے والے نے جسم پر حوٹھو ہونا لوٹ لے ۔ ٹھکی کرنے والوں میں بعض اوقات حار حار سو کا گروہ بھی ہوتا تھا ۔ ٹھکوں کی نطہ خاصی باقاعدہ تھی ۔ ان کے اپنے حصہ اسارے اور الفاظ تھے ۔ ٹھکوں نے اودھ سے لے کر حدر آباد تک اور راجپوتانہ اور بدیل ٹھہد میں اپنی مجرمانہ سرگرمیاں جاری کر رہی تھیں ۔ ۱۸۲۸ء میں لارڈ ولیم سٹیک نے ٹھکی کے انسداد کا مقصد بنا اور ٹرنل ولیم سلیم کو اس کام کے لیے مامور کیا ، جس نے سرینا دتھ ہرار ٹھک گرفتار لے اور اسے سرائے دیں ۔ ٹھکوں کے خلاف مہم کئی سالوں تک جاری رہی حلی ۱۸۳۷ء تک اس مہم گروہ کا بھی خاتمہ ہو گیا ۔

اگرچہ ہنداروں اور ٹھکوں سے اہل ہند کو نجات دلا کر اور ملک کے راسوں کو محفوظ بنا کر اسٹ انڈیا کمپنی نے اس و امن ضرور قائم کر دیا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کمی نے اسی بحار اور حکومت کے مخلوط عہد میں ، حکومت کے پردے میں خوب زر کسی کی ۔ ہندوستان کی صعب و حرف اور بحار دن بدن کم ہونی لگی ، ہندوستانیوں کو تمام بڑے عہدوں سے خارج کیا گیا ، عدالتوں کو درجہ آمدنی ہرار دیا گیا اور عدالتی انصاف کے معاملے میں ہندوستانیوں اور فرنگیوں میں امتیاز کیا گیا ، بلکہ دسی عسائیوں اور دوسرے مذہب والے ہندوستانیوں کے درمیان بھی امتیاز برتا گیا<sup>(۱)</sup> ۔ ان سب سکایاں اور حند دیگر وجوہ کی بنا پر برطانوی پارلیمنٹ نے ۱۸۳۳ء میں کمپنی سے بحار کا حق چھین لیا اور اس وقت سے اس کے ہاتھ میں صرف ہندوستان کی حکومت رہ گئی ۔ بحار کا مشعلہ ناف نہ رہے سے کمپنی کی پوری وجہ توسیع سلطنت کی طرف ہو گئی چنانچہ ۱۸۵۶ء تک سندھ ، پنجاب ، اودھ ، برما اور دوسری کئی ریاستیں براہ راست کمپنی کی حکومت میں آ گئیں ۔

انگریزی فوجیں ستمبر ۱۸۰۳ء میں مرہٹوں کو سکست دے کر دہلی میں داخل ہو گئی تھیں ۔ مغل بادشاہ شاہ عالم مرہٹوں کے چنگل سے نکل کر انگریزوں کی ماتحتی میں

آگئے تھے۔ اس وقت بادشاہ اور ناساہت کی حالت کس مدرسیم بھی اس کی ایک  
 جھلک ”تاریخ ہند بعہدِ برطانیہ“ کے مؤلف نے یوں دکھائی ہے۔ ”جنرل لک کو  
 ۱۵ ستمبر ۱۸۰۳ء کو ساہی ملاقات کا سرف حاصل ہوا، موصوف نے دیکھا کہ وہ قدم  
 عزت و شان کا مصیب زدہ مجسمہ ضعیف سری، بے نصارتی، ناداری و زوالِ مرست کی  
 مصیبتوں سے حسہ حال اور سکسہ دل ایک چھوٹے سے بوسدہ سامانے کے نیچے، جو  
 اس کی شان و سؤت کا سمہا ناگوار بٹھا بٹھا اور اندرونی و سرونی مصائب کا ایک  
 عبرتناک نظارہ پس کر رہا تھا“ (۱)۔ انگریز چاہے ہو اس وقت مغلوں کی نام نہاد بادشاہت  
 کو خم کر سکے تھے لیکن انہوں نے اسانہیں کما کونکہ ان کے خیال میں اس وقت  
 کے حالات میں مغل بادشاہ کو اسانہ کارما کرنا ہی رکھنا سیاسی اعتبار سے زیادہ مناسب  
 تھا۔ چنانچہ انگریزوں نے ساہ عالم کی بادشاہت کو قائم رکھا، اس کی نشن مقرر کر  
 دی اور لال قلعے کے اندر ناساہ کی خود بخاری میں کوئی دخل نہں دیا۔ جو لوگ قلعے  
 میں آباد تھے ان کا سہار ناساہ کی رعانا میں ہوا تھا۔ ساہی خاندان کے افراد کی عزت کی  
 حانی بھی، ساہی دربار کے آداب کا خیال رکھا جانا تھا، دربار باقاعدگی سے منعقد ہوتے  
 تھے، خطابات کا سلسلہ قائم تھا، دربار کی خصوصی زبان بھی باقی بھی۔ انگریز حکام  
 دوسرے درباروں کی طرح دربار میں حاضر ہوتے تھے۔ جب تک ساہ عالم ناساہ زندہ رہے  
 انگریزوں نے ناساہ کی عرب و احرام میں کمی نہں کی، لیکن نومبر ۱۸۰۶ء میں  
 ساہ عالم کی وفات پر ان کے فرزند اکبر ساہ ثانی خب کے وارث ہوئے ہو ساہ عالم اور  
 اسٹ انڈیا کمپنی کے ماہن جو عبوری ساسی تعلقات قائم ہوئے تھے حلد ہی ان کی  
 نوعیت بدلتی شروع ہو گئی۔ اکبر ساہ ثانی نے تخت نشن ہونے پر ان تمام مبہم  
 مراعات اور ساسی حقوں سے فائدہ اٹھانا چاہا جو انگریزوں اور ساہ عالم کے درسان  
 معاہدے کی رو سے معل ناساہ کو دئے گئے تھے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم قدم  
 بادشاہ نے یہ اٹھانا کہ ایک جانب وزیرِ پیشکس یعنی نشن میں اضافے کے لئے کمپنی سے  
 محرک کی، دوسری جانب اننے ساہی اخسارات کے استعمال کے طور پر اپنے فرزند اکبر  
 سہزادہ ابو ظفر کی جگہ جنہیں حسبِ نجویز ریزیڈنٹ ولی عہد بنایا گیا تھا اپنے منجھلے  
 بیٹے سہزادہ مرزا جہانگیر کو ولی عہد نامزد کرنا چاہا۔ اس وقت دہلی میں مسٹر سہن  
 ریزیڈنٹ تھے جو خاندانِ ساہی کا بڑا احترام کرتے تھے لیکن اس مسئلے پر انہوں نے  
 بادشاہ کی بات نہ مانی اور یہ اختلاف یہاں تک بڑھا کہ مرزا جہانگیر نے ریزیڈنٹ پر  
 طعنہ سر کر دیا۔ ریزیڈنٹ بچ گیا لیکن مرزا جہانگیر گرفتار کر کے الہ باد بھیج دیے

(۱) عبدالسلام (مترجم) ”تاریخ ہند بعہدِ برطانیہ“ مطبوعہ حیدر آباد دکن بحوالہ علوی،  
 نویر احمد ”ذوق۔ سوانح اور انتقاد“ - ص - ۴ لاہور - ۱۹۶۳ - پریول اسپرے  
 ”مغلوں کی شام“ میں ص - ۳۵ (کیمرج ۱۹۵۱ء) پر یہ تاریخ ۱۶ ستمبر ۱۸۳۰ء بتائی ہے۔

گئے<sup>(۱)</sup>۔ اور کمیٹی نے اعلان کر دیا کہ وہ مرزا ابو ظفر کے علاوہ کسی دوسرے سہزادے کو ولی عہد تسلیم نہیں کریں گی۔

۱۸۱۳ء میں لارڈ ہسٹنگز نے گورنر جنرل سپہائی اور ۱۸۲۳ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ ان کے دور میں بقول کے . و . مہلی سن ”ہمارے امداد اعلیٰ کو واضح طور پر پس کرنے میں اب کوئی فائل نہیں رہا اور اس غرض کے لئے ضروری ہوا کہ سلطنتِ دہلی کا مہرودہ ختم کر دیا جائے“<sup>(۲)</sup>۔ گورنر جنرل نے سہلی بدوسان کا دورہ کیا تو اکبر شاہ ثانی کی خدمت میں بطور رعنا پس ہو کر نذر گزرا جس سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد والٹی اودھ کو نادر شاہ کا لقب احسار کرنے کا مشورہ دیا گیا اور دوسرے والیانِ رنات کو برص دی گئی کہ وہ مغل ناح و بخت سے رسمی وفاداری کی روایت کو ختم کر دیں۔ دہلی کے ربرنڈنٹ بھی نادر شاہ سے اسے قبول و فعل سے برابر نہ واضح کرتے حلے جائے بھی کہ وہ صرف نام کے نادر شاہ ہیں اس لیے ساہی حقو و احسارات پر اصرار کرنا بے سود ہے۔ نادر شاہ نے ہسٹنگز کی پیشکش سے اسٹیف میں اضافے کی جو درخواست کی بھی اس کے بارے میں کمیٹی کی جانب سے اس میں نہ جواب ملا کہ اس وقت ممکن ہے جب نادر شاہ ایک عہد نامے کے ذریعے کمیٹی پر اسے دعوؤں سے دستبردار ہو جائیں۔ نادر شاہ اس سلسلے میں راجارام موہن رائے کے توسط سے انگریزی حکومت سے بات کر رہے تھے کہ راجہ کا انتقال ہو گیا اور کوئی مسئلہ ہونے سے پہلے ۱۸۳۷ء میں خود ادر شاہ ثانی بھی قوت ہو گئے۔

مہادر شاہ ظفر بعد معلیٰ کی حکومت کے وارث ہوئے تو انہوں نے پھر اسے ساہی حقو و احسارات سوائے کی کوسس کی، ربر ہسٹنگز کا سوال پھر اٹھانا گیا، مگر کمیٹی نے پھر وہی شرط رکھی کہ نادر شاہ اسے سب دعوؤں سے دستبردار ہو جائیں، مگر نادر شاہ اس پر راضی نہ ہوئے۔ اس گئی گوری حالت میں بھی نادر شاہ کو اپنی حاندانی عظمت کا اس قدر حال تھا کہ انہوں نے جس نے موقع پر گورنر جنرل لارڈ ایلن براؤن اسے برابر کرسی دینے سے انکار کر دیا، جس کے جواب میں گورنر جنرل نے ساہی سرکات کے موقع پر کمیٹی کی جانب سے نذر سس کرنے کی رسم موقوف کر دی۔ نذر سس کرنے کی رسم کا بند ہو جانا سیاسی طور پر نہ معنی رکھتا تھا کہ اب کمیٹی نادر شاہ کو سرے سے نادر شاہ ہی تسلیم نہیں کرتی۔ ۱۸۴۹ء میں جب ولی عہد دارا شہ کا انتقال ہوا تو سہزادہ مرزا فخر الدین سے جو نادر شاہ کا بڑا لڑکا تھا انگریزوں نے اسے حصہ معاہدہ کیا کہ وہ نادر شاہ بننے پر لالہ ملنے کی سکوت کر لیں اور نصیب (مہروئی) حلے جائیں گے، سیر

(۱) تفصیلات کے لیے دیکھئے۔ ”مرزا جہانگیر اور ان کا مدفن“ مشہور رسالہ شاہکار

لاہور۔ مارچ۔ ۱۹۳۷ء

(۲) تاریخ تحریک آزادی۔ ج۔ ۲۔ حصہ اول، ص۔ ۱۱

گورنر جنرل سے مساویانہ طور پر ملیں گے۔ نادرشاہ اور ملکہ اپنے چھوٹے بیٹے جوان بخت کو ولی عہد نامزد کرنا چاہتے تھے لیکن انگریزوں نے مرزا فخرالدین کی ولی عہدی کا اعلان کر دیا اور جب بہادر شاہ کی زندگی ہی میں یعنی ۱۸۵۶ء میں، مرزا فخرالدین کا انتقال ہو گیا تو نادرشاہ کے بڑے بیٹے مرزا فوس سے انگریزوں نے نہ معاہدہ کیا کہ بہادر شاہ کے بعد لقب شاہی موقوف نہ جائے گا، صرف خطاب سپہرادہ باقی رہے گا اور زیر شکس یعنی نسس سوا لاکھ کے بجائے ہندو ہزار روئے ماہانہ ہو گی۔ مرزا فوس نے نہ مجوز مسطور لڑ لی اور نسس نے ان کی ولی عہدی کا اعلان کر دیا۔ نہ دودمان سموری پر آخری مہلک وار تھا۔ بلکہ، معتلی کی جس سلطنت کا خاتمہ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے ساتھ مسموم ہو چکا تھا وہ مرزا فوس کے ہاتھوں آتشی طور پر ایک سال پسر ہی ختم ہو گئی تھی۔ شاہ عالم سے لے کر بہادر شاہ تک سب محل نادرشاہ اگرچہ محض نام کے نادرشاہ تھے لیکن دسی نے بھی دسی وہب نہ مسلم ہیں نہ تھا کہ وہ قانونی و آتشی طور پر ہندوستان کی فرمانروائی سے محروم ہو چکا ہے۔ بقول سنٹر ”اگر ہم عورت و فکر سے کام لیں تو معلوم ہو گا کہ نہ عام حال غلط ہے کہ آخری میں محل نادرشاہ عورتوں کی طرح لمرور تھے اور نسس و فجور میں عورت، ان سوں میں سے صرف ایک کو خدا نے نہ توفیق ارزائی کی کہ وہ حکومت لڑے دیکھائے، لیکن وہ ناکام رہا کیونکہ حالات عمر معمولی طور پر نا مساعد تھے مگر اس کی ناکامی میں بھی عظمت اور جلالت کی قدر موجود ہے“ (۱)۔

انگریزی راج کے مستحکم ہو جانے سے حواس و سکون کا دور دورہ ہوا اگرچہ یہ سکون گوسہ فوس کے سکون کے مماثل تھا، تاہم اس سے نسس کی ربع صدی کی مساعلا غر یعنی و غیر محفوظ حالت اور برا گندگی و اسرار کے مقابلے میں اہل ہند نے عام طور پر اسے عسب حانا۔ علماء کا ایک طبقہ اب بھی اصلاح عائد و اعمال اور اس کے ساتھ ساتھ حرمت ہندی کے جذبات نہلانے میں مصروف رہا، تاہم حواس و عوام کی بڑی اکثریت نے انگریز حکمرانوں کی فرمانروائی کو بطور ایک اسر واقعی کے تسلیم کر لیا اور اپنی معمول کی زندگی اور مسائل میں مصروف ہو گئے۔ محل نادرشاہ کی نظر میں سب رعایا حواء مسلم ہو نا ہندو، سب سے ہو نا سنی برابر تھی۔ اہل دہلی نے بھی معاشرت کے اسی معیار کو اپنایا ہوا تھا۔ تمام قومیں مل جل کر ہر سکون زندگی بسر کرتی تھیں۔ تجارت زیادہ تر ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی اور صنعت و حرفت مسلمانوں کے۔ لوگ بالعموم حوس باش اور زندہ دل تھے، میلوں ٹھیلوں اور مہرباب کے نشانی تھے۔ برطانوی حکومت کے استحکام نے انہیں جو امن و سکون کی زندگی بخشی تو انہوں نے اپنے حسی، جالیانی، فکری، علمی

و تمدنی مقاصد کو پورا کرنے کی کوششیں شروع کر دیں اور مجلسی زندگی کی ایک نئی لہر سارے معاشرے میں دوڑ گئی۔

چھ لاکھ مربع گز رقبے کا لال قلعہ کسی زمانے کی معاشقہ، مہدنی و ثقافتی زندگی کا مرکز تھا۔ شاہانہ مغلہ کو بھی اس بات کا احساس تھا، اس لیے انہوں نے بھی لال قلعے کی مرمریت اور اس کی معاشقہ و ثقافتی اہمیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ حو روایات انہیں ورے میں ملی تھیں اور جنہیں وہ غریب رکھنے بھی وہ برابر باقی رکھی گئیں۔ اگرچہ انہیں اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا کہ اب ان کی حسبِ سابق سطرینج سے زیادہ نہیں، تاہم قلعے کی چار دیواری کے اندر اب بھی اہمی کا سکھ چلنا تھا۔ اس لیے انہی روایات کو اس چار دیواری کے اندر برقرار رکھ کر وہ نہ صرف اپنی نفسانی تسکینی کر لے بھی بلکہ قلعے کے باہر رہنے والوں کے لیے بھی نہ طمانت پیدا کر دے بھی کہ مغلہ سلطنت اور اس کے تمدن و ثقافت کا حراج انہی گل میں ہوا۔ دربار شاہی میں امیر و وزیر، مہدی، محاسب، محافظ، خواص و خواجہ سرا، حویدار و عصا بردار سب برقرار تھے اور مجرے، سلاہ، ندرائے، خطاب، خلعت، انعام وغیرہ کی رسوم ابھی باقی تھیں۔ شاہی حسن اور خلوسوں کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ لوگ شاہی حسنوں اور خلوسوں کو سوو سے دیکھتے تھے اور بڑی دلچسپی سے ان میں سرکرتے تھے۔

پرسیول سبٹر نے اگرچہ آخری دن محلِ نادساہوں کو عورتوں کی طرح ٹمرور اور فسق و فجور میں مبتلا ماننے سے انکار کیا ہے لیکن یہ بھی لکھا ہے ”سائنس و مہدیت نادساہوں، جھگڑالو اور نکھٹو سپہرادوں اور عیسائے سند سلاطینوں کا مرکز ہونے کی حسبِ قلعہ ایک اسے سب سے مرمر کے سہ نشین کی طرح تھا جو بدر رو در بنانا گیا ہو“ (۱)۔ بدر رو سے سبٹر کا اشارہ درباری سازسوں اور عیس و عشرت اور لہو و لعب کے ماحول کی طرف ہے۔ خلیق احمد نظامی نے بھی منشی فہاس الدین کی کتاب ”درم آخر“ کے حوالے سے لکھا ہے کہ انہوں نے ”دہلی کے آخری دو نادساہوں آدر شاہ بانی اور بہادر شاہ ظفر کے طریقِ معاشرت کی تصویر کشی کی ہے، اس بوری تصویر میں صرف آمائش اور عیس کا رنگ بھرا ہوا ہے“ (۲)۔ راب اور دن جن میں گزرے تھے، کبھی

- 
- (۱) امپیر پرنسول، ص ۸۱-۸۲۔ اس میں مبالغہ کا مہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ قلعہ شہر دہلی نو نہ تھا اور اگر قلعہ میں سازسں ہوں بھی تو فقط مقام و مدارج، یا پسں اور مراعات کے لیے۔ ملک سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ اس لیے اس روڈ اطلاں صحیح معلوم نہیں ہونا۔۔۔ مدیر۔
- (۲) یہ نقشہ بھی یک رجا ہے۔ کیونکہ منشی فہاس الدین درم آخر کی تصویر کشی کرتے ہیں اور اس میں قلعہ کی مجلسی اور برمی زندگی کی جزئیات سے بحث ہے۔ مگر یہ نا ممکن تھا کہ دن رات اور چوبیس گھنٹوں میں سپہرادے یا سلاطین زادے فقط عیس و نشاط کی سوچتے رہیں۔ دوسرے ان افراد کو نہ کہیں ملازمت ملتی تھی اور نہ وہ حسب و نسب کی وجہ سے ملازمت (نقہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نورے بندی ہے ، کبھی رب جگا ، کبھی نو روز ، کبھی آخری چہار سنبہ ، کبھی خواجہ صاحب کی جھڑیاں ، کبھی سلونو ، کبھی بھول والوں کی سیر - غرض بزم ہی بزم ہے ، رزم کا کہیں نام نہیں<sup>(۱)</sup>۔ لکن سازشوں اور عباسوں کا مرکز ہونے کے علاوہ بھی لال قلعہ بہت کچھ تھا - اسی بھلو کو سنٹر نے سنگ مرمر کے سہ شش سے تعبیر کیا ہے - وہ کہتا ہے کہ ”مغلہ دربار صرف دہلی کے لیے نہیں بلکہ سارے ہندوستان کے لیے رفتار و گفناں ، نسبت و برخاست ، وضع قطع اور آداب و رسوم کا اسٹا ہی نمونہ تھا جیسا ورسائی کا فرانسیسی دربار یورپ کے لوگوں کے لیے - لکھنؤ اور حیدر آباد کا نوای معاصرہ اسی اصل کی ساحل تھیں - تنگال سے لے کر سجاد تک اور حبوب میں مدورا تک مغلوں کے آداب مجلس اور مراسم دربار معاری تسلیم کیے جاتے تھے - لباس میں بھی اہل دربار ہی کی نقل کرنے کی کوشش کی جاتی - جس زمانے میں انگریزوں کا تھافی اور بریڈنس کے سپروں سے آگے نہیں بڑھا تھا مغلہ دربار کا نہ اثر ہندوستانی معاصرے کے لیے ایک قیمتی رسنہ اتحاد تھا<sup>(۲)</sup>۔ اس نے نہ بھی لکھا ہے کہ ”مہادر ساہ کا دربار بڑی قدر و قیمت رکھنے والی مؤثر سے بھی ، سابی سرپرستی نے اردو ادب کو ترقی دی ، مصوری کا دہلوی دستان برقرار رکھا ، حناجہ قلعہ تمام فنون اور دستکاریوں کا قدرتی مرکز تھا<sup>(۳)</sup>۔“

حالی نے نادگر غالب میں لکھا ہے ”دیرھون صدی بحری میں حب مسلمانوں کا بول درجہ شاد کو مہج حکا تھا اور ان کی دوا ، عرب اور حکومت کے ساتھ علم و فضل اور کمال بھی رخصت ہو چکے تھے ، حیرت افق سے دارالاحلام دہلی میں حیدر اہل کمال اسے جمع ہو گئے تھے جس کی مجلس اور جلسے عہد انوری و ساجھانی کی صحبتوں اور جلسوں کی یاد دلاتے تھے<sup>(۴)</sup>۔ اسی باب کو مولوی دد اللہ اسے انداز میں یوں بیان کرتے ہیں ”قاعدہ ہے کہ حب حراغ بچھے کو ہوا ہے تو لو بھڑک اٹھی ہے - اسی طرح سلطنت سمورہ کا حراغ گل ہوئے کو ہوا تو اس نے اسی وہ روسی چمکائی اور اسکا سنہالا لیا کہ اس کی نظر مشکل سے نارنج میں ملے گی<sup>(۵)</sup>۔“ سر سید نے ان باتوں کا

کے آرزو مند تھے - سیاست کے میدان میں ان کی کھپ بو سکی تھی مگر یہاں انگریز کا راج تھا - لا محالہ انہیں تضحیع اوقات اور دفع الوقتی کے مسائل کی طرف متوجہ ہونا پڑنا تھا - مگر ان میں کئی شہزادے ایسے تھے جو مختلف فنون میں کافی مہارت رکھتے تھے ... مدیر

(۱) نظامی خلیق احمد ”تاریخ مشائخ“ ص - ۳۴۲ دہلی - ۱۹۵۳ -  
بحوالہ عبادت بریلوی ”موسم اور مطالعہ موسم“ ص - ۱۹۵ لاہور و کراچی - ۱۹۶۱

(۲) اسپر ، پرسول - ص - ۸۲ - ۸۳

(۳) انصاف

(۴) حالی الطاف حسین ”نادگر غالب“ ص - ۹ - اردو اکیڈمی سندھ ۱۹۶۲

(۵) ذکاء اللہ - ”تاریخ اسلامیان ہند“ ص - ۳۶ - بحوالہ علوی ، نور احمد ص - ۱۰



ایک تذکرہ جو معلول کے دورِ آخر میں دہلی میں جمع بھی اپنی تالیف 'آثار الصنادید' میں شامل کیا تھا۔ اس تذکرے پر نظر ڈالنے سے حالی اور ذکاء اللہ کے سانچ کی پوری پوری تصویر ہو جاتی ہے۔ اس تذکرے میں سرسید دے ۱۱۵ ہجری ہجریوں کا حال لکھا ہے، جس میں مسائح و صوفیاء، اہلِ باطن و علمائے علوم دینی و دنیوی، شعرا و ادباء، ترا و حفاظ، حوسنوس، مصتور اور ماہرینِ موسیقی شامل ہیں۔ اس زمانے کی دلتی کی روحانی، علمی، فکری، فنی و ثقافتی زندگی کس قدر بھرپور ہوئی، جہاں دانتوں کی اتنی بڑی تعداد موجود بھی!

نادساہ وقت بہادر شاہ دو شعر و ساعری سے خاص دلچسپی بھی۔ وہ خود بھی شعر کہتے تھے اور ظفر حخلص لڑے تھے۔ قلعے میں نافعہ کی سے مساعری ہوتے تھے۔ قلعے سے باہر بھی سپہر میں مختلف جگہوں پر شعر و ساعری کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔ غالب، مومن، دوو، ظفر، شاہ نصیر، بٹر و رحسان، سفید، نمون، صہبائی، عس، خضر، شاعر، مجروح، عارف، طہیر، احسان، سالک و عمرہ کے فارسی اور اردو نغموں سے دلتی کی ساری رضا گوشت رہی تھی۔ مصتوری سے بھی نادساہ کو دلچسپی تھی اور بقول برسول سپہر اس دور نے ہم سے ہم دو اہم مصتور راجہ حوں رام اور حسن ظفر جدا کیے، جنہوں نے دہلی کے دستانِ مصتوری کو زندہ رکھا<sup>(۱)</sup>۔ سرسید نے علاء علی حان، فضل علی حان، مرزا ساہرج نیگ اور محمد عالم کی مصتورانہ مہارت کی بھی داد دی ہے<sup>(۲)</sup>۔ اکبر شاہ ثانی اور ظفر دونوں موسیقی سے بھی سبقت رکھتے تھے اور ان کے زمانے میں لال قلعہ موسیقی کا بھی اچھا خاصہ مرکز بن گیا تھا۔ موسیقی کی باقاعدہ محفلیں منعقد ہوتی تھیں، جس میں اس زمانے کے نامور موسیقار حصہ لیتے تھے۔ سرسید نے اس دور کے نامور اربابِ موسیقی میں ہمب حان دہرید سرا، راگ رس حان نس ہوار، مرزا ناصر احمد نغمہ سرا و بین ہوار، بہادر خاں سارون، رحیم سین سارون، نظام حان اور قائم حان دہرید سرا، گلاب سنگھ بکھاوچی اور مکھو بکھاوچی کے نام گنائے ہیں اور ہر ایک کے ذہال فن پر تبصرہ کیا ہے<sup>(۳)</sup>۔ میں حوسنوسی کے ماہروں میں خطِ سبعلی میں سد محمد امیر، سید آغا، مرزا عبداللہ سک، امام الدین احمد خاں، اخوند عبد الرسول اور بدر الدین علی خاں ممتاز بھی اور خطِ سبعلی میں حافظ کلوا خاں، میر امام الدین، خطِ سکسہ میں مولوی حیات علی اور نذرت سنگر ناٹھ کا ذکر سرسید نے کیا ہے<sup>(۴)</sup>۔

فنونِ لطیفہ کے ماہرین کے علاوہ فنونِ مہندہ کے ماہر بھی دہلی کی رونق بڑھا رہے تھے۔

(۱) اسپر، پرسول - ص ۸۳

(۲) سرسید "تذکرہ اہل دہلی" ص ۱۷۳ - ۱۷۴ - مرتبہ اختر جونا گڑھی، مطبوعہ کراچی

(۳) سرسید "تذکرہ اہل دہلی" ص ۱۷۴ تا ۱۷۷

(۴) سرسید "تذکرہ اہل دہلی" ص ۱۷۰ تا ۱۷۳

طب کی اہمیت انسانی زندگی میں روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ اس فن کو بھی اس دور میں بڑے بڑے ناکمال ملے۔ حکیم احسن اللہ کا نام اس سلسلے میں نمایاں ہے جو شاہی معالج بھی تھے۔ وہ اپنے وف کے بڑے عالم فاضل تھے۔ نہ صرف طب بلکہ ہندسہ و ہشت سے بھی خوب واقف تھے۔ اور بدتر و ساست میں بھی ممتاز تھے۔ حکیم غلام نجف خان بھی مشہور طبیب تھے اور ایک زمانے تک طبیب کی حشہ سے اسٹانڈیا کمپنی کے ملازم رہے۔ ان کے علاوہ حکیم غلام حدر خان، حکیم غلام حسن خان، حکیم امام الدین، حکیم فتح اللہ خان، حکیم پیر بخش، حکیم حسن بخش خان، حکیم محمد یوسف خان، حکیم محمود خان، وغیرہ بھی نہ صرف علاج میں اساد تھے بلکہ دوسرے علومِ قدیمہ کے بھی عالم تھے۔

حسابی صحت کی طرح روحانی صحت بخشنے والوں کی بھی اس دور میں کمی نہ تھی۔ کئی صاحبِ دل اولیا و مسائخِ دہلی میں موجود تھے جنہوں نے صرف ریاضت و عبادت ہی میں کمال حاصل نہیں کیا تھا بلکہ جو اختوت اور انسانی محبت کے خیالات بھی عام کرتے تھے اور انی تعلیم و مواعظ کو درس و تدریس، کشف و کرامات، اور نصف و تالیف کے واسطوں سے عوام تک پہنچاتے تھے۔ حضرت شاہ غلام علی اس زمانے کے بہت بڑے بزرگ بھی جن کی معرفت کرے ہوئے سرسید کی ریاں خشک ہوئی ہیں۔ ان کی ”خانقاہ میں نانچ سو سے کم ہر نہیں رہتا تھا اور سب کا روٹی کٹوا آب کے ذمے تھا اور باوجود یکہ کہیں سے ایک حد مقرر نہ تھا، اللہ تعالیٰ غیب العیب سے سب کام حلانا تھا“۔ شاہ غلام علی کے حلقہ شاہ ابو سعید تھے اور ان کے بڑے بڑے شاہ سعد احمد، سب علمِ حدیث و فقہ، تفسیر و قرآن عالم اور ساتھ ہی صاحبِ دل و اہلِ باطن تھے۔ اسی طرح شاہ عبدالغنی، شاہ محمد آفاقی، حاجی علاء الدین احمد، اور مولانا محمد فخر الدین بھی تھے، خواجہ محمد نصر ربیع جو حواہ بہر درد کے نواسے تھے علاوہ علومِ دینی و باطنی کے ریاضات اور توسعی کے بھی بڑے ماہر تھے اور سر بھی کہتے تھے۔ میر محمدی، مولانا قطب الدین، حاجی غلام نصر الدین، مولوی یوسف علی، حضرت شاہ غیاث الدین، حضرت شاہ صابر بخش مبران شاہ نانو، حضرت جلال، مولانا محمد حیات وغیرہ اس دور کے ممتاز مسائخین و صوفیا میں سے تھے جن کا ذکر سرسید نے اسے تذکرے میں کیا ہے۔

ان علمائے کرام کا ایک وسیع طبقہ بھی دہلی میں موجود تھا جنہوں نے دینِ اسلام کے مختلف پہلوؤں کو مفکرانہ انداز میں سمجھا۔ انہی مہر و تقریر میں، دینی معاملات و مسائل کے سمجھانے میں ایک اجتہادی شانِ بیدا کی اور اپنے زمانے کے معاشرے کو ہاکیزہ بنانے کی حتی المقدور کوششیں کیں۔ بعضوں نے تحریر و تقریر سے آگے بڑھ کر

عملی طور پر جہاد اور آزادی کی تحریکیں چلائیں اور مسلم امداد کے احسا کی تدبیریں کیں۔ سرسند نے اپنے مدثرے میں جن علمائے دین کے حالات لکھے ہیں انکے نام یہ ہیں، سہ عبدالعزیز، مولانا صدرالدین، مولوی رسدالدين خان، سہ رفیع الدین، مولوی مخصوص اللہ، مولوی عبدالقادر، مولانا عبدالحمی، مولانا محمد اسماعیل سہید، مولانا محمد اسحاق، مولانا محمد یعقوب، مولانا قطب الدین خان، مولوی عبدالعالی، مولوی بدیر حسن، مولوی محبوب علی، مولوی بصیر الدین، مولوی کریم اللہ، مولانا فضل امام، مولانا فضل حق، مولوی نورالحسن، مولوی کریم علی، مولوی مملوک علی، معی سند رحمہ علی خان، احوید سر محمد، مولوی امان علی، مولوی محمد جان، مولوی نوارس علی، مولوی محمد رسم علی، مولوی حاجی محمد سرفراز۔ ان کے علاوہ مولانا سند احمد سہید کا دتر سر سند نے مسائیں میں اور مولوی امام محسن صہبائی کا بلبل ہوانا ساچھاں آباد ے تحت لیا ہے۔

سہ ولی اللہ کے فرورد سہ عبدالعزیز سرہ سال کی عمر ہی میں والد کے اسقال پر ان کے حلقہ میں اور ساٹھ سال تک امہوں نے اپنے والد کے کام کو جاری رکھا۔ علم حدیث کے درس کی طرف امہوں نے خاص طور پر روح کی جامعہ ہندوستان کے اتر مجددین کا سلسلہ آب سے ملنا ہے۔ آب کا زیادہ وف درس و تدریس میں گرنا تھا تاہم مسلمانان ہند کی سیاسی و اخلاقی ترقی سے بھی آب غافل نہ تھے۔ سہ عبدالعزیز نہ صرف اسلامی علوم کے بلکہ زبان و ادب کے بھی بڑے ماہر تھے اور دوسرے علوم و فنون پر بھی ان کی نظر گہری تھی۔ اس زمانے کے بستر علمائے آپ سے مص حاصل کیا۔

سہ ولی اللہ کے دوسرے بٹوں سہ رفیع الدین، سہ عبدالقادر اور سہ عبدالعزیز نے بھی والد کے مس کی تکمیل میں اپنا اپنا حصہ ادا کیا اور اپنے علم و فضل، درس و تدریس، تحریر و تہذیب میں مسلمانوں میں ایک نئی زندگی اور ایک نئی روح بھونکیے کی کوشش کی۔ سہ رفیع الدین کا سب سے اہم کارنامہ قرآن مجید کا محب اللفظ اردو ترجمہ ہے۔ سہ عبدالقادر نے بھی قرآن مجید کا ایک ترجمہ لیا اور اس میں اردو محاورے کا خیال رکھا۔ ان ترجموں سے عام مسلمانوں کو اپنے دین کے وسیع سے براہ راست آگاہی ہوئی۔ سند احمد سہید اور سہ اسماعیل سہید نے خاندان ولی اللہی سے فص حاصل کر کے جو مجاہدانہ کارنامے انجام دیے ان کا دتر آئے تفصیل سے آنا ہے۔

مولانا فضل حق حر آبادی علوم معقولہ و معقولہ دونوں میں بد طولی رکھے تھے، فاضل ادب بھی تھے اور عربی و فارسی تحریر پر نکساں عبور رکھے تھے۔ مؤلف تذکرہ علمائے ہند نے لکھا ہے کہ ان کی نظم چار ہزار اسعار سے زیادہ پر مشتمل ہوگی<sup>(۱)</sup>۔ مولانا امام بخش صہبائی جو دہلی کالج میں صدر مدرس فارسی مقرر ہوئے تھے

(۱) رحمان علی، مولوی ”تذکرہ علمائے ہند“۔ ص ۳۸۲-۳۸۳۔ کراچی۔ ۱۹۶۱ء

عربی اور فارسی کے بڑے عالم تھے ، فارسی و عربی میں شعر بھی کہتے تھے اور نثر بھی لکھتے تھے ۔ مولانا مملوک العلی جو دہلی کالج میں مدرسِ اول تھے عربی ، فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں کمال رکھتے تھے ، علومِ معقولہ و معقولہ کے ماہر تھے اور بلا کا حافظہ رکھتے تھے ۔ صدر الصدور معنی صدرالدین آزرہ اعلیٰ نائے کے ساعر ، عالم اور بلند فطرت انسان تھے جو اسے فرائضِ منصبی کی ادائیگی کے بعد زیادہ تر وقت درس و تدریس میں صرف کرتے تھے ۔ انہوں نے مدرسہ دارالافتا کو از سرِ نو تعمیر کرایا اور مدرسہ علوم کا انتظام کیا ۔

غرض یہ کہ دہلی انیسویں صدی کے نصف اول میں مسرقی تہذیب و تمدن ، علوم دینی و دنیوی ، اور فنونِ لطیفہ و مفیدہ کا بہت بڑا مرکز بھی مگر جسے جسے انگریزوں کے قدم حمے گئے مغربی اثرات بھی آپسہ آپسہ نفوذ کرنے لگے ۔ حوالہ لال ملے میں بھی انگریزی اثرات بعض سمہرادوں کے رہن سہن ، سہسے اوڑھے اور تعمیرِ مکانات کے سلسلے میں ظاہر ہوئے ۔ اکثر ساء بانی کا دوسرا سٹا مررا باہر تھا جس نے لال ملے میں دیوانِ عام کی سب بر رنگ محل کے احاطے میں مغربی طرز کا ایک مکان تعمیر کرایا ۔ وہ مغربی طرز کا لباس بھی پہنا تھا ، اس کے ناؤں میں بھاری بوٹ اور ہاتھ میں ایک بھاری سی جھڑی ہوئی تھی ۔ اس انداز سے وہ جھ گھوڑوں کی گاڑی میں بیٹھ کر سہر میں نکلتا تھا<sup>(۱)</sup> ۔

دہلی میں انگریزی اثرات کا سب سے بڑا منبع دہلی کالج<sup>(۲)</sup> تھا جو بہت تھوڑے عرصے میں ایک علمی اور تعلیمی ادارے سے بڑھ کر ایک تہذیبی و ثقافتی مرکز بن گیا ، ایسا مرکز حمان مشرق و مغرب کا سنگم ہوا ۔ دہلی کالج کا نام بننے سے پہلے یہ تعلیمی ادارہ مدرسہ غازی الدین کے نام سے مشہور تھا اور ۱۷۹۲ ع سے اس تاریخی عمارت میں قائم تھا جو نواب غازی الدین خان فروز جنگ کی سائی ہوئی ہے ۔ ۱۸۲۵ ع تک اس مدرسے میں اس زمانے کے رواج کے مطابق عربی فارسی کی تعلیم ہوتی تھی لیکن ۱۸۲۵ ع میں جب اسے دہلی کالج بنا دیا گیا تو مسرقی علوم کے ساتھ پوری علوم کی تعلیم اس کا خاص مقصد قرار پانا ، تاہم شروع شروع میں انگریزی کو شاملِ نصاب نہیں کیا گیا ، البتہ ۱۸۲۸ ع میں انگریزی جامع کا اضافہ ہوا ۔ ”اس تدبیر سے لوگوں میں بڑی بے چینی پھیلی اور ہندو مسلمان دونوں نے اس کی مخالفت کی ۔ دندار برہگوں کا یہ خیال تھا کہ یہ ہمارے نوجوانوں کے مذہب کو بگاڑنے اور اندر ہی اندر عسائی مذہب کے پھیلانے کی ترکیب ہے<sup>(۳)</sup> ۔ تاہم روسن

(۱) سپر پرسیول - ص - ۶۴ - ۶۵ -

(۲) دہلی کالج کے بارے میں تھامس مولوی عبدالحق کی ”مرحوم دہلی کالج“ مطبوعہ

کراچی ۱۹۶۲ ع سے ماخوذ ہیں ۔

(۳) عبدالحق ، مولوی - ص - ۱۵

خیال اور وسیع النظر علماء انگریزی تعلیم کے مخالف نہ تھے ، چنانچہ شاہ عبدالعزیز نے مسلمانوں کے سب ”سبہات کو رفع کیا اور علی گڑھ کالج قائم ہونے سے پچاس سال پہلے انگریزی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کا فتویٰ دیا“ (۱)۔ لوگوں کی مخالفت اور سو و غوغا کی وجہ سے انگریزی جامع مشرفی مدرسے سے علیحدہ کر دی گئی ، مگر برنسپل دونوں شعبوں کا ایک ہی رہا اور نگران کمٹی بھی وہی رہی۔ مسرفی شعبے میں عربی ، فارسی اردو اور سنسکرت پڑھائی جاتی تھی اور انگریزی شعبے میں انگریزی کے علاوہ یورپ کے جدید علوم دونوں شعبوں میں اردو اور ہندی کی جماعتیں بھی تھیں۔

انگریزی اور مشرقی شعبے کئی سال تک نصاب اور طریقہ تعلیم میں ایک دوسرے سے جدا اور مختلف رہے۔ جب ۱۸۴۱ء میں مسٹر ہیروس برنسل ہوئے تو انہوں نے دونوں شعبوں کو ملا کر ایک درجے کا منصوبہ بنانا تاکہ دونوں شعبوں کی تعلیم اگر بالکل یکساں اور ایک نہ ہو سکے تو کم از کم برابر ضرور ہو جائے۔ اس مقصد کے مد نظر ۱۸۴۳ء میں دونوں شعبوں کو ایک ہی مضامین پڑھا کر اور ایک ہی سوالات دے کر امتحان لیا گیا۔ جس سے ثابت ہوا کہ اردو ذریعہ تعلیم سے پڑھنے والے عربی شعبے والوں سے کم نہیں تھے۔ گورنر نے اس محور کو پسند کیا اور اس کے قائم رکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ دونوں شعبوں کی تعلیم کا ایک نظام کر دیے کا مقصد یہ تھا کہ دونوں شعبوں میں تاریخی ، اخلاقی اور سائنسی مضامین کی تعلیم یکساں طور پر دی جائے ، انگریزی شعبے میں زبان انگریزی اور مسرفی شعبے میں زبان اردو۔ ان مضامین کے ذیل میں حساب ، علم ہندسہ ، جبر و معادلہ ، علوم طبیعی ، جغرافیہ ، تاریخ ہند ، معاشیات اور اصول قانون کا خاص طور پر ذکر کیا گیا تھا۔ مسٹر ہیروس ۱۸۴۵ء میں بوجہ غلاب واس انگلستان چلے گئے۔ انہوں نے اننی آخری رپورٹ میں مسرفی شعبے میں تاریخ ، اخلاق اور سائنس کی تعلیم کے متعلق پورا اطمینان ظاہر کیا اور اس امر کی توقع ظاہر کی کہ اگر ایک سال اور اسی طرح کوشش جاری رہی تو مسرفی شعبے کے طالب علم سوائے تاریخ کے کسی علم میں انگریزی شعبے والوں سے کم نہیں رہیں گے۔

مغربی علوم کو دسی زبان کے ذریعے سے پڑھانے میں بڑی مشکل نہ تھی کہ کتابیں نہیں تھیں اور اگرچہ اسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے سرکاری تعلیمی کمیٹی نے ۱۸۳۵ء میں اعتراف کیا کہ دسی زبانوں میں مغربی علوم کا ترجمہ ہونا چاہیے ، لیکن چونکہ یہ فیصلہ

(۱) اکرام ، شیخ محمد ”رود کوثر“ ص - ۵۶۹ لاہور ۱۹۵۸ء - اکرام نے یہ بات دہلی کے حوالے سے کہی ہے حالانکہ کالج کے بننے اور وہاں انگریزی تعلیم شروع ہونے سے پہلے شاہ عبدالعزیز وفات پا چکے تھے۔ نیز یہ بھی ذکر انہوں نے نہیں کیا ہے کہ شاہ صاحب نے انگریزی تعلیم کے حصول کے لیے یہ شرط لگائی تھی کہ اس کا مقصد انگریزوں سے تعلیمات پڑھانا یا ان کا مسمیٰ ، ملازم یا مہابی بنانا ہو (متاویٰ عربی ص - ۱۹۵ - دہلی - ۱۹۶۳ء/۱۱/۱۳۱۱ھ)۔

بھی ساتھ ہی ہو چکا تھا کہ تمام مضامین کی تعلیم انگریزی کے ذریعے سے دی جائے گی ، اس لیے عملاً ترجموں کے کام کی طرف توجہ نہیں ہوئی ۔ البتہ جب ۱۸۴۳ء میں دہلی میں انجمنِ انصافِ علوم و تدوین السہ ملکی یا دہلی ورنیکر ٹرانسلٹس سوسائٹی ، بعض سچے سائقین اور دسی زبانوں نے ہمدردوں کی سعی و توجہ سے قائم ہوئی تو اردو میں بہت سی کتابوں کا ترجمہ ہو گیا ۔ سوسائٹی کا مقصد انگریزی ، عربی ، سنسکرت اور فارسی زبانوں سے اعلیٰ درجے کی کتابیں اردو ، بنگالی اور ہندی میں ترجمہ کرنا تھا ، لیکن بنگالی اور ہندی میں کوئی ترجمہ نہیں ہو سکا ، کیونکہ ایک تو انجمن کا سرمایہ محدود تھا ، دوسرے دہلی میں بنگالی اور ہندی کے ترجموں کے لیے مناسب سہولتیں نہیں تھیں ، بسرے سرگرمی سے کام کرنے والے صرف ایک ہی صاحب تھے ، یعنی دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر نروس ، جو اس سوسائٹی کے سربراہی نہ تھے ۔ انہی نے نہ کام اس سے پہلے چھوٹے سہارے پر اسے کالج میں شروع کر رکھا تھا اور جب یہ سوسائٹی قائم ہوئی تو اس کا کام بھی کالج والے ہی کرنے لگے ۔ شروع ہی سے نہ سوسائٹی اور اس کا سارا کام دہلی کالج کے ہاتھ میں آ گیا اور نہ دہلی کالج ورنیکر ٹرانسلٹس سوسائٹی کہلانے لگی ۔ نہ سوسائٹی غیر سرکاری اصحاب ہی اعانت سے چلی بھی ، تاہم حکومت اس کی مدد نہ کر رہی تھی اور حکومتی سائے سے بھی اس کے متعدد نسخے خرید کر کالجوں اور مدرسوں میں تقسیم کرانے لگے تھے ۔ اس سوسائٹی کے ترجموں اور نالفاظ کی فہرست سواسو کے لگ بھگ ہے ۔

دہلی کالج کے اساتذہ میں مسٹر ٹیلر ، نروس اور ڈاکٹر اسپرنگر ، یہ تین پرنسپل بہت ممتاز ہیں ۔ خاص کر مشرقی شعبے کی اصلاح و ترقی اور اردو زبان میں مغربی علوم کے ترجموں کے متعلق مسٹر نروس اور ڈاکٹر اسپرنگر کی خدمات بہت قابل قدر ہیں ۔ مشرقی شعبے میں عربی کے صدر مدرس مولوی مملوک علی ، حسانہ پہلے ذکر ہوا ہے ، بڑے جہد عالم تھے ۔ مولوی امام بخش صہبائی کا بھی ذکر پہلے ہوا ہے ، جو اس کالج کے صدر مدرس فارسی تھے ۔ ان کی کتابیں نصابِ تعلیم میں داخل تھیں ۔ انہوں نے علاوہ فارسی کی مشہور نالفاظ کے اردو صرف و نحو پر بھی ایک کتاب لکھی اور حقائق البلاغت کا ترجمہ اردو میں کیا ۔ سمرائے اردو کا انتخاب بھی انہوں نے کیا تھا جو اسی زمانے میں طبع ہو کر سائے ہوا ۔ دہلی کالج کے ایک اور قابل اور کار گزار مدرس مولوی سبحان بخش تھے جن کی کتاب محاوراتِ ہند مشہور ہے ۔ انہوں نے تاریخ ابن خلدون اور ترک تیموری کا ترجمہ بھی اردو میں کیا ، اس کے علاوہ ایک مذکرہ مفسرین ، اور ایک مذکرہ حکماء ، بھی لکھا ۔ ماسٹر راجندر جو دہلی کالج میں سائنس اور ریاضی کی تعلیم اردو میں دیتے تھے اسی کالج کے معلم یافتہ تھے ۔ مولوی ذکاء اللہ بھی اسی کالج کے طالب علم اور سینئر پڑھین اسکالر تھے ، جنہوں نے اس کالج میں مہندس کی خدمت قبول کر لی تھی ۔ دہلی کالج کے

فارغ التحصیل طلباء میں جن لوگوں نے سہرہ حاصل کی ، ان میں ماسٹر رام چندر اور مولوی ذکاء اللہ کے علاوہ مولوی نذیر احمد ، مولانا محمد حسن آزاد ، ماسٹر سارے لال آسوب ، اور مولوی کریم الدین قابلِ ذکر ہیں ۔

مغلہ بہدب و معدن اور قدم مشرقی اقدار و افکار کے مرکز دہلی میں ، اس کالج کے قیام سے جو اثرات پیدا ہوئے اس کے انک پہلو کا اندازہ کرنے کے لیے مولوی عبدالحق کا یہ اقباس ملاحظہ ہو :

”دلی کا لڑکا جس نے گھر کی چار دیواری اور برائی روایتوں اور قصوں میں پرورش پائی ہے ، تعدادی قاعدہ ، قرآن کی دوچار سورس یا انک آدھ مذہبی رسالہ یا زیادہ سے زیادہ کرنا ، مامعلمان بڑھ کر اس عصر میں قدم رکھا ہے جہاں زمانے کے بعض نباضوں نے آدم گری کا بیڑا اٹھانا ہے ۔ وہاں جا کر وہ نئی صورتیں ، نیا رنگ ، نئی بات حسبِ دیکھا ہے ۔ اول اول ڈرنا گھبرانا ، جھجھکنا اور جھنسا ہے اور سہرے لچھو دیوں بعد ہی یہاں تک مقام اس کا گہوارہ ہو جاتا ہے ۔ اب انک وقت آنا ہے حکمِ معربی علوم کی صدا اس کے کانوں میں انی لمرور مگر سرس زبان کے درجے مہجی ہے ۔ وہ حدید پست کی کہانی سنا اور علوم طبعات کے بحرے دیکھا ہے ۔ اس کے دل میں ولولہ اور دماغ میں تلاطم پیدا ہوتا ہے اور برائی روایتوں کی بباد سرزل ہوئے لگی ہے ۔ اس کا سوچ اور بڑھا ہے اور لکچر کا انک انک لفظ کانوں سے سنا نہیں سنا ہے ، اس کی نظریں طبعات کے بحرے میں اس طرح گڑی ہوئی ہیں کہ گونا گونا ایسے نظریوں ہی بطروں میں لٹھا جائے گا ۔ وہ گھر مہجی ہے اور نہایت ساری اور سوچ سے ایسے بررگوں کے سامنے سائنس کے عجائبات اور بحرے مان کرنا ہے اور داع داع ہوا جاتا ہے ۔ اس کے مان بات اس کی انو لھی باتیں سن س کر سہمے جائے ہیں اور دل ہی دل میں کہتے ہیں خدا خیر کرے اس کے لچھن تو اچھے نہیں معلوم ہوئے“ (۱) ۔

مولوی نذیر احمد اگر دہلی کالج میں تعلیم نہ پائے بلکہ قدم انداز ہی میں قدم طرز کی درسگاہ میں تعلیم پائے تو وہ کیا ہوئے ، اس کا ذکر خود انہوں نے بہت واضح انداز میں کیا ہے جس سے اس کالج کے اثرات کا انک اور پہلو سامنے آتا ہے ۔ نذیر احمد کہتے ہیں ۔ ”معلومات کی وسعت ، رائے کی آزادی ، ٹالرسس (درگرہ یا رواداری) ، گورنمنٹ کی سچی خبر خواہی ، اجتہاد ، اعلیٰ بصیرت نہ حیرت جو تعلیم کے عمدہ نتائج ہیں اور

جو جمعیت میں سرطِ زندگی ہیں ان کو میں نے کالج ہی میں سیکھا اور حاصل کیا۔ اور اگر میں کالج میں نہ بڑھا ہوتا تو بتاؤں کیا ہوتا؟ مولوی ہونا سنگ خیال، متعصب، اکل کھرا، اپنے نفس کے احساس سے فارغ، دوسروں کے عیوب کا متجسس، برخود غلط۔۔۔  
 ترک دنیا بمردم آمورد۔  
 خوشنشین سیم و علہ اندوزند

مسلمانوں کا نادان دوسب، بغضائے وقت کی طرف سے اندھا ہوا۔ صم، ”کم“ عمی“  
 فہم لا ترجعون، ما اصابنی من حسنتہ فی الدنیا فمن الکالج“ (۱)۔

غرض دہلی کالج نے نہ صرف یہ کہ اردو زبان کو علمی بنائے میں حصہ لیا اور مشاعرے اور ادبی محفلیں منعقد کر کے ادبی ذوق کو عام کرنے اور سنوارنے میں مدد دی، بلکہ سب سے بڑی بات یہ کہ، مسرے کی حامد فکری و علمی روایات میں مغرب کے بری نافرمانی، علوم و اقدار کا پیوند لگا کر ان کے حمود کو بوڑھا دیا۔ نہ وہ زمانہ تھا کہ بقول حالی ”انگریزی مدرسوں کو ہمارے علما محفلے کہتے تھے۔ دلی ہج کر حس مدرسے میں مجھ کو سب و روز رہنا پڑا وہاں سب مدرس اور طلباء کالج کے معلم نافرمان لوگوں کو محض حایل سمجھتے تھے“ (۲)۔ لیکر دہلی کالج نے اسی زمانے میں مغرب و مسرے کا سنگم قائم کر کے انک ہی چھٹے سچے انک ہی پیغام میں مسرے و مغرب کا علم و ادب ساتھ ساتھ سکھا کر لوگوں کے خیالات کے بدلے، معلومات میں اضافہ کرنے، دوق کی اصلاح کرنے، صحیح علمی محسوس پیدا کرنے اور انک نئی تہذیب اور نئے دور کی بنیاد رکھنے میں خاصا حصہ لیا۔

لیکر جہاں دہلی کالج نے نہ مثبت فائدے دیے اور اہل دہلی کو سہجائے وہاں لوگوں میں نہ بدگمانی بھی ضرور پیدا کی کہ کالج کی تعلیم کا انک مقصد طالب علموں کو اپنے مذہب سے بد دل کر کے مسیحیت قبول کرنے کی طرف مائل کرنا ہے۔ اس خیال کو بقوت اس وقت پہنچی جب دہلی کالج کے معلم نافرمان اسناد ماسٹر راجندر نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔ دوسری بات قدامت پسندوں کو سوس میں ڈالنے والی نہ بھی، کہ نئے تعلیم یافتہ طبقے میں سائنسی علوم سے واقفیت پیدا ہوئی حاتی بھی، تو انہی مذہب کی بعض باتوں میں شک بھی پیدا ہوا جانا تھا۔ ان موانع کے باوجود دہلی کالج میں طلباء کی تعداد برابر بڑھتی رہی اور انگریزی تعلیم لانے والوں میں مسلمانوں کی تعداد میں برابر بھوڑا بھوڑا اضافہ ہونا رہا۔

راجہ رام موہن رائے نے ۱۸۲۳ء ہی میں نہ کونسن شروع کی بھی کہ ہندوستان والوں کو مشرقی زبانوں کی جگہ انگریزی زبان میں تعلیم دی جایا کرے اور مشرقی علوم

(۱) بحوالہ عبدالحی، مولوی - ص - ۱۸۱

(۲) ایضاً ص - ۱۶



والسنہ ۱۸۱۷ء میں فائیم ہو گیا تھا، صرف مشرقی زبانوں بلکہ مغربی زبانوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے واسطیے ایک گزانت منظور کی۔ تاہم ۱۸۳۵ء تک کمپنی کی تعلیم عامہ کی عمومی کمپنی نے لڑائی متب اور طبعی اقدام اس سلسلے میں نہیں لیا۔ ذریعہ تعلیم نے مسئلے پر کمپنی کے ارکان اور عدالت کے افسروں میں اتفاق رائے نہیں ہوا۔ بعض صاحبے بھی د۔ مغرب علم کی اساع مشرقی زبانوں کے واسطیے سے ہو، بعض مغربی علوم کے لئے انگریزی ذریعہ تعلیم کے حق میں تھے۔ علوم و السنہ مشرق کے بارے میں بھی اختلاف رائے تھا۔ بعض ان کی حوصلہ افزائی کرتا صاحبے بھیے اور بعض ان کے خلاف تھے۔ کمپنی کی مجلس نظام بھی اس طبعی کی نائید کر دینی بھی اور بھی اس طبعی کی۔ اس لئے ڈوئی اسی تعلیمی نالسی جس پر ہر جگہ عمل ہو ۱۸۳۵ء تک نہیں ہی۔ السنہ ۱۸۳۵ء میں جب کہ محفل طبعی کی رائیں معرض مصلہ گورنر جنرل کے پاس بھی ہوئیں، اس وقت سکالے د۔ صرف تعلیمی کمپنی کا صدر بلکہ گورنر جنرل کی کونسل ڈارکن بھی تھا۔ اس نے انی مسطور ناد داسب مورخہ ۲ فروری ۱۸۳۵ء اس بارے میں لکھ کر کونسل کے آگے رکھی<sup>(۲)</sup>، جس کی روسی میں ایک طبعی تعلیمی نالسی معین ہو گئی۔ سکالے نے انگریزی زبان کے واسطیے سے مغربی علوم و فنون کی تعلیم دینے کی ہر روز حایب کی اور لکھا ”انک اچھے یوری کتب خانے کی ایک الہاری ہندوسان اور عرب کے سارے لٹریچر برہاری ہے“<sup>(۳)</sup>۔ علم مشرق کے بارے میں اس حعار کا اظہار کر کے اس نے انگریزی کی حایت میں کہا ”جو شخص یہ زبان حاسا ہے اسے دیا بھر کی عقلمند ترین اقوام کے دینی ورے تک دسترس ہو جاتی ہے۔ نیز انگریزی ہندوسان کے حکمران طبعی کی زبان ہے اور حکومت کے مراکر میں دیسیوں کا بالائی طبع بھی اسے بولتا ہے اور گان غالب ہے کہ بھی زبان تمام مشرقی سمندروں میں ناہمی رابطے کی زبان بنے گی“<sup>(۴)</sup>۔ سکالے نے یہ بھی لکھا ”ہمیں ایک اسی جاعب بنائی چاہئے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو اور یہ اسی جاعب ہونی چاہئے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہو مگر مذاق اور رائے، اظہار اور فہم کے اعتبار سے انگریز ہو“<sup>(۵)</sup>۔ سکالے نے یہ بھی کہا کہ دیسی زبانیں انی ترقی یافتہ نہیں ہیں کہ علوم مغربی کی تعلیم ان کے ذریعے دی جا سکے اس لئے سوائے انگریزی کے اور کوئی ذریعہ تعلیم نہیں

(۱) کروور ہی۔ ایل اور سیٹھی، آر آر ”حدید تاریخ ہند کے مطالعے“ (انگریزی)

ص ۲۷۱ - مطبوعہ دہلی - ۱۹۶۳ء

(۲) ایضاً - ص ۲۷۲

(۳) ایضاً - ص ۲۷۲

(۴) ایضاً - ص ۲۷۲ - ۲۷۳

(۵) بحوالہ طفیل احمد سید - مسلمانوں کا روشن مستقبل دہلی ۱۹۴۵ء - ص ۱۵۰

ہو سکتا<sup>(۱)</sup>۔

ولیم ہشنگ گورنر جنرل نے میکالے کی ناد داس کی روسنی میں ۷ مارچ ۱۸۳۵ء کو ایک فرار داد اپنی کونسل میں منظور کر لی جس کی رو سے طے کیا، کہ حکومتِ برطانیہ کا بڑا مقصد اہل ہند میں نوری لریجر اور سائنس کی اشاعت ہونا چاہیے۔ اور جس قدر قوم مقاصدِ تعلیم کے لیے مخصوص ہیں وہ صرف انگریزی تعلیم پر صرف ہونی چاہئیں<sup>(۲)</sup> اس فرار داد میں اگرچہ یہ بھی لکھ دیا گیا تھا کہ ایسے دینی علوم کے مدارس کا بند کرنا مقصود نہیں ہے، جن کے فوائد سے دیسی لوگوں کو مستفیع ہونے کی توقع ہے، لیکن تعلیمی کمیٹی نے عملاً مشرقی تعلیم کا گلا بھی گھونٹ دیا، جس سے عام بے اطمینانی پھیل گئی۔ اس بے اطمینانی کو لارڈ آکلنڈ نے اپنی گورنر جنرلی کے زمانے میں دور کیا۔ انہوں نے تعلیم عامہ کی کمیٹی کے نام ۲۴ نومبر ۱۸۳۹ء کو ایک یادداشت لکھی جس میں یہ فیصلہ کیا کہ مشرقی مدارس میں مشرقی تعلیم کی تکمیل و ترقی کو ترجیح دی جائے اور کامل ترقی و تکمیل کے بعد حورم بھی وہ انگریزی تعلیم کی ترقی میں صرف کی جائے۔ اعلیٰ قابلیت کے دیسی مدرسے معقول سہواہ دے کر مشرقی تعلیم کے لیے رکھے جائیں اور طلباء کو وظائف دینے کا دستور جو بد کر دیا گیا تھا، بھر جاری کیا جائے اور مشرقی زبانوں کی مفید کتابیں سائے کی جائیں۔ ان احکام سے مشرقی علوم و السنہ کو بھر سنہالا ملا، لیکن اب اس تعلیم سے روزگار میں کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی۔ ۱۸۳۷ء میں مرکزی حکومت نے صوبائی حکومتوں کو اجازت دے دی کہ بحالے فارسی زبان کے جو اس وقت تک صوبوں میں سرکاری زبان کے طور پر رائج تھے، اپنے اپنے صوبے کی زبان جاری کریں۔ اس کے بعد ۱۰ اکتوبر ۱۸۴۴ء کو لارڈ ہارڈنگ کا فیصلہ اس مضمون کا شائع ہوا کہ اب ملازموں میں انگریزی تعلیم نافوں کو ترجیح دی جائے گی<sup>(۳)</sup>۔ اس اعلان سے مشرقی علوم و السنہ کی تعلیم کو اور دھکا لگا اور مغربی تعلیم اور انگریزی زبان کی اشاعت و مقبولیت میں بڑی مدد ملی۔

ہندوستان میں انگریزی تعلیم نافذ کرنے کے مقاصد میں جہاں کالج انگریز پیدا کرنا، حکومت کی مشینری چلانے کے لیے بابو سار کرنا اور مغربی علوم و افکار اور تہذیب و اقدار کو عام کرنا شامل تھا وہاں ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اس سے مسیحی مذہب کی اشاعت میں سہولت پیدا ہو۔ اس طرف خود میکالے نے بھی اپنے ایک خط میں اشارہ کیا تھا جو اس نے اپنی والدہ کو لکھا تھا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں ”اس تعلیم کا اثر ہندوؤں پر بہت زیادہ ہے، کوئی ہندو جو انگریزی دان ہے کبھی اپنے مذہب پر صداقت

(۱) بحوالہ تاریخ تحریک آزادی - ج - دوم - حصہ اول - ص - ۲۰۷

(۲) ایضاً - ص - ۲۰۹

(۳) بحوالہ طفیل احمد، سید ”مسلمانوں کا روشن مستقبل“ ص ۱۵۱

کے ساتھ قائم نہیں رہا ، بعض لوگ مصلحت کے طور پر بندو رہے ہیں مگر بہت سے یا تو موحد ہو جاتے ہیں یا عسائی مذہب اختیار کر لیتے ہیں ۔ مراحمہ عہدہ ہے نہ اگر معلم کے متعلق ہزاری تجاویز پر عمل درآمد ہوا تو بس سال بعد نکال میں انک تب یسب بھی باقی نہیں رہے گا“<sup>(۱)</sup>۔

ایسے انڈیا کمپنی نے ۱۸۱۳ء تک مسیحیت کی تبلیغ کے سلسلے میں عملاً کچھ نہ کیا تھا ، لکن ۱۸۱۳ء میں جب کمپنی کے چارٹر کی تجدید ہوئی تو اس کی ’رو سے اہل ہند کی “اخلاقی ترقی“ کی عرص سے مسیحی مشنریوں کو پوری سہولتیں فراہم کی گئیں اور انک لا کھ روپہ دہی اداسات کو ترقی دینے ، ہندوستانی سکالروں کو امداد دینے اور لوگوں میں مغربی علوم کو معارف کرائے کی عرص سے رٹھا گا ، جو مسر اہ مشنریوں نے استعمال میں آنا ، جنہوں نے احزاب ملیے ہی برطانوی ”موصوفہ علاقوں میں ایسے سکول اور سم جائے کھول لیے تھے ۔ مشنریوں نے پہلے نکال اور مدراس میں انکا کام شروع کیا اور پھر آپسہ آپسہ ملک کے دوسرے حصوں میں بھی پھیل گئے ۔ ۱۸۱۳ء سے ۱۸۳۱ء تک انہوں نے ایسے مراٹر صوبجات متحدہ کے تقریباً ہر سہر میں کھول لیے تھے“<sup>(۲)</sup> اور پھر سجات ہر کمپنی کی عملداری ہوئی تو وہاں بھی نہ سلسلہ شروع ہوا ۔ کمپنی کے عہدے دار مشنریوں کی ہر طرح اعانت و حاب کرتے تھے ۔ شروع شروع میں صوبجات متحدہ اور سجات کے صرف محلے طبقے کے لوگوں نے مسیحیت قبول کی ، کیونکہ حاکموں کا مذہب شول کرتے سے اس میں اتنی سماجی اور اقتصادی حالت سدھارے کا موقع ملتا تھا ۔ رورین طبقے میں کاسائی کو نا کافی سمجھ کر نالائی طبقوں میں بھی مسیحیت پھیلانے کی عرص سے ۱۸۳۰ء میں کلکتے میں انک انگریزی سکول قائم کیا گیا جہاں انگریزی درجہ تعلیم بھی اور نصاب میں اچھل اور مسیحی تعلیم شامل تھی ۔ اس مدرسے کو قائم کرنے والا الگریڈر ڈف تھا ۔ اس مدرسے میں تعلیم سائے والے کلکتے کے نالائی طبقے کے لڑکے تھے ۔ اس تعلیم ہی کے اثر سے نکال نے ۲۶ اچھے خاندان مسیحی ہو گئے“<sup>(۳)</sup> ۔ مدراس اور ممبئی میں جاں ولسن اور حاں انڈرس نے بھی وہی ترکیب استعمال کی جو ڈف نے کلکتے میں کی تھی ۔ اس کے کچھ عرصے بعد مشنری عورتوں نے بھی ہندوستان کی عورتوں کو مسیحیت کے دائرے میں لانے کی کوششیں شروع کر دیں ۔ مشنریوں کی سرگرمیاں ہر کون نہ ہوئیں ، جب کہ برطانوی حلقوں میں یہ ناثر عام تھا کہ تقدیر نے اہل برطانیہ کے ہاتھ میں ہندوستان کی حکومت اسی لیے نو دی ہے کہ اس ملک میں حضرت مسیح کا بول بالا ہو ۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی مجلس نظام کے صدر

(۱) بحوالہ طفیل احمد ، سید ۔ ص ۔ ۱۵۰ ۔ ۱۵۱

(۲) ڈار ، بشیر احمد ، ”سرسید کے مذہبی افکار“ ۔ ص ۔ ۲۰ لاہور ۔ ۱۹۵۷ء

(۳) ڈار ، بشیر احمد ، ”سرسید کے مذہبی افکار“ ۔ ص ۔ ۲۲

مسٹر مینگز نے ۱۸۵۷ء میں برطانوی دارالعوام میں جو بیان دیا تھا وہ انگریزوں کی خواہشوں اور ان کی کوششوں کا رخ صاف طور پر واضح کرنا ہے۔ انہوں نے واشکاف انداز میں کہا ”ہندیر نے ہندوستان کی وسیع سلطنت انگلستان کے حوالے اس لیے کی ہے کہ حضرت مسیح کا ترجمہ ہندوستان کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک پھیل جائے۔ ہر شخص کو اپنی پوری سعی لڑی چاہیے کہ سارے ہندوستان کو مسیحی بنائے۔ عظیم الہاں کام میں کوئی سہايل کسی وجہ سے نہ ہو“۔

برطانوی عوام اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب حاصل ہونے کی وجہ سے مسیحی مسلمان کے حوصلے بہت بڑھ گئے۔ نہ لوگ عام محموعوں اور مسلوں وغیرہ میں بھی جانے لگے اور وہاں نہ صرف مسیحیت کی نائید میں ترمیم لے کر، بلکہ دوسرے مذاہب کے مقدس لوگوں اور تبرک مساوات کو حجاز و عرب سے باہر لے کر، مذہبی رسم و رواج کا مذاق اڑانے اور ان کو دلیل دینے کے لیے کتابیں اور رسالے چھپوانے لگے، جن میں اہل ہند کے مذہبی سواؤں کی توہین کی جاتی تھی۔ اکثر حکام اور فوجی افسرانے ماسخوں سے مذہبی کشمکشوں اور ان کو حکم دینے نہ پھاری لڑائی لے کر نادری کا وعظ سنا۔ مسیحیت قبول کرنے والوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے ۱۸۳۲ء میں ایک قانون مگال میں نافذ ہوا کہ کوئی شخص اپنا مذہب تبدیل کرنے کو وہ اپنے پندائشی اور سہری حقوق سے محروم نہیں ہوگا۔ یہی قانون ۱۸۳۵ء میں دوسری جگہوں پر بھی نافذ ہوا۔ ۱۸۳۷ء-۱۸۳۸ء میں ہندوستان میں محض نڑا نو مسلمانوں نے بارس اور آگرے میں رسم حائے کھول دے، تاکہ لاوارث اور ناداروں کو اسی عھول میں لے کر انہیں عسائی بنالیں۔ اس طرح ۱۸۳۸ء سے ۱۸۴۰ء تک د ہزار افراد کو عسائی بنا لیا گیا (۲)۔

۱۸۳۳ء میں انگلستان کے علاوہ دوسرے ممالک کی مسلمانوں کو بھی ہندوستان میں تبلیغ کی اجازت مل گئی تھی اور پھولے ہی عرصے کے اندر ملک بھر میں نئی مسری سوسائٹیوں کا حال بچھ گیا۔ یہ سے مسری اسکول لھل گئے، علاج گھر قائم ہوئے، رسم حائے جاری ہو گئے۔

مسیحیت کی تبلیغ سے بقول سرسید ”مسلمان بہ سبب ہمود کے بہت زیادہ ناراض تھے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ عام ہندو اپنے مذہب کے احکام بطور رسم و رواج کے ادا کرتے ہیں، نہ بطور احکام مذہب کے۔ ان کو اپنے مذہب کے احکام و عقائد اور وہ دلی اور اعتمادی بابیں جن پر نجات عاقبت کی موافق ان کے مذہب کے منحصر ہے مطلق معلوم نہیں ہیں اور نہ ان کے برناؤ میں ہیں۔ اس سبب سے وہ اپنے مذہب میں

نہایت سب اور عمر ان رسمی باتوں کے اور لکھائے گئے تھے اور کسی مذہبی عقیدے میں یخہ اور معصوب نہیں تھے۔ ان کے سامنے ان کے اس عقیدے کے، (حس کا دل میں اعتقاد چاہیے) خلاف باتیں بٹھا کر تیں، ان کو لکھتے تھے۔ تاہم میں آنا۔ در خلاف مسلمانوں کے کہ وہ اسے مذہب کے عقائد کے متوجہ ہو جائیں کہ ان کے مذہب میں نجات دینے والی اور عذاب میں ڈالنے والی ہیں نحوی حائے ہیں اور ان احکام کو مذہبی احکام اور خدا کی طرف کے احکام سمجھ کر لے رہے ہیں۔ اس سب سے اسے مذہب میں محمد اور معصوب ہیں۔ ان وجوہات سے مسلمان زیادہ در بار اس بھیے<sup>(۱)</sup>۔

برطانوی حکومت کے ہندوستان میں قائم ہو جانے سے راجہ العبدہ مسلمانوں کے نزدیک ملک میں کیا صورت حال پیدا ہو گئی تھی، اس کا برملا اظہار شاہ عبدالعزیز کے قزوین سے ہونا ہے، جو اسے زمانے کے سب سے بڑے مسخر عالم بھیے اور مدرسہ رحمتہ میں درس دیئے تھے۔ ان کے والد بزرگوار شاہ ولی اللہ دہلوی نے مسلمانان ہند کی اصلاح و ترقی کے لیے جو راہ عمل معین کی تھی اس کی تبلیغ و اشاعت شاہ عبدالعزیز نے اپنا مسلک بنانا۔ ان کے خیال میں شاہ ولی اللہ کی تحریک کا مقصد ایک جمہوری اسلامی معاشرہ قائم کرنا تھا، جس کی بنیاد سہریوں کی اقتصادی مساوات کے حق پر ہو اور نہ مقصد اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا تھا، جب تک کہ مسلمان ملک کے کسی علاقے میں سیاسی خود مختاری اور امداد حاصل کرنے کے لیے متحدہ اور متحدہ و متحدہ دوسرے نہ تریں۔ اس لیے انہوں نے سوچا کہ ایک قومی مجلس سانی جانے جو مسعمل کی قومی فوج کے لیے سرکار کا کام کرے۔ چنانچہ انہوں نے معتمدین اور دروڑوں پر مشتمل دو نمائندگی تشکیل دیں، ایک کمیٹی عسکری مقاصد کے لیے اور دوسری تحریک عمل کی نظربانی و عقائدی بناد کو خالص رکھنے کے لیے۔ عسکری کمیٹی کے صدر سید احمد رائے دہلوی بھیے اور اراکین مولانا عبدالحی اور شاہ اسماعیل۔ نظربانی کمیٹی کے اراکین مولانا محمد امجدی اور مولانا محمد یعقوب بھیے۔ شاہ عبدالعزیز نے سب لوگوں کو مطلع کر دیا تھا کہ ان دونوں کمیٹیوں کے مفقہ مفصلے خود شاہ صاحب کے مفصلے سمجھے جائیں گے<sup>(۲)</sup>۔

اب سوال یہ تھا کہ کس علاقے سے تحریک حصول امداد شروع کی جائے اور سیاسی برتری حاصل کرنے کی کیا تدبیر ہو اور مسلم عوام کو بے عملی و غفلت سے کیونکر بیدار کیا جائے۔ مسلمانوں کو انگریزوں اور سکھوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کے لیے سار کرنا بڑا مشکل کام تھا، خصوصاً ایسے زمانے میں جبکہ یہ دونوں طاقتیں مستحکم ہو گئی تھیں۔ چنانچہ اس کام کے لیے لوگوں کو آادہ کرنے کے واسطے شاہ عبدالعزیز نے یہ

(۱) سرمد۔ امیاب تعاون ہند۔ ص۔ ۱۳۱ - ۱۳۲ - کراچی ۱۹۵۷ء

(۲) تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو۔ سندھی، عبداللہ۔ "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک"

ص۔ ۶۳ تا ۹۶ - لاہور۔ ۱۹۳۳ء

فتویٰ جاری کیا کہ ہندوستان دارالاسلام نہیں رہا ہے بلکہ دارالحرب ہو گیا ہے اور عوام کو مغل بادشاہ کی برائے نام موجودگی سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ہندوستان میں اسلامی حکومت ہے۔  
شاہ عبدالعزیز ۱۸۲۳ء میں فوب ہوئے لیکن اپنی وفات سے پہلے وہ مسلمانوں کو نہ صرف برآن و حدیب کی تعلیم دے چکے تھے اور نہ صرف غیر اسلامی عقائد و رسوم ترک کر کے صحیح اسلامی عقائد و اعمال اخبار کرنے کی تلقین کر چکے تھے، بلکہ سکھوں اور انگریزوں کے تسلط سے نجات حاصل کر کے لیے اپنی اکسا چکے تھے اور علی امدادات کے لیے ایک عسکری مجلس عمل کی تشکیل بھی کر چکے تھے<sup>(۱)</sup>۔ اور جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے، ان کی تشکیل کردہ مجلس عمل کے صدر سید احمد شہید اور دوسرے ارکان شاہ اسعظم شہید اور مولانا عبدالحی تھے۔ انہوں نے شاہ عبدالعزیز کی نوافات پوری کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

سید احمد شہید رائے ٹریلوئی ۱۸۶۷ء/۱۳۰۱ھ میں بدایا ہوئے، کچھ عرصہ لکھنؤ میں ایک امیر کے ناس کام کیا، اس کے بعد شاہ عبدالعزیز سے علمِ دین حاصل کرنے کے لیے دہلی گئے اور پھر ۱۸۱۰ء کے قریب نواب امیر خان کے ناس جو بعد میں والی ٹونک ہوئے، سوار بھرتی ہو گئے۔ انہوں نے تقریباً چھ سال فنِ سپاہ گری کی تکمیل میں صرف کئے۔ ۱۸۱۶ء میں آپ دوبارہ دہلی گئے اور یہاں درس و تدریس اور ہدایت و ارشاد کا سلسلہ شروع کیا۔ انہی دنوں مولانا عبدالحی نے جو شاہ عبدالعزیز کے داماد تھے، آپ سے بمع کی اور پھر شاہ اسماعیل جو شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے یعنی شاہ ولی اللہ کے پوتے تھے، آپ کے مرید ہوئے۔ کچھ عرصے کے بعد آپ اپنے دونوں معتقدوں کو ساتھ لے کر وعظ و ہدایت کے لیے دورے پر نکلے۔ مظفر نگر، سہارنپور، رامپور، بریلی، شاہجہانپور، بنارس اور لکھنؤ، جا بجا آپ نے دورے کر کے رشد و ہدایت کے سلسلے جاری کیے۔ آپ نے ایک طرف تو مسلمانوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح پیش نظر رکھی اور دوسری طرف ان کے سینوں میں جہاد فی سبیل اللہ کی حرارت پیدا کرنے کی سعی کی۔ پیر پرستی، قبر پرستی، سویم، چہلم، شادی کی ہندوانہ رسوم، بیجا اسراف، ممانعتِ نکاح بیوگان وغیرہ مشرکانہ بدعات کو دور کرنے کی کوشش کی۔ پھر حج کا ارادہ کیا۔ حج کے سفر سے سید صاحب کے ارادوں میں بڑی پختگی اور حوصلوں میں نئی بلندی پیدا ہوئی۔ ان کی واپسی سے پہلے شاہ عبدالعزیز فوت ہو چکے تھے لیکن اس سے سید صاحب کے عزائم اور مساعی میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ چند ماہ کے وقفے کے بعد جہاد کی تیاریاں شروع ہو گئیں<sup>(۲)</sup>۔

(۱) ابو یحییٰ امام خان نوشہروی نے "تراجم علماے حدیث ہند" - ص ۸۷ (مطبوعہ دہلی ۱۹۳۸ء) پر لکھا ہے کہ شاہ عبدالعزیز خود بھی جہاد میں حصہ لینے کے خواہشمند تھے لیکن پیرانہ سالی اور ضعف بصارت کی وجہ سے معذور تھے۔

(۲) سید صاحب کی زندگی اور کام کی مستند تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو، مہر، غلام رسول سید احمد شہید - مطبوعات لاہور۔

سد صاحب کے حج برحائے سے پہلے شاہ اسماعیل سہد اور مولانا عبدالجثی نے آپ کے احوال و ارشادات کو فارسی میں منضبط کر دیا تھا اور کتاب کا نام ”صراط مستقیم“ رکھا تھا۔ اس کتاب سے ظاہر ہوا ہے کہ سد صاحب نے اس زمانے میں طریقت اور سربیت کے نامی بظاہر کی کوسس کی تھی۔ وہ جامعاً معرفت الہی اور طریق سلوک کے شرعی اسلوب پر روز دیر تھے۔

”صراطِ مستقیم“ اور دوسری کتابوں سے جو سد صاحب نے سفر حج سے پہلے ہی لکھی تھیں، نہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ جو مذہبی و معاشری اصلاحات وہ عمل میں لانا چاہتے تھے، ان کا خیال انہیں شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور شاہ عبدالعزیز کے فہمِ صحت سے ہوا۔ جب وہ حج کے لیے مکہ معظمہ گئے تو وہاں انہیں سید محمد بن عبدالوہاب اور ان کے پیروؤں کی اصلاحی کوسسوں اور عقائد کا علم ہوا۔ اگرچہ سد صاحب اور وہابیوں کے مقاصد میں بہت سی باتیں مشترک تھیں اور بہت سی باتیں وہ وہابیوں سے اختلاف رکھتے تھے، مگر سد صاحب اور ان کے پیروؤں کو ہندوستان میں وہابی کے نام سے یاد کیا جائے گا۔ چونکہ عرب کے وہابی اپنے سنیوں اور انہما سنیوں کی وحدت سے غور نہیں کیا تھا اس لیے سد صاحب اور ان کے پیروؤں کو وہابی کے نام سے یاد کرنا نہ صرف تقلید پرست طبع کے اپنے مفاد کے لیے تھا بلکہ انگریزوں کے لیے بھی۔ جامعہ یہ نام عام ہو گا۔

سد احمد سہد نے دستِ راست شاہ اسماعیل سہد اور مولانا عبدالجثی سے شاہ اسماعیل میں حضرت عمر کا سا حوس و حروس اور حراب و مہادری بھی اور ناطل اور بدعت کے خلاف وہ اسی طرح سے تکلف رہے تھے۔ مولانا عبدالجثی بڑے عالم اور حاموش طبع انسان تھے مگر ان کا ایمان حثاں کی طرح محکم و مصبوط تھا اور طبع میں حضرت ابوبکر کی طرح وفار و محمل تھا۔ سد صاحب کی اصلاحی کوسسوں کو دونوں سے بہت مدد ملی، خصوصاً حتی نبوت اور رتبہ شاہ اسماعیل سے ہوئی شاید ہی کسی اور فردِ واحد کی مدد سے ہوئی ہو۔

سد احمد سہد، شاہ اسماعیل سہد اور مولانا عبدالجثی نے انہی پیروؤں اور پیروؤں سے نہ صرف مسلمانوں کے عقائد، رسومات اور اعمال کو بدعت اور غیر شرعی امور سے ناک کرنے کی سعی بلیغ کی، بلکہ انہیں راہِ حق میں لڑے مارے کے لیے بھی تیار کیا۔ اچانکے دس کے ذریعے مسلمانوں کو سیاسی عظم و برتری دلانا اور صحیح مسلم معاشرہ اور شرعی حکومت قائم کرنا ان بزرگوں کا مقصد تھا۔ نہ حال نہ سد احمد شہید اور ان کے پیروؤں نے صرف سکھوں کے خلاف جہاد کا منصوبہ بنایا تھا اور وہ انگریزوں کے خلاف جہاد کو ناخائز سمجھتے تھے، محض سے غلط ثابت ہو چکا

ہے۔“ سید صاحب نے جہاد کی ساریوں کے مرکز کے طور پر علاقہ سرحد کو اس لیے منتخب کیا تھا کہ وہاں کی پوری آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی اور سرحد کے شمال اور مغرب میں دور دور تک اسلامی آبادیاں تھیں، جن سے اگر مدد نہ ملی تو کم از کم مخالفت کا ڈر بھی نہ تھا۔ نیز سکھ اپنا حلقہ اثر سرحد میں بھلانے جا رہے تھے اور مسلمانوں پر طرح طرح کی سختیاں اور مظالم کر رہے تھے جس سے سرحدی مسلمان سخت نالاں تھے اور ان سے پوری توقع کی جا سکتی تھی کہ اگر جہاد کا آغاز سکھوں کی حکومت کے خلاف جنگ سے ہو، تو وہ بحریک جہاد میں جوس و خروش سے سرگرم ہوں گے۔ غرض سید صاحب اور ان کے ساتھیوں نے پورے غور و خوض کے بعد یہی طے کیا کہ پہلے سکھوں کی فوج نوڑ کر پنجاب و سرحد میں مسلمان اپنی نورس مضبوط بنا لیں اور پھر انگریزوں سے ٹمٹیں۔ مومن خان مومن سید صاحب کے مرید تھے اور ان کے اسعار سے بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جہاد آخر کار انگریزوں ہی کے خلاف ہونا تھا۔ مومن لکھتے ہیں۔

اس عیسویان ملت رساندند	خان من و خان آفرنس
مگزار کہ نائال گردیم	زان سم سران آفرنس
ناچند بخواب نار باسی	فارغ ر۔ فغان آفرنس
مومن سندہ پھر باں عرفی	ار بہر امان آفرنس
پر خنز کہ سور کفر برخاست	اے فسد نسان آفرنس

ناہم انگریزوں کی مستحکم اور وسیع طاقت سے ٹکر لےنے سے پہلے اپنے قدم جما لینا ضروری تھا۔ اسی لئے جہاد کا آغاز پنجاب و سرحد میں سکھوں کے خلاف کیا گیا۔

سید صاحب ۱۸۲۵ء میں سفر جہاد پر بہاولپور، سندھ اور افغانستان ہوئے ہوئے سرحد پہنچنے کے عزم سے نکلے۔ ”اس وقت ان کے رفیق نایح چھ سو سے زیادہ نہ تھے۔ ان میں سے اکثر کے پاس ہندوؤں اور بلواریں تو تھیں، لیکن یوب کوئی نہ تھی۔ حب ہندوستان سے متعدد فافلے پہنچ گئے تو اندازہ نہ ہے کہ کل مجاہدین دو اڑھائی ہزار ہوں گے۔ اس سے ان کی تعداد کبھی نہ بڑھی۔ البتہ مختلف جنگوں میں مقامی لوگ سربیک ہوتے رہے، جو حملے کے وقت تعداد بڑھانے کے موجب بن جاتے تھے، لیکن استقامت کے موقع پر عموماً ساتھ چھوڑ دیتے تھے۔ ناہم نہ امر خاص توجہ کا مسحو ہے کہ اس مختصر سی فوج سے سید صاحب نے سرحد میں سکھوں کے لیے حد درجے نازک صورت پیدا کر دی اور وہ بعض شرائط نرائک نار کا پورا علاقہ سید صاحب کو دے دینے کے لئے تیار ہو گئے“ (۲)۔

(۱) تفصیلی بحث کے لئے دیکھئے۔ ”مہر، غلام رسول“ سید احمد شہید“

ح - ۱ - ص - ۲۵۰ تا ۲۶۱

(۲) ”مہر، غلام رسول“ ”جماعت مجاہدین“ ص - ۷۶



سکھوں سے مجاہدین کا پہلا معرکہ ۲۱ دسمبر ۱۸۲۶ء کو بوسہرہ سے ساب آٹھ میل کے فاصلے پر مقام اٹوڑہ ہوا جس میں مجاہدین کامیاب رہے۔ اس کے بعد سکھوں نے حصرو کا واقعہ پس لیا، جس میں ۱۰۰۰۰ ہتھیاروں کا مالِ غنیمت ہاتھ آنا۔ ۱۱ جنوری ۱۸۲۷ء کو علم و روسائے علاقہ نے سید احمد شہید کو دفاعیہ امرالمومنین دینا، تاکہ آج کو انتظامِ جہاد، تقسیمِ ممالک، اقامتِ جمعہ اور ترویجِ شریعت کے لیے ہتھیاروں کو جمع کر لیا۔ سید احمد نے اس کے ساتھ ساتھ سکھوں کے ساتھ جہاد میں مجاہدین کو شکست ہو گئی اور سید صاحب شریعت جہاد کے لیے سرحدی علاقے سوات اور پشاور میں چلے گئے۔ فروری ۱۸۲۸ء میں مولانا عبدالجبار فاضل ہو گئے۔ ان مصائب کے باوجود سکھوں اور ان کے افغان ساتھیوں سے مجاہدین کی لڑائی جاری رہی اور سکھ فرمانروا رنجیت سنگھ نے تمام صلح بھیجا، جسے سید صاحب نے مسترد کر دیا۔ رنجیت سنگھ نے حاکمِ ساور سردار نار محمد خان کو اپنے ساتھ ملا لیا اور حیدر اور افغان سرداروں کو بھی اسی طرف ڈر لیا، جس کی وجہ سے سید صاحب کو ان افغان سرداروں سے بھی لڑنا پڑا۔ اس میں سید صاحب کامیاب ہوئے۔ ۱۸۳۰ء میں ساور فتح ہوا اور سرحدی حکومت کے ساتھ ہوا۔ رنجیت سنگھ اور اس کے حامیوں کی بددیواریوں سے سید صاحب اور ان کے ساتھیوں نے خلاف اس کے ہو سکنا پڑا تاکہ بعض علمائے ان کے خلاف فوٹے دے دینے اور ملک سمیت کے حوادث جو سید صاحب کے ساتھ تھے۔ ان کے خلاف ہو گئے اور انہوں نے ساور کے سردار کے اہلکاروں کو سید صاحب کی انتظامیہ سرحدی کے نئی افراد کو قتل کر دیا۔ اس پر سید صاحب نے سرحدی حکومت کو کسی دوسری جگہ منتقل کرنے کے لیے بالا کوٹ کی طرف رجوع کی۔ ایک مقامی آدمی کی بختری اور عدالتی کی وجہ سے سید صاحب کی فوج بالا کوٹ کے مقام پر سکھ لشکر کے گھیرے میں آگئی اور سید صاحب اور شاہ اسماعیل دیوبند شہید ہو گئے (۶ مئی ۱۸۳۱ء) اس طرح اس دور کے سب سے بڑے جہاد کا انجام ناکامی پر ہوا۔ سید صاحب کے آٹھ سو ہندوستانی رفیق رہنما بچ رہے تھے، جن میں سے اکثر نوواںس ہو گئے لیکن کوئی دیر نہ ہو مجاہد اسے بھی جہنم نے ہندوستان واپس جانا گوارا نہ کیا اور حدودِ سوات میں موضع سہمانہ میں ڈنڈا ڈال دیا۔ ان کے ہاں تمام سے محریک جہاد کی لہریں لٹی سالوں تک اٹھتی رہیں۔ تاہم مجاہدین کی شکست بالا کوٹ نے ہندوستان کے حاکمان جہاد کے دل توڑ دیے اور بازہ مجاہدین اور مالی امداد بھیجے کا سلسلہ فریب فریب رک گیا۔ ہندوستان میں جو لوگ روایت و مدامت کے برسر تھے اور سید احمد شہید، شاہ اسماعیل شہید اور ان کے ساتھیوں کے غیر تعلیمی عقائد اور سرحدی اصلاحات سے اختلاف رکھتے تھے، انہیں بالا کوٹ کی شکست کا کوئی رنج نہیں ہوا، بلکہ وہ اس سے خوش ہوئے۔ دہلی کے مشہور شاعر

شاہ نصیر نے ایک طولانی قصیدہ مسرت لکھا جس کے وہ شعر آزاد نے آجبات میں دے دیے ہیں<sup>(۱)</sup>۔  
 کلام اللہ کی صورت ہوا دل ان کا سپارہ  
 نہ ناد آئی حدب ان کو نہ کوئی نصِ قرآنی  
 ہرن کی طرح میدانِ وفا میں چوکڑی بھولی  
 اگرچہ بھے دمِ سعلہ سے وہ سرِ نسانی

سید صاحب اور ان کے رفیقوں کی تحریک اس وقت کے لحاظ سے ایک جامع ملی تحریک بھی جس میں طاہری سرعب اور ناطنی طریعب کی تعلیم کے ساتھ عسکری تنظیم کو ضم کر دیا گیا تھا۔ اس تحریک نے سہالی اور مسروی ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگی میں خاصا متوج اور مل کر کام کرنے کا جذبہ پیدا کیا۔ اسٹ انڈیا کمپنی کے حکام نے جہاد کی دعوت و تبلیغ کو بالکل نہ روکا، کیونکہ ان کے خیال میں نہ صرف سکھوں کے خلاف بھی اور سکھوں کی طاقت کے ٹوٹنے میں کمپنی کو ایسا فائدہ نظر آتا تھا۔ لیکن جس وقت سحاب خود کمپنی کے قبضے میں آگیا تو نہ حکمت عملی لا محالہ بدل گئی۔ سہانہ سروساد کا مآخذ، مجاہدین کی مالی اعانت جرم اور وناس اور بغاوت مرادف الفاظ قرار دیے گئے۔ سید صاحب کی سہادت کے بعد ان کی تحریک کے دو مرکز ہو گئے، دہلی اور شہ۔ دہلی کے مرکزے عسکری سے قطع نظر کر کے مسلمانوں کے عقائد و عفاف کی حفاظت و اصلاح ہی کو اپنا مقصد بنانا اور شیعے کے مرکز نے وہی لائحہ عمل جاری رکھا جو سید صاحب کا تھا، یعنی سرحد کی طرف ہجرت برائے جہاد اور نن، من اور دھن کی قربانی۔ یہ سلسلہ اسوین صدی کے ربع ثالث تک چلتا رہا۔

سید صاحب کے تمام کلکے کے زمانے میں بے شمار سنگالی مسلمان ان کے مرید و معتمد ہو گئے تھے، جنہوں نے ان کی تحریک کو وہاں زندہ رکھا۔ گونا گونا ان معتمدین نے شاہ ولی اللہ کی تحریک کو سید صاحب کے واسطے سے سنگال میں بھلا کر سنگالی مسلمانوں کا ربط سہالی ہند کے روحانی مراکز سے پیدا کر دیا۔ وسیع سید صاحب کے مریدوں کے علاوہ بعض اور مذہبی رہنما بھی سنگال میں اچائے دین اور ردِ بدعات کی کوششوں میں مصروف تھے، جیسے حاجی سرعب اللہ اور ان کے فرزند حاجی محمد محسن جو دودو سال کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ لوگ اسلامی فرائض کی بجا آوری پر بہت زور دیتے تھے اس لیے فرائضی کہلائے۔ یہ مصلحین عرب کی وہابی تحریک سے متاثر تھے نہ کہ شاہ ولی اللہ کی تحریک سے۔ ان کا اثر بھی سنگال کی روحانی زندگی پر خاصے عرصے تک رہا۔ لیکن سید احمد شہید کے مرید سطو مر نے بھی سنگال میں اپنا اثر کچھ کم قائم نہیں کیا۔ ان سب مصلحین نے نہ صرف روحانی مذہبی و معاشقی اصلاح پر توجہ دی بلکہ ہندو زمینداروں

کے مطالب سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنے کی بھی کوشش کی اور چونکہ اسٹانڈا کمینی کے حکام مسلمانوں کی بصیرت و تدبیر کی بالسی کے تحت بددوں کی حمایت و اعانت کرتے تھے اس لیے ان لوگوں نے لمبی سے بھی ٹکریں ، مگر لمپی کی مستحکم و منظم طام کے آگے ان کی توجہ بس نہ آئی ۔ فرائضوں کے علاوہ بنگال میں جن مذہبی رہنماؤں کا ار سب سے زیادہ رہا اور جنہوں نے بنگال کے مسلمانوں کا ربط بددوسان کے خاص روحانی مراکز سے سدا کیا ، وہ سب سدا احمد سمیت کے مرید و معتمد تھے ۔ بطور خاص کے علاوہ ان میں بمانا نام مولوی عابد الدین حاجی پوری ، صوفی نور محمد ، مولوی عیاد علی اور مولوی کرامت علی کے ہیں ۔

سدا صاحب کی عمریک اصلاح و جہاد کوشش سے ہم دہلی لکھنؤ میں ہوئی ۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ لکھنؤ میں سعید کا غلبہ تھا اور دوسری یہ کہ عس و عسرت کی فصائے لولوں کو اس قدر بے آسان اور لذت پرست بنا دیا تھا کہ سدا صاحب کی تعلیمات انہیں اصل میں لڑتی تھیں ۔

اودھ کے نواب سعادت علی خاں نے آدھا ملک اسٹانڈا کمینی کے حوالے کرنے کے باوجود انہی انتظامی صلاحیت اور ثقات سعاری کی بدولت ریاست کی مالی حالت خاصی مستحکم کر لی تھی اور جب ۱۸۱۴ء میں وہ فوت ہوئے تو حراہ بھرا ہوا تھا<sup>(۱)</sup> ۔ غازی الدین حیدر مسد سین ہوئے تو گورنر جنرل لارڈ ہارڈنگ کے اکسانے پر انہوں نے بادشاہ کا لقب اختیار کیا اور محل بادشاہ سے رسمی وفاداری کا جو سلسلہ تھا اسے منقطع کر دیا ۔ ساری الدین حیدر میں نہ بات کی سی مدار مغزی بھی نہ دولت کی قدر اور نہ اگلے فرمانرواؤں کی سی فوجی سرگرمی ۔ البتہ آصف الدولہ کے عہد کی سی عس برسی اور آرام طلبی ضرور تھی ، مگر اس میں بھی بقول سر ” نہ فرق آگیا تھا کہ آصف الدولہ کا اسراف بھی ملک و ملت کی نفع رسانی کے لیے ہونا تھا اور اب حالص نفس پروری تھی ۔ غازی الدین حیدر کو بات کا جمع کیا ہوا کروڑوں روپے کا نقد خزانہ مل گیا تھا حواسا ہی شوہ کے ہوا ہوئے میں نہایت سربا دلی سے اڑنے لگا“<sup>(۲)</sup> ۔ انہیں موسمی کا بھی بہت سوچ تھا ان کی بیگم کو مذہبی معاملات میں بہت دلچسپی تھی اور انہی کے زمانے میں عجیب عجیب رسومات سعید کے سلسلے میں رائج ہوئیں اور سید مجتہدین کا اثر بڑھ گیا ۔ امام العصر کی چھٹی کی رسم اور اچھوسوں کا سلسلہ شروع ہوا ، اماموں کی ولادت کے ڈرامے کھیلے جانے لگے ۔ ۱۸۲۷ء میں جب انہوں نے انتقال کیا تو خزانہ بہت کچھ خالی ہو چکا تھا ۔ ان کے فرزند نصیر الدین حیدر نے رہی سہی کسر پوری کر دی ۔ عیس و عسرت اور خود

(۱) بقول نجم العی مولف - ” تاریخ اودھ“ ج - ۴ - ص - ۸۸ (مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۱۹ء)  
تیرہ کروڑ روپیہ خزانے میں تھا ۔

(۲) شرر ، عبدالحلیم - ” گزشتہ لکھنؤ“ ص - ۴۹ - مطبوعہ نسیم بک ڈپو لکھنؤ ۔

اجداد کردہ رسموں سے انہیں بالکل فرصت نہ تھی۔ فضول خرچیوں سے سارا روبہ ختم ہو گیا۔ عورتوں میں زیادہ وقت گزارنے کے باعث نصرالدین حیدر میں، اس قدر زنانہ مزاجی آگئی تھی کہ عورتوں کی سی لباس کرنے بھی اور عورتوں ہی کا لباس پہنتے بھی۔ زنانہ مزاجی کے ساتھ مذہب نے نہ صورت بدلا کر دی کہ آئمہ اتنا عذر کی فرضی بیباں یعنی اچھوساں اور آئمہ کی ولادت کی خبریں جو ان کی ماں نے فائم کی تھیں ان کو اور نرمی دی۔ یہاں تک کہ ان بھابیوں میں ”خود حاملہ عورت بن کر رچہ خانے میں بٹھنے، چہرے اور حرکات سے وضع حمل کی تکلیف ظاہر کرے اور بھر خود انک فرضی بچہ جننے جس کے لیے ولادت، چھٹی، اور نہانے کے سامان بالکل اصل کے مطابق کسے جاتے“ (۱)۔ نہ بقیوں اس قدر زیادہ تھیں کہ سال بھر پادشاہ کو انہی سے فرصت نہ ملی، انتظاماتِ سلطنت کی طرف کون بوجہ کرنا۔

نصرالدین نے ۱۸۳۷ء میں وفات پائی اور ان کے جانشین سعادت علی خان کے بیٹے محمد علی شاہ ہوئے جسہوں نے باپ کی روایت پر عمل کرنے کی کوسس کی اور جہاں تک ممکن ہوا انتظاماتِ سلطنت کو ٹھیک کیا۔ انہوں نے اتنا مسہور امام ناٹھ حسن آباد اور اس کے قریب انک عالیسان مسجد تعمیر کرائی شروع کی، جس کی بات انہام کیا گیا تھا کہ دہلی کی جامع مسجد سے رونی اور وسعت میں بڑھ جائے۔ انہوں نے بابل کے مینار نا وہاں کے ہوائی ناغ کی طرح انک عمارت بھی حسن آباد کے قریب تعمیر کرائی شروع کی جس میں محرابوں کے مقدور حلقوں پر دوسرا حلقہ اور دوسرے پر تیسرا حلقہ، غرض بونہی بنے اور حلقے قائم ہوئے حلے جاتے تھے۔ ارادہ تھا کہ بونہی سات منزلوں تک اسے بلند کر کے انک اونچا اور بڑا سا برج اور بنا دنا جائے، لیکن باغ ہی منزلیں بننے پائی تھیں کہ محمد علی شاہ نے انتقال کیا۔

ان کے بیٹے امجد علی شاہ بہت مذہبی آدمی تھے۔ مجتہد العصر کو لاکھوں روبہ زکوٰۃ کے نام سے نذر دنا جانے لگا اور ”انہیں اتنے خیال کی تابددی۔ سرع سے اتنی فرصت ہی نہ ملتی تھی کہ نظم و نسقِ مملکت کی طرف بوجہ کریں جس کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ محمد علی شاہ نے اتنی مجربہ کاری اور بدار مغزی سے جو کچھ انتظامات کیے تھے سب درہم برہم ہو گئے“ (۲)۔ ان کے زمانے میں حکومت بالکل علما و مجتہدین کے ہاتھ میں چلی گئی تھی۔ مگر اربابِ نشاط کا محکمہ ان کے یہاں بھی موجود تھا (۳)۔ ۱۸۴۷ء میں امجد علی شاہ کی وفات پر واجد علی شاہ تخت پر بٹھے۔ ان کا فطری

(۱) شرر عبدالحلیم - ”گذشتہ لکھنؤ“ ص - ۵۶ - مطبوعہ نسیم بک ڈپو لکھنؤ

(۲) شرر، عبدالحلیم - ص - ۶۱

(۳) محل خانہ شاہی - ص - ۴۲ - ۴۳ لکھنؤ - ۱۹۲۶ء - بحوالہ ادیب، سید مسعود حسن رضوی

”اردو ڈراما اور اسٹیج“ پہلا حصہ ص - ۱۹ لکھنؤ - ۱۹۵۷ء

رجحان مول سر ”عاسی اور فون طرب و نساط کی طرف تھا۔ اگرچہ باپ کی ناکد سے لکھنے پڑھنے کی تعلیم بھی اچھی تھی لیکن موسمی کا سون غالب تھا۔ ولعہدی ہی میں اپنے ذاتی سون سے انہوں نے باب کے مشا کے خلاف گوئیوں اور ڈھاڑیوں کو انہی صحت میں رکھ کے ہانا عانا سکھا، آوارہ عوریوں اور ڈوم ڈھاڑیوں سے ربط و صبط پڑھانا اور انجام نہ ہوا کہ حولطف انہیں حسن عوریوں اور گوئیوں کی صحت میں آنا، علمی مداں کی مہذب صحتوں میں نہ آنا“۔ واحد علی ساہ کو عہاراب کا بھی سون تھا اور ولعہدی ہی میں انہوں نے خاص ابی محمل طرب اور عس کے لیے ایک در فضا باغ اور اس میں دو ایک محضر، حویصورت اور بر نکلف مکان سوائے۔ تخت نس ہونے کے بعد قریب ایک سال تک انہیں عدالت گسری اور اصلاح فوج کی طرف خاص توجہ رہی، حال کہ جوان حسن عوریوں کی بھی ایک جھوٹی سی ربانی فوج مرتب کی گئی، لیکن سر کا سان نہ ہے کہ ”نورا ایک سال بھی نہ گزرا ہوا کہ طبع ان حیزوں سے اکٹا گئی، رہا نہ ولعہدی کا وہی برانا مداں پھر عود کر آنا، حسن اور آوارہ عوریوں سے صحت پڑھی، ارباب نساط کا نارار گرم ہوا اور پھوڑے پی دنوں میں ڈوم ڈھاڑی ہی ارکان دول اور معرین سلطنت بن گئے۔ ناساہ کے دل میں اب اگر کوئی علمی اور سرپانہ مداں باقی تھا تو وہ ساعری بھی نہ ہو کہ خود سر کہے اور سعرا کی قدر کرتے تھے۔ لکھنؤ میں ان دنوں ساعری کا حرجا حد سے زیادہ پڑھا ہوا تھا، اگلے لکھنؤ میں اسے ساعر موجود تھے کہ اگر سارے ہندوستان کے سعرا جمع کرے جائے تو ان کی تعداد لکھنؤ کے ساعروں سے نہ پڑھ سکی“۔ بروفسر مسعود حسن رضوی نے انہی کتاب ”اردو ڈراما اور اسٹیج“ مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۵۷ء میں سر کے بیان کی پوری طرح نائند نہیں کی۔ ان کا کہنا ہے کہ ”واجد علی ساہ ایک ربرک حاکم، ایک انساب دوست شخص اور ایک رعایا پرور ناساہ تھے اور انہوں نے اسظام کی اصلاح کی کوسس کی، مگر چونکہ اودھ میں لارڈ ولزلی کے زمانے ہی سے ”حلبہ معاونت“ کے ماتحت انگریزی افواج مسع ہو گئی تھیں اور اندرونی معاملات میں ریزڈنٹ دخل دسا رہا تھا، اس لیے واجد علی ساہ نے مجبور ہو کر، اسظام سلطنت انے وزیر اور خسر نواب علی نفی خان کے سرد کر دیا تھا“۔ در اصل لارڈ آک لسٹ نے ۱۸۳۷ء میں ساہ اودھ کو نہ سببہ کر دی تھی

(۱) سر، عبدالعلم، گرسہ لکھنؤ ص - ۶۵

(۲) اص ص - ۶۶ - ۶۷

(۳) ادیب، ص - ۱۳ تا ۲۰ - بروفسر ادب کا بیان حسب ذیل مآخذ پر مبنی ہے -

(۱) طہیر الدین بلگرامی ”اسرار واجدی“ خطوط نصف سدہ ۱۲۶۶ھ تا ۱۹۷۸ھ

(۲) مشکاف سی ٹی ”دو ہندوستانوں کے قلم سے عدر دہلی کا بیان (انگریزی) مطبوعہ

۱۸۹۲ء - (۳) مرزا محمد تقی ”آفتاب اودھ“ خطوط نصف سدہ ۱۸۷۳ء - ۱۸۷۵ء

(بقیہ حاشیہ اگلے صفہ پر)

کہ اگر انتظامیہ کو درس نہ کسا گیا اور رعایا کے حقوق کا خیال نہ رکھا گیا تو ریاست کو برطانوی علاقے میں شامل کر لیا جائے گا۔ یہی سبب لارڈ ہارڈنگ نے ۱۸۴۷ء میں واجد علی شاہ کو بھیجی کی بھیجی۔ کچھ دیر سے برطانوی ساسٹ دانوں کے حلقہ میں نہ خیال پیدا ہو رہا تھا کہ اودھ کو برطانوی ہند میں مستقل طور پر شامل کر لیا جائے، مگر کرنل سلیمن جو اودھ میں ۱۸۴۸ء تا ۱۸۵۴ء ریزیڈنٹ رہا اور اس کے بعد کرنل اوٹ رم جو حکومت اودھ کے خاتمہ تک یہیں ریزیڈنٹ تھا، دونوں اس مجبور کے خلاف تھے اور لارڈ ڈلہوری نے جو مجاور اسٹ انڈیا کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کو لندن میں بھیجی ان میں بھی نہ مشورہ دیا گیا تھا کہ اودھ کا مکمل الحاق درس میں، تاکہ شاہ اودھ خود اپنی حکومت سے دست بردار نہ ہو جائیں۔ اس نے اس عجز کی برزور جانب کی کہ شاہ اودھ کے القاب اور مراتب بدستور سابق رہیں دے جائیں، مگر شاہ اودھ ریاست کا انتظام کلی طور پر کمپنی کے سپرد کر دیں۔ لیکن اس مجبور پر بورڈ آف ڈائریکٹرز معفی نہ ہوا اور ولایت سے جبری الحاق کا حکم آگیا۔ ان سب مجاور سے جو بات بار بار ظاہر ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ اودھ کی انتظامیہ سال سال بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن کسی نے نہ بات نہیں کہی کہ واجد علی شاہ خود بالکل نیکمے اور بیکار قسم کے حاکم تھے۔ نہ ممکن ہے کہ اگر حالات بہتر ہوتے اور انہیں اپنی مملکت میں اختصار کٹی ہوتا، تو وہ اپنی فراست اور تدبیر کو استعمال کرتے حالات درس کر لیتے۔ کیونکہ وہ ایک نادوں اور سائنس دان و دماغ کے مالک تھے اور اگرچہ انہیں فنون لطیفہ کی طرف خاص رغبت تھی مگر نہ بات قابل قبول نہیں ہو سکتی کہ وہ بالکل لہو و لعب کے غلام تھے۔

واجد علی شاہ نے اسے دور میں رفعت و موسمی کا سوو دل ڈھول کر بورا کسا، بلکہ شعر و ساعری، نصف و نائف اور عماریں بنانے کے سوو میں بھی کوناہی نہ کی۔ ان کی لکھی ہوئی اردو و فارسی نظم و نثر کی کتابیں، جن کی تعداد ان کی وفات تک سو سے اوپر پہنچ گئی تھی، ادب، خود نوس، مدہسات، عطیات، ساسات، جنسات، مضحکات، صنعت و حرف، فلسفہ و اخلاق وغیرہ بہت سے موضوعات کو محیط ہیں<sup>(۱)</sup>۔ واجد علی شاہ نے اسٹی لاکھ کے صرے سے مصر باغ کی سائدار عارب اور باغ بھی سوایا جہاں سال میں ایک بار ایک عظیم السان ملا لگتا تھا۔ اس میں عام لوگوں کو بھی آنے اور بادشاہ کی رنگ رلبان دیکھنے کا موقع مل جاتا تھا۔ بادشاہ شعر و ساعری، نصف و نائف،

گذشتہ سے پیوستہ

(۳) ہلال، سند محمد امیر علی خان ”وزیرنامہ“ - کانپور - ۱۲۹۳ھ - (۵) سندیلوی

راجا درگا پرشاد ”بوستان اودھ“ لکھنؤ ۱۸۹۲ء - (۶) خنجر، قدا علی ”محل خانہ شاہی“

لکھنؤ ۱۹۲۶ء - (۷) شرف، آغا حجی ”افسانہ لکھنؤ“، مطوطہ تصنیف شدہ - ۱۲۹۰ھ -

(۱) منیر مسعود (رضوی) ”رجب علی بیگ سرور“، ص ۳۵ - ۳۵ - الہ آباد - ۱۹۶۸ء

رمض و نغمے سے دل بہلائے اور عسّٰی امروز کے فلسفہ کو عملی جامہ پہنائے ، حلی کہ فروری ۱۸۵۶ء میں اسٹ انڈیا کمپنی نے انہیں معرول کر دیا اور اودھ کو برطانوی ہند میں شامل کر کے براہ راست اسے انتظام میں لے لیا ۔ واجد علی شاہ کلکتے بھیج دے گئے ، جہاں وہ مشا بریج میں مقیم رہے ۔ وہاں بھی ان کی دلچسپیاں بدستور قائم رہیں ۔ لکھنؤی مہذب و تمدن ، معاشرہ و ثقافت اگرچہ دورِ معلہ کے دہلوی اصل ہی کی بناخیں نہیں لیکن ایک نو انی اصل سے دوری اور نوری ماحول کے اثر سے ، دوسرے والیان اودھ کی سعیت اور عجمت دوسی کی وجہ سے ، سرے سیاسی و معاشی انساں سے محفوظ ہونے اور عام طور پر امن و خونجالی کے دور دورے کے سبب ، اور جونہی دہلی سے معانیے اور صد کے باعث وہ انی اصل سے محفل ہوگئیں اور نہ اخلاف وہب کے مابہ بڑھا رہا ۔ لکھنؤی مہذب و تمدن نے چند ہی سال کے اندر انی ارتقائی منزلیں طے کر لیں اور پھر بہت سر رفتاری کے ساتھ ایک واضح و مسرہ شکل اختیار کر گیا ۔

دہلی سلاطین مغلہ کا دارالخلافہ ہوئے کے علاوہ ایک عظم روحانی و دینی مرکز بھی تھا ۔ جہاں اٹھارھویں صدی کے دور لائظمی و انساں میں بھی شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان نے انا فضان جاری رکھا تھا ۔ نہ صورت لکھنؤ کی نہ بھی ۔ نہ درس ہے کہ لکھنؤ کا فرنگی محل اور درس نظامہ بھی اہمیت کے حامل تھے اور لکھنؤ میں بھی بہت سے فاضل اور فانی عزت علما موحود تھے ، لیکن ان کے ارباب انی روحانی نہ تھے حتے کہ مکہبی و مسلمانانہ ، دسائی و دہنای تھے ۔ درس نظامہ میں علوم ناطنی اور نفس و حدیث کا عنصر بہت کم تھا ۔ درآخالکہ شاہ ولی اللہ اور ان کے فرزندان علوم ناطنی اور نفس و حدیث و رجال کو اولین اہمیت دیتے تھے ۔ لکھنؤ میں فقہ ، اصول فقہ ، کلام ، صرف و نحو ، منطق و فلسفہ ، الہیات ، اقلیدس اور ہست کی تعلیم پر بھی زور دیا جانا تھا اور حق یہ ہے کہ سارے ہندوستان میں ان علوم کی تعلیم کا سب سے بڑا مرکز لکھنؤ تھا ۔ ”سبعہ“ مجتہدین کا آغاز بھی فرنگی محل ہی سے ہوا ۔ لکھنؤ کے پہلے مجتہد مولوی دلدار علی نے بھی ابتدائی کتب درسہ فرنگی محل ہی میں بڑھی تھیں ، پھر عراں جا کے علمائے کربلا و نجف کے سامنے زانوئے ساگردی نہ کیا اور واس آکر خود فرنگی محل والوں کی تصدیق و تعریف سے مجتہد اور سبعہ فرمانروایان وقت کے مہندا قرار پائے ۔ انہوں نے چونکہ عراں میں تعلیم نائی لہذا عربی کا نا ادبی ذوق اسے ساتھ لائے ۔۔۔۔ علمائے سبعہ کے ادبی مذاں نے لکھنؤ کو ادب کی تعلیم کا اعلیٰ ترین مرکز بنا دیا ۔۔۔ ادب ، شاعری اور عروض عربی کو علمائے سبعہ و مجتہدین لکھنؤ نے انا لیا تھا“ (۱) ۔

فارسی دانی کا آغاز لکھنؤ میں مراسل سے ہوا ، ان سے پہلے ملا فائق نے جن کا

خاندان آگرے سے آکر مضافات لکھنؤ میں بس گیا تھا فارسی ادب و انشا کی نظم و نثر میں بلند پایہ کتابیں تصنیف کی تھیں۔ فارسی دانی کے ساتھ فارسی کے اصول و ضوابط اور اس کے صرف و نحو مدّون کرنے کا سو لکھنؤ میں انہی کے طفل شروع ہوا، اس کے بعد فارسی وہاں کی عام تعالیم میں داخل رہی اور نصاب فارسی نہایت بلیغ و دقیق رکھا گیا۔ عرفی، فیضی، ظہوری اور نعمت خان عالی کے سے نازک خیال شعرا کا کلام داخل درس رہا۔ ملا طغرا اور مصنفِ پنج رقعہ جسے دقتِ سندوں کا کلام بڑھایا جانا رہا۔ فصبات اودھ کے آکر شرفا کا مہذب مشغلہ اور مہذب دریعہ معاش فارسی بڑھانا تھا۔ ”لکھنؤ میں فارسی کا مذاق جس قدر بڑھا ہوا تھا اس کا اندازہ لکھنؤ کی اردو زبان سے ہوسکتا ہے، یہاں تک کہ جھلا اور غوریوں کی زبان پر فارسی کی ترکیبیں، سندسبیں اور اضافتیں موجود ہیں“ (۱)۔

جہاں تک علم طب کا تعلق ہے سرر کا کہنا ہے ”کہ دہلی کے اطباء کے برخلاف جو کہ یونانی طب کے اصولوں پر نورا نورا عمل نہیں کرتے بلکہ ویدک اور ڈاکٹری اصول بھی دیکھتے ہیں، لکھنؤ کے اطباء یونانی نصابِ تعلیم پر وفاداری سے عمل کرتے ہیں“۔

فنونِ لطیفہ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ موسیقی میں آکرچہ بعض بڑے بڑے ماہر موسیقار اودھ میں موجود تھے لیکن واحد علی ساہ کے رہانے میں علم موسیقی اپنے کلاسیکی مقام سے گر کر چھوٹی چھوٹی حرروں پر آگیا تھا۔ نول اسد اللہ خان نوک ”کدر بانے ٹھمرناں بحسب کر کے عوام میں بھلائی اور موسیقی کو بحسن کر دیا، چنانچہ اکثر سدا یاں موسیقی اعلیٰ درجے کی راگ راگنیوں کو چھوڑ کر کدر سا کی ٹھمریاں پسند کرنے لگے۔۔۔ زمانے کا یہ رنگ دیکھ کر نفسِ طبعی رکھنے والے گوشتوں نے بھی راگ راگسوں کی مسکلاں کو ترک کر کے چھوٹی چھوٹی سادی دلکش اور عام فہم چروں پر موسیقی کو قائم کیا۔ عوام میں غزل اور ٹھمری کا چرچا ہو گیا اور دھرد، پوری وغیرہ جو نہایت بھل اور مشکل چیزیں ہیں ان کی طرف مطلق توجہ نہ کی گئی۔ کھاج، جھجھوٹی، بھروس، سندورا، بلک کا مود، سلو وغیرہ چھوٹی چھوٹی مزیدار راگنیاں اہلِ مذاق کے فتنے کے لیے منتخب کی گئیں اور یہی چیزیں ناساہ کو بالسطع مرغوب تھیں“ (۲)۔ موسیقی میں ہلکی بھلکی چیزوں کے اضافے کے علاوہ سلطنتِ اودھ میں موسیقی پر ایک بہت

اہم کتاب بھی لکھی گئی جس کا نام اصول النغمات الأصناف ہے۔ یہ بٹن کے ایک رئیس محمد رضا نے ۱۸۱۳ء میں لکھی اور اس میں ہندوستانی موسیقی کے نظریے کی تشریح ہی نہیں کی بلکہ موسیقی کے متخالف مسلکوں میں نظم اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی بھی کوشش کی۔

(۱) شرر، عبدالعظیم، گزشتہ لکھنؤ۔ ص - ۱۳۸ - ۱۳۵

(۲) بھوالہ سرر، گزشتہ لکھنؤ۔ ص - ۲۰۱ تا ۲۰۴



موسمی ہی کے سلسلے میں سوزِ حوائی کا ذکر سروری ہے۔ سب سے مدہب کی سرگرمی نے جہاں ساعری میں مرتبہ گوئی اور محبت اللہ خوائی کو پیدا کیا، اسی طرح موسمی میں سورِ خوائی پیدا کر دی۔ پھر ان دونوں کو جہاں تک ترقی دی کہ مسلسل فن بن گئے اور اسے فنِ حوِ ابداء سے اسہا تک لکھتو ہی کے ساتھ مخصوص ہیں۔

مصورِی میں نہ ہوا نہ لکھتو کا ایک مقامی اسلوب بن گیا جو دہلی کے اسلوب سے مختلف تھا۔ دہلی کے اسلوب میں خطوط بہت حسب اور رنگ نکھرے ہوئے ہوتے جاتے تھے۔ لکھتو کے اسلوب میں ہوسے خطوط اور فصا زیادہ انتہائی تھی اور نرم و گداز رنگ زیادہ استعمال کیے جاتے تھے، اس اسلوب کا انداز رومانیوی و ساعرانہ تھا۔

رخص کے فن نے بھی اودھ میں ایک خاص شان پیدا کر لی۔ نواب سراج الدولہ ہی کے زمانے سے اربابِ بساط اور محرا کرنے والی رندوں کے طائفے اودھ میں جمع ہونے لگے تھے۔ اچوڑھا اور بنارس کے لہک حو اس علاقے میں موجود تھے قدرتی دیکھ کر دربار کے سرکاری طرف لہجے لکے اور دونوں کے مل حول سے رخص کا فن الگ انداز میں ترقی کرنے لگا۔

سعر و ادب میں نہ ہوا نہ حو نصف و نصف اور حو لدت برسی اودھ کی زندگی و معاشرے میں بھی وہ مضامین اور طریقیں اظہارِ دونوں میں چھلکے لگی۔ سب سے مرتبہ کوئی کو فروغ دیا اور بصورت کے مضامین کو ساعری میں تم کر دیا۔ موسمی و رخص کے رواج نے ڈرامائی نظم کی ساد ڈال دی۔ ماس بنی کے سوئے اور طوائفوں کی شہرت نے رنجی اور واسوخت حسنی اصناف کو عام مقبولیت بخشی۔ رحب علی بگ سرور، ناسخ، آس، اسس، رنگیں، ددر، امام و عمرہ ان خصوصیات کی برحمائی کرتے ہیں۔

اودھ کے فنِ تعمیر کے بارے میں مشہور متصرِ تعمیر کاری جیمس فرگوسن کا تبصرہ یہ ہے کہ ”اگر برٹش و آرائس کی شہرت اور تکلف ہی تعمیر کاری کے لئے کافی ہوئے تو لکھتو کا جواب ہندوستان بھر میں ملنا مشکل ہوتا۔ نہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اودھ کے فرمانرواؤں نے کسی عالی شان عمارتیں تعمیر کر دیں لیکن سب کی سب (بجز دو ایک کے) سخت بد ذوق کی آئینہ دار ہیں۔ سولہویں صدی کے یورپی شاہ ناسہ یا کلاسیکی طرزِ تعمیر کے احباب کے بارے میں خواہ کچھ ہی کہوں نہ کہا جائے، ہندوستان میں تو یہ شامب محض ہی ثابت ہوا۔ جس عی اوجھے ہیں سے یہاں اطالوی طرزِ تعمیر کا استعمال ان لوگوں نے کیا ہے جو اب اس خاص طرز میں نہایت اعلیٰ عمارتوں کے بنانے کے اہل تھے، یہ بات تعمیر کاری کی تاریخ کے تعجب انگیز مظاہر میں سے ہے۔ اطالوی طرز میں بنی ہوئی اولین اہم عمارتوں میں لکھتو کے جبرل کلاڈ مارٹن کی کوٹھی ہے۔۔۔ اس طرز کا اثر والیان اودھ کے مذاق پر بہت ہوا۔ اگرچہ ان کے ممبرے، مسجدیں امام باڑے اس وقت کے مرتوجہ

سبک اسلامی طرزِ نعمر کے مطابق ہیں لیکن لکھنؤ کے تمام محل اس جعلی اطالوی طرز سے متاثر ہیں۔ سعادت علی خان کا فرح بخش، نصر الدین حدر کا چھتر منزل اور متعدد دوسری عمارتیں فرانسس اول کے دور کی سی عجب نامانوس دلفریب بے صابطگی ظاہر کرتی ہیں جس میں ہنری چہارم کی عمارتوں سے زیادہ عجیب تفصیلات کی آمیزش ہے۔۔۔ البتہ ہگم کوٹھی میں ایک خاص دلفریبی ہے جو کسی حد تک اس کے فرائض کی تلافی کر دی ہے، لیکن ایسے نہ تو اطالوی آرٹ کا اچھا نمونہ کہا جا سکتا ہے اور نہ اس کا مشرقی مقاصد کے لیے کامیاب نصرف۔۔۔ ہندوستانوں نے اپنے حاکموں کی نقل کرنے کی کوشش میں اپنا حسن آرٹ جھوڑ کر بد ذوق اور سوخت کا وہ گڈ مڈ آمیزہ بس کیا ہے جو ہمیں لکھنؤ اور دوسرے مقامات پر ملتا ہے۔۔۔ تاہم لکھنؤ میں چند عمارتیں ایسی ہیں جن میں یورپی آمیزش در انداز نہیں سوئی ہے مثلاً آصف الدولہ کا بنایا ہوا بڑا امام باڑہ<sup>(۱)</sup>۔

زبان و ادب اور علوم و فنون لطیفہ و منصفہ کے علاوہ تمدن و معاشرے میں بھی لکھنؤ دہلی سے کئی باتوں میں مختلف ہو گیا تھا۔ سر رہے بنایا ہے کہ تفریحی مساعلیٰ میں اہل لکھنؤ کو نہ صرف درندوں اور حیوانوں کی لڑائی دیکھنے کا سونہا بلکہ مرغ، سر، بٹر، لوے، گلدہ، لال، کنور اور طوطوں کی لڑائی کرائے دیکھنے کا بھی بہت سونہا اور اس سے کم کسکوؤں اور سنگوں کے لڑائے کا نہ تھا۔ بھانڈوں کی نقلیں بڑی دلچسپی سے دیکھی جاتی تھیں۔ کیونکہ وہ ہنسی ہنسی میں حوٹیں کر جاتے تھے کھانے پینے میں بڑی نفاستیں اور نارنگیاں سدا ہو گئی تھیں۔ تلافی کا رواج نہ بسب برتانی کے زیادہ تھا۔ سرمایہ لکھنؤ بی میں اتحاد ہوئے۔ لباس میں بھی نئی باتیں پیدا ہوئیں، اچکن اتحاد ہوئی اور معری اور سے کف کالر والی قمیض کا رواج ہوا۔ ننجائی غرارے باحارے اور گھٹھے مصول ہوئے۔ عورتوں کے زینر ہلکے ہلکے ہو گئے۔ عجمی اثرات کے باعث مردوں کی ڈاڑھیاں کم ہونے لگیں۔ محلی اخلاق، آداب نشست و برخاست، صاحب سلامت، مزاج برسی، طرز کلام، سادی و عمی کی رسموں اور مجلسوں، محفلوں میں بہت تکلف و تصنع، مگر ساتھ ہی سائنس کی بھی آگئی۔

لکھنؤ کے معاشرے میں طوائفوں کی مجلسی تہذیبی اہمیت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ ”مشہور تھا کہ جب تک اسان کو رنڈیوں کی صحبت نصیب نہ ہو آدمی نہیں بنتا۔ آخر لوگوں کی اخلاقی حالت بگڑ گئی اور ہمارے زمانے تک (یعنی انیسویں صدی کے آخر تک بھی) لکھنؤ میں بعض ایسی رنڈیاں موجود تھیں جن کے گھر میں اعلانہ اور بیباکی سے چلا جانا اور ان کی صحبت میں رہنا معروب نہ سمجھا جاتا تھا۔ بہر تقدیر اس چیرے تک بڑی حد تک ان کی عادات و خصائل بگاڑ دیے، گونا گونا کے نتیجے

(۱) فرگوسن، جیمس ”ہندوستانی اور مشرقی تعمیر کاری کی تاریخ“ (انگریزی) ج ۲ - ص ۲۲۸ تا

میں انہیں نسبت و برخاست کا سلسلہ بھی آگیا۔ طوائف دہلی میں بھی تھیں۔ لیکن لوگ انہیں محض بوس رانی کے لیے محض سمجھتے تھے اور اس لیے انہیں معاشرے میں کوئی اچھا مقام نہیں دیتے تھے۔ برخلاف اس کے لکھنؤ میں یہی صاحبیں سانِ ریاست میں داخل تھیں اور ٹوب تماشائی برسرِ درے تھے۔ استروں کی وضع میں داخل ہو گا تھا نہ ایسا سوو پورا کرنے کا ایسی سان دکھائے کے لیے کسی نہ کسی بازاری حسین فروس سے ضرور تعلق رکھتے تھے۔ ”حکم مہدی کا سا قابل و ہوسار اور مہذب و سائنسہ شخص جو وزیر اعظم کے رہنے تک پہنچ گیا، اس کی برف کی سادہ سارو نام انک ریلڈی سے بڑی حسین لے دھڑوب کی رقم اپنے پاس سے ادا کر کے اسے انک صوفے کی نظامت کا عہدہ دلوانا تھا“ (۲)۔ طوائفوں کی مقبولیت و اہمیت کی انک وجہ نہ تھی یہی نہ وہ محض عصمت فروس اور فن فروس ہی تھیں بلکہ ادب و سسر اچھی تعلیم نائی ہوئی اور اعلیٰ درجے کا ادبی ذوق رکھنے والی ہوتی تھیں اور آدابِ محفل، حسن و برخاست کے انداز اور مہذب طرزِ گفتگو سے بوزی واقف رکھتی تھیں، خاصہ ان نائوں کے سکھنے کے لیے طوائفوں کے بالا حائے مہربان تربیت دہ سمجھے جاتے تھے اور رئیس زادے اسی عرصے سے طوائفوں کے پاس بھجے جاتے تھے۔

لکھنؤ کے مہذب و تمدن کی تصویر وہاں کے نائوں کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ نہ وہ طبع تھا جس نے فنِ سہکری میں خصوصی مہارت مہم پہنچا کر اس کو گونا گونا گویا زندگی و مؤلف بنا لیا تھا۔ نہ طبع اسے سردار، اطوار اور وجداری کے لحاظ سے مہارت تھا۔ ”مطلوب کی جانب میں ظالم سے بھڑکانا، حرفوں کو ان کی تعداد کا لحاظ کرتے بغیر دھڑک سربارار لٹکار دینا، جو ان سے مدد طلب کرنے کے لیے جان تک دے دینے سے دریغ نہ کرنا، انک وضع مقرر کر کے مرے دم تک اور ہر حال میں اسی برقاء رہنا، غیبت و خود داری بر لمحے بھر کے لیے بھی آغ نہ آئے دینا، نہ سب خصوصیات نہیں جنہوں نے ان کو انک افسانوی حسب دے دی۔ واقعات گراہ ہیں کہ ان کے اہل ارادوں کو ناساہ تک جنس نہ دے سکے تھے۔ حسب سن کی طرح وہ حصولِ مقصد کے لیے جان بر کھیل جاتے تھے، ان کی بہادری سچاغت سے گزر کر مہرور کی حدوں میں داخل ہو گئی تھی۔ ان کی وجہ سے سہر میں آئے دن کسب و خون اور معرکہ آرائیاں ہوا کرتی تھیں اور ان کے دم سے لکھنؤ امن و امان کے دیوں میں بھی بلواروں کی جھنکار، فرایسوں کے دھماکوں اور خنکی نعروں سے گونجا کرنا تھا“ (۳)۔ بعد میں یہی بانکے جوانمردی سے اغاٹس کرنے لگے اور محض بانکپن کی طرف متوجہ ہو گئے، جس کی وجہ

(۱) شرر، گزشتہ لکھنؤ - ص - ۳۲۱

(۲) ایضاً - ص - ۳۲۱

(۳) نیر مسعود ”رجب علی بیگ سرور“ - ص - ۲۸ الہ آباد ۱۹۶۷ء

سے ”لکھنؤ کے بانکے“ ایک مدموم اصطلاح بن گئی۔

حاصلِ نلام نہ کہ لکھنوی ہذیب و تمدن میں اگرچہ عظمت و بلندی اور گہرائی نہ تھی، کیونکہ اس کے پسِ پست صدیوں اور فربوں کے تجربات و حوادث کا فرما نہ تھے، تاہم خوبصورتی، رونق، رکھ رکھاؤ، نفاس و لطافت، وضعداری و سائستگی اور نکلف و نصنع نے اسے ایک انفرادیت ضرور بخش دی تھی۔

۱۸۰۳ء سے ۱۸۵۷ء کے دور کی حد اور قابل ذکر باتیں یہ ہیں کہ ۱۸۳۷ء میں دہلی (۱) میں لکھوگرافی کے درجے طابع کا مطبع قائم ہوا اور اردو کتابوں کی اساعت میں بڑی سہولت ہو گئی ورنہ اس سے پہلے ٹائپ کے مطبعے قائم ہوئے تھے جن میں نستعلیق خط کی حوی و خوبصورتی نہیں آتی تھی۔ لکھوگرافی نے اردو صحافت کی ترقی میں مدد دی اور کتابوں، رسالوں، مکتبوں، سرکاری اعلیٰوں، سرکاری قوانین کے ترجموں وغیرہ کی اساعت میں بھی اس سے بہت سہولت ہو گئی۔ جس طرح دخانی جہاز، برطانیہ میں ریل گاڑی سے پہلے رائج ہو گئے تھے اسی طرح ہندوستان اور برطانیہ کے مابین دخانی جہازوں کی آمد و رفت ہندوستان میں ریل گاڑی سے پہلے شروع ہو گئی۔ نومبر ۱۸۲۳ء بی میں کلکتے میں ایک عام جلسہ ہوا (۲) جس میں سگال اور انگلستان کے مابین دخانی مواصلات کو ترقی دینے کے لیے ایک کمٹی مائی گئی۔ جس کی وجہ سے ہندوستان کا ریلوے مغرب سے فرنی ہو گیا اور مغربی ارباب کے نفوذ میں آسانی ہو گئی۔ ہندوستان میں پہلی ریلوے لائن بمبئی اور بھالے کے درمیان ۱۸۵۳ء میں ڈالی گئی۔ ۱۸۵۵ء میں سگال ریلوے نے کلکتے کو ران گچ سے ملا دیا، اس کے بعد ریلوے میں تدار توسع ہوئی گئی اور ملک کے مختلف حصے ایک دوسرے سے مربوط ہی نہیں ہوئے بلکہ اس سے ملک کی تجارت، معیشت، معاشرہ وغیرہ پر بھی بہت اثر پڑا۔ ٹیلی گراف یعنی نار ترقی کا آغاز ہندوستان میں ۱۸۵۵ء میں ہوا۔ سسی ڈاک کا انتظام اس سے ایک سال پہلے ہو چکا تھا جبکہ خطوط کے لیے آدھ آنہ اور کارڈ کے لیے ربع آنے کا ٹکٹ لگانا کافی تھا۔

غرض مختصر یہ کہ ہندوستان کی زندگی و معاشرہ اور فکر و عمل کے ہر شعبے میں اگرچہ ابھی قدامت و روایت کا اثر گہرا تھا لیکن تبدل سے ثبات دلانے کی کوششیں بھی برابر ہو رہی تھیں اور مغربی ارباب بھی آپسہ آپسہ نفوذ کرنے لگے تھے اور ترقی زندگی اور برائے سماج کے انداز تدریج بدل رہے تھے۔ قدیم اور جدید کی کسمکس شروع ہو چکی تھی لیکن ابھی اس کا صرف آغاز تھا۔ ہندوستان دور وسطیٰ سے نکل کر دور جدید میں ابھی نہیں آیا تھا اگرچہ اس سمب میں گلزن ہو چکا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ایک تعبیر یہ بھی کی گئی ہے کہ یہ قدیم نظام زندگی و نظام فکر کی ایک آخری کوشش

(۱) یوسف علی، عبداللہ ”برطانوی عہد میں ہندوستان کی ثقافتی تاریخ“۔ ص - ۱۵۲

(۲) ایضاً۔ ص - ۱۶۲

نہی تاکہ جدید نظام زندگی و نظام فکر کے بڑھتے ہوئے بوجھ کو اپنے سر سے اتار دھینکیں گے مگر جس طرح قدیم کو جدید کے مقابلے میں ہمیشہ شکست ہوئی رہی ہے اسی طرح اس کوسس کے سلسلہ میں بھی ہوئی -



### کتابیات (اردو)

آزاد ، محمد حسن	آجیاب	لاہور - ۱۹۵۷ء
ابوالحسن علی ندوی	ہندوستانی مسلمان	لکھنؤ - ۱۹۶۱ء
ابو بھٹی خاں بوسہروی	تراجم علمائے حدیث ہند	دہلی - ۱۹۳۸ء
ادب ، سد مسعود حسن	اردو ڈراما اور اسٹج	لکھنؤ - ۱۹۵۷ء
رضوی -		
اکرام ، سیخ محمد	نفاذ نائسان	کراچی - سن اساعب درج نہیں -
اکرام ، سیخ محمد	رود کوہ	لاہور - ۱۹۵۸ء
اکرام ، سیخ محمد	موج کوہ	لاہور - ۱۹۵۸ء
اینڈریوز ، سی ایف	حیات ذکاء اللہ (مرحمہ ضی الدین احمد برنی)	کراچی
امداد صابری	فرنگیوں کا حال -	دہلی - ۱۹۴۹ء
جعفری ، رئیس احمد	بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد	لاہور - سن درج نہیں
جعفری ، رئیس احمد	واحد علی شاہ اور ان کا عہد	لاہور - سن درج نہیں
حالی ، الطاف حسن	نادگار عالم	کراچی - ۱۹۶۲ء
خورشید مصطفیٰ رضوی	جنگ آزادی ۱۸۵۷ء	دہلی - ۱۹۵۹ء
ذکاء اللہ	تاریخ عروج عہد سلطنت انگلشیہ	دہلی - ۱۹۴۳ء
رحمان علی	مذکرہ علمائے ہند	کراچی - ۱۹۶۱ء
سالک ، عبدالحمید	مسلم نفاذ ہندوستان میں	لاہور - سن درج نہیں
سر سید	اسباب بغاوت ہند	کراچی - ۱۹۵۷ء
سر سید	مذکرہ اہل دہلی	کراچی - سن درج نہیں
سندھی ، عبداللہ	شاہ ولی اللہ اور انکی سیاسی تحریک	لاہور - ۱۹۴۴ء

لاہور - مارچ ۱۹۳۷ء	گزنہ لکھنؤ -	سناہکار (رسالہ)
لکھنؤ - سن درج نہیں -	برم تیموریہ	سرر ، عبدالعظیم
اعظم گڑھ - ۱۹۳۸ء	لکھنؤ کا دبستان ساعری	صباح الدین عبدالرحمن
لاہور - ۱۹۶۷ء	مسلمانوں کا روسن مستقبل	صدیقی ، ابواللب
دہلی - ۱۹۳۵ء	مومن اور مطالعہ مومن	طفیل احمد ، سد
لاہور و کراچی - ۱۹۶۱ء	مرحوم دہلی کالج	عابد بریلوی
کراچی - ۱۹۶۲ء	نارنج ہند بعہد برطانیہ	عبدالحمی ، مولوی
حدر آباد ، دکن	فناوٹے عزیز	عبدالسلام (مرحم)
دہلی - ۱۸۹۳ء	سرالمحشم	عبدالعزیز ، ساء
جاوڑہ - ۱۸۵۱ء	بہادر ساء طفر	عبدالغفور جاوڑہ
لکھنؤ ۱۹۳۵ء	ذو - سواغ اور اسفاد	علوی امیر ، احمد
لاہور - ۱۹۶۳ء	لال قلعے کی ایک جھلک	علوی ، تنویر احمد
دہلی - سن درج نہیں	علائے ہند کا سانداز ماضی	فراق ، ناصر ندیر
دہلی - ۱۹۵۷ء	ح - ۳ - ح - ۳	محمد ساء ، سید
دہلی - ۱۹۶۰ء	حاجب مجاہدین	مسہر ، غلام رسول
لاہور - سن درج نہیں	۱۸۵۷ء	مسہر ، غلام رسول
لاہور - سن ندارد -	سید احمد سہید	مسہر ، غلام رسول
لاہور - سن ندارد -	نارنج اودھ ج - ۴	نجم الغنی
لکھنؤ - ۱۹۱۹ء	نارنج مسائح جیب	نظامی ، خلق احمد
دہلی - ۱۹۵۳ء	رجب علی بگ سرور	نبر مسعود (رضوی)
الہ آباد - ۱۹۶۷ء	نارنج مسلمانان پاکستان و	ہاسمی فرید آبادی
کراچی - ۱۹۵۳ء	بھارت ج - ۲	ہاسمی ، نور الحسن
کراچی - ۱۹۶۶ء	دلی کا دبستان شاعری	

## دوسرا باب

(ادبی منظر)

۱۸۵۷ء - ۱۸۰۳ء

سہالی ہند میں لکھی ہوئی اردو نثر کی پہلی کتاب فضل علی فضلی کی دہ مجلس با کربل کتھا سمجھی جاتی ہے ، جو ملا حسن واعظ کا سعی کی فارسی کتاب روضۃ السعدا کا ترجمہ ہے ۔ کرم الدین و فلز کے تذکرہ سمرائے ہند میں دہ مجلس کا دساحہ (۱) نقل کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فضل علی نے یہ کتاب ۱۸۳۱ء/۱۱۴۵ھ میں لکھی تھی اور پھر اس پر ۱۸۷۷ء/۱۱۶۱ھ میں نظر ثانی کی تھی ۔ اسی دساحے میں فضل علی نے دعویٰ کیا ہے :

”ہنس ازین کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا مخیرع اور اب تک ترجمہ فارسی زبان ہندی نہیں ہوا مسموع“ (۲) ۔

دہ مجلس کے بعد نوں نو اور بہت سی تحریریں اردو میں لکھی ہوئی درخاف ہو گئی ہیں یا ان کے حوالے ملے ہیں لیکن ان کی نوعیت ادبی میں نیکہ مدہبی ہے (خود دہ مجلس مدہبی نوعیت رکھتی ہے) نا بھرفتی ہے ، مثلاً پری پر دساحہ سہلی کی بدائع الفنون ، محمد حسن کالم دہلوی کا ترجمہ فصوص الحکمہ ، نادر علی ساہ فادری کا رسالہ تصوف ، مولوی بدر عالم کا قصہ محفوظ خانی ، ساہ رفیع الدین ، ساہ عبدالعادر اور حکیم محمد سرف حان دہلوی کے تراجم قرآن مجید ، نادری نجم سلر کا ترجمہ اعجاز ، محمد جعفر کی روح الانعام و الاسلام ، مرزا سودا کا نثری دیباچہ جو مر محمد نفی گھاسی کے سلام اور مر سے بر منظوم نقصد کا دس لفظ ہے ۔

البہ ادبی حبیب کی حامل اگر کوئی کتاب اٹھارویں صدی عیسوی کی ہے تو وہ مر محمد حسن عطا خان محسن کی بوطریر مرصع ہے جو فارسی قصہ چہار دروس کا ترجمہ ہے ۔ یہ کتاب والٹی اودہ سجاع الدولہ کے عہد میں شروع کی گئی تھی اور آصف الدولہ کی تحب نسبی (۱۸۷۵ء) کے وف نا اس سے کچھ پہلے مکمل ہو چکی

(۱) حامد حسن فادری ، داستان تاریخ اردو ، ص ۵۰ آگرہ ۱۹۵۷ء

(۲) ایضاً - ص ۵۰

نہی<sup>(۱)</sup>۔ نو طرزِ مرصع کی زبان اور اسلوبِ بیان بہت زیادہ فارسی زدہ ، پر نکاح و پر نصنع اور جا بجا معنی و مسجع ہے۔ اس میں عربی و فارسی الفاظ و تراکیب ، تشبیہات ، استعارات و تلمیحات وغیرہ کی انہی کثرت ہے کہ اکثر فقرہوں میں صرف فعل اور حروفِ ربط وغیرہ چند الفاظ ہی اردو کے ہیں ، باقی سب فارسی و عربی کے اور پھر فعل ، فاعل ، مفعول ، صفت ، موصوف ، مضاف اور مضاف الیہ کی ترتیب بھی اس سے مختلف ہے جو عام طور پر اردو بول چال میں مسعمل ہے۔ اردو روزمرے اور محاورے کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا ہے اور نہ ہی بیان میں سلاست و روانی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہی اسباب ہیں کہ محسن کی نو طرزِ مرصع کو قبولِ عام نصیب نہیں ہو سکا ، اگرچہ نارغی حبشت سے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکا ، کہ ادبی نثر کی پہلی اردو کتاب جو شمالی ہند میں لکھی گئی ، وہ موجودہ تحفیات کے مطابق ہی ہے۔

نو طرزِ مرصع کی عبارت کا نمونہ یہ ہے :

”بعد ایک لمحے کے وہ ماہ سب چہار دہم رونق افزا حدیث فردوس کے ہو کر اور مسد زر بقع بھری کے حلوہ آرا ہوئی۔ واہ جی واہ۔ جس وقت وہ صر طلع داخل ناعحہ نمونہ جب کی ہوئی عطر گلاب رخسارہ رلیخانے سب مہتاب کا بھوب بھس دماغ نماسائبوں کا ہو کے زینت آرا نرم کلرانی کا ہوا۔ نوسف عکس ناص نگہ ہائے الماس انجم کا اور خاء مسا رنگ سبزہ زمین خلا آئن کے زنب افزا دیدہ نورانی کا ہوا“ (۲)۔

حال ہی میں نابینا مغل ناساہ ساہ عالم ثانی آفات کی ایک سری تصنیف عجائب القصص منظر عام پر آئی ہے<sup>(۳)</sup> اس نثری داستان کا حوالہ قدرت اللہ فاسم کے مجموعہ نفز میں بھی ملتا ہے۔ ڈاکٹر سد عبداللہ اس داستان کو ساہ عالم ثانی کی لکھوائی ہوئی ہزار دہیے ہیں اگرچہ یہ بھی کہتے ہیں کہ کہانی کے ربط و اسطام میں شاہ عالم نے اپنے متوسلین میں سے کسی سے مدد لی ہوگی۔ اس حصے کا سال نصف دہائیے میں ۱۷۹۲ء۔ ۱۲۰۷ء پایا گیا ہے۔ اس حصے کو شاہ عالم نے نو طرزِ مرصع کے بریکف انداز کے برعکس عام فہم زبان میں لکھوانا ہے اور خود دعویٰ کیا ہے کہ ”قصہ زبان ہندی میں بہ عبارت نثر لکھے اور کوئی لفظ اس میں نا مانوس اور خلاف روزمرہ اور بے محاورہ نہ

(۱) نور الحسن ہاشمی از مقدمہ نو طرزِ مرصع ، بحوالہ گلکرسٹ اور اس کا عہد مؤلفہ محمد عتیق صدیقی

ص ۵۸ مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۶۰ء

(۲) منقول از داستان تاریخ اردو ص ۵۷

(۳) شاہ عالم ”عجائب القصص“ مرتب راحت افزا بخاری ص ۱۴ مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۵ء



حکومت نہ ہے نہ حدودِ اردو نہ کا ظہور صحیح معنوں میں فورٹ ولیم کالج (کلکتہ) کے تمام کے بعد ہی پیدا ، چونکہ کالج کے مسطمن نے اردو میں سادہ سلسلہ میں نگاری کا متعدد معنیوں کے ساتھ لکھوائیں اور انہیں چھپوانے کا بھی بندوبست کیا ۔ مسطمن نے سادہ و سلسلہ اردو میں کتابیں لکھ کر اردو زبان و ادب کی محبت کا اس کی خدمت کے حوالے سے نہیں لکھوائی تھیں ، بلکہ اس لیے کہ اس کے اندر انسانی کے اربابِ اقدار بخار کے ساتھ ساتھ ملک داری کی دہری بھی اسے سر لے کے بعد ، اس بات کی سادہ سے ضرورت محسوس کر رہے تھے کہ انسانی کے ملازم کو علاوہ فارسی کے ہندوستان کی وہ زبان بھی سکھائی جائے ، جو سارے ملک میں عام طور پر سمجھی اور بولی جاتی تھی ۔ اصل میں بات یہ تھی کہ ، انگلستان سے انسانی کے ملازم کو کر جو محرم یعنی ترک (جنہیں رائے لیا جاتا تھا) ہندوستان آئے تھے ، وہ بالکل نو عمر ہونے لگے اور ان میں سے اکثر کی تعلیم بہت کم ہوئی تھی ۔ جب کہ نو عمر محرم پہلے پہل ہندوستان آئے تو ان کی حالت لا واریوں کی سی ہوئی تھی اور اس کے ملازم میں کوئی ان کی اخلاقی اور مذہبی حالت کا نگران و رہنما نہیں ہوتا تھا ۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اگر با اہل اور کابل ہو جائے تھے ۔ دوسری بات یہ تھی کہ انسانی کے ملازم کو مختلف مذہب ، مختلف زبان ، مختلف طور طریق ، مختلف عادات و اطوار والے ہزاروں افراد کے عدالتی معاملات فصل کرنے اور اصلاح کی مال گزاری کے انتظامات کرنے اور ان کے چھٹڑے طے کرنے پڑتے تھے ۔ عدالتوں میں وکالت اور تمام ضروری کارروائی دہی زبان کے ذریعے ہوئی تھی ۔ ان عدالتوں میں انگلستان کا قانون نہیں بلکہ ہندوستان ہی کا قدم قانون بالعموم رائج تھا ۔ اس لیے محسوسوں کے فرائض بہت سنجیدہ اور اہم ہو گئے تھے ۔ معمولی سببی فرائض کے علاوہ بچوں اور محسوسوں کو وقتاً فوقتاً گورنر جنرل اور اس کی کونسل کے سامنے مروجہ قوانین کے متعلق برسماب وغیرہ نس کرنی ہوتی تھیں ۔ اس غرض کے لیے ضروری تھا کہ انہیں اہل ملک کی خواہشات اور ضروریات کا پورا پورا علم ہو ۔ دوسری بات یہ تھی کہ انسانی کی تجارت کے فروغ کے لیے بھی ضروری تھا کہ

کمپنی کے ملازمین ملک کی عام زبان اور حالات سے اچھی طرح واقف ہوں۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ بھارت کے ساتھ ساتھ کمپنی اب حکومت بھی کر رہی تھی۔ انہی سب باتوں کے پس نظر پہلے نو کلکٹریں میں ایک اسکول اور سنٹل سمنٹری کے نام سے ۱۷۹۹ء کے شروع میں قائم کیا گیا اور پھر ڈیڑھ سال بعد اسی اسکول کی بنیادوں پر وہ عظیم الشان عمارت تعمیر ہوئی جو اردو کی ادبی تاریخ میں فورٹ ولیم کالج کے نام سے مشہور ہوئی۔

۱۰ جولائی ۱۸۰۰ء، مطابق ۴ ساون ۱۸۵۷ء سمیت، مطابق ۱۷ صفر ۱۲۱۵ھ کو گورنر جنرل مارکوئس آف ویلزلی نے فورٹ ولیم کالج کی ضابطہ داع مل ڈالی<sup>(۱)</sup>۔ اسی تاریخ کو گورنر جنرل کی کونسل نے کالج کے آئین و ضوابط کا مسودہ منظور کر کے کالج کے وجود کو قانونی شکل دی۔ السنہ ویلزلی نے یہ کہا کہ سرنگا نام میں ٹیوسلطان کی سکست اور برطانوی افواج کی فتح کی پہلی سالگرہ کی تاریخ یعنی ۴ مئی ۱۸۰۰ء کی تاریخ اس دسویں پر ڈلوئی<sup>(۲)</sup>۔ فورٹ ولیم کالج کا خاکہ ویلزلی کے دہن میں بہت وسیع اور سائدار تھا۔ جہاں وہ اسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز سول اور فوجی ملازمین کو نہ صرف فارسی اور اردو (جسے انگریز ہندوستانی کے نام سے یاد کرتے تھے) کی تعلیم دے چاہتا تھا بلکہ انہیں مسرت سے پورے طور پر واقف کرانے کے لیے اور کمپنی کے مفاد کی خاطر اور بہت کچھ سکھانے کا بندوبست کرنا چاہتا تھا۔ کالج کے نصاب میں حسب ذیل مضامین کو تعلیم میں داخل کرنے کی تجویز تھی۔

”عربی، فارسی، سنسکرت، ہندوستانی، نکتہ، ہلگی، مرہٹی، نامل، اسلامی فقہ، ہندو دھرم ساسر، علم الاخلاق، علم قانون، بین الاقوامی قوانین، قانون انکسار، گورنر جنرل کی کونسل اور فلیم سنٹ جارج اور نمٹی بریڈنڈنسی کی حکومتوں کے نافذ کردہ قوانین، معاسات، تجارتی اداروں خصوصاً اسٹ انڈیا کمپنی کے مفاد کی تعلیم، جغرافیہ، علم الحساب، یونانی لاطینی اور انگریزی کلاسیکی ادب، قدیم و جدید تاریخ، ہندوستان و دکن کی قدیم و جدید تاریخ، علوم طبیعی یعنی نہجول پستری، علم نباتات، علم کیمیا اور علم نجوم“<sup>(۳)</sup>۔

ان مضامین کو نصاب میں داخل کرنے کی تجویز پر اس حد تک عمل بھی ہو گیا کہ سات انگریز پروفیسروں کا تقرر ہوا جو عربی زبان اور اسلامی فقہ، فارسی زبان و ادب،

(۱) O. C. (Supplement July) 10, 1800 بحوالہ گلکرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۳۷

(۲) P. C. (Supplement July) 10, 1800 بحوالہ گلکرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۳۷

(۳) بحوالہ گلکرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۳۷

ہندوستانی زبان ، یونانی ، لاطینی اور کلاسیکی ادب اور ہندوستان کے برطانوی مقبوضات کے لیے نافذ کردہ قوانین کی تعلیم دینے کے لیے مامور ہوئے (۱)۔

چونکہ ہندوستان میں برطانوی مفاد کو تقویت و استحکام دینے کے لیے ویلزلی اس کالج کے قیام کو اس قدر ضروری سمجھتا تھا ، اس لیے اس نے اسے قائم ہو پہلے کر دنا اور مجلسِ نظامہ نو اس کی اطلاع بعد میں دی۔ اس کا خیال تھا کہ کالج کے کثیر اخراجات کے سبب نظر اگر اس کے قیام کی عوبیر مجلسِ نظامہ میں گئی ہو اس کے منظور ہونے کا امکان کم ہے ، لیکن اگر کالج پہلے قائم کر دیا جائے تو نظامہ اتے نوڑنے کا حکم دینے ہوئے ہچکچائیں گے اور ہوا بھی یہی ہے ، جب نظامہ نو اس کالج کے قیام اور اس کے مجوزہ نصاب اور اخراجات کی تفصیلات کا علم ہوا تو انہوں نے اسے فوراً نوڑ دینے اور اوریشل سیمینری کی متعدد کمرے کا حکم صادر کر دیا۔ یہ حکم نامہ جون ۱۸۰۲ء میں انگلستان سے کلکتے پہنچا۔ ناہم گورنر جنرل ویلزلی نے انہی نوٹس کو اس بات پر راضی کر لیا کہ یہ عرصے تک مجلسِ نظامہ کے حکم پر عمل درآمد ملوای رکھا جائے (۲) اس اثنا میں ویلزلی نے مجلسِ نظامہ کے اعتراضات کا مفصلی اور مدلل جواب لکھ بھیجا اور بر رور درخواست کی کہ کالج کو نوڑنے کا حکم واپس لے لیا جائے اور کالج کے قیام کی منظوری دی جائے۔ ویلزلی کی نوٹسوں کا سچہ نہ نکلا نہ آخر نظامہ نے کالج کے قیام کو قبول کر لیا ، البتہ اس کو مختلف علوم و فنون کی درس گاہ کے بجائے صرف مسرے زبانوں کی درس گاہ قرار دیا۔

فورٹ ولیم کالج میں ایک نو تعلیمی سہجہ تھا جہاں السنہ سرسہ کی تعلیم دی جاتی تھی اور اسی سے تعلیمی نصیبی و بالنتی سہجہ تھا جس میں زیادہ تر قدم کتابوں کے ترجمے کا کام اہم تھا۔ دوسرے کالج کا ایک مطبع تھا جو اردو نائٹ میں کتابیں چھاپتا تھا۔ دوسرے ایک لٹری خانہ تھا۔ کالج کے تعلیمی سہجے میں نوربن پروفیسروں کے علاوہ مولویوں ، مسنون اور ہندوؤں کی تعداد اسی (۸۰) تھی جو بعض اوقات طلباء کی تعداد سے بھی زیادہ ہوجاتی تھی۔ ہندوستانی یعنی اردو کے پروفیسر ڈاکٹر خان گلکرسٹ تھے جو کالج سے منسلک ہونے سے پہلے اورینٹل سیمینری میں کام کر چکے تھے اور انگریزی ہندوستانی لف ، ہندوستانی زبان کے قواعد (زبان انگریزی) اور مسرے زبان دان (زبان انگریزی) جیسی کتابوں کے مؤلف کی حشیت سے سہرہ حاصل کر چکے تھے۔ وہ چار سال تک فورٹ ولیم کالج سے وابستہ رہے۔ ابتدا میں ہندوستانی سہجے کے عملے کی تعداد تیرہ چودہ سے زیادہ نہ تھی لیکن آگے چل کر یہ گنتی جیس تک پہنچ گئی۔ یہ لوگ طالب علموں کی

(۱) کلکتہ گزٹ مورخہ ۲۹ ستمبر ۱۸۰۰ء بحوالہ گلکرسٹ اور اس کا عہد ص ۱۳۹

Martin : Wellesley's Despatches. (۲)

Vol. II, P. 366

رہائی کے علاوہ تصنیف و تالیف کی خدمت بھی انجام دیتے تھے کیونکہ ہندوستانی یعنی اردو کی تدریس کے سلسلے میں ڈاکٹر جان گلکرسٹ کو سب سے بڑی دقت یہ ہس آئی کہ اس زبان میں شعرو ساعری کا ہر کچھ ذخیرہ ملتا تھا لیکن نثر نہ ہونے کے برابر تھی ، در آن حالکہ زبان سکھانے کے لیے نثری نمونوں کی زیادہ ضرورت تھی ۔ چنانچہ منسوب کو درس و تدریس کے ساتھ تالیف و ترجمے کے کام پر بھی لگا دیا گیا ۔ اس طرح ڈاکٹر گلکرسٹ نے اردو نثر کی بھی داسی دور کر دی ۔ انہوں نے جو کام شروع کرا دیا تھا وہ ان کے انگلستان واس حلے حلے کے بعد بھی کالج میں جاری رہا اور اس طرح جدید اردو نثر کی بنیادیں فورٹ ولیم کالج کے مصنفین و مترجمین نے مضبوط کر دیں ۔ میر اس کی باغ و بہار اور گنج حوی ، حیدر بخش حیدری کی ہونا کہانی اور آرائیں محفل ، مرزا علی لطف کا تذکرہ گنسی ہند ، سر علی افسوس کی ناغ اردو اور آرائیں محفل ، بہادر علی حسنی کی دس بے نظیر اور اخلاق ہندی ، مظہر علی ولا کی ماد ہونل اور کام کندلا ، ہفت گلشن اور سال محسنی (جس میں للولال حی نے بھی ولا کی مدد کی) کاظم علی جوان کی شکنتلا ، سح حنط الدس کی خرد افروز ، حلیل علی حان اسک کی داسان امر حمزہ ، اکرام علی کی احوان الصفا ، مال حمد کی مذہب عشق ، بنی نرائن جہاں کا دیوان جہان ، للولال جی کی سنگھاسن سنسی وعبرہ ، نہ سب کسان فورٹ ولیم کالج ہی میں تالیف و ترجمہ ہوئیں ۔ اس کالج کی نہ خدمات ہم وہیں ہس ہس جاری رہیں اور اس عرصے میں تقریباً محاس کسائیں اردو میں لکھی گئیں ۔ ہسیر ذخیرہ قصے کہانیوں پر مشتمل تھا لیکن ساتھ ہی تذکرہ ، لغات ، صرف و نحو ، تاریخ ، اخلاق اور مذہب جسے مختلف موضوعات پر بھی توجہ دی گئی تھی ۔ نہ کسان بالعموم سلس و سادہ اردو میں لکھی گئی تھیں ۔ اس طرح اس امر میں مطلق سبہ نہیں لیا جا سکتا کہ فورٹ ولیم کالج نے اردو زبان میں مفیدی و مستجع عبارت کے بجائے سادہ اور روز مرہ کی زبان ، صفائی اور فصاحت کے ساتھ لکھنے کا ڈھنگ رائج کیا ۔ دوسری بڑی خدمت اس کالج کے اساد ڈاکٹر گلکرسٹ نے یہ کی کہ اس زمانے کے لحاظ سے لغت اور صرف و نحو پر جدید طرز پر کسان لکھیں ۔ نسعلقی ٹائپ کا مطبع قائم کیا اور اس مطبع سے کسان چھوٹیں ۔

فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کے علاوہ ولی اللہی مسلک کے علما اور مبلغین نے بھی عام فہم زبان اور سادہ طرز بیان کو اردو میں مستحکم کرنے کی خدمت انجام دی ۔ جس تحریک کو ہندوستان میں وہابی تحریک کا نام دیا گیا ہے اس کے بانی سد احمد سہید رائے بریلوی (۱۸۲۷ء تا ۱۸۳۱ء) سمجھے جاتے ہیں ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس تجدید و اصلاح کا بیڑا انہوں نے اٹھایا تھا اس کا آغاز شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اٹھارہویں صدی

عیسوی ہی میں کر دیا تھا۔ تاہم سد احمد سہید نے اس میں جیسی عملی سرگرمی دکھائی، اس کے ہنس نظر انہیں اس تحریک کا بانی قرار دینا بالکل غلط بھی نہیں ہے۔ سد احمد سہید کو وعظ و مبلغ میں بڑا ملکہ حاصل تھا اور ان کا ہر قول تکلف و تصنع سے خالی ہوتا تھا، مقرر میں سدھی سادی مساں ہوئی تھیں جنہیں سننے والے آسانی سے سمجھ لیتے تھے۔ ان کی طبیعت میں خلوص، اسرار اور حر خواہی خلق کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اسی لیے حوالفظ ان کی زبان سے نکلتا سننے والوں کو مبارک کر دیتا تھا۔ آپ کے دو مریدوں یعنی شاہ اسماعیل سہید اور مولانا عبدالحی نے آپ کے احوال و ارسادات کو فارسی میں منضبط کیا اور کتاب کا نام صراطِ مستقیم رکھا۔

شاہ اسماعیل سہید (۱۷۷۹ء تا ۱۸۳۱ء) بھی نئے سولہ سال مقرر اور نا ابر واعظ تھے۔ آپ نے اردو میں ایک معرکہ الٹا کتاب بھی لکھی جس کا نام نہوت الایمان ہے (قبل از ۱۸۲۵ء)۔ یہ کتاب نہ صرف مذہبی بلکہ ادبی نقطہ نظر سے بھی اہم ہے کیونکہ اس کا طور تحریر سدھا سادہ، صاف و سلس ہونے کے ساتھ ساتھ اور رور سال کا حامل ہے، مثلاً ایک امیاس ملاحظہ ہو:

”اول سنا چاہیے کہ سرک لوگوں میں بہت بھل رہا ہے اور اصل بوجد ناباب۔ لیکن اکبر لوگ بوجد اور سرک کے معنی نہیں سمجھتے اور ایمان کا دعویٰ رکھتے ہیں حالانکہ سرک میں گرفتار ہیں۔ سوال معنی سرک و بوجد کے سمجھنا چاہیے نا برائی اور بھلائی ان کی قرآن و حدیث سے معلوم ہو۔ سنا چاہیے کہ اکبر لوگ ہیروں کو اور سمیروں کو اور امانوں کو اور سہیدوں کو اور فرسوں کو اور ہیروں کو مشکل کے وہ بکارنے ہیں اور ان سے مرادیں مانگتے ہیں اور ان کی منہیں مانتے ہیں اور حاجت براری کے لیے ان کی نذر و ساز کرتے ہیں اور بلا کے ٹلنے کے لیے انہیں بٹوں کو ان کی طرف نسبت کرتے ہیں۔ کوئی انہیں بٹے کا نام عبدالنبی رکھا ہے، کوئی علی بخش، کوئی حسن بخش، کوئی میر بخش، کوئی مدار بخش، کوئی سالار بخش، کوئی غلام محی الدین، کوئی غلام معن الدین اور ان کے جننے کے لیے کوئی کسی کے نام کی چوٹی رکھتا ہے، کوئی کسی کے نام کی بدھی بہنا ہے، کوئی کسی کے نام کے کپڑے بہنا ہے، کوئی کسی کے نام کی بیڑی ڈالنا ہے، کوئی کسی کے نام کے جانور کرنا ہے، کوئی مشکل کے وقت

دھائی دبتا ہے ، کوئی اپنی بانوں میں کسی کے نام کی قسم کھانا ہے .... ” (۱) -

ساہ اسماعیل کی طرح سند احمد سہید کے دوسرے مریدوں نے بھی بہت سی کتابیں تبلیغ و اشاعت کی غرض سے اردو میں لکھیں ، مثلاً مرغیب جہاد ، ہدایہ المؤمنین ، نصیحت المؤمنین و عمرہ اور نہ کہیں بھی صاف و سلیس ، عام فہم طرز سان کو رواج دینے میں مدد و معاون ثابت ہوئیں ۔

اگرچہ اٹھارویں صدی کے برصغیر میں عام بول چال کی زبان کی حسب سے اردو ملک بھر میں سمجھی اور بولی جاتی تھی ، تاہم فارسی زبان سرکاری و عدالتی زبان کی حیثیت رکھتی تھی اور علمی و ادبی حلقوں میں بھی ذریعہ اظہار کے طور پر فارسی بہت مقبول تھی ، خصوصاً نثر میں ۔ البتہ نظم کی حد تک ولی کے اثر سے اردو کی مقبولیت زیادہ ہو گئی تھی ۔ اور اٹھارویں صدی میں کوئی نصف درجن ناگہال شعرا بھی دہائے نفاقت میں آسا سکے رائج کر چکے تھے ۔ حب اسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کے وسیع علاقوں پر عملی دخل حاصل کر لیا تو اس نے بھی شروع شروع میں فارسی ہی کو سرکاری زبان کی حسب سے برقرار رکھا لیکن اسے امداد اور اثر و نفوذ کو مستحکم کرنے کے لیے یہ ضروری سمجھا کہ برائے دور کی ناد نازہ رکھنے والی جزوں کو آہستہ آہستہ خم کر دنا جائے ۔ دوسرے کمپنی کے ارباب امداد نے نہ بھی محسوس کیا کہ فارسی سے عوام الناس کا تعلق خم ہو گا ہے اور اب وہ صرف حواص کی علمی زبان رہ گئی ہے ۔ اس لیے عوام سے رابطہ قائم کرنے اور ان کے ذہنوں کو ماسر کرنے کے لیے وہی زبان موروث ہے جو عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے ۔ حاتمہ انیسویں صدی کے دوسرے ربع میں اسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے زیر تسلط علاقوں میں اردو کو سرکاری و عدالتی زبان بنانے کا اقدام شروع کر دنا ۔ دہلی کالج کے پرنسپل مسٹر سروس نے فرانسیسی پروفیسر گارسان دباسی کے نام جو خط دہلی سے ۱۹ دسمبر ۱۸۴۱ء کو لکھا تھا اس میں وہ بیان کرتے ہیں ”ہندوستانی زبان نے دو دن سال سے ایسی اہمیت حاصل کی ہے جو اس سے پہلے نہ تھی ، نہ ہمارے مغربی صوبوں میں یعنی راج محل سے لے کر پردوار تک کی سرکاری زبان بن گئی ہے ۔ پردوار ہالہ کے دامن میں ایک قصبہ ہے ۔ مزید برآں نہ زبان سارے ہندوستان میں سمجھی جاتی ہے اور کم سے کم جار کروڑ اشخاص اسے روزمرہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں ۔ اب انگریزی حکومت نے اسے عدالتوں اور سرکاری اخباروں میں جاری کر دنا ہے “ (۲) ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۸۳۸ء تک اردو سرکاری و عدالتی زبان بن چکی تھی ۔ سرکاری و عدالتی تحریروں میں

(۱) محمد یحییٰ تنہا مؤلفہ سر المصنفین جلد اول ص ۵۰ مطبوعہ لاہور ۱۹۴۸ء

(۲) مولوی عبدالحق ، مرحوم دہلی کالج ، ص ۷ تا ۸ مطبوعہ کراچی ۱۹۶۲ء

مقفی، مستمع و مرتبع امدار کی کوئی گنجائش نہ تھی اس لیے سادہ و سلبس زبان کا استعمال عام ہونا گیا۔

فورٹ ولیم کالج، شاہ عبدالعزیز کے خاندان کی تبلیغی مساعی اور سرکاری زبان بنانے کے اقدامات کے علاوہ اور چہرے بھی جو اردو کی اساعب و برو کا باعث ہوئیں۔ اس سلسلے میں دہلی کالج کے کام کو بھلانا نہیں جا سکتا۔ مولوی عبدالحق کی محض کے مطابق دہلی کالج کی ابتدا مدرسہ غازی الدین کی شکل میں ۱۷۹۲ء میں ہوئی اور ۱۸۲۵ء میں اسے کالج بنا دیا گیا<sup>(۱)</sup>۔ جب تک کہ کالج نہیں بنا تھا بلکہ مدرسہ ہی تھا اس زمانے میں فاس غالب نہ ہے کہ یہاں بھی مثل دوسرے مدارس کے عربی فارسی کی مروجہ تعلیم ہوئی ہوگی اور وہی رنگ ہو گا جو اس وقت دوسرے مدرسوں کا تھا۔ اسے کالج بنا دینے کے بعد پوری علوم کی تعلیم اس کا خاص مقصد قرار دانا اور اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانا گیا۔ شروع شروع میں فارسی عربی کی تعلیم ہوئی تھی اور اسی کے ساتھ سنسکرت کا شعبہ بھی تھا۔ حساب اور سادہات اقلیدس بھی پڑھائے جاتے تھے۔ انگریزی جامعہ کا اضافہ ۱۸۳۸ء میں ہوا۔ اگرچہ کچھ عرصے تک اردو اور انگریزی ذریعہ تعلیم کے شعبے بصاب نے لحاظ سے الگ الگ رہے لیکن آگے چل کر دونوں شعبوں کی تعلیم بالکل ایک حسی کر دینے کی کوشش کی گئی، جس کا مقصد نہ تھا کہ دونوں شعبوں میں تاریخی، اخلاق اور سائنسی مضامین کی تعلیم یکساں ہو جائے۔ البتہ اس میں نہ مشرقی شعبے میں فارسی و عربی زبان و ادب کی تعلیم ساتھ ساتھ ہو اور انگریزی شعبے میں انگریزی زبان و ادب کی۔ اس طرح اردو کے ذریعے نہ صرف حساب، علم ہندسہ، جبر و مثلث، جغرافیہ، تاریخ، معاشیات، قانون، اخلاقیات اور سرع کی تعلیم شروع ہوئی بلکہ علم مثل، علم احصاء، علم طب، علم فلکی، علم نبات، طبعیات، حرکیات، سکونیات، علم المناظر، مکانکس، مساحہ و عمرہ کی بھی تعلیم دی جانے لگی۔ معری علوم کو دینی زبان کے ذریعے پڑھانے میں بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ کتابیں نہیں تھیں۔ اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے انک انجمن کا تمام عمل میں آنا جسے ”انجمن اساعب علوم بذریعہ البتہ ملکی“ کا نام دیا گیا۔ اس کے سکریٹری دہلی کالج کے ٹرنسپل مسٹر سروس ہیں۔ انہوں نے اس سے پہلے بھی نہ کام چھوٹے سماتے کر دہلی کالج میں شروع کر رکھا تھا اور جب نہ انجمن ہی ہو اس کا کام بھی کالج والے ہی کرتے تھے۔ جیسا کہ ان کے ہاں پہلے سے ہوا آنا تھا سب کتابیں اور ترجمے اردو ہی میں مرتب ہونے لگے اور شروع ہی سے نہ انجمن اور اس کا سارا کام دہلی کالج کے ہاتھ میں آ گیا۔ بعد میں نہ انجمن دہلی کالج ورنکر ٹرانسلیشن سوسائٹی کہلائے لگی۔ ورنکر سوسائٹی، ٹرانسلیشن

سوسائٹی ، لائبریری آف ہوزفل نالج سب اسی انجمن کے مختلف نام تھے ۔ اردو کو علمی زبان بنانے کی نہ پہلی کوشش بھی جو خاص اصول ، قاعدے اور نظم کے ساتھ عمل میں آئی ۔ اس سوسائٹی کے تراجم و تالیفات کی تعداد سوا سو سے اوپر ہے اور ان میں ادبیات ، علوم اجماعی اور علوم سائنسی کے مختلف شعبہ جات پر کتابیں شامل ہیں ۔

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی میں دہلی کالج کو بڑا نقصان پہنچا ۔ اس کا سارا کتب خانہ لٹ گیا اور شعبہ سائنس میں جتنے آلات تھے سب ٹوٹ بھوٹ گئے ۔ سات سال تک کالج کا احاطہ عمل میں نہ آیا ، پھر مئی ۱۸۶۳ء میں اسے از سر نو جاری کیا گیا اور ۱۸۷۷ء تک چلنا رہا ۔ لیکن اس نئے دور میں برائے دہلی کالج کی جو خصوصیتیں نہیں وہ باقی نہ رہیں ۔ اردو زبان اور اردو نالیف و ترجمے کا حرجا خم ہو گیا اور زیادہ زور انگریزی پر دیا جانے لگا ۔ ۱۸۷۷ء میں دہلی کالج کو برخاست کر کے اس کا سارا عملہ لاہور کالج بھیج دیا گیا ۔

دہلی کالج نے اردو زبان کو علمی بنانے اور علمی حسب سے اس کی تہی دامن دور کرنے میں جو گران قدر خدمت انجام دی ہے اسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ۔ ہندوستان میں وہی پہلی درس گاہ بھی جہاں جدید مغربی علوم کی تعلیم اردو کے ذریعے دی جاتی تھی اور جہاں مغرب و مشرق کا سنگم قائم ہوا ، یعنی ایک ہی عمارت میں مشرق اور مغرب کا علم و ادب ساتھ ساتھ بڑھانا چاہا تھا ۔ اس ملاپ نے بقول مولوی عبدالحق ”خالات کے بدلنے ، معلومات کے اضافہ کرنے اور دو کی اصلاح میں جادو کا سا کام کیا اور ایک نئی سہذیب اور نئے دور کی بنیاد رکھی اور ایک نئی جامع ایسی پیدا کی جس میں اسے بخشہ ، روشن خیال اور بالغ نظر انسان اور مصنف نکلے جن کا احسان پاری زبان اور پاری سوسائٹی پر ہمیشہ رہے گا ۔ اگر دلی کالج نہ ہوتا تو کیا ماسٹر رام چندر ، مولانا آزاد ، مولانا نذیر احمد ، مولوی ذکاء اللہ ، ماسٹر ہارے لال جسے لوگ ہدا ہو سکتے تھے (۱) ؟“

انیسویں صدی کے نصف اول میں صحافت نے بھی اردو کی کچھ کم خدمت انجام نہیں دی ۔ اب تک کی محقق سے نہ ظاہر ہوتا ہے کہ اردو کا پہلا مطبوعہ اخبار ”جام جہاں نما“ تھا جو ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء کو کلکتے سے جاری ہوا (۲) لیکن جون ۱۸۲۲ء تک اس کی زبان فارسی ہو چکی تھی ۔ اس کے ایک سال بعد ”جام جہاں نما“ کے فارسی ایڈیشن کے ساتھ ایک اردو ضمیمہ بھی شائع ہونے لگا جسے اخبار کے خریدار چاہنے کو علیحدہ بھی خرید سکتے تھے ۔ اردو ”جام جہاں نما“ کے ابتدائی دور میں زیادہ تر جگہ خبروں کو دی جاتی تھی اور کبھی کبھار ایک آدھ غزل بھی چھاپ دی جاتی تھی ۔ لیکن چونکہ یوری قارئین اس اخبار

(۱) عبدالحق مولوی ، مرحوم دہلی کالج ، ص ۱۸۰

(۲) عبدالسلام خورشید ، ”صحافت پاکستان و ہند میں“ ، ص ۳۶ ، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۳ء



کو زبانِ اردو میں سہارت حاصل کرنے کی خاطر پڑھا کرتے تھے اس لیے یکم مارچ ۱۸۲۶ء سے اردو اڈیشن میں خبروں کی اساعت مرتب مرتب ہو گئی اور حار مہینے تک بالاساط تاریخِ انگلستان سائے کی گئی۔ پھر تقریباً ایک سال تک نپولین کی لڑائیوں کا حال چھپا رہا۔ پھر کوئی چھ ماہ تک تاریخِ عالمگیری کا ترجمہ درج کیا گیا۔ اس کے بعد ۲۳ جنوری ۱۸۲۸ء کو اردو حصہ بند کر دیا گیا۔ اردو ”جامِ جہاں نما“ کی زبان سہل اور اندازِ سان شستہ تھا، مثلاً ۲۸ دسمبر ۱۸۲۵ء کے شمارے میں پہلے دخانی جہاز کے کلکسے پہنچنے کی خبر سے اقتباس ملاحظہ ہو:-

”بہت دنوں سے نہ خبر منسہور بھی کہ انگلستان میں ایک جہاز سار ہونا ہے کہ جس طرح ایک ناؤ بچھلے برس کلکسے میں آئی کہ صرف دھوئیں کے زور سے جڑھاؤ اناہر پر بے تکلف دریا میں حلی جانی ہے۔ وہ جہاز اس طرح بے کھٹکے بحرِ محط میں آمد و سد کرتے گا اور اس جہاز کے بنانے والے نے انگلنڈ سے کلکتے پہنچنے کی بھہر دد کی مدت ٹھہرائی ہے۔ کس واسطے کہ وہ حہار نال سے علاوہ نہیں رکھتا جو ہوا کا محتاج ہو۔ اس کو آندھی، طوفان، موسم، غیر موسم سب برادر ہے، بارے بچھلے ہفے وہ حہار ولایت سے آیا۔“

”جامِ جہاں نما“ کے بعد اردو کے جس اخبار کا نہ حلا ہے وہ ”شمس الاخبار“ ہے جس کے اجرا کی درخواست ۶ مئی ۱۸۲۳ء کو دی گئی تھی اور جو کلکسے ہی سے فارسی اور ہندوستانی زبان یعنی اردو میں سائے ہونا تھا۔ اس اخبار کے بارے میں ابھی پوری تفصیلات منظرِ عام پر نہیں آئی ہیں، صرف اس قدر محبت ہو سکا ہے کہ اس میں نالعموم ملکی خبریں ہوتی تھیں۔

یسرا اخبار ”دہلی اردو اخبار“ تھا جو ۱۸۳۶ء میں مولوی محمد یامر نے دہلی سے جاری کیا، اس میں صرف سیاسی ہی نہیں بلکہ تعلیمی، تمدنی اور مجلسی زندگی سے تعلق رکھنے والی خبریں بھی سائے ہوتی تھیں اور ادبی مضامین اور ہمعصر شعرا کی غزلیات بھی چھپتی تھیں۔ مثلاً ذوق، غالب، مومن اور ظفر وغیرہ کی غزلیں۔ اس اخبار کی زبان بھی سادہ اور اندازِ بیان شستہ تھا، مثلاً ۲ مئی ۱۸۴۱ء کے شمارے میں ایک خبر یہ ہے:-

”افواہ عام ہے کہ قلعہ مبارک میں عجب طرح ہو رہی ہے۔ سہر میں کوئی جگہ اسی نہیں جہاں الغباث و فریادِ اہل کارانِ ساہی کا ذکر نہیں۔ ننخواہوں کا یہ حال ہے کہ کسی کے ہانچ مہنے چڑھے ہوئے ہیں۔ جو لوگ حضور رس ہیں یا مختار سے یا حکیم معالج

حضور والا سے سازش رکھتے ہیں البتہ وہ ماہ بہ ماہ منخواہ لے جاتے ہیں“ (۱)۔

دہلی اردو اخبار اور اس کے سارے ہمعصر لبتھو بوجھتے بھی کیونکہ ٹائپ کے مقابلے میں لٹھو چھائی کم خرچ بھی۔ ۱۸۳۷ء میں سر سید احمد خان کے بھائی سید محمد خان نے ”سبداخبار“ دہلی سے جاری کیا۔ اس میں اسے مضامین خاص اہم سے شائع ہوئے بھی جن میں قانونی مسائل پر بحث ہوئی بھی۔ اس کے بعد نو گویا اردو اخباروں کا باقاعدہ دور شروع ہوگا۔ ہندوستان کے مختلف سہروں سے اخبارات نکلتے لگے اور بفل گار سان دناسی ”۱۸۵۲ء کے آغاز میں ممالک مغربی و سہالی کے ہندو سہروں میں ۳۴ سنگی مطابع بھی جہاں سے ۳۱ ہندوستانی رسالے اور اخبار طبع ہوئے بھی۔ یکم جنوری ۱۸۵۴ء تک چھائے خانے ۴۰ اور اخبارات ۳۳ ہو گئے“ (۲)۔

جس طرح سہالی ہند میں اردو علمی ادبی ہی نہیں، بلکہ سرکاری و عدالتی اور صحافتی زبان کی حیثیت سے برقی کر رہی بھی، اسی طرح دکن میں اس کا فروغ و ارتقا جاری رہا۔ دکنی زبان میں نظم و نثر کی تاریخ تو بہ قدم ہے لیکن اب انیسویں صدی کے نصف اول میں یہ رجحان بڑھا نظر آتا ہے کہ دکنی کے بجائے سہالی ہندی ٹکسالی زبان کو علمی و ادبی تصنیفات کے لیے استعمال کیا جائے۔ ویسے تو شعر و ساعری میں دکنی زبان کا استعمال اٹھارویں صدی ہی میں ترک ہونے لگا تھا، لیکن نثر میں دکنی برابر استعمال ہو رہی تھی۔ انیسویں صدی میں اس کا استعمال نثر میں بھی کم سے کم نہ ہونا گوارا نہ تھا۔ بالکل موقوف نہر بھی نہ ہوا، حاتمہ سال محمد ابراہیم سجا دوری نے ”انوار سہلی“ کا ترجمہ دکنی زبان ہی میں کیا جو ۱۸۲۴ء میں طبع ہوا (۳)۔ اسی طرح سید حسن علی خان حیدر آبادی نے فارسی کے مشہور قصوں ”کام روپ“، ”چہار درویش“ اور ”بہار دانش“ کے ترجمے ”مرغوب الطبع“، ”چار دروس“ اور ”ہمسہ بہار“ کے نام سے کیے جن میں دکنی زبان کا بجا استعمال ہوئی ہے، مثلاً یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

”کئی صاحبوں نے کہے کہ اگر اوسکا ترجمہ زبانِ ہندی سے ہو تو سب با علم و بے علم کی سمجھ میں جو یہ کہانیاں اور نفلان جو رنگین ہیں، آئیں گی اور کئی مشیوں نے بہت سی کتابیں فارسی کی بموجب انگریزوں کے ترجمہ ہندی سے جو فربہ الفہم ہونا ہے، کئے ہیں“ (۴)۔

ایسے ہی اور بہت سے ترجمے اس دور میں دکنی زبان میں ہوئے۔

(۱) عبدالسلام خورشید، صحافت پاکستان و ہند میں، ص ۱۰۶

(۲) بدر شکیب بھوالہ اردو صحافت، ص ۱۴۱ تا ۱۴۲، مطبوعہ کراچی ۱۹۵۲ء

(۳) نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو، ص ۵۹، مطبوعہ لاہور، ۱۹۵۲ء

(۴) ایضاً، ص ۶۲

لیکن قصے کہانیوں سے ہٹ کر جو مصنفات و نالفاظ با دراجم دکن میں ہوئے وہ بالعموم دکنی میں نہیں بلکہ ٹکسالی اردو میں ہوئے۔ اس سلسلے میں سب سے ممتاز خدمت سمس الامرا نانی محمد فخرالدین خان نے انجام دی کہ مغربی زبانوں سے سائنس کی تقریباً پچھتر کتابیں اردو میں ترجمہ کرائیں۔ انہوں نے یہ کام ۱۸۲۶ء (۱۲۴۲ھ) میں شروع کرا دیا تھا یعنی اس زمانے میں جبکہ دہلی میں ابھی ابھی دہلی کالج قائم ہوا تھا۔ ”سسہ سمسبہ“ کے نام سے علم طبعات پر چھ رسالے ۱۸۳۷ء میں سمس الامرا نانی کے اہتمام سے ترجمہ ہو کر طبع ہوئے، جس کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں۔

”نازمند درگاہ ایزدی کا محمد فخر الدین المخاطب سمس الامرا اس طور پر گزارس رکھا ہے کہ اکثر اوقات کتابیں چھوٹی بڑی علومِ فلاسفہ کی جو زبانِ فرنگ میں مرقوم ہیں، سب ملانِ طبعیت کے نسب اس طرف سوی رکھا تھا مری سہاعت میں آئیں۔ اس صہب سے چند مسائل ان کے ار برہے اور اگرچہ بعضے علومِ فلسفہ ربانِ عرب و عجم میں بھی مسہور ہیں، جسے علمِ حشرِ نمل اور علمِ الانظار وغیرہ، مگر اس قدر سسے ہیں کہ حسا اب اہلِ فرنگ نے ان کو دلائل اور براہین سے بدرجہ کمال اثبات کیا ہے۔ بلکہ بعض علومِ اہلِ فرنگ میں اسے رواج پائے ہیں کہ ان کے نام بھی یہاں کے لوگوں نے نہیں سنے۔ مثلاً علمِ آب و ہوا، مضاطس اور کمسٹری وغیرہ۔ اس واسطے مدت سے ارادہ تھا کہ مسدیوں کے فائدے کے لیے ادسی کوئی کتاب مختصر جامع چند علوم کی ربانِ فرنگ سے ادسی ترجمہ کی جاوے کہ فرصتِ قبل میں اسکی معلومات سے طالبوں کو کچھ کچھ فائدہ مسر ہووے۔“

نواب سمس الامرا نانی نے جن کتابوں کا ترجمہ کروانا ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ اصولِ علمِ حساب، رسالہ کسورِ اعساریہ، رسالہ علم و اعمالِ کرہ، رسالہ منتخب البصر، کمسٹری کا رسالہ، رسالہ خلاصہ ادوہ، نافع الامراض، ترکیبِ ادوہ، رسالہ حیواناتِ مطلق اور سمس الہیث وغیرہ۔ رسالہ ”اعمالِ کرہ“ کے اس اقتباس سے ترجمے کی زبان اور اسکی سلاست کا اندازہ ہو سکتا ہے :

”انسوان زلزلہ ۱۸۳۶ء میں شہرکلا، حوبرو کے ملک سے متعلق ہے اور اس شہر میں پانچ ہزار سپاہی سکونت کرتے تھے، اس طرح سے ہوا تھا، کہ ناگہ وہاں کی زمین صدمہ کھانے لگی۔ جو لوگ سوتے تھے ان کو زمین کا صدمہ معلوم ہوا، اٹھنے نہیں پائے کہ دریا اس

طغیانی سے بلند ہوا کہ اس کی موجیں اس سہرے گزرے اور تمام آبادی ڈوب گئی۔“

شمس الامرا (۱) نواب رسبد الدین خاں نے ایک ضخیم تاریخی کتاب غلام امام ماں برین المصلح بہ ہجر سے لکھوائی جس میں راجگان ہند کے حالات ، سلاطین دہلی کے حالات ، مسلم سلاطین دکن کے حالات ، مسابہ دکن کے حالات ، انگریزوں کی دکن میں آمد اور حیدر علی اور ٹیپو سلطان سے جنگ کے مفصل واقعات درج ہیں۔ یہ کتاب ”تاریخ سید الدین خانی“ کے نام سے ۱۸۵۳ء (۱۲۷۰ھ) میں طبع ہوئی۔ اس کی عبارت نہایت صاف ، مربوط اور سلجھی ہوئی ہے ، مثلاً آصف جاہ اول کے ذکر میں لکھا ہے :

”نواب چونکہ بنفس بنفس جمع مہتمم مالی اور ملکی کا انصرام فرماتے تھے مگر بعضے ندما نے فی الجملہ آن کے آرام کا خیال کر کے ایک معتمد علیہ مقرر کرانے کے لئے عرض کیا۔ نواب نے خدمت دیوانی کے لئے امرائے کبار میں سے ایک معتمد علیہ مدین کو مجوز کر کے جن کا نام رافہ کو تحقق نہیں ہوا اس عہدے کا مردہ ان کو مہمانا۔ محمد ابو الخیر خاں بہادر جو ایک دور اندیش شخص اور خیر خواہ سرکار تھے انہوں نے اس کو نا مناسب حانا اور سب کے وقت جس کی صبح کو کار خدمت ان کے سرد ہونے والا تھا ، ابو الخیر خاں در دولت تر حاضر ہوئے اور نواب کو اطلاع کرائی۔ نواب باہر سرف لائے اور فرمایا کہ نا وقت آنے کا کیا سبب ہے۔ عرض کیا جناب والا کل دیوان کیا جاہے ہیں ، میں اس باب کا خیال کرنا ہوں کہ ساہجہان آباد میں جب ناساہ سلامت کو اس تقرری کا علم ہو گا تو وہ یہیں کریں گے کہ آصف جاہ کبیر سنی کی وجہ سے آرام طلب ہو گئے ہیں اور نہ باب نا مناسب ہوگی ، تو نواب نے فرمایا میں تو حکم دے چکا ہوں۔ ابو الخیر خاں نے عرض کیا کچھ مضائقہ نہیں ہے ، دربار کے وقت بجائے عرض بگی کے بندے کو اعلام کا حکم ہو ، فدوی اس وقت کچھ حکمت عملی کر گزرے گا“ (۱)

انیسویں صدی کے نصف اول کا نثری ادب داستانوں سے رہا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ارباب فورٹ ولیم کالج نے انگریزوں کو ہندوستانی زبان سکھانے کے لیے ادب ، روان اور با محاورہ زبان میں کلاسیکی زبانوں سے اردو میں ترجمے کروائے تھے اور

اس غرض کے لیے قصے کہانیوں سے بنادہ موزوں صف اور کتا ہو سکتی تھی۔ دوسری وجہ یہ بھی کہ داساں آما و عوام دونوں میں معمول ہو گئی تھیں کیونکہ انگریزوں کے بڑھے ہوئے تسلط کی وجہ سے اہل ہند کے قومی کردار میں بن آسانی اور سہل پسندی پیدا ہو گئی تھی۔ (سید احمد سہید اور ان کے رفقا کی تحریک کا دائرہ اثر بہت محدود تھا)۔ چنانچہ داساں کا موضوع اس معاصرے کے دماغوں پر حسبِ انتہا تھا، کیونکہ داساںوں میں انہوں کی برنگ ہوسندہ تھی۔ سیاسی لطائف مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئی تھی لیکن حکومت کا شہ اور عظمیٰ گرسہ کے حواب دہنوں سے نہ دیکھے تھے۔ نہ حواب انہی دے داساںوں میں دیکھے تھے کہ ان میں اسی ناداساںوں اور اسی سان و سوک کا سان ہونا تھا جو تاریخ کے عظمیٰ سان سلاطین کو بھی میسر نہ تھیں۔ ذہن اسے ماحوا کی ناخوشگواروں سے بناہ لےنے کے لیے داساںوں کی دنیا میں مہج حائے تھے، جہاں ہر بلا اور ہر مصیبت پر پرو اور اس کے ساتھ ہی فح نا لےے تھے اور نہ فح داساں کے ساتھ ہی کی فح بن حای تھی۔ بعد ہاتھ ناؤں بلائے صرف محمل کے زور سے دماغ سے ہفحواں طے کر کے رتھ دسا تھا۔ سے نا بڑھے والوں کے دل جن جن حروں کے خواہس مند ہوئے تھے وہ سب اسی داساںوں میں مل حای تھیں، سلا عس کے معاملات، وصل کے لداوند، عر معمولی حسن، عر معمولی سجاوٹ وغیرہ۔ سنج حلی کے مصوبوں کی طرح حال ہی حال میں ہر طرح کا عس و آرام اور دولت و حسبِ مسر آ جاتی تھی۔ ”آما داساں گوبوں کو ملازم رکھنے تھے جو راب کو داساں سنائے تھے۔ داساں سے سرپرست کے دماغ کو آسائیں بہنجانا مقصود تھا۔ کامل فن داساں گو جدھر نواب صاحب کی رغبت دیکھا اسی سمب داساں کا رخ بھر دسا۔ نواب صاحب کو معلوم ہونا گونا ان کے کسی سردار نا نائب لے مہم سر کر لی۔ اسی نئے میں حضور حواب کی دنیا میں شریف لے جانے اور وہاں بھی ساند ربوں اور ساحروں کے حواب دیکھے۔“ (۱) غرض انیسویں صدی کی سیاسی اور معاصرہی حالت بڑی حد تک داستاںوں کے عروج کی دسے دار ہے۔ اس زمانے کی فضا نے لکھنؤ، دلی اور رامپور میں داساں گوئی کو پروان چڑھانا، خصوصاً لکھنؤ میں ۱۸۵۷ء کی نا کام جنگِ آزادی کے بعد داساںوں کو اور بھی مقبولیت حاصل ہوئی، کیونکہ یہ ناخوشگوار حقیقتِ حال سے دہنی فرار کا آسان ترین راستہ تھا۔ ادب پر داساںوں کی گرفت اس وقت تک رہی جب تک کہ ناولوں کا دور شروع نہیں ہو گیا۔

تمام داستاںوں میں کردار نگاری کا راز مثالیت ہے۔ تقریباً سہی پرو بادشاہزادے ہوتے ہیں اور ان کی ذاب میں جو خوبیاں ہوتی ہیں وہ اتنا درجے تک پہنچی ہوئی ہوتی ہیں۔

وہ بے حد خوبرو ہونے ہیں۔ نہایت بہادر، صاحبِ امان، فیاض، ہمدرد، نیک، انسان دوست، مہم جو، صاحبِ فہم اور ہیرو کے مخالفین سب ذلیل، مغرور، مکر و فریب اور خود غرضی کے نمونے ہوتے ہیں۔ گویا ہیرو نیکی کے نمائندے ہیں اور مخالفین بدی کے اور ان دونوں کی کشمکش سے داسان کا نار و بود بنتا ہے۔ فتح آخر میں ہمیشہ نیکی کی ہوتی ہے۔ داستانوں کا نہ انداز نہ صرف داسان گویوں یا داسان نویسوں بلکہ ان کے سامعین و قارئین کی آرزو مندانہ سوچ کی آئینہ داری کرنا ہے اور ان کی نخبل اور تمنائوں کا یہ بہترین مثالی نقشہ پس کرنا ہے۔

جو منصب داسانوں کے ہیرو نثر میں انجام دے رہے تھے اسی سے ملنا جلتا منصب نظم میں مرثیوں کے ہیرو انجام دے رہے تھے۔ خلق و ضمیر اور انس و دیور نے مرثیے سے مرثیت کو کم کر کے اسے ایک مجلسی اور تہذیبی، فنی و ادبی جز بنا دیا۔ چنانچہ آس نے دہر کے ایک مرثیے کو سن کر اسے لندھور بن سعدان کی داستان قرار دیا تھا۔ مرثیے میں ساعروں نے خالوں اور خوابوں کی مدد سے حال کی زندگی کو بھلانے اور ماضی کی عظمت میں سربک ہو کر حال کی سسی کے احساس کو کم کرنے کی کوسس کی اور حضرت امام حسین کے صبر و استقلال، سجاعت و حمیت، عزم و انار، ہمدردی و وفاداری اور دیگر اخلاقی فاصلہ کی ما خوانی کر کے نہ صرف انہی نجات اور ذہنی سکین کا سامان کیا بلکہ عامۃ المسلمین کی وہ ذہنی و جذباتی پاس بھی بچھائی جو انہیں ایک مٹی ہیرو کی جسجوج میں بے قرار رکھتی تھی۔ اودھ کی سوسائٹی اپنے ہیرو، اسے نارغی کارنامے، اپنے حمی افسانے نہ رکھتی تھی۔ یہ چیز اسے داستانوں اور مرثیوں میں مل گئی۔

یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ دہلی کے اجڑنے پر اٹھارہویں صدی کے بسرے ٹلت میں اردو شعر و ساعری کی بساط پہلے قبض آباد میں اور پھر جب لکھنؤ اودھ کا دارالخلافہ بنا تو لکھنؤ میں بچھی۔ ان شعرا کی فہرست بہت لمبی ہے جو حالاتِ زمانہ کی نا مساعدت کے سبب دہلی چھوڑ کر اودھ پہنچے۔ ان میں ممتاز نام آرزو، سودا، میر حسن، منب، حسرت، سوز، میر، جراب، انشا، مصحفی، رنگین اور نسیم کے ہیں۔ اس زمانے میں اگرچہ میر کی ساعرانہ عظمت عام طور پر تسلیم بھی لیکن ملاک الشعراء سودا کو قرار دیا گیا تھا۔ اس وقت کی ادبی فضا میں فارسی شعرائے متاخرین کا سکہ رائج تھا۔ جو اپنی مضمون آفرینی، خیال بندی، تمثیل نگاری اور صنعت کاری کی خصوصیات کے باعث پسند کیے جاتے تھے اور یہی خصوصیات دیگر شعرا کے مقابلے میں سودا کے اردو کلام میں زیادہ نمایاں نہیں۔ جو دبستان آگے چل کر لکھنؤ کا دبستانِ شاعری کہلانا، اس کی تعمیر بیشتر انہی اصولوں پر ہوئی جو سودا کی شاعری میں ملتے ہیں، البتہ

اتنا ہوا کہ دہلی اور اودھ کے عام ماحول و مذاق ، ہندی و معاصرین و امصادی حالات میں جو فروں نہا اس کی وجہ سے لکھنوی دبستان کی ساعری میں جذبات کی وہ ناکہزگی ، نصوص کی وہ حاسنی اور سان کی وہ مساب و نمابت نافی نہ رہی جو دہلی کے شعرا میں بالعموم نائی حافی بھی ۔ صعت کاری کے روئے اور الفاظ کا صرف ان کی نسبت دکھانے کے لیے استعمال اور لعب ساری کی طرف رجحان مہم پڑھ گیا ۔

والہاں اودھ کی قدر دانوں نے اگرچہ دہلی کے اکثر سر برآوردہ شعرا کو ترک وطن پر آمادہ کر دیا تاہم دہلی میں ساہ نصیر ، ذالہ فراہ ، قدر اللہ فاسم ، عظم سنگ عظم ، ولی اللہ محب ، سان سکسا ، عبدالرحمن حان احسان و عمرہ وہ شعرا بھی جو ذوق ، موسم اور غالب کے مطر عام بر آئے سے پہلے شعر و ساعری کا دنا حلاتے رہے ۔ الہ قدر دانوں کی بلاس میں ساہ نصیر دو دفعہ لکھنؤ اور حار دفعہ دکن گئے اور آخر وہیں وفات پائی ۔ وہ اسسا و مصحفی کے بمعصر بھی اور ناسخ و آس کے بسرو ۔ جس زمانے میں لکھنؤ جا کر انہوں نے اسسا و مصحفی کے ساتھ مساعروں اور مطارحوں میں مقابلہ کیا<sup>(۱)</sup> اس وقت ناسخ و آس کی ساعری نوری طرح نکٹوں کے سامنے نہیں آئی بھی ۔ ساہ نصیر سنگلاخ رمسوں ، مسکل زدی فاموں میں سسار گوئی و مسلسل نگاری کر کے زبان و بیان پر اننی قدر کا مظاہرہ کرے تھے ۔ اسادانہ روس ، ٹکسالی ساعری ، قادر الکلامی ، رعاب لفظی اور مسکل رمسوں کے انجاب کے لحاظ سے ان کا مذاق سخن بھی وہی تھا جو ادھر لکھنؤ میں اسسا ، مصحفی ، جراب و عمرہ نے عام کر دیا تھا ۔ لیکن اس نکات و صنوع کو لکھنوی زندگی کے مصبوعی ماحول اور بریکٹف معاصر سے زیادہ مناسب بھی چنا تھے اسے وہیں پر رناده فروغ ہوا اور سنج امام بحس ناسخ جنہیں دبستان لکھنؤ کا نائی کہا جاتا ہے مطر عام بر آئے ۔

ناسخ کے انداز کی مصولت و سہرت نے نہ صرف شعرائے لکھنؤ کو بلکہ شعرائے دہلی کو بھی کم و بس مساہر کیا ۔ ساہ نصیر تو پہلے ہی اس سمب میں حار رہے تھے ، یوں بھی ان کے ربائے میں دہلی میں بھی انک حد تک ویسے ہی حالات ندا ہوئے جا رہے تھے جو لکھنؤ کی ساعری پر ابراندار ہوئے تھے ۔ لکھنؤ جسی خوش عبشی و خوش معاسی کی جو حیر دہلی میں اب گھٹائس نہ بھی لیکن بن آسانی و عبس سندی کی روایت یہاں بھی تھی اور شعر گوئی و شعر ساری کا رواج عام تھا ، مساعروں کی گرم بازاری اور مشاعروں میں خریفانہ مقابلے اور معاصرانہ معرکہ آرائیاں یہاں بھی شعرا کو داخلت کی سمت لے جا رہی تھیں اور اس رجحان کی بھر نور نمائندگی شاہ نصیر کر رہے تھے ۔ ناسخ

(۱) محمد حسین آزاد ، آپ حیات ، ص ۳۹۶ ، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۷ء ، نیز تذکرہ گلستان سخن بحوالہ عبدالسلام ندوی ، شعر الہند ، جلد اول ص ۸۱-۸۲ ، مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۹۴۹ء

کی شہرہ نے انہیں اس اندازِ شعر گوئی میں بخندہ بر کر دیا۔ چنانچہ جب وہ لکھنؤ کے سفر سے دلی واپس آئے تو ایک مشاعرے میں دو غزلیں جو انہوں نے لکھنؤ میں لکھی تھیں پڑھیں جن کے ردیف فافے بھی ”فس کی سلاں“ اور ”کفن تھر کے“۔ ان غزلوں کی اس قدر تعریف ہوئی کہ ”بعض لوگوں کو اس پر رسک ہوا اور انہوں نے اس پر اپنے بعض ساگردوں سے غزل لکھوا کر مشاعرے میں پڑھوائی۔ بہ باب ساہ صاحب کو ناگوار ہوئی اور مہلی زمین میں تقریباً ۴۵ غزلیں کہہ کے آئندہ مشاعرے میں اپنے نلامذہ سے پڑھوائیں۔ اس کے بعد رسک و حسد کا ایسا ہنگامہ گرم ہوا کہ کئی مہینے تک جو مشاعرہ ہونا تھا اس میں بھی طرح ہوئی بھی اور تمام شعرا اسی زمین میں غزل کہتے تھے۔ عام طور پر لوگ آٹھ نو شعر سے زیادہ کی غزل نہیں لکھتے تھے لیکن ساہ صاحب ہر بار ساٹھ سر شعر کا دوغزلہ کہہ کر لائے بھی اور پڑھتے تھے“<sup>(۱)</sup>۔ حناغہ عبدالسلام ندوی نے ساہ نصیر کو دلی کا سب سے ناسخ فرار دیا ہے ”نصیر کے کلام میں سیخ ناشخ کی تمام خصوصیات موجود ہیں“<sup>(۲)</sup>۔

محمد حسین آزاد نے ذوق کے بارے میں لکھا ہے

”تمام اساتذہ معتمدین کو ادب سے ناد کرتے تھے اور فی الحقیقت سب کے انداز کو اسے اسے موقع پر پورا پورا کام میں لائے تھے۔ بھر بھی جاننے والے جانتے ہیں کہ اصلی میلان ان کی طبیب کا سودا کے انداز پر زیادہ تھا“<sup>(۳)</sup>۔

ناسخ اور ساہ نصیر بھی سودا ہی کے سب کے معروف تھے۔ ذوق نے اول اول نو ساہ نصیر کی ساگردی کی اور بعد میں ان سے حریفانہ مقابلے کیے۔ اس طرح ان کی شاعری کا رخ بھی وہی ہو گیا جو لکھنؤ کی ادبی روایت اور ساہ نصیر کی شاعری کا تھا۔ ناسخ اس وقت اپنے زمانے کے مزاجِ سخن اور معیارِ ادب کے نمائندے تھے۔ ذوق نے دہلی اور فلندہ، معلیٰ کا اساتذہ شاعر ہونے کی حیثیت سے ناسخ کی معرکہ آلا زمینوں میں سرکھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ کسی رنگ میں بے رنگ ہیں، مثلاً ذوق کی حسب ذیل غزلیں ناسخ کے رنگ میں ہیں: ”جہان میں عرصہ عشرت کے سوا وہ چند ہے غم“، ”طلسم طرفہ پر اشکوں نے میرے مردمان باندھا“، ”ہے زلف نری سنبلِ صحنِ چمن کی شاخ“، ”سرو عانس ہو گیا اس عبرتِ شمشاد کا“۔ ایسی غزلوں میں ناسخ کی طرح ذوق کے یہاں بھی غزلِ یرسی، تمثیلِ بسندی اور خارجیت کا عنصر بہت نمایاں ہے اور اس وقت

(۱) عبدالسلام ندوی، شعر الہند جلد اول ص ۸۲۔

(۲) ایضاً ص ۲۴۱۔

(۳) محمد حسین آزاد، آبِ حیات، ص ۴۵۹۔



یہی معیارِ پسندیدگی تھا (ذوق کے علاوہ دوسرے اسانڈہ دہلی مثلاً مومن ، احسان وغیرہ سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے)۔ ذوق کے ہاں عشق بھی لکھنوی شعرا کے عشق کی طرح خالی ہے نہ کہ حقیقی اور واقعی۔ ساہ نصر کے حواب میں لکھی ہوئی ذوق کی غزلوں کا عام وصف یہ ہے کہ ان کا آہنگ و اسلوب نصیر کے طرزِ نگارش کے ساتھ ملو مارنا ہے ، ناثر و تفکر ، جذبہ و احساس پر خارجیت پسندی کا رنگ چڑھا ہوا ہے اور زبان کے ناؤ بھاؤ کو فکر کی حرارت اور جذبے کی سبب پر ترجیح دی گئی ہے۔ خصوصاً ان غزلوں میں جو ناہموار زمینوں اور سنگلاخ طرحوں میں طبع آزمائی کا نسخہ ہیں۔

بہادر شاہ ظفر بھی شاہ نصر اور ذوق کے واسطے سے شعرا کے اسی سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں جو وجدانی ساعری کے مقابلے میں فنِ ساعری پر زیادہ توجہ دیتا ہے۔ چنانچہ وہ بھی سنگلاخ زمینوں ، مشکل فافوں اور ردیفوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں اور محاورہ بندی اور رعابِ لفظی کا سوو رکھے ہیں۔

مومن اور غالب بھی اسے فکری و فنی ارتقا کے ایک دور میں سودا ، ساہ نصر اور دیبسان لکھنؤ کی ادبی روایات سے متاثر رہے۔ مومن نے نو ساہ نصر کی ساگردی بھی کی تھی۔ ان کا اثر کونکر نہ مول کرے۔ مومن کی غزلوں میں لمبی ردیفیں سادہ اسی اثر کی یادگار ہیں۔ لیکن وہ اسے طرزِ سخن میں نصیر سے زیادہ ناسخ سے متاثر ہوئے اور ابتدائی دور میں ناسخ ہی کے انداز میں شعر لکھے ، مثلاً یہ غزل صاف ناسخ کی یاد دلائی ہیں : ”بن برے اے نعلہ رو آسکدہ بن ہوگا“ ، ”ے مرّوب نایوان ہیں پس دے رونا دیکھ کر“ ، ”ہمیری اس راف سے اب نہ بھی ایسا ہوگا“ ، ”سوزِ دل کے ہاتھ سے ڈھونڈوں جو مامن آب میں“۔ لکھنوی شعرا کی طرح صوفیانہ عشق کے مضامین سے مومن کی غزل بھی غاری ہے۔ لیکن ناسخ کے اثرات کو مومن کے مزاج نے جلد ہی ایسا انفرادی رنگ بخش دیا ، جس کے نتیجے میں ان کے ہاں مضمون آفرینی اور نازک خیالی کی فیضِ صوری بہت تھوڑی رہ گئی اور ایسا بہت کم ہوا کہ مضمون حقیقت سے بہت دور چلا گیا ہو ، یا حقیقت سراسر منقلب ہو گئی ہو۔ مومن کا عشق بھی محض خیالی و رسمی نہیں تھا جو ناسخ اور دوسرے شعرائے لکھنؤ کی طرح برائے سرگفتن ہو ، بلکہ واقعی و حقیقی تھا جس نے انہیں ناسخ کے طرز سے ہٹا کر انہی انفرادیت بخشی۔ انہوں نے معاملاتِ عشق اس طرح بیان کیے کہ لکھنؤ کی خارجیت پر دہلی کی ممانت کا رنگ چڑھا دیا۔ تہذیب و متانت نے مومن کے پیراہنِ ادا میں رمزیت اور کنائے کے جو حادو جگائے ہیں وہ ان کی انفرادیت کا واضح ثبوت ہیں۔

غالب بھی اپنے ابتدائی دور میں جہاں سوکھ بخاری ، اسیر ، بدل ، صائب ، غنی اور ناصر علی جیسے متاخرین شعرائے فارسی سے متاثر ہوئے ، وہیں ناسخ سے بھی انہوں نے

اثر قبول کیا کہ ناسخ کی ساعری کا براہِ راست نعلی ناصر علی ، بدل ، صائب وغیرہ ہی سے ہے ، مثلاً غالب کی یہ غزلیں ناسخ کا اثر واضح طور پر دکھاتی ہیں : ”زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک“ ، ”یرے نوسن کو صبا باندھتے ہیں“ ، ”پھونکا ہے نالہ ہر سب صورا سرافیل کی“ ، ”رحِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیِ سمع“۔ ناسخ کی مضمون آفرینی اور رعب دار طرزِ بیان سے غالب ابتدائی دور میں مرعوب رہے تھے ، لیکن آگے چل کر عرفی ، ظہوری ، نظیری ، طالبِ آملی اور مر ہی میر کے طرز نے انہیں زیادہ متاثر کیا ۔ نمیل نگاری ، خیال بندی اور مناسباتِ لفظی سے غالب کی وجہ ہٹ گئی اور حقائقِ زندگی ، مسائلِ حیات و کائنات ، نفسانِ انسانی اور حسن و عسوی کی تحلیلِ نفسی کے مضامین و موضوعات نے غالب کی دلکس شخصیت اور اوکھے طرزِ بیان کے رنگ میں رنگ کر اس کی غزل میں ایک خاص جود پیدا کر دی ۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اسی صدی کے نصفِ اول میں لکھنؤ کی روایاتِ ساعری کا ٹٹا حرجا رہا اور اس کے اثرات بھی عام رہے۔ صرف مومن اور غالب نے اپنی اپنی علیحدہ راہیں نکالیں جو صاف طور پر دبستانِ لکھنؤ سے الگ پہچانی جا سکتی ہیں ، لیکن شاہ نصیر ، ذوق ، ظفر اور دوسرے شعرا انہی ادبی قدروں کو ماننے اور ان پر عمل کرتے رہے ، جن کے لحاظ سے انکی ساعری نہادی طور پر جذبات و بصورت کے حسین و مترنم اظہار کے بجائے ایک لسانی آرٹ نظر آتی ہے ۔

لکھنؤ میں وہاں کے مخصوص حالات کی وجہ سے بعض اصنافِ ادب جیسے مرثیہ ، عنائتہ ڈراما ، رنجی اور واسوخت کو خصوصی برقی ہوئی اور چونکہ وسے حالاتِ دہلی میں نہیں تھے اس لیے یہ اصنافِ دہلوی شعرا نے نہیں اپنائے ۔ لکھنؤ کی فضا ، شاہی مذہب ، رعایا کا جوسِ عصمت ، محرم میں عزاداری کی روز افزوں برقی ، مجالسِ عزا کی کرب ، سامعینِ عوام کی قدر دانی ، اور خواص کی قدر افزائی نے اردو مرثیے کو وسعت دے کر معراج پر پہنچا دیا ۔ مرثیہ اب تک صرف سہدائے کربلا کی یاد اور ان کے مصائب کے ذکر سے عبارت تھا ۔ میر ضمیر نے چہرہ اور سراپا اس میں ایراد کیا اور رزمہ مدحیہ عناصر داخل کر کے جنگ کے ساز و سامان کا بعتین اور شریح اور نلوار اور گھوڑے کے ساعرانہ اوصاف مرثیوں میں بیان کیے ۔ واقعہ نگاری اور ہر واقعے کی تفصیل بھی انہی کا عصبہ ہے اور مرثیے کو محنتِ اللفظ پڑھنا بھی انہی کی ایجاد ہے ۔ میر خلیق نے بھی میر ضمیر کے ساتھ مرثیے کی برقی میں حصہ لیا ۔ ان دونوں کے بعد مرثیے کو اوجِ کمال تک پہنچانے والے انیس اور دیر تھے ۔ لکھنؤ میں مرثیے کی صنف کی برقی جس نہج پر ہوئی اس نے اس میں ایک یعنی رزمیہ اور ٹریجڈی یعنی حزنہ دونوں کی خصوصیات پیدا کر دیں ۔ مرثیہ ایک ایسی نظم بن گیا جس میں مثنوی کی سادگی اور بیانیہ رنگ ،

قصیدے کا سکھ اور مضمون آفرینی و تارک خیالی ، داسان کی رنگا رنگی ، اخلاقی مضامین ، جذبات نگاری ، واقعہ نگاری اور منظر نگاری ہی نہیں ، بلکہ رزم کا سا بھی ہے اور بزم کا بھی ۔ ان پر مستزاد ، سماجی زندگی کی دونوں حالوں میں ایک زوال آمادہ ، انحطاط بذریعہ تہذیب کے بہترین آئینہ کردار ۔ بہتر سے بہتر زبان و سان میں ، فن کے ہر ممکن حسن کے ساتھ موجود ہیں ۔ حالانکہ بنیادی غرض اس کی یہ ہے کہ سنتے والوں کے دلوں میں عہدِ رفتہ کے کارناموں سے ، مذہبی عقائد سے اور اہلِ نسبِ نبوی سے محبت بردار کی جائے اور نزکۂ نفس کے ساتھ کردار میں بلندی اور حالات میں رفعت پیدا ہو ۔

واجد علی شاہ کے زمانے تک اردو میں ڈرامے کا وجود نہ تھا ۔ اس صنفِ ادب کی بنیاد انہی کے ہاتھوں لکھنؤ میں پڑی ۔ انہوں نے اپنی ولعہدی ہی کے زمانے میں رادھا کنہیا کی داستانِ محبت پر مبنی ایک جھوٹا سا ڈراما ’رہس‘ کے طور میں لکھا جو اگرچہ فنی اعتبار سے بلند نہیں لیکن اردو کا پہلا ڈراما ہونے کی حثیت سے اہم ضرور ہے ۔ اس میں رقص و نغمے کا عنصر غالب ہے ۔ واحد علی شاہ نے اسی طرح کے اور بھی کئی غنائی ڈرامے لکھے لیکن اس صنف میں جو مصولت و سہرہ امانت لکھنوی کی ”اندر سہا“ نے حاصل کی وہ کسی اور غنائی ڈرامے کو نصیب نہ ہو سکی ۔ اندر سہا کی فضا اس دور کے لکھنوی تمدن و معاشرے کا عکس پس کرتی ہے ۔ اس میں ہندو اور مسلم تمدن ، ہندوستانی اور ایرانی روایات اس طرح ہم آہنگ ہو گئے ہیں کہ انہیں ایک کو دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا ۔

لکھنؤ میں طوائفوں کی کثرت اور عیس و ہوسنائی کی عام فضا نے اس صنفِ سخن کو پروان چڑھایا جسے رغبتی کہتے ہیں ۔ یہ ساعری کی وہ قسم ہے جس میں ہوس برس یا پشہ ور عورتوں کے سڈل حذات اور پہچان انگیز جسی خواہشات و مجربات کا اظہار انہی کی مخصوص عاسانہ سوانی زبان میں کیا جاتا ہے ۔ رغبتی ایک خاص انداز کی کاریگری ہے ، مگر کھلے بندوں بے حاشی کا اعلان بھی کرتی ہے ۔ رنگین ، انسا ، فس ، نازنین بیگم اور جان صاحب نے اس صنف کو خوب برقی دی ۔ رغبتی کے علاوہ ایک اور کاریگرانہ فحاسی واسوخت کی شکل میں عام ہوئی ۔ واسوخت ایک طرح کی عاسانہ جھڑ چھاڑ یا تماسِ بستی کی واردات کو نظم کرنا ہے ۔ اس صنف کو امانت لکھنوی نے فنی معراج پر پہنچا دیا ۔ ان کے مشہور واسوخت میں دین سو سے زائد بند ہیں ۔ قصہ مختصر اور معمولی ہے لیکن امانت نے اس خاکے میں لکھنؤ کے تمدن کا رنگ بھر کر اور لفظی صنعت گری اور ساعرانہ صناعی رب کر اسے لکھنوی دستانِ ادب کا ایک نمائندہ شاہکار بنا دیا ہے ۔

اس زمانے کے نقدی شعور اور ادبی مذاق عام طور پر ناسخ و آس و دہر اور نصبر

و ذوق و ظفر کا ہی دلدادہ تھا (مہی وحہ بھی کہ غالب جیسے بلند مرصعہ شاعر کی قدر اس دور میں اتنی نہیں ہوئی جتنی دوسرے اردو شعراء کی)۔ یہ شعور نظیر اکبر آبادی کو بقائے دوام کے دربار کے قابل ہو کجا، شعرائے سن میں بھی سہار کیے جانے کے قابل نہ سمجھتا تھا۔ مشکل وفاقی، لمبی ردیفوں، سنگلاخ زمینوں اور دور از کار شبیہوں پر وجد کرنا تھا۔ فن کا احترام فن کی حسرت سے کرنا تھا۔ مدربِ بیان اور صورتِ کلام کو سراہا تھا۔ محاورے، روز مرے، الفاظ اور ننسنتِ الفاظ کے استعمال پر عبور کو شاعرانہ کمال سمجھا تھا، ہر صنفِ سخن کو جانا تھا لیکن غزل کو سب سے اعلیٰ صنف ماننا تھا اور نفس ننگنے بنانے اور مساکاری کرنے کو بہت کچھ سمجھا تھا۔ شاعری سے بڑھ کر اسنادی و سعدی نازی، سادگی و روانی سے بڑھ کر صنعت گری و نکاح، صداقت سے بڑھ کر مبالغہ و اغراق، بلندی سے بڑھ کر بلند پروازی، نادر سے بڑھ کر مخمیل، خیالات و جذبات و احساسات سے بڑھ کر زنان دانی و زنان سازی و رعایبِ لفظی کا ماننے والا تھا۔ ”ہریوں میں بھی مرا نازک بدن ملتا نہیں“ جسے مصرعوں پر مساعروں کی چھتیں اڑ جانا کرتی تھیں اس لیے کہ نازک بدن پر کی ایک قسم کا نام ہے اور معشوق کی نازک بدنی تو مسئلہ امر ہے حاتمہ اس رعایبِ لفظی پر لوگ خوب سر دھنتے تھے۔

صنموں اور لفظی رعایوں کا رجحان صرف عزل ہی میں عاناں میں تھا بلکہ مثنوی میں بھی۔ یہ دیا سنکر نسیم کی ”گلزارِ نسیم“ اور اسد علی خان فانی کی ”طلسمِ الفت“ میں ظاہر تھا۔ محاوروں اور رور مروروں پر خصوصی توجہ دینے کا میلان مومن اور مرزا شوق کی مثنویوں سے ہوتا ہے۔ جس طرح اس سے پہلے بھی عشقہ مثنویوں میں سراہا نگاری اور معاملاتِ وصل کے بیان میں کھلی کھلی ناس لکھ دی جاتی تھیں، اس دور میں بھی اس روایت کو قائم رکھا گیا بلکہ مومن نے چونکہ اپنے دانی معاسموں کو مثنویوں کا موضوع بنایا تھا، نہ کہ مخمیلی قصوں کو، اس لیے ان کی مثنویوں میں یہ عریانی اور لذتِ کچھ زیادہ ہی ہو گئی۔ سووی کی مسویوں پر بھی کم و بیش ہی بات صادق آتی ہے۔ اگرچہ اس زمانے میں اور بھی کئی مسویناں لکھی گئیں لیکن انہیں عام مقبولیت حاصل نہ ہو سکی، بلکہ مقبول ہو درکنار ان کی عام طور پر اساعت بھی نہیں ہوئی۔ مثلاً سکندلا کے قصے پر مبینی غلام احمد کی ’فراموس ناد‘، نل دمن کے قصے پر مبینی احمد سراوی، نیار علی نکمت، بھگونب رائے راحت کا کوروی، مر علی بنگالی اور احمد علی کی مثنویاں۔ راجا چتر مکٹ اور رانی چندر کرن کے قصے پر سنی روسن علی اور راغب امرہوی کی مثنویاں و عمرہ۔ ان سب مسویوں کا علم محققین کو گزشتہ چند سالوں میں ہوا ہے اور ان نازہ معلومات کی روشنی میں یہ کہنا تو درست نہ ہوگا کہ اس دور میں مثنویاں بہت کم لکھی گئیں، البتہ یہ درست ہے کہ شعرا کی محبوب ترین اور عوام میں

مقبول ترین صنفِ نظم غزل ہی رہی اور دوسرے نمبر پر (مسدس کی ٹیپ میں) مرتبہ - ساعری کے مضامین و موضوعات بالعموم عسکری اور دنیوی علائق سے محصور رہے ، البتہ مرتبہ نگاروں نے مذہبی جذبات و معنویت سے بھی محریک نائی بھی اور رہا فکر و فلسفہ ، وہ غالب کے یہاں مل جاتا ہے -

لسانی فنکاری و صناعی کا تصور بعض سر نگاروں کے بھی سیرِ نظر تھا جو سادہ و سلس زبان میں اظہارِ حال کے مقابلے میں نکٹف و نصتغ کو ادب بنا کرنے کے لیے لازمی سمجھے تھے - اس طبعی حال کے سرگروہ رحب علی بک سرور تھے جو اودھ ہی کے رہنے والے تھے - محمد بخش مہجور ، ہم چند لہری ، امانت لکھوی ، سد باقر حسن ، سید ظہیر الدین حسن ، علامہ امام سہید وغیرہ بھی اسی طرزِ بیان کے دلدادہ تھے جس میں فافہ ہندی ، عبارت آرائی ، رنگینی اور فارسی کی تقلید ہوتی تھی - اس طرح اس زمانے کی سر میں ایک دھارا نو سلاست و سادگی کا تھا اور دوسرا نکٹف و نصتغ کا اور نہ دھارے بعض اوقات ایک ہی مصنف کی ایک ہی صنف میں ناہم مل بھی جاتے تھے ، مثلاً غلام امام سہید کی نصیف ”مولد سرف سہید“ میں حمد و نعت کے مقامات مفنی ، عالمانہ عبارت میں ہیں اور عربی و فارسی کے الفاظ و ترکیب سے معمور ہیں ، نای مصمون سادہ عبارت میں ہے - اسی طرح حواجه علامہ عوب لے حر کی تریطن نو نکاف و نصتغ سے گرانار ہیں لیکن دوسری تحریریں سلس سر ہیں - علامہ امام خاں برین نے ناربخ رسد الدین حانی کا دساحہ پر نصتغ انداز میں نکھا ہے لیکن اصل کتاب میں عبارت صاف و سادہ ہے -

حبابہ حابون کے عام ہونے سے پہلے شعراء کے نلام کی سر و اساعب کے لیے مساعروں کی بڑی اہمیت تھی - بقول مولوی عبدالحق ”اس زمانے کی سب سے بڑی علمی اور مہذب مجلس مساعری تھی جن کے لیے بڑے بڑے اہام لبے جاتے تھے - اس کے خاص خاص آداب تھے - بڑے بوڑھے ، نوجوان ، بچے سب ہی سریک ہوتے تھے - با لال سخوروں کو دل کھول کے داد دی جاتی تھی ... نوجوان ان مساعروں میں سریک ہوتے اور اپنے کانوں سے محسن و آفرین کے نعرے سننے تھے جو شعرا کے لبے سب سے بڑی داد اور سب سے بڑا انعام تھا ، نو ان کے دل میں بھی امگ پیدا ہوتی تھی - کسی استاد کے پاس حاضر ہوئے ، ساگرد ہو گئے اور سر کہنا شروع کر دیا ، گونا سر کہنے کے لیے صرف کسی استاد کا ساگرد ہو جانا کافی ہے - یہ مساعری در حقیقت ساعرگر تھے“ (۱) - تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر استاد کے ساتھ اس کے ساگردوں کا گروہ ہوتا تھا جو ساعرانہ ساطروں میں اپنے استاد کا ساتھ دیتا تھا - اس طرح ادبی گروہ بندیوں

(۱) علی لطف مع مقدمہ ار مولوی عبدالحق ار گلشن ہند ، ص ۱۹ ، مطبوعہ لاہور و حیدر آباد

کو فروغ ہونا تھا جس کے گھر میں مجلسِ شاعرہ منعقد ہونی وہ اپنی حیثیت اور مہارت کے مطابق مہمانِ سعرا کی تواضع کنا کرنا تھا۔ شاعرے مجلسی و ادبی زندگی کا جزو بن گئے تھے اور ان کی مخصوص روایں قائم ہو گئی تھیں۔ اسادی اور شاگردی کا رشتہ باہمی رفاقت، نکتہ چینی اور خوردہ گیری، آگے بڑھنے کا سوال، سمع کی گردش، نشست و برخاست کے فائدے، داد دینے کے طریقے، مہرِ شاعرہ کی مہمان نوازی اور شاعروں کی ربہ سناسی وغیرہ، یہ سب باتیں آپسہ آپسہ لوازم کی حثیت اختیار کر گئی تھیں۔ کوئی شخص اس وقت تک شاعرے میں کلام سنانے کی جرأت نہیں کرنا تھا جب تک کہ اسے اپنی زبان دانی پر اعتقاد نہ پیدا ہو جائے اور فنی واقفیت مکمل نہ ہو جائے نا اسناد اسے اجازت نہ دے دے۔ اس زمانے کے شاعروں میں شعر کے خیال، مضمون یا جذبے کی طرف لوگ کم دھیان دیتے تھے اور زبان و بیان کے حسن و فصاحت و سقم اور صنموں کی موجودگی یا عدم موجودگی پر بوجہ زیادہ دیتے تھے۔ طرحی شاعروں میں اکثر اشعار محض قافیہ بازی ہو کر رہ جاتے تھے۔ عام سعرا اعراض کے ڈر سے نئی باتیں نئے انداز میں کہنے سے جھجکتے تھے کیونکہ ہر سرِ شاعرہ ہی خیال یا زبان و بیان کی سید مانگ لی جاتی تھی۔ بعض اوقات شاعروں میں سعرا کی معرکہ آرائیاں اپنی بڑھ جاتی تھیں کہ بھکا فضیحی تک نوبت پہنچ جاتی تھی اور شاعرے درہم برہم ہو جاتے تھے۔

شعر و شاعری کے ذوق عام کی وجہ سے نہ صرف شاعروں کا رواج بڑھ گیا تھا بلکہ باضوں اور تذکروں کی بھی بڑی مانگ تھی اور طلب کے مطابق ان کی رسد بھی تھی۔ جو لوگ تذکرے نہ لکھ سکتے تھے وہ باضین مرتب کر لیتے تھے، جس میں اپنی پسند کے اشعار اور غزلیں شاعر کے نام کے حوالے کے ساتھ جمع کرتے تھے۔ چونکہ باضوں کی حثیت بڑی حد تک نجی بھی اس لیے ان میں کوئی خاص ترتیب مقرر نہ تھی بلکہ مرتب جس طرح اس کا جی چاہتا تھا ترتیب دے لیتا تھا۔ اس کے منتخب کردہ اشعار میں مفرد اشعار بھی ہوتے تھے اور کبھی سالم غزلیں بھی ہوتی تھیں۔ انتخاب اشعار میں اکثر ردیف کی ترتیب ملحوظ رکھی جاتی تھی، لیکن ہمسہ ایسا نہیں ہوتا تھا۔ غزلوں کے علاوہ کبھی دوسری اصناف کے اشعار بھی جن لیے جانے تھے۔ کبھی نو مضمون کی خوبی کے پس نظر اور کبھی اسلوب یا زبان و بیان کے لطف کی وجہ سے شعر داخلِ بیاض کر لیا جاتا تھا۔

تذکروں کی نوعیت باضوں سے مختلف تھی۔ ان میں سعرا کے کلام کے انتخاب سے پہلے ان کے مختصر حالات اور ان کے کلام پر مختصر سا تبصرہ بھی دیا جاتا تھا اور سعرا کا ذکر بالعموم حروفِ تہجی کے اعتبار سے ہوتا تھا، کبھی ادوار کی فہرست کے ساتھ اور کبھی

بلا مد ادوار۔ اٹھارہویں صدی میں مفصل اور جامع تذکرے لکھے کی طرف توجہ نہیں تھی بلکہ صرف مسخ سحر کو تذکروں میں حکم دی جاتی تھی، لیکن انیسویں صدی کے آغاز سے اسے تذکرے بھی لکھے جانے لگے جن میں تذکرہ نگاروں کا مقصد جامع اور استعاب تھا۔ جامعہ قدرب اللہ ناسم کے تذکرے ”مجموعہ نفز“ (۱۸۰۶ء-۱۲۲۱ھ) میں تقریباً چھ سو سحرائے حالات و استعاب ہیں۔ سر محمد خان سرور کے تذکرے ”عمدۃ مسخ“ میں، جو عالتاً ۱۸۰۹ء/۱۲۲۴ھ میں مکمل ہوا، تقریباً بارہ سو سحرائے حالات و استعاب ہیں اور خوب حد دکا کے تذکرے ”عمار السحر“ میں جو ۱۸۳۱ء/۱۲۴۷ھ میں مکمل ہوا، دہڑہ ہزار سحر کے حالات اور لامل کے نمونے ہیں۔ یہ جامع تذکرے اسی اسلوب تذکرہ نگاری کا ارتقا طاہر تذکرے ہیں جو میں ہی میں اور قائم چاند پوری کے تذکروں میں برآ گیا تھا۔

لیکن لکھنے میں فورٹ ولیم کالج اور دہلی میں دہلی کالج کی وجہ سے ادب کے جدید رجحانات کا بھی آغار ہو رہا تھا اور تذکرہ نویسی کا میں بھی ان جدید رجحانات کا اثر قبول کر رہا تھا۔ مذم تذکروں کا ایک بڑا نقص یہ تھا کہ ان میں سنی و واقعات کی تعدین نہیں ہوتی تھی اور استعاب کے واقعات زندگی کی حقیقی بھی مکمل نہ ہوتی تھی اور کبھی کبھی مصنف کسی گروہ یا ساعر کی طرف داری یا مخالف میں یا انصافی برآ جانے ہتھے۔ جو تذکرے شے رجحانات و حالات کے مح لکھے گئے، ان میں ان نائص کی اصلاح کی طرف خاص توجہ ہوتی۔ جامعہ مررا علی لطف کا ”تذکرہ گلشن ہند“ (۱۸۰۱ء/۱۲۱۵ھ) جو حلیل کے تذکرے ”گلزار انراہم“ سے مستفاد ہے، نہ صرف شے رجحان کی نمائندگی کرنا ہے، بلکہ سحرائے اردو کا پہلا تذکرہ ہے جس کی زبان اردو ہے۔ اس تذکرے میں محض اور تاریخی ملان کی خاص برآ ہمن سوحہ تذکرے ہے۔ صہبائی کا تذکرہ جس کا نام ”خلاصہ“ (انجاء) دواوین سحرائے مسہور ریاں اردو کا“ ہے، ۱۸۴۴ء تا ۱۸۴۶ء میں سائع ہوا۔ اس انتخاب میں ہر ساعر کے لامل کے ساتھ اس کے کچھ حالات بھی درج ہیں اور شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں اردو ساعری پر سمدی نظر ڈالی گئی ہے اور اس میں جدید رنگ جھلک رہا ہے۔ کریم الدین نے فلن کی مشارک سے تذکرہ دناسی (ہزبان فرانسسی) بر ہناد رکھے ہوئے ”طبقات السحر“ (۱۸۴۸ء) لکھا جس کی تریب ادوار و طبقات کے اعتبار سے ہے اور جس میں سنین اور نارخوں کا البرام بھی کا گیا ہے اور سحر کے حالات بھی مفصل دے ہیں۔ صہبائی اور کریم الدین کے تذکروں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں سوانحیت کے ساتھ ساتھ یہ کوسن بھی کی گئی ہے کہ اردو ساعری کا ارتقا بھی مطالعے میں آ جائے۔ ان میں زبان اردو کی لسانی تحقیق اور مختلف ادوار میں مختلف اصناف سخن کی تری کے اسباب اور فن تذکرہ نویسی کی تمید پر بھی اشارے موجود ہیں۔

## تیسرا باب (الف)

### فورٹ ولیم کالج کے مصنفین

اردو نثر کی تاریخ میں فورٹ ولیم کالج انک ایہم سنگ میل کی حثیت رکھتا ہے۔ اس کالج کا امام اگرچہ انگریزوں کی سیاسی مصلحتوں کے تحت عمل میں آنا لیکن اس سے اردو نثر کو بہت فائدہ پہنچا۔ اٹھارھویں صدی کے اواخر میں اسٹینڈن کمپنی کے ارباب حل و عقد اس ضرورت کو سدّت سے محسوس کرنے لگے تھے کہ کمپنی کے نووارد ملازمین کو فارسی اور اردو کی تعلیم دی جائے، جامعہ لارڈ ویلزلی گورنر جنرل نے وہب کے نفاذ اور سیاسی مصلحتوں سے مجبور ہو کر حاکم کلکرسٹ کی سربراہی میں جنوری ۱۷۹۹ء میں ایک مدرسہ (Oriental Seminary) قائم کیا۔ یہی مدرسہ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کا بس رو نام ہوا۔ کلکرسٹ کے مدرسے کی سرکاری حیثیت اور کمپنی کے مقاصد کا اندازہ گورنر جنرل کونسل میں لارڈ ویلزلی کی مفصل یادداشت اور کونسل کی ۲۱ ستمبر ۱۷۹۸ء و ما بعد کی کارروائیوں کے ریکارڈ سے بخوبی ہو سکتا ہے<sup>(۱)</sup>۔ لارڈ ویلزلی نے اسی سفارش میں لکھا کہ ”ہندوستانی بول حال کی زبان میں (نووارد رائٹس) جو مہارت حاصل کریں گے اس کی بدولت کمپنی کی ملازمین کے دوران میں اسے مصمت کے تمام فرائض بھی وہ حسن و خوبی کے ساتھ انجام دے سکیں گے“<sup>(۲)</sup>۔

کونسل نے گورنر جنرل کی سفارش مطور کر لی اور حوری ۱۷۹۹ء سے کلکرسٹ کے مدرسے کے کام شروع کر دیا۔ ڈیڑھ برس بعد (جولائی ۱۸۰۰ء) میں اس مدرسے کے طلباء کا گورنر جنرل کی معزز کردہ کمپنی نے پہلا اور آخری امتحان لیا اور یہ مدرسہ ہم ہو گیا۔ مارکوائس آف ویلزلی گورنر جنرل ہندوستان نے ۱۰ جولائی ۱۸۰۰ء (۱۷ صفر ۱۲۱۵ھ) کو فورٹ ولیم کالج کی نصابیہ داع بیل ڈالے ہوئے اس کے آئین و ضوابط کا مسودہ منظور کیا۔ اگرچہ کالج میں تعلیم و تدریس اس سے بھی چھ ماہ بعد شروع ہوئی لیکن لارڈ ویلزلی نے ۱۰ جولائی کو جو دستاویز منظور کی اس کی نسانی پر لکھا گیا : ”ہز لارڈ سپ (ویلزلی) کے حکم خاص سے اس (دستاویز) پر ۴ مئی ۱۸۰۰ء کی تاریخ ڈالی گئی جو میسور کے دارالسلطنت سرنگا پٹم میں برطانوی افواج کی سانداری اور فصلہ کن فتح کی پہلی سالگرہ تھی“<sup>(۳)</sup>۔ گونا بہ کالج سقوط میسور اور فتح برطانیہ کی یادگار بنا۔

(۱) تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو، محمد عتیق صدیقی، گل کلکرسٹ اور اس کا عہد۔

(۲) (Proceedings, op. cit.) بحوالہ محمد عتیق صدیقی، گل کرسٹ اور اس کا عہد، ص ۱۱۰۔

(۳) O.C. (Supplementary) July, 10, 1800. بحوالہ محمد عتیق صدیقی، گلکرسٹ اور اس کا عہد، ص ۱۳۷۔



لارڈ ولبرلی نے کالج کا وسیع تعلیمی دائرہ عمل مستقر کیا تھا اور وہ در حقیقت اسے یونیورسٹی بنانا چاہتا تھا۔ لیکن گورنمنٹ آف انڈیا کی مخالفت کے باعث اس کا منصوبہ صحیح معنوں میں عملی جامہ نہ پہن سکا۔ ۲۹ ستمبر ۱۸۰۰ء کے کلکتہ گزٹ کے ”عمر معمولی سہارٹ“ میں کالج کے مختلف شعبوں کے پروفیسروں کے نمبرز کا اعلان ہوا، کالج کے پرنسپل (پرویسٹ) مڈری ڈیورنڈ، ہود براؤن اور سینیٹر ہندوستانی کے پروفیسر خان گلکرسٹ سرگز ہوئے۔“

ہندوستانی شعبے کے تمام کے بعد یووارد انگریزوں کی تدریس کے لیے اردو کی کتابوں کی مہم رسانی و انتخاب کا مسئلہ فوری طور پر سامنے آتا۔ انسی کتابیں مطلوب تھیں جن کے ذریعے نہ یووارد اردو زبان بھی سیکھ جائے اور انہیں ہندوستانیوں کی عادات و اطوار، مہذب و معاشرہ، روایات و اقدار اور رسومات و عیادت سے بھی فوری واقف ہو جائے۔ اردو میں جو چند انک کتابیں تھیں وہ اس قدر دمی، فارسی آمیز اور معیشتی و مسجع عبارت میں تھیں کہ مقصد پورا نہ کر سکتی تھیں۔ ان حالات میں میں صورتیں ممکن تھیں۔ (۱) اردو میں مسلسل کتابیں لکھی جانی جائیں۔ (۲) انگریزی سے اردو میں ترجمے کروائے جائیں یا (۳) مسبری زبانوں کے مسجع ادب کا ترجمہ کروانا جائے۔ پہلی صورت طویل المعاد منصوبے کی بعضی بھی حکمت ضروری فوری نوعیت کی نہیں۔ دوسری صورت مقصد تو لہذا چند، پورا نہیں کر سکتی تھی کیونکہ انگریزی کے حسن ادب کا ترجمہ کیا جاتا وہ اسے ساتھ انہی روایات لہذا حکمت کالج کے تمام کا مقصد ہندسی حاکموں کو دیسی معاشرے سے آگاہی بخشنا تھا۔ علاوہ ازیں اردو، انگریزی دونوں میں نکساں سہارٹ رکھنے والوں کا ملنا بھی حتمی سہل نہ تھا، اس لیے فائل عمل اور موروثی بریں صورت مسبری ادبیات کا سلسلہ اردو میں ترجمہ کرانا تھا اور اس ادب میں بھی افسانوی ادب ہی زیادہ مقصد بطلب ثابت ہو سکتا تھا۔ گلکرسٹ نے اسی پہلو پر عمل شروع کیا اور اچھے لکھے والوں کو ملک بھر سے منگوا کر کالج میں جمع کیا۔ اس طرح تدریس کے ساتھ ساتھ کالج میں تصنیف و تالیف کا کام بھی شروع ہو گیا۔ پہلی اس باب کی ٹائڈ گلکرسٹ کے ۱۲ جنوری ۱۸۰۲ء کے خط تمام کالج پرنسپل کی اس عبارت سے بھی ہوتی ہے کہ ”انسی ہندوستانی کتابوں کے عام فقدان نے جس طرح بھی تھروہ کیا جا سکے مجھے فوری طور پر حسب ذیل کتابیں چاہیے پر مجبور کر دیا ہے اور کلکتہ کے تمام چھاپے خانوں کو میں نے اس کام پر لگا دیا ہے، کیونکہ کم سے کم وقت میں اس کام کو انجام دینے کا یہی طریقہ میری سمجھ

(۱) The Calcutta Gazette (Extra Ordinary) 29 Sept, 1800 بحوالہ محمد عتیق صدیقی، گلکرسٹ اور اسکا عہد، ص ۱۳۹-۱۴۰۔ ہماری کتب نوارخ ادب میں اکثر گلکرسٹ کو مورٹ ولیم کالج کا پرنسپل لکھا گیا ہے جو صحیح نہیں۔

میں آیا (۱)۔

فورٹ ولیم کالج کے مصنفین میں خود ڈاکٹر جان گلکرسٹ کا نام بھی سرِ فہرست ہے۔ جان بارنہ وک گلکرسٹ ایڈبرا میں ۱۷۵۹ء میں پیدا ہوئے، ۱۷۸۲ء میں بمبئی دہشجمنٹ (Bombay Detachment) میں اسسٹنٹ سرجر کے عہدے پر بھری ہو گئے (۲)۔ اسٹ انڈیا کمپنی میں اس فوجی طبیبی ملازم برائے ال کا تقرر سورب میں ہوا اور ۱۷۸۳ء میں سورب سے فتح گڑھ تبادلہ ہوگا۔ ۱۷۸۵ء میں انہوں نے ہندوستانی زبان کے قواعد و لغت کی تصنیف کے لیے مواد کی فراہمی کی خاطر ایک سال کی رحلت لے لی اور پھر اس رحلت میں سال نہ سال توسیع کروائے رہے۔ گلکرسٹ نے ۱۷۸۵ء میں فتح گڑھ سے شمالی ہند کی طرف سفر کیا اور قس آباد میں قیام کیا۔ اسی سال لغت کی تصنیف کا کام مکمل ہو گیا۔ حاکم انہوں نے اس کی طباعت کے لیے کلکتے کا سفر کیا۔ ۱۷۸۶ء میں اس لغت کی طباعت ۵۰۰۰ شروع ہوئی اور ۱۷۹۰ء میں لغت چھ ڈر مسطریہ عام در آئی۔ گلکرسٹ اس دوران میں عاری دور میں قیام پر رہے اور ۱۷۹۵ء میں دوبارہ کلکتے پہنچے جہاں ۱۷۹۶ء میں ”ہندوستانی زبان کی قواعد“ شائع کی۔ ۱۷۹۸ء میں ”صمیمہ“ اور ”سری رتن دان“ کی اشاعت ہوئی۔ جنوری ۱۷۹۹ء میں (Oriental Seminary) کا آغاز ہوا جس کا در سطور میں قیام میں ہو چکا ہے۔ گلکرسٹ جو ۱۷۸۲ء میں ایک طبیب تھے، ماہر زبان ہوئے کے بعد اب ہندوستانی زبان کے معلم ہو گئے تھے۔ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد جب وہ ہندوستانی بروہہ کے عہدے پر متعین ہوئے تو انہوں نے سرسی اور تصنیفی کاموں پر خصوصی توجہ دی۔ اسی عرصے میں گلکرسٹ ڈامپٹن ”ہندوستانی برس“ (۱۸۰۲ء) بھی قائم ہوا۔ کالج میں اپنے چار سالہ قیام کے دوران میں انہوں نے خود بارہ کتابیں لکھیں اور دیگر ”مسئلوں“ سے بھی کتابیں لکھوا کر ۶۳ کے لگ بھگ کتابیں شائع کیں۔ ۱۸۰۴ء میں گلکرسٹ فورٹ ولیم کالج سے مستعفی ہو کر اسے وطن چلے گئے جہاں انہیں ایڈنبرا یونیورسٹی نے ہندوستانی زبان کی خدمت کے سلسلے میں اہل اہل کی اعزازی ڈگری دی۔ آپ نے ۱۸۴۱ء میں وفات پائی۔

گلکرسٹ ایک دہس اور دور اندیش انسان تھے، انہیں اسے حال سے زیادہ مستقبل کا فکر تھا، جس کے سلسلے میں انہوں نے ساحلِ بمبئی پر قدم رکھنے کے بعد ملکی زبان سمجھنے

(۱) Proceeding of the Colleges of Fort William (National Archive of India) P. 16

بحوالہ مجدد عتیق صدیقی، گلکرسٹ اور اس کا عہد - ص - ۱۴۴

(۲) خلیل الرحمان داؤدی نے قواعد زبان اردو مسطورہ، رسالہ گلکرسٹ (مطبوعہ مجلس برقی ادب) کے دیباچے میں لکھا ہے کہ گلکرسٹ بھری ہو کر بمبئی آئے تھے۔ لیکن داؤدی صاحب کے پاس اس دعوے کے لیے کوئی ٹھوس دلیل نہیں۔

کو خاص اہمیت دی۔<sup>(۱)</sup> بقول عسقی صدیقی، ”اس کا صرف یہی سبب نہیں تھا کہ وہ یہاں کی زندگی سے پورے طور پر لطف اندوز ہونا چاہتا تھا بلکہ ایک اور اہم سبب بھی تھا اور وہ یہ کہ ہندوستان آئے ہی اس کے ذہن رسا نے نہ اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ ہندوستان کا بوڑھا جاگردارانہ نظام اس کے وطن کے بوجھ بھاری سامراج کے مقابلے میں ٹک نہ سکے گا۔ لیکن ہندوستان میں انگریزی سامراج کے وام و بھاکے لیے ضروری ہے کہ اس کے ہندوستانی اہلکار ہندوستان ریان لو، جس کے ہندوستان گھر ہونے کا اسے یقین تھا، زیادہ سے زیادہ سیکھیں۔ جامعہ ایسے ایسے اس حوالہ پر پورا پھوسہ تھا نہ حکمران طبقے کے بھاری و انتظامی مصالح ان کو ہندوستانی زبان کے سیکھنے پر حائل ہی مجبور کر رہے تھے، جس کے موثر ذرائع اس وقت کلتا نام نہ تھے“<sup>(۲)</sup>۔ فلکرسٹ کی تحریروں میں بھی ان امور کی طرف حوالہ دیا گیا ہے۔ انہوں نے اپنی لغت اور قواعد کے ”ضمیمے“ کی حلد (Appendix) میں لکھا ہے کہ ۱۸۲۰ء میں بمبئی میں وارد ہونے والے ہی میں نے نہ محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان میں میرا مقام، خواہ اس کی نوعیت جو بھی ہو، اس وقت تک نہ ہو میرے ہی لیے خوشگوار ہو سکتا ہے اور نہ میرے آقاؤں ہی کے حق میں مفید ثابت ہو سکتا ہے، جب تک کہ اس ملک کی مروجہ زبان میں میں پوری دس گاہ نہ حاصل کر لوں۔ جہاں غرضی طور پر مجھے مقام کرنا ہے“<sup>(۳)</sup>۔

### جان فلکرسٹ کی تصانیف

فلکرسٹ کی تصانیف میں سب سے پہلی ان کی انگریزی ہندوستانی لغت ہے جس کا پہلا حصہ ۱۸۲۶ء میں اور دوسرا ۱۸۲۹ء میں شائع ہوا۔ بعد ازاں اس کا مکمل یک جائی انڈس انڈبرا سے ۱۸۱۰ء میں شائع ہوا، جس میں ۲۱ صفحات کے میں کے علاوہ ۶۴ صفحات پر مشتمل ہندوستانی زبان کے قواعد پر ایک جامع مقدمہ بھی تھا۔ اس لغت کے کلکے سے چھپنے والے انڈس کا فائل د ٹرہلو یہ ہے کہ اس میں انگریزی الفاظ کے معنی اردو رسم الخط میں درج کیے گئے تھے، حکمہ ایڈبرا والے انڈس میں معانی رومن رسم الخط میں تھے<sup>(۴)</sup>۔ سر انگریزی میں بھی معانی درج کیے گئے تھے۔ سلا (to desert) (برک کرنا) (turk-karna) (چھوڑنا) (abandon, -chhorna) - اس لغت میں الفاظ کے معنی

(۱) فلکرسٹ نے اپنی تحریروں میں اردو زبان سیکھنے کے سلسلے میں John Rattray اور کلیات سودا

کا خصوصی ذکر کیا ہے۔

(۲) جید عتیق صدیقی، گل کرسٹ اور اس کا عہد، ص - ۳۹

(۳) Gilchrist, op. cit. بحوالہ جید عتیق صدیقی، گل کرسٹ اور اس کا عہد، ص - ۶۶ - ۶۷

(۴) گریٹرمن کی نظر سے غالباً کاکتے والا ایڈیشن نہیں گزرا اس لیے انہوں نے لکھا ہے کہ معانی رومن رسم الخط میں تھے۔

سمجھانے کے لیے اردو اور ہندی اشعار بھی رومن میں درج کئے گئے تھے<sup>(۱)</sup>۔  
 گلکرسٹ کی دوسری نالغ ”ہندوستانی زبان کے قواعد“ ہے جو ۱۷۹۶ء میں کرانیکل  
 ریس کلکٹ سے (۳۳۸ صفحات) سائے ہوئی۔ سروروی برکات کا نام (A Grammar of the  
 Hindustanee Language or Part Third of Volume First of a System of  
 Hindustanee Philology) لکھا ہے اور رومن اور اردو رسم الخط میں سودا کے نہ  
 سر درج ہیں :-

اب سامنے میرے جو کوئی ہر و حوال ہے  
 دعویٰ نہ کرے نہ کہ میرے منہ میں زبان ہے  
 میں حصہ سودا کو سنا بولے نارو  
 اللہ ہی اللہ کہ کتا نظم و سان ہے  
 اس کے بعد فارسی اور انگریزی عبار میں لکھا ہے -

”پرہا کہ سہوئے و حطائے واقع سود بذمل کرم یونسند و فلم اصلاح برآن جاری  
 دارند“ اس کتاب میں ولی ، حاتم ، دمن ، سودا ، درد ، فائم ، مر حسن اور سور کے اشعار  
 سالوں کے لیے بکرت استعمال ہوئے ہیں اور شکسپیئر کے دو مختلف ڈراموں کے دو ٹکڑوں کا  
 ترجمہ اردو رسم الخط میں ملتا ہے۔ کتاب میں یائے معروب و نائے مجہول نیز ”لا“ اور  
 ”ھ“ کے استعمال میں کوئی اساز نہیں رکھا گیا۔ آخر میں ۳۱ صاحب دیوان سورا کی  
 فہرست ہے جس کو گلکرسٹ اساد نا ماہر فن سمجھتے تھے -

گلکرسٹ کی دوسری کتاب ”لغ اور قواعد کا ضمیمہ“ ہے جو ۱۷۹۸ء میں جھپی -  
 نہ قواعد و لغ کے مقدمے پر مشتمل تھی - اس کتاب میں گلکرسٹ نے ہندوسان میں آنے  
 نام کی سرگزشت بھی احوالاً بیان کی ہے -

جان گلکرسٹ کی چوتھی مشہور کتاب ”سنری زبان دان“ ہے جو ۱۷۹۸ء میں  
 سائے ہوئی - اسے سروروی کے مطابق نہ ”ہندوسان کی مقبول عام زبان کا سدھا سادا دیباہہ“  
 بھی - اس کتاب میں اردو رسم الخط بالکل استعمال نہیں کیا گیا - اس کا چوتھا باب بین  
 فصوٹ پر مشتمل ہے اس کتاب میں اردو اور فارسی کی کئی غزلوں کی دھنین انگریزی  
 دھنوں کے سانچے میں ڈھالی گئی ہیں اور ساتھ ہی ان کے نقشے بھی دیے گئے ہیں جن کی  
 مدد سے وہ بانو بر بجائی جا سکی ہیں - ان کے علاوہ گلکرسٹ کی دیگر نالغات حسب  
 ذیل ہیں<sup>(۲)</sup> :-

۱ - ہندوستانی زبان پر مختصر مقدمہ (The Anti-Jargonist) کلکتہ - ۱۸۰۰ء -

(۲) نمونے کے لیے ملاحظہ ہو - محمد عتیق صدیقی کی کتاب، گل کرسٹ اور اس کا عہد -

(۱) بحوالہ محمد عتیق صدیقی، گل کرسٹ اور اس کا عہد - خلیل الرحمن داؤدی - مقدمہ قواعد زبان  
 اردو - سید محمد ، ارباب نثر اردو - رام بابو سکیمہ ، تاریخ ادب اردو وغیرہ -

- ۲ - نو اعداد یعنی نفسہ افعال فارسی معہ مصدرات آن و مرادفات ہندوستانی)  
 A new theory of the Prospects of Persian Verbs)
- ۳ - ہندی کی آسان مسعیں (Hindee Exercises for the first and Second  
 Examination in Hindustanee, at the College of Fort William,  
 Calcutta.) کلکتہ - ۱۸۰۱ء
- ۴ - معلم ہندوستانی (The Strangers' East India Guide to the Hindu-  
 stanee, or the Grand Popular Language of India, کلکتہ - ۱۸۰۱ء
- ۵ - ہاضی ہندی (The Hindee Manual or Casket of India.) دو جلدیں  
 کلکتہ ۱۸۰۲ء - ۱۸۰۳ء
- ۶ - علمی خاکے (Practical Outlines or a sketch of Hindustanee  
 Orthoepey in Roman Characters.) کلکتہ - ۱۸۰۲ء
- ۷ - انالی ہندی (Hindee Moral Preceptor, and Persian Scholar's  
 Shortest Road to Hindustanee Language, or Vice Versa.) کلکتہ ۱۸۰۳ء
- ۸ - ہندی الفاظ کی قرأت (The Hindee Roman Orthoepical Elocution)  
 کلکتہ - ۱۸۰۳ء
- ۹ - ہندی عربی آنسہ (Hindee-Arabic Mirror). کلکتہ - ۱۸۰۴ء
- ۱۰ - مکالمات انگریزی و ہندوستانی (Dialogue, English & Hindee)
- ۱۱ - مسرے مصرعے (The Oriental Fabulist). کلکتہ - ۱۸۰۳ء
- ۱۲ - ہندی داستان گو (The Hindee Story) کلکتہ ۱۸۰۲ء - ۱۸۰۳ء
- ۱۳ - The General East India Guide and Vade Mecum.  
 اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۲۵ء میں لندن میں شائع ہوا -

### فورٹ ولیم کالج کے مصنفین - مر امن

فورٹ ولیم کالج کے دسویں لکھیے والوں میں سب سے زیادہ شہرت مر امن دہلوی کو نصیب ہوئی۔ سرسند احمد خان کے قول کے مطابق ”جو مدرسہ مر امن سرکو نظم میں حاصل ہے وہی مر امن کو در میں ہے“۔ مر امن کے حالات زندگی بھی فورٹ ولیم کالج کے دیگر مشہور و معروف مصنفوں کی طرح بردہ تاریکی میں ہیں۔ مورخین کا زیادہ تر انحصار ”ناع و بہار“ اور گنج حوی ”کے دساحوں میں مر امن کے سانات پر ہے (۱)۔

(۱) محمد عتیق صدیقی، گل کرست اور اس کا غم - ناع و بہار مر امن - ممتاز منگھوری -  
 ڈاکٹر وحید قریشی، ناع و بہار ایک تجزیہ -

لیکن وہ اپنے مجمل ہیں کہ ان کے تمام حالاتِ زندگی پر روشنی نہیں پڑتی۔ فاس ہی ہے کہ میر امن محمد سابی عہد کے بالکل آخری دور میں نا اس کے بعد احمد شاہی دور (۱۷۳۸-۱۷۵۳ء) (۱۱۶۱-۱۱۶۷ھ) میں پیدا ہوئے<sup>(۲)</sup>۔ اور جب انہوں نے دلی سے نفل مکانی کی ہو انی عمر ضرور بھی کہ احمد شاہ ابدالی کے حملے اور سورج مل جاٹ کے ظلم و ستم کو اچھی طرح دہن سن کر سکے بھی، جس کا ذکر انہوں نے باغ و بہار کے دساحے میں کیا ہے<sup>(۳)</sup>۔ دلی سے میر امن عظم آباد پہنچے جہاں فرائض سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے برساً ۳۵ برس گزارے۔ چونکہ باغ و بہار کے دیباچے میں انہوں نے اس صحن میں صرف ایک فقرہ ”کسے برسِ بلندۃ عظم آباد میں دم لیا۔ کچھ نئی کچھ بگڑی آخر وہاں سے بھی ناؤں اکھڑے“ لکھا ہے، اس لیے بعض محققین اور نفاذوں کو غلط فہمی ہوئی کہ انہوں نے عظم آباد میں صرف چند ماہ نا دو چار سال بسر کئے۔ میر امن عظیم آباد سے ۱۷۹۸ء کے اوائل میں کلکتہ پہنچے<sup>(۴)</sup> اور کچھ عرصہ لے کر رہنے کے بعد نواب دلاور جنگ کے بیٹائی میر محمد کاطم کے انالی مقرر ہوئے۔ اپریل ۱۸۰۱ء میں میر بہادر علی حسنی کی سفارس پر فورٹ ولیم کالج کے سیمینڈر دوسانی میں مسمی ہو گئے۔ کالج کوسل کی کاروائیوں میں ۲۹ اپریل ۱۸۰۱ء کو ان کے مقرر کا ذکر ملتا ہے، نیز ۴ جون ۱۸۰۶ء تک کالج میں ان کی ملازمت کا ثبوت ملتا ہوا ہے۔ ۴ جون ۱۸۰۶ء کی کارروائی کے مطابق اس حار ماہ کی منخواہ دے کر ملازمت سے سبکدوس کرنے کا فصلہ کیا گیا<sup>(۵)</sup>۔

فورٹ ولیم کالج میں ملازمت کے دوران میں ان کی دو نالفاظ سائے ہوئیں، ”باغ و بہار“ اور ”گنجِ خوبی“۔ ”باغ و بہار“ کا ماحد محسن کی ”نوطرزِ مرصع“ ہے<sup>(۱)</sup> اور ”گنجِ خوبی“ اخلاصِ محسنی کا ملخص ترجمہ ہے۔ میر امن کے بیان کے مطابق ”باغ و بہار“ کا سنِ نالاف ۱۸۰۲ء/۱۲۱۷ھ ہے اور باغ و بہار اس کا تاریخی نام، لیکن بعض دیگر شہادیوں سے

(۱) مقدمہ باغ و بہار مرتبہ ممتاز حسن۔ مقدمہ باغ و بہار مرتبہ ممتاز منگلوری، ڈاکٹر وحید قریشی۔

باغ و بہار ایک تجربہ۔

(۲) مقدمہ باغ و بہار مرتبہ ممتاز حسن۔ مقدمہ باغ و بہار مرتبہ ممتاز منگلوری، ڈاکٹر وحید قریشی۔

باغ و بہار ایک محزیہ۔

(۳) ان فرائض کے لیے ملاحظہ ہو مقدمہ باغ و بہار، ممتاز حسین، مقدمہ باغ و بہار ایضاً۔

(۴) محمد عتیق صدیقی، گل کرسٹ اور اس کا عہد۔

(۵) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کا مقدمہ قصہ چار دوریں، در مقدمات۔ حافظ

محمود شیرانی کا مضمون قصہ چار دوریں، در مقالات۔ اکثر کتب تاریخ ادب میں لکھا ہے کہ میر امن نے اسے فارسی قصہ چہار درویش سے ترجمہ کیا ہے جسے امیر خسرو نے لکھا تھا، لیکن یہ دونوں باتیں صحیح نہیں۔

ثابت ہونا ہے کہ میر امن نے قصہٴ چار دروس کے نام سے یہ کتاب ۱۸۰۱ء میں مکمل کر لی تھی اور ۱۲ جنوری ۱۸۰۲ء کو ہرکارہ برس میں اس کے ۵۸ صفحات جھب بھی چکے تھے<sup>(۱)</sup>۔ ممکن ہے بعد ازاں حب کالج کی دیگر تمام کتابوں کی طاعت ملوی ہو گئی ہو اس دوران میں۔ میر امن نے اس پر نظرِ نانی کر کے اسے باغ و بہار بنا دیا ہو، جو ۱۸۰۳ء میں پہلی بار کلکتے سے شائع ہوئی۔

”باغ و بہار“ فورٹ ولیم کالج کی مول برس مطبوعات میں سے ہے اور اس نے میر امن کو شہرہ لازوال بخشی ہے۔ اس کی فصاحت و سلاست نے اسے وہ مولِ عام دیا ہے کہ جب تک اردو زبان ہے نہ زندہ رہے گی۔ باغ و بہار میں میر امن کی شخصیت اور ان کے زمانے کی دلی کی نہد کا بڑا روس عکس اور گہرا رجاؤ ملتا ہے۔ اس میں اسے عہد کی زندہ اور محرک تصویریں پس کی گئی ہیں، اسی لیے ڈاکٹر سید عبداللہ اس کی نثر کو ”زندہ نثر“ کہتے ہیں۔ باغ و بہار کی زبان نہ صرف بے تکلف بول چال کی نا محاورہ زبان ہے بلکہ داستان کے فنی تقابوں سے نورے طور پر ہم آہنگ بھی ہے۔ میر امن کو موزوں اور مناسب الفاظ کے استعمال پر قدرت حاصل ہے۔ زبان میں سادگی، سلاست اور روانی ہے اور جملوں کی ساخت و ترتیب میں ایسا تناسب ہے کہ ٹھہراؤ کے باوجود ایک حرکت پائی جاتی ہے جسے کلام الدین احمد ”باغ و بہار“ کی عبارت کا خاص آہنگ قرار دیتے ہیں۔ باغ و بہار میں واقعات، مناظر اور ترسیات کی موزوں اور دلچسپ جزئیات نے تنوع اور جاذبہ پیدا کر دی ہے، اور ایک عام رنگ کے باوجود یکسانی نا بے رنگی نہیں ہے<sup>(۲)</sup>۔ نمونے کے طور پر ملاحظہ ہو۔

”آگے روم کے ملک میں کوئی سہسہا نہ تھا کہ نوسبرواں کی سی  
عدالت اور حاکم کی سی سخاوت اس کی ذات میں بھی..... اس کے  
وقت میں رعیت آباد، حراہ معمور، لسكرمر فہ، عرب غربا آسودہ،  
ایسے جن سے گران کرے اور حوسی سے رہے کہ ہر ایک گھر میں  
دن عید اور رات سب رات تھی“۔

میر امن کی دوسری نالیف ”گنج حوی“ ملاحسن واعظ کسفی کی ”اخلاقِ محسنی“ کا ملخص ترجمہ ہے، جسے میر امن نے ۱۸۰۲ء میں لکھنا شروع کر کے ۱۸۰۳ء میں مکمل کیا۔ اس کتاب میں بھی میر امن نے حدیثِ طبع سے کام لیا ہے، اگرچہ باغ و بہار کی طرح نہیں، بھر بھی اسے آزاد ترجمہ کہا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کو چنداں شہرت حاصل

(۱) محمد عینی صدیقی، گل کرسٹ اور اس کا عہد۔

(۲) باغ و بہار کی معمولیت کے اسباب اور اسلوب کے لیے ملاحظہ ہو۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، میر امن سے عبدالحی تک۔ مولوی عبدالحی، مقدمہ کلام الدین احمد فن داستان لونی وغیرہ۔

نہیں ہوئی۔ یہ کتاب اخلاص سے متعلق ہے نفول میر امن ”از سکہ جتنی خوبیاں انسان کو چائیں اور دنیا کی نیک نامی اور خوش معاشی کے لیے درکار ہیں سو سب اس میں بیان ہوئیں، اس واسطے اس کا نام گنجِ خوی رکھا۔“

### شیر علی افسوس

میر شیر علی افسوس فورٹ ولیم کالج کے مشہور مصنفین میں سے ہیں۔ ان کی سہرب بقول ڈاکٹر وحید فریسی ”انہی زمانے میں ”ناغِ اردو“ کی وجہ سے بھی اور بعد میں نام آوری ”آرائسِ محفل“ کی وجہ سے ہوئی“۔ میر شیر علی افسوس نے ”ناغِ اردو“ کے دیباچے میں اپنے حالاتِ زندگی مختصراً بیان کیے ہیں۔ ان کے آباو اجداد حصر امام جعفر صادقؑ کی اولاد سے تھے اور حاف (ادیان) سے بندوساں آ کر آگرے کے قرب نرنول میں مقیم ہوئے۔ مجد ساء کے عہدِ حکومت میں افسوس کے دادا سید علام مصطفیٰ خان انہی دونوں سب سے علی مظفر حاف و سید علام علی حاف کے ہمراہ دلی“ چلے گئے اور بنوں نے وہاں نواب عمدہ الملک امیر حاف کی ملازمت اختیار کر لی۔ اسی زمانے میں (۱۷۴۵-۱۷۷۸ء) افسوس سید علی مظفر خان کے یہاں پیدا ہوئے“۔“۔ شہانوں، مرہٹوں اور حائوں کے ہاتھوں دلی“ کی بربادی کے بعد افسوس لکھنؤ چلے گئے اور نواب سالار جنگ بہادر کے یہاں ملازمت کر لی۔ نواب صاحب کے بعد ان کے بیٹے میر نواز علی خان سرفراز جنگ نے بھی قدر دانی کرے ہوئے کفالت جاری رکھی۔ انہی دنوں افسوس لکھنؤ میں مرزا حواں بخت جہاندار ساء ولی عہد سلطنت مغلیہ کے مصاحب بھی رہے، پھر نواب آصف الدولہ کے نائب حسن رضا خان سرفراز الدولہ نے بھی ان کی سرپرستی کی اور انہی کے خواہر زادے مرزا فخر الدین احمد حاف عرف مرزا جعفر کے درجے وہ ریڈنٹ لکھنؤ کرنل سکٹ سے متعارف ہوئے، جنہوں نے ۱۵ اکتوبر ۱۸۰۰ء“ سے ان کا فورٹ ولیم کالج کے لیے انتخاب کر لیا۔ افسوس کرنل سکٹ سے زائد راہ لے کر کلکتے پہنچے اور وہاں نو برس علمی خدمات انجام دے کر ۱۹ دسمبر ۱۸۰۹ء کو انتقال کر گئے۔ وفات کے وقت وہ کالج میں چف ماسی کے عہدے پر مامور تھے۔

میر شیر علی افسوس نے فورٹ ولیم کالج میں گورنمنٹ کے ایما پر نسخہ سعدی کی گلسان کا

(۱) ڈاکٹر وحید فریسی، کلاسیکی ادب کا تعمیری مطالعہ۔

(۲) پیدائش کی یہ قیامی تاریخیں ڈاکٹر وحید فریسی کے اسد لال پر مبنی ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ان کی کتاب کلاسیکی ادب کا محفلی مطالعہ۔ ص ۹۳-۱۵۸۔ باغِ اردو، مطبوعہ مجلس ترقی ادب کے مقدمے میں کلب علی خان فانی نے بھی تاریخ پیدائش معین کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ان کے استدلال سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔

(۳) شیر علی افسوس کی کرنل سکٹ سے ملاقات ۱۷ اکتوبر ۱۸۰۰ء کو ہوئی تھی لیکن شاید نصف مہینے کی حسابی سہولت کے پیش نظر ۱۵ اکتوبر سے ان کا تقرر عمل میں آیا۔



”باغِ اردو“ کے نام سے ترجمہ کیا جس کی تکمیل ۲۱ اپریل ۱۸۰۲ء کو ہوئی۔ اگرچہ اس کتاب کی زبان سادہ و سلیس ہے مگر اس میں اسلوب کی کوئی حاشی نہیں اور اس میں انہی طرف سے کہیں کہیں حملے بھی ٹھائے ہوئے ہیں۔ اس کی نسبت ”آرائسِ محفل“ کا اسلوب زیادہ جادب رکھتا ہے۔ آرائسِ محفل افسوس کا کارنامہ حاش ہے۔ یہ سچا رائے ٹالوی کی مشہور تاریخ ”حلاۃ الخوارزم“ ۵ اردو ترجمہ ہے۔ اسے افسوس ۱۸۰۳ء (۱۲۱۹ھ) میں مسیحی ایچ مارٹن کے اہتمام سے شروع کر کے ۱۸۰۵ء میں مکمل کیا۔ ترجمے کے علاوہ افسوس نے اپنے دور تک اس کی تکمیل بھی کی اور یہ پہلی بار ۱۸۰۸ء میں کلکتے سے شائع ہوئی۔ تاریخ کی کتاب ہونے کے باوجود اسے سادہ و سلیس اسلوب کی بنا پر یہ بارے دور میں ادب کی کتابوں میں شامل ہونے لگی ہے<sup>(۱)</sup>۔ ”آرائسِ محفل“ سے اسلوب کے لیے یہ نمونہ ملاحظہ ہو:-

”حب سے نہ مر کر حاکی آرام دہ حیوانات ہوا، سسکڑوں لا لہوں  
سہر فصے سے اور سے حائے ہیں، کوئی ادنیٰ کوئی اعلیٰ، لیکن  
ہندوستان کی سر زمین عالم سے برا ہے، کوئی ولادت اس  
کی وسعت کو نہیں پہنچی اور کسی مملکت کی آبادی اس کو نہیں  
لگتی۔ یہاں کی ہر ایک کسی میں گہا گہی، جاغا ایک نئی طرح  
عالم، ہر سہر و قصہ میں سہری، نائبرہ متعدد سرانیں، مسافر  
کے واسطے ہر موسم کے اور بے بھونے اور اقسام کی عداوتیں، ادب  
میں مسجدمیں، حاشیوں، مدر سے، ناعاب۔ غریبوں کے کسوں مسافروں  
کے لیے متعدد مکانات، قلعے بڑے بڑے مضبوط وسعت میں اسے نہ  
سسکڑوں ڈاؤن ان میں ہیں اور رفعت میں اس قدر نہ نادل ان کے  
سچے برسی۔“

### نہال چند لاہوری

نہال چند لاہوری کو انہی مآلف ”مدبِ عشق“ کی بدولت سہرے حبس ہوئی۔ ان کے حالات زندگی بھی صرف اسی قدر معلوم ہو سکے ہیں جسے انہوں نے خود ”مدبِ عشق“ کے دساحے میں لکھ دے ہیں۔ نہال چند، ساہجہاں آباد کے رہنے والے تھے اور ڈیوڈ رابرٹس<sup>(۲)</sup> کے درجے حاکم کلکتہ تک ان کی رسائی ہوئی۔ محمد عشق صدیقی کے بیان

(۱) مرکزی اردو بورڈ نے بھی ۱۹۹۶ء میں سچا رائے ٹالوی کی تاریخ کا ترجمہ کرا کے شائع کیا ہے۔ لیکن اس کے مترجم نے اصل متن میں اس قدر کثرت سے اشعار شامل کر دیے ہیں کہ اصل متن کی صورت مسخ ہو گئی ہے۔

(۲) خلیل الرحمن داؤدی - یہ نام کبیران ولورٹ لکھتے ہیں - (دیباچہ مدبِ عشق، طبع مجلس برق اردو لاہور)۔

کے مطابق نہال چند کالج کے باقاعدہ ملازم نہیں تھے بلکہ گلکرسٹ نے خصوصی فرمائش کے ذریعے ان سے یہ کتاب لکھوائی تھی۔

”مذہبِ عشق“ سیخ عزت اللہ سنگالی کی تصنیف ”داسان ناچ الملوک و گل نکاؤلی“ (۱۷۲۱ء) (۱۲۴۷ھ) زبانِ فارسی) کا ترجمہ ہے۔ اسے لفظی ترجمہ نہیں کہا جاسکتا، نہال چند نے بھی دساجے میں لکھا ہے ”نظم کتاب کو کئی مواقع میں بالکل چھوڑ دیا اور بعضے مقام میں جو مناسب دیکھا تو بطور انتخاب کے ترجمہ کیا، کہیں تو نظم میں اور کہیں نثر میں۔ سو اس کی عبارت کی ترکیب بھی بعضے مواقع میں بدلی ہے، کہیں کہیں فلم انداز کی ہے۔“ - مذہبِ عشق کی تکمیل ۱۸۰۳ء (۱۲۱۷ھ) میں ہوئی۔ اسے فورٹ ولیم کالج کی دیگر کتابوں میں اس اعشاریے افرادیت حاصل ہے کہ اس میں ہندی الفاظ کی بجائے فارسی برآکب اور بر سکوه فارسی الفاظ کے استعمال کی طرف زیادہ جھکاؤ ہے۔ محاورات اور رورمرہ کم اور سببہات و اسعارات زیادہ ہے۔ گھریلو الفاظ بھی بڑی بے تکلفی سے درجے گئے ہیں۔ نمونہ<sup>۲</sup> ایک احساس ملاحظہ ہو:-

”اس نے کہا اے بوسانِ سرداری کے بونہال اب دک سری گلشنِ جوانی کا سگوفہ بھی نہیں بھولا اور بہارستانِ سبابت کے حمنوں کو نادِ صرصر کی ببری کا جھونکا بھی نہیں لگا۔ کیا لارم ہے جو تو سفر کر کے آنشکدہ محنت میں عمداً آپ کو گرائے اور آس سرگردانی، قصہٴ نادمائی میں قصداً لگائے؟ مجھ کو بھی اس کیفیت سے مطلع کر کہ میں بھی میرے ساتھ حب نک میرے قالب میں جان رہے اور وہ مہم سر نہ ہو، سعی و تردد کروں کہ اب مجھ کو میرے بغیر یہ گھر بندی خانہ ہے“ (۲)۔

### مظہر علی ولا

مظہر علی ولا فورٹ ولیم کالج کے مترجمین میں سے تھے۔ سنسکرت تذکرہ نگاروں نے ان کا نام لطف علی اور عرف مظہر علی لکھا ہے۔ نخلص کے سلسلے میں اختلاف ہانا جاتا ہے۔ مظہر علی ولا نے ”جہانگیر شاہی“ کے دیباچے میں اپنے حالاتِ زندگی اور اپنا شجرہ بیان کیا ہے جس کے مطابق ان کے آباو اجداد اصفہان سے ساہجہان آباد میں آکر متوطن ہوئے۔ ان کے دادا اور پھر والد سلیمان علی خاں عرف مرزا محمد زمان و دادا محمد شاہ نادر شاہ کے ملازم رہے۔ ولا فورٹ ولیم کالج کی ملازمت میں آنے سے پہلے نجف قلی خاں بہادر مظفر جنگ، شہزادہ جوان بخش اور آصف الدولہ کی مصاحبت میں رہے۔

(۲) مآخذ اور اسلوب کے لیے ملاحظہ ہو، گیان چند جین - اردو کی نثری داستانیں - محمد یحییٰ دہلوی - سیر المصنفین، مقدمہ مذہبِ عشق طبع مجلس ترقی ادب لاہور۔

فورٹ ولیم کالج نے فادہ نہ بھی دے سکا بلکہ اسوس کی طرح مرزا جعفر کے توسط سے ٹرنل سٹاٹ تک پہنچے اور ۱۰ نومبر ۱۸۰۰ء سے محاسب مترجم ملازم ہو کر کلکتہ گئے۔ ولا ۳ اگست ۱۸۰۲ء کو ایک نارملارٹ سے برطرف بھی ہوئے لیکن ان کی اہل برکاج کونسل نے ۳ اکتوبر ۱۸۰۲ء کو ان کی بحالی کا فیصلہ کر دیا۔

مظہر علی ولا کی نالغاب میں ”مادہ بویل اور کام ٹنڈلا“، ”رحمہ“ ”کرما“، ”ہفت گہن“، ”نارنج“ ”سہر ساہی“، ”چھانگر ساہی“ اور ”سال محسی“ وغیرہ شامل ہیں۔ کالج کونسل نے وقتاً فوقتاً ولا کو مادہ بویل اور کام ٹنڈلا، ہفت گہن اور سال محسی پر اعامات بھی دیے۔ ولا کی نالغاب میں سال محسی زیادہ مشہور ہے جسے انہوں نے ٹیکرسٹ کے اہم ہر ۱۸۰۳ء میں برج بھاسا سے اردو میں مقلد کیا۔ اس میں محس لہاساں ہیں جو صدیوں قدم سسکرت ٹلاسک سے ماخوذ ہیں۔ ان سب لہاسوں کا اس سطر حالصاً ہندوآہ ہے۔ سال محسی کی ریاں ہندی آہر ہے۔ سری فارسی کے الفاظ حال خال ہی استعمال ہوئے ہیں۔ لیکن ہندی کے الفاظ بھی بڑے سک اور ہلکے ہلکے ہیں غالباً اس کتاب کے موضوع کا تعلق تھا کہ ان میں ہندی سسکرت کے الفاظ کا تکرر استعمال ہو رہا ہے جس سبب سے ان کی کئی جہ وہ غورے طور پر ادا کر رہے ہیں اور اس کا ناثر ایسا گہرا نہ ہونا محسوس ہے۔ اس کتاب کے ترجمے میں لٹو لال لوی بھی شامل تھے۔“ عبارت کا مجموعہ ملاحظہ ہو:-

”نہ احوال۔ یوان ۵ سا میں، ایسے سوار دیوا، گہر دو بولے آنا،  
 ہر راہ کا سنا رہ کی سڑ سے لے کل ہا کہ، نکھا بڑھا، کھانا  
 سما، سونا، راج کاج، سب لکھو بھ سنھا۔ ہسہ اس کی صورت کا  
 لکھو نکھو دیکھا اور روبا۔“

### لٹو لال کوی۔

لٹو لال لوی سسکرت، ہندی، برج بھاسا اور دیگر برہکریوں پر عالمانہ قدرت رکھتے تھے۔ ٹیکرسٹ نے ۳ جنوری ۱۸۰۲ء کو کالج کونسل کو حو مطالبات پس کئے تھے ان میں برج بھاسا کے ایک مہسی کے نمونے کا مطالبہ بھی تھا جسے تسلیم کرے ہوئے کالج کونسل نے ۷ جولائی ۱۸۰۲ء کو لٹو لال کوی کا نمونہ منظور کیا۔ ۱۱ جون ۱۸۰۳ء کو ٹیکرسٹ کے جاسن کی تجویز پر ان کی اسامی کو عرر ضروری قرار دے کر انہیں برطرف کر دیا گیا لیکن بعد ازاں دوبارہ ان کا نمونہ عمل میں آنا۔

لٹو لال کوی نے سال محسی کے ترجمے میں مظہر علی ولا اور سگھاس بیسی کے ترجمے میں کاظم علی حوان کی معاونت کی۔ ان کی انی نالغاب میں ”بریم ساگر“، ”راج ننتی“،

”سبھا بلاس“ ، ”سبھا دیو بلاس“ ، اور ”لطائف ہندی“ شامل ہیں۔ کوی کا زیادہ تر کام ہندی سے متعلق ہے۔ انہوں نے ہندی اور بھاسا وغیرہ سے اردو میں ترجمہ کرنے والوں کی مدد کی اور ان کے اثر سے فورٹ ولیم کالج کے لکھنے والوں کی تحریروں میں ہندی اور سنسکرت کے سک الفاظ نکتہ استعمال ہونے لگے۔

”لو“ لال کوی کی تالیفات میں ”نرم ساگر“ بیگم گنتا کے دسویں باب کا ترجمہ بھی ہے۔ اس میں انہوں نے فعل سنسکرت الفاظ و تراکیب سے احتراز کیا ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۰۳ء میں شائع ہوا اور بعد ازاں نہ صرف کئی ایڈیشن چھپے ، بلکہ انگریزی میں بھی اس کے دو ترجمے ہوئے۔ ”لطائف ہندی“ ، ہندوستان کی ظرفانہ کہانیوں اور لطائف کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۸۱۰ء میں شائع ہوئی۔ ”لو“ لال کوی کے اسلوبِ بیان کا ایک نمونہ نس کا جانا ہے:-

”نرمیں کہیں لگا ، جب بلا“ لگن آوے حواس میں مندر اٹھاوے ،  
جب تک وہ لگن رہے تب تک کام اس میں جاری رکھے ، اور جب  
بلا لگن سوچکے تب اس کا کام موقوف کرے۔ اسی طرح بلا لگن  
میں ہی وہ سارا مکان ساری تر لاوے تو اس کا آٹوٹ بھنڈا رہو۔ اور  
لچھمی اس کے ہاں سے کبھی نہ جاوے۔ یہ باب سن کر  
راجہ میں حوس ہوا۔ دیوان کو بلانا اور مندر اٹھانے کی اجازت  
دی کہ ہم اچھی جگہ ڈھونڈ کر محال بناؤ۔ انے میں بلا لگن بھی  
آن مہکا ، اس مندر کی ننوی دس دس میں نہ ادا ہوئی کہ راجہ  
بلا لگن میں محل بوانا ہے۔ جسے کارنگر اس میں کام کرے بھی ، وے  
اٹھ کر بلا لگن سائے بھی۔ کہیں کام اس میں سونے کا اور کہیں  
روپے کا اور کہیں لوہے کا اور کہیں کاٹھ کا ، نئی نئی طرح سے بنتا تھا۔“

### خلیل علی خاں اشک

خلیل علی خاں اشک غالباً اردو کے اسے واحد ادیب ہیں کہ ان کی کتاب جنی مشہور ہوئی گئی خود وہ فراموس ہونے لگے۔ ان کے حالاتِ زندگی یکسر تاریکی میں ہیں۔ فورٹ ولیم کالج میں ان کا تفرز ۹ اگست ۱۸۰۱ء کو عمل میں آنا لیکن اس سے پہلے انہوں نے گئرسٹ کی فرمائیں برکٹی سو صفحات پر مشتمل داستان ”امیر حمزہ“ ۱۸۰۱ء میں تصنیف کی۔ یہ اسک کی مقبول ترین کتاب ہے۔ اس میں ان کا اسلوبِ بیان انتہائی سلیس اور بے تکلف ہے۔ ان کے ہاں مر امن اور شیر علی افسوس کی طرح دلی کا ٹھٹھ محاورہ اور روز مرہ نہیں ملتا لیکن سادگی کے ساتھ ساتھ شیرینی اور گھلاوٹ موجود ہے۔ فارسی

اور ہندی کے الفاظ میں مناسب ہے اور مناسب طول کے رواں قمرے ہیں۔ داسان میں بہت سے رسم و رواج خالص ایرانی ہیں جو نصیے کے فارسی الاصل ہونے کا مظہر ہیں، لیکن اشک نے بہت سی ناسی ہندوستانی معاصر کی بھی اس میں نڑھا دی ہیں<sup>(۱)</sup>۔ داسان امیر حمزہ کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

”چالسون دن صبح کو اٹھ کر غسل کیا اور اگلے کٹرے میں کر  
عصا کو ہاتھ میں لیا کہ آج آبِ چل کر الفس و رب سے ملاقات  
کے لئے کہ اپنے بیٹے اس سہر میں سوا اس کے اور کسی سے واسطہ نہیں  
ہے۔ یہ کہہ کر گھر سے نکلا اور ورنہ کے گھر کی طرف حلا“۔

اشک کی دیگر کتابت میں ”واعابِ آذر“ ابوالفضل کے ”آذر نامے“ کا ترجمہ ہے جو اشک نے کسان و لم ٹلر کے ایما پر ۱۸۰۹ء میں لکھی۔ ”قصہ کرارِ حین“ کو انہوں نے ۱۸۰۴ء میں پٹری ہوٹ کے ایما پر فارسی سے اردو میں مسلسل کیا اور ”رسالہ کائنات“ گلکرسٹ کی فرمائش پر ۱۸۰۳ء میں مرتب ہوا۔

### حیدر بخش حیدری

حیدر بخش حیدری کے خالابِ زندگی کا انحصار زیادہ تر ”نونا کہانی“ کے دساحے پر کیا جاتا ہے۔ حیدری دلی کے رہنے والے تھے، آبا و اجداد مجھ اسرف سے آئے تھے۔ والد کا نام سد ابو الحسن تھا۔ ماس ہے کہ حیدری ۱۷۶۷-۱۷۶۸ء میں پیدا ہوئے<sup>(۲)</sup> دلی کی نبابی کے بعد ان کے والد بنارس چلے گئے۔ حیدری بھی ہمراہ تھے۔ وہاں نواب علی ابراہیم خاں خلیل اور مولوی غلام حسن غازی پوری سے تعلیم پائی۔ فورٹ ولیم کالج میں مشیوں کی ضرورت سنکر کلکتے کا رخ کیا اور ”قصہ مہر و ماہ نہ تریب سہر“ لکھا۔ جان گلکرسٹ کو یہ قصہ پسند آیا اور انہیں ۴ مئی ۱۸۰۱ء سے منسی رکھ لیا گیا۔ ۱۸۱۳ء سے پہلے ملازم سے سکدوس ہو کر بنارس چلے گئے جہاں ۱۸۲۳ء (۱۲۳۹ھ) میں ان کا انتقال ہوا۔

کہا جاتا ہے کہ حیدری فورٹ ولیم کالج کے مصنفین میں سب سے زیادہ کتابوں کے مؤلف تھے۔ حیدری کی تصانیف میں سے اب تک جن کا علم ہو سکا وہ یہ ہیں:-

- ۱۔ ”قصہ مہر و ماہ“ ۲۔ ”قصہ لیلیٰ مجنوں“۔ یہ امر خسرو کی فارسی مثنوی کا اردو ترجمہ ہے۔ ۳۔ ”نونا کہانی“ ۱۲ جنوری ۱۸۰۲ء کو ٹلی گراف برس کلکتہ میں چھپ رہی تھی لیکن ۱۸۰۴ء میں پہلی بار مضطرب عام بر آئی۔ سنسکرت کی ستر کہانیوں

(۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اربابِ لٹر اردو، ہذیل حلیل علی خان اشک۔

(۲) تاریخِ پیدائش سے متعلق اس قیاس کے لیے ملاحظہ ہو ڈاکٹر وحید قریشی کا مضمون حیدر بخش حیدری در کلاسیک ادب کا حقیقی مطالعہ۔

میں سے ضیاء الدین نجیبی نے باون کو طوطی نامہ کے نام سے فارسی میں منقل کیا تھا ، سید محمد قادری نے ان میں سے ۳۵ کا انتخاب کر کے مزید سادہ فارسی میں لکھا ، جس سے حیدری نے یوں کہانی نالیف کی ۔ حیدری نے انہیں اردو میں منقل کرنے ہوئے بلخص اور رد و بدل بھی کیا ہے ۔ ۴ قصہ ”حام طائی“ (آرائس محفل) ۱۹ اگست ۱۸۰۳ء کو زیر طبع بھی اسے فارسی سے اردو میں منقل کیا گیا ۔ ۵ ”ہفت سکر“ ، یہ نظامی کی ہفت سکر کا ترجمہ ہے اور ۱۸۰۵ء میں مکمل ہوا ۔ ۶ ”گل مغرب“ ”ملا حسین واعظ کافسفی کی ”روصہ السہدا“ سے حیدری نے ”گلشن شہیدان“ کے نام سے ترجمہ کیا تھا جس سے یہ انتخاب ۱۸۱۲ء میں مرتب کیا ۔ ۷ ”گزار دانس“ عنایت اللہ کی بہار داس کا ترجمہ تھا ۔ اب نااب ہے ۔ ۸ ”گلشن ہند“ شعرائے اردو کا تذکرہ ہے ۔ ۹ تاریخ نادری ، یہ محمد سہدی کی ”چہانکسائی نادری“ کا ترجمہ ہے اور ۱۸۰۹ء (۱۲۲۴ھ) میں مکمل ہوا ۔ ۱۰ ”گلشنہ“ حیدری“ ، حیدری کے منفرد مضامین ، حکایات ، منظومات اور دیباچوں کا مجموعہ ہے جو ۱۸۰۲ء (۱۲۱۷ھ) میں برسب دیا گیا ۔

حیدری اپنے اسلوب نگارش میں سادگی کے ساتھ رنگینی کو ضرور نیس نظر رکھتے ہیں ۔ فافے ، سسپہ ، و اسعارے کا لے نکاح استعمال کرتے ہیں ۔ علم فہم محاوروں اور مسعمل صرب الاسال کا بھی ان کے یہاں بکثرت استعمال ملتا ہے ، ہندی اور فارسی الفاظ میں دلکس تناسب ہے ۔ ”آرائس محفل“ کا نمونہ ملاحظہ ہو :-

”اکلے زمانے میں طے نام من کا ناساہ تھا ، نہایت صاحبِ جسم و عالی  
 حاہ ۔ فوج افواج کی طرف سے فرحہدہ حال ، رروحوابر سے مالا مال ،  
 رعس اس کی پردہ ہرار اور ساہ بے سار ۔ القصہ اسے حکا کی سٹی کو  
 نکاح میں لا کر اسدوار بحر جوانی کا ہوا ، نارے خدا کے فضل سے  
 کسے دنوں میں اسی بیگم سے ایک لڑکا مہر لیا ہوا“۔

### میر بہادر علی حسینی

میر بہادر علی حسینی ۴ مئی ۱۸۰۱ء کو دو سو روئے ماہوار بر فورٹ ولیم کالج میں جب مسی مقرر ہوئے ۔ دہلی کے باسدے تھے ”۔“۔ میر امن بھی اسی تاریخ کو ان کی سفارش پر ملازم ہوئے تھے ۔ جان گلکرسٹ جب کالج سے مسعفی ہو کر حلے گئے تو حسینی بھی

(۱) ارباب نثر اردو کے مؤلف نے طبقات شعرائے ہند کے حوالے سے ان کے والد کا نام سید عبداللہ کا ظم لکھ کر کہا ہے کہ انہوں نے شاہ عبدالعادر دہلوی کا اردو ترجمہ قرآن مجید شائع کیا تھا ۔ ڈاکٹر وحید میریسی کو اس سے اختلاف ہے ، لیکن خود ڈاکٹر صاحب کی کتاب میں گارماں دتاسی کے اقتباس میں سید عبداللہ کو حسینی کا بیٹا لکھا ہے اور اسی صفحے پر کریم الدین کا بیان التہانی مبہم ہے ۔ ملاحظہ ہو ”کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ“ ، ص ۱۹۵ - ۱۹۷ ۔

۱۹ نومبر ۱۸۰۳ء کو ملارب سے الگ ہو گئے۔ ان کی جگہ میں شیر علی افسوس چیف منسٹر ہوئے۔ حسنی نے فورٹ ولہ کالج میں ملارب کے دوران میں حار کتابیں تالیف کیں، اس کے علاوہ دوسرے لکھے والوں سے اسراک بھی کیا۔

کالج میں حسنی کی پہلی کتاب ”دریے نظر“ ہے جو مسوی ”سحرالسان“ کی تفری تلخیص ہے۔ ”نہ اخلاق بندی“ سے پہلے لکھی گئی، لیکن اس کے بعد ۱۸۰۳ء میں چھپی۔ دوسرے انڈنس کے وفٹ کلکرس کے حکم سے میں سر شیر علی افسوس نے اس پر نظر ثانی کی۔ حسنی کی دوسری اہم کتاب ”اخلاق بندی“ ہے۔ سسکرب الاصل اخلاقی حکمان کے اس مجموعے کو حسنی نے کلکرس کی فرمانوں پر مسی ناح الدس کی ”مفرح“ القلوب“ سے اردو میں منسلک کیا۔ ۱۸۰۲ء میں نہ دیونا گری رسم الخط میں پہلی گراف برس میں چھپ رہی تھی۔ تمام کتابوں کے ساتھ اس کی طابع بھی رک گئی اور ۱۸۰۳ء میں جو انڈنس چھپا وہ اردو رسم الخط میں ہوا۔ دوسری کتاب (ناربخ آسام) ہے، جو سہاب الدس کی ناربخ آسام کا ترجمہ ہے، لیکن سادہ رنگور طبع سے آراستہ میں دو سکی۔ حسنی نے کلکرس کی ”ہندوستانی زبان کے قواعد“ کی ”قواعد زبان اردو“ کے نام سے اردو میں تلخیص کی جو ۱۸۲۰ء میں کلکس سے چھپی اور اب رسالہ کلکرس کے نام سے معروف ہے۔ نصاب کی دو جلدیں انہوں نے دوسرے مسسوں کی مدد سے مراب کیں۔ ان نالفات کے علاوہ حسنی نے ”نصاب لغوی“ اور قرآن محمد کے ترجمے میں دوسرے مسسوں سے اسراک کیا۔ حسنی کی عبارت سادہ و سلس ہے مگر اس میں بعض برعے والے کے لیے حادث کا لونی عنصر ہیں۔ انہیں ان کے اسلوب کے لئے لمسے مسلسل قدرے قواعد کے احسا سے درس ہوئے کے باوجود روز مرے اور محاورے کی لمی کی بدولت سمجھے دیکھائی دیے ہیں، مگر اسی اخلاق آموز کہانیوں کے لئے آسان اور سادہ زبان پر درس بھی ہے۔ ”دریے نظر“ اور ”اخلاق بندی“ کی عبارت کے نمونے درج ذیل ہیں۔

”جب گارہ برس حشر سے گرے، نارہواں برس آنا الحمد للہ احس دن کی آرزو بھی سو درم نے ساتھ حوشی کے دکھانا“ (دریے نظر)

ہو، ہو، ہو

”ایک ہرانا سائب نہ اس میں چلے پھرنے کی طواف نہ رہی تھی ایک جھل کے کنارے پر آپسہ آپسہ آکر سمگن ہو بیٹھا۔ یہ سندھ کون کے ناساہ نے اس سے سوچھا۔ اے سائب بھٹے کیا ہوا ہے جو انا دلگڑ ہے۔ اس نے جواب دیا کہ بھٹے برائی کیا بڑی ہے تو انی نسر“۔ (اخلاق بندی)

(۱) اصل مآخذ کی بحث کے لیے ملاحظہ ہو ڈاکٹر وحید قریشی کی کتاب، کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ، ص ۲۰۱-۲۱۱

## مرزا علی لطف

مرزا علی لطف فورٹ ولیم کالج کے نافعہ ملازم نہیں تھے لیکن انہوں نے گلکرسٹ کی فرمائش پر 'مذکرۃ گاشنِ ہند' مرتب کیا۔ گاشنِ ہند کے دساحے میں انہی بھوڑے سے حالات بھی دئے ہیں۔ مرزا علی نام، لطف مخلص، والد کا نام کاظم سنگ خاں اور ہجر تخلص بھا جو اسر آباد کے ناسندے بھی اور ۱۷۳۹ء (۱۱۵۲ھ) میں نادر شاہ کے ساتھ آکر دلی میں آباد ہو گئے۔ لطف دلی میں پیدا ہوئے۔ مر و سودا دونوں سے عسب رکھتے تھے۔ دلی کے اجڑے برکٹی برس لکھو رہے۔ وہاں سے عظام آباد اور وہاں سے حیدر آباد جانے کے ارادے سے کلکتہ پہنچے جہاں گلکرسٹ سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے علی ابراہیم خاں کے 'گلزارِ ابراہیم' کی طرز پر اردو میں مذکرہ لکھنے کی فرمائش کی۔ اسے ۱۸۰۱ء میں مکمل کر کے لطف حیدر آباد چلے گئے اور وہیں ۱۸۲۲ء میں وفات پائی۔

لطف کا سان کافی حد تک گنجلک اور نعمت سے تر ہے۔ پورا مذکرہ معنی و مستمع عمارت میں ہے جو عربی فارسی کی سسپھوں اور اسعاروں سے معمور ہے۔ گاشنِ ہند کی اگر تاریخی حسب نہ ہو تو نہ طاقِ سنان کی نذر ہو چکا ہوتا۔<sup>(۱)</sup>

## مرزا کاظم علی جوان

مرزا کاظم علی جوان کا اصل وطن دلی تھا۔ ۱۷۶۰ء (۱۱۷۴ھ) میں احمد شاہ کے حملے سے دلی کا سپارہ نکھرا تو جوان بھی لکھو چلے گئے، جہاں مرزا سیف علی سگسہ خلف نواب سجاع الدولہ کی سرکار سے واسطہ رہے۔ ان کے خاندان، تاریخِ بدائیس، تعلیم اور ابتدائی زندگی کے حالات کے ضمن میں تمام مذکرے اور کتبِ باریجِ ادب خاموس ہیں۔ لکھنؤ میں ان کی سہرت کے سبب کرنل سکاٹ نے انہیں ۱۰ نومبر ۱۸۰۰ء کو فورٹ ولیم کالج کے لئے منتخب کر لیا، جس کا ذکر جوان نے سکنتلا ٹائیک کے دساحے میں کیا ہے۔ ۱۸۱۵ء تک کاظم علی کے کالج میں موحود ہوئے کا بیوب ملتا ہے کیونکہ اسی سال انہوں نے حمط الدین کی 'خرد افروز' پر نظر ثانی کی تھی۔ اس کے بعد کے حالات کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔

کاظم علی جوان عربی اور فارسی کے اچھے عالم تھے۔ ان کی تالیفات میں 'سکنتلا'، 'بارہ ماہ' یا 'دستورِ ہند' اور 'سگھاسنِ بیسی' شامل ہیں۔ علاوہ ازیں انہوں نے کالج کے دیگر لکھنے والوں کے ساتھ ترجمہ 'قرآن مجید'، ترجمہ 'تاریخِ فرسہ'، انتخابِ میر اور انتخابِ سودا کی مکمل میں سرکب کی۔

کاظم علی جوان کا یادگار کارنامہ 'سکنتلا' ہے۔ کالی داس کے اس سنسکرت ٹائیک کو جو

(۱) عبارت کے نمونے کے لئے ملاحظہ ہو عتیق صدیقی، گلکرسٹ اور اس کا عہد، ص ۲۷۷



فرخ سبر کے عہد میں برج بھاسا میں مستقل ہوا۔ جوان نے ۱۸۰۱ء میں اردو میں مستقل کیا۔ یہ فورٹ ولیم کالج سے ۱۸۰۲ء میں ناگری حروف اور ۱۸۰۴ء میں رومن رسم الخط میں چھپا، ’لؤلّال کوی‘ نے اس ترجمے میں ان کی معاونت کی تھی<sup>(۱)</sup>۔ جوان کی دوسری اہم تصنیف ’نارہ ماہ‘ یا ’دسویں ہند‘ ہے۔ یہ ایک طویل اردو نظم بطور مسوی ہے جسے ہندو جدی کے مہسوں کے مطابق ترتیب دیا گیا ہے اور ان مہسوں میں جو مسلم اور ہندو ہمارے مسنے جاتے ہیں، ان کا مفصل بیان ہے۔ یہ مسوی اگرچہ ۱۸۰۲ء میں مکمل ہو گئی تھی لیکن ۱۸۱۳ء میں طبع سے پہلی بار شائع ہوئی۔

جوان کی دوسری نالیف ’سنگھاس نبیسی‘ ہے۔ راجا نکر ماحب سے متعلق حکایات کے مجموعے کو دربار ساہجپانی کے ذریعے رائے سدر نے سنسکرت سے برج بھاسا میں مستقل کیا تھا جسے کاظم نے ’لؤلّال کوی‘ کی مدد سے ۱۸۰۱ء میں اردو میں مستقل کیا<sup>(۲)</sup>۔ کاظم علی نے ۱۸۰۹ء میں نارنج فرسہ کے سلاطین بھمنہ والے ابواب کا ترجمہ بھی کیا جو شائع نہیں ہو سکا۔

کاظم علی کی عبارت سلس ہوئے کے ناوجود مصفیٰ ہے، لیکن اس میں گلشن ہندی کی سی تعمید نہیں، موضوع کے اعتبار سے ہندی الفاظ کا بھی نکتہ استعمال ہے، لیکن ’بیتال پیمسی‘ کی طرح ہندی آہر نہیں۔ محرم میں برجسکی اور روائی ہے۔ سکسلا کی عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

”ان د لہوں سے اس کو کبھی ایک دم آرام نہ تھا، سوا اٹھائے ان  
جھاؤں کے کام نہ تھا، نہ اس خا کساری سے آرزو دل کی تراوے اور  
درخت کے مدعا کے بھل ناوے۔ اس کا جوگ گنا، اس کا آس بٹھا،  
نزدیک تھا کہ مدگی کے زور سے راجہ اندر کی سنگھاس چھٹ لے۔  
جسے سربہ تھے ان سب میں گنا۔ سہر سہر دریا دریا گھاٹ گھاٹ  
نارنا کرنا پھرنا۔“

### مولوی اکرام علی

مولوی اکرام علی گلکرسٹ کے دور کے بعد کالج میں ملازم ہوئے۔ ان کے حالات زندگی کے بارے میں صرف اس قدر معلوم ہو سکا ہے کہ ان کے ایک بھائی براب علی نے جو کلکتہ میں کسی انگریز کے سر منشی تھے، انہیں وہاں بلا کر ایک انگریز ایبراہام لاخٹ

(۱) جوان، کاظم علی، ”شکتہ لا“۔ مرتبہ ڈاکٹر املم قریشی، مجلس برقی ادب لاہور ۱۹۶۳ء۔

(۲) سید محمد نے ارباب تہ اردو میں اسے ’لؤلّال‘ کی تالیف قرار دی ہے ہوئے لکھا ہے کہ جوان نے اس میں معاونت کی، لیکن کالج کونسل کی کاروائیوں سے اس بات کی تردید ہوتی ہے۔

کے توسط سے ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازم رکھوا دیا۔ بعد ازاں کالج کے اردو پروفیسر کپتان جان ولیم ٹلمر نے انہیں کالج میں منتقل کرا لیا اور ”رسائل اخوان الصفا“ میں سے ایک رسالہ ان سے اردو میں منتقل کرانا جو ۱۸۱۰ء میں مرتب ہوا۔ یہ رسالہ مولوی صاحب کی واحد نادر نگار ہے۔ اگرچہ وہ اس کے بعد بھی کالج میں رہے اور ۱۸۱۳ء میں کالج کے محافظ کتب خانہ بھی، لیکن ان کی کسی اور نالی کا نہ یہی حلیا۔

مولوی اکرام علی نے ”اخوان الصفا“ کے دمی مطالب کو بھی انسہائی سلسل اور سادہ انداز میں بیان کیا ہے۔ عربی اور ہندی کے نامانوس الفاظ کے استعمال سے احتراز کیا ہے۔ محاورہ نہ استعمال کرے ہوئے بھی بیان میں سنجیدگی کے ساتھ ساتھ دلچسپی پیدا کی ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:-

”اللہ تعالیٰ نے جس گھڑی انسانوں کو خدا کا عبادت محض ہے۔ بدن  
برکھ نہ بھا کہ سردی اور گرمی سے محافظت میں رہیں۔ بھل بھلائی  
جنگل کے کھانے اور درختوں کے پھول سے بن کو ڈھانسی۔ اس  
واسطے ان کے مدد کو سدبا اور لہا بنانا کہ درختوں کے بھل بوڑ  
کر داسانی کھاویں۔“

### بینی نرائن جہاں

بینی نرائن جہاں فورٹ ولیم کالج کے انسہائی عمر معروف مؤلفین میں سے ہیں۔ یہ بھی گلکرسٹ کے بعد کالج میں ملازم ہوئے۔ لاہور کے ایک علم دوست گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ والد مہاراجہ لکسمی نرائن اور بڑے بھائی کھم نرائن رند تھے<sup>(۱)</sup>۔ آوارہ وطن ہو کر کلکتہ پہنچے اور وہاں بھی برسوں پریشانی میں بسر ہوئی۔ حیدر بخش حیدری کی سفارش پر کپتان ٹامس روبک نے انہیں کالج میں ملازم رکھ لیا۔ دوران ملازمت کی تالیفات میں ”چار گلشن“، ”دیوان جہاں“ اور بقول گارسان دناسی ساہ رفیع الدس کی فارسی کتاب ”ننبیہ الغافلین“ کا اردو ترجمہ شامل ہیں۔ دناسی کا مان ہے کہ سد احمد بریلوی کے ہاتھ پر بیعت کر کے انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ارباب نیر اردو کے مؤلف دناسی کے بیان کی نائید میں ”ننبیہ الغافلین“ کے ترجمے کو بطور دلیل پس کرتے ہیں<sup>(۲)</sup>۔

بینی نرائن کی تالیفات میں ”چار گلشن“، ایک عشقیہ قصہ ہے جو انہوں نے ۱۸۱۱ء میں تالیف کیا۔ ”دیوان جہاں“ وہ تذکرہ ہے جو کپتان روبک کی ایا ہر دو سال میں لکھا گیا اور ۱۸۱۳ء میں مکمل ہوا۔ اس میں ۱۲۵ شعرا کا اجمالی تذکرہ ہے۔ مرتب حروف۔

(۱) کریم الدین بجاوالہ سید محمد - ارباب نیر اردو - ص - ۲۴۹ -

(۲) ایضاً - ص - ۲۵۱ -

نہجی کے اصول پر ہے۔ جہاں نے اس میں ایسا بھی نہیں سا کلام جگہ بجگہ شامل کر دیا ہے اور غالباً اسی لیے اس کا نام دیوانِ جہاں رکھا گیا ہے۔ ساعروں کے نان کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

”اسوس مخلص ، نام میر میر علی ، میر علی مظفر خان کے بیٹے ۔  
پہلے چوڑے دنوں میر سور سے اصلاح لی ، بعد اسی کے ساگرد ہوئے۔“

☆ ☆

میر حیدر علی حیراں ، نابول کے رہنے والے ، دیکھنے میں آن کر  
رحمات کی (۱)۔“

### مولوی اماب اللہ

مولوی اماب اللہ فورٹ ولیم کالج میں عربی اور فارسی کتابوں کا ترجمہ کرنے پر مامور تھے (۲)۔ ان کے حالات زندگی بہت کم معلوم ہیں ، بالخصوص میں ’ہدایات الاسلام‘ (۲ جلد) ، ’ترجمہ قرآن سرب‘ ، ’جامع الاحلاق‘ اور ’صرف اردو‘ (مظلوم) شامل ہیں ، ’ہدایات الاسلام‘ انہوں نے کالج کی ملازمت سے پہلے عربی میں دو جلدوں میں لکھی تھی۔ پھر خود ہی ایک جلد کا ترجمہ اردو میں کر کے فلکرسٹ کے ملاحظے کے لیے بکس لیا ، جس سے متاثر ہو کر فلکرسٹ نے انہیں کالج میں عربی و فارسی کی ذمہ داریوں کے ترجمے کے لیے ملازم رکھ لیا۔ ’ہدایات الاسلام‘ کی پہلی جلد ۱۸۰۳ء میں دلچ کی طرف سے شائع ہوئی۔ ملازم ہونے کے بعد انہوں نے دوسری جلد کا ترجمہ بھی لیا۔ فلکرسٹ کے حکم سے مولوی صاحب نے میر بہادر علی حسینی کے ساتھ مل کر قرآنِ محمدیہ کا اردو ترجمہ شروع کیا۔ جب فلکرسٹ ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو ترجمے کے ۵۶ صفحات چھپ چکے تھے اور ترجمے کے کام میں دن اور افراد بھی شامل ہو گئے تھے ، لیکن گورنر جنرل نے نا احلاس ٹونسل ۱۸۰۳ء مارچ ۱۰ء ، اس کی اساعت کو روک دینے کے احکام دے دیئے اور ڈاڈر سر کو ہدایت کی گئی کہ وہ تمام طبع شدہ احرا ، معاوضہ ادا کر کے حکومت کے حوالے کر دیں۔ ڈاکٹر وحید فرسی کا خیال ہے کہ تمام طبع شدہ فورسے شائع کر دے گئے ، لیکن ”حسنی اتفاق سے قرآنِ پاک کے اس ترجمے کا ایک فلمی مسودہ کس خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہے ، نصر الدین باسمی نے اسی وضاحتی فہرست میں اس کے پہلے صفحے کا عکس بھی شائع کیا ہے (۳)۔“

(۱) سید محمد - ارباب نثر اردو - ص ۲۵۶

(۲) محمد عتیق صدیقی کی کتاب ’فلکرسٹ اور اس کا عہد‘ میں دیگر منشیوں اور مترجموں کی فہرست میں ان کا نام نہیں ملتا اگرچہ اسی کتاب میں مختلف حکموں پر زبرد طبع کتابوں اور انعام کے لیے مجوزہ کتابوں کے ساتھ ان کا نام آتا ہے۔

(۳) ڈاکٹر وحید فرسی - کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ - ص ۲۱۶

’جامع الاحلاق‘، مولوی امانت اللہ کی انک اور نائف ہے جو ’اخلاق جلالی‘ کا اردو ترجمہ ہے اور کہان جیمس موٹ کی فرمائش پر ۲۰ جولائی ۱۸۰۵ء کو مکمل ہوا۔ اس کتاب کا موضوع اور اندازِ بیان دونوں ہی دمی ہیں اور عربی و فارسی کے دمی الفاظ کے استعمال سے عبارت میں بے تعلد اور گنجشک پیدا ہو گئی ہے۔ مولوی امانت اللہ کے اسلوب نگارش کا اندزہ اس کتاب کے دساحے کی عبارت سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ لکھنے ہیں ”اگرچہ نہ کتاب بعباب مغلق اور دمی المضمون، اوّل سے آخر تک تمام مسائلِ حکمی اور بدیعات علمی سے مسحوں ہے اور ترجمہ کرنا اس کا مسئلہ، مجرد مادہٴ جسمانی اور اسقاطِ قوائے انسانی کا ہے۔۔۔ وعبرہ وعبرہ“۔ ’صرفِ اردو‘ مولوی صاحب کی منظوم تصنیف ہے جس میں صرف و نحو کے اسدائی مسائل کو نظم کر دیا گیا ہے۔ اس کا مہلا اندیس ۱۸۱۰ء میں کلکتہ سے چھپا۔

### مرزا جان طہس

مرزا جان طہس فورٹ ولیم کالج کے مافاعدہ ملازم نہیں تھے۔ کالج کے تمام کے اسدائی رمانے میں کلکتہ پہنچے اور وہاں کالج سے جو کتابیں سائے ہوئی تھیں ان کی نظر نانی کا کام کرے رہے۔ ساعر ہونے کی وجہ سے اکثر بدکروں میں ان کے حالات زندگی مل جائے ہیں۔ ’منوی سحر البیان‘ کی طرز پر انہوں نے بھی انک فارسی قصہ کو ’مہار دانس‘ کے نام سے منظوم کیا جو ۱۸۰۹ء میں مکمل ہوا۔ ’کتاب طہس‘ کالج کی طرف سے ۱۸۱۱ء میں سائے ہوا۔ ان کا اسفال ۱۸۱۲ء میں کلکتہ سے ہوا۔

طہس کے یادگار کارناموں میں ’سمس البیان محیطِ احباب ہندوستان‘ ہے جو ۱۷۹۳ء میں رئیس ڈھاکہ کی اما پر لکھی گئی۔ نہ کتاب فارسی میں ہے اور غالباً ایسے موضوع پر اولت کا درجہ رکھی ہے۔ اس میں ۲۷۵ محاوروں کو ردیف وار مرتب کر کے ان کی سد میں اسعار دے کئے ہیں، مثلاً انگاروں پر لوٹنا۔ کنایہ ار بفراری کہ درعالم اسک لاحق کردد، ولی دکنی گوید۔

سعلہ جو جب سے نظر آنا نہیں سب سے انگاروں نہ لونے ہے ولی

شیخ حفیظ الدین (مصنف خرد افروز)

سیخ حفیظ الدین کے آباو اجداد عرب سے آ کر پہلے دکن میں س گئے اور دو بن بنسوں کے بعد بنگالہ میں آ گئے۔ اس کے باغ بشوں بعد سیخ حفیظ الدین پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان طریمت کی طرف مائل تھا اور ان میں سے اکثر لوگ صوفی منس تھے۔ شیخ حفیظ الدین نے کلکتہ مدرسہ میں تعلیم پائی اور پھر فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہو گئے

(۳ مئی ۱۸۰۱ء) - ان کی مشہور کتاب 'حرد افروز' ہے جو ۱۸۰۴ء میں چھپی - یہ ابوالفضل کی 'عبار دانش' کی جزوی تلخیص کا سلسلہ اردو ترجمہ ہے - 'عبار دانش' 'کلبہ و دمنہ' کی مشہور فارسی شکل 'انوار سہیلی' کے بعد کی تصنیف ہے اور اس کی عبارت میں رنگ آمیزی موجود ہے - انوار سہیلی کے کئی ترجمے ہوئے جن میں فقیر محمد خان گونا کا ترجمہ نام 'دسان حکمت' (۱۸۳۵ء) بعد میں چھپا - سچ حفظ الدین کا اسلوب صاف و سلس ہے - اس میں سوخی بالکل نہیں ، البتہ رورمرہ کی ناسدی سے زبان میں لہجہ اور فصاحت پیدا ہو گئی ہے - حفظ الدین نے ابوالفضل کی اس بردازی سے گریز کیا ہے اور وہ اسعارے کا استعمال بہت کم کرتے ہیں - انی طبع کے اعضا سے ان کے بیان میں سنجیدگی کا عنصر بھی موجود ہے ، بلکہ اس معلوم ہوتا ہے کہ آج کل کا کوئی مصنف لکھ رہا ہے - نہ کا نمونہ ملاحظہ ہو :-

” . . . . ایک سوداگر کے یہاں بہت سا جواہر تھا ، اس نے دسی شخص کو اس سے چھیننے کے لئے سو دسار مردوری دیئے کہے - جو وہ بدھا سوداگر کے گھر آیا ، ایک حنک وہاں دہری بھی ، اس نے بوجھا ”چنگ بجانی آتی ہے“ کہا ”ہاں“ - کہا ”بجاؤ“ - حنک اٹھالی اور بجائے لگا - سوداگر حوس ہوا اور رائ کے مزے میں جو مصروف ہوا نوٹا کھلے کا کھلا اور جواہر بڑے کا بڑا رہ گیا“ -

سید حمید الدین بہاری

۹ اگست ۱۸۰۳ء کو فورٹ ولیم کالج میں مسمی مقرر ہوئے انہوں نے ڈیکریٹ کے ایما پر ہندوستانی کہانیوں کی کتاب 'حوان الوان' ۱۸۰۴ء میں تالیف کی جس میں تمام مروجہ کہانیوں اور مٹھائیوں کا مفصل ذکر کیا گیا اور ان کے اجزا اور نکلے کے طریقے بھی مذکور ہوئے -

### دہلی کالج کی علمی خدمات

دہلی کالج کو پلامالغہ سہلی ہندوستان میں نساہِ ثانیہ کا پہلا مشہور علمبردار کہا جا سکتا ہے - اس سے پہلے انگریزی اور سے بنگال میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے ذریعے ایک پیداری پیدا ہوئی لیکن وہ زیادہ تر ادبی اور لسانی بھی ، نیز فورٹ ولیم کالج کے قیام کے مقاصد میں نمایاں باب نو وارد انگریزوں کو اردو فارسی زبان سکھانا اور ہندوستانیوں

کی معائنہ سے آگاہ کرنا تھا ، تاکہ وہ محض مجازی ادارے کے ایجنٹ بننے کی بجائے ہندوستانی تہذیب سے روشناس ہو کر ہندوستان میں برطانوی سامراج کو مستحکم بنیادوں پر قائم کرنے کے اہل ثابت ہوں۔ نالفاظِ دیگر فورٹ ولیم کالج کے مخاطب ہندوستانی نہیں بلکہ انگریز تھے ، اسی لیے علامہ عبداللہ یوسف نے اسے ایک 'جریبے' سے تعبیر کیا ہے<sup>(۱)</sup>۔ فورٹ ولیم کالج نے سلسلے میں نگاری کی طرح ڈال کر فارسی کے عالمگیر اثر کے باوجود مذہبی اسلوبِ سان میں انک انقلاب پیدا کیا ، لیکن شاید نہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ زبانِ دانی کا کالج بن کر رہ گیا۔ چنانچہ اس کے اثرات اسلوبِ سان کی سرحدوں سے آگے نہ بڑھ سکے ، نہر کالج کے حلقہٴ اثر سے باہر تا دیرنجی خط و کتابت تک میں 'محمد ساہی روسوں' کا دور دورہ رہا۔ اس کے برعکس دہلی کالج کی حنیب علمی اور سائنسی بھی۔ اس کالج کے ذریعے سہلی ہندوستان میں پہلی مرتبہ آرڈو کے ذریعے معری علوم ، ریاضی ، سائنس ، علمِ ہیئت اور فلسفہ وغیرہ کی تدریس شروع ہوئی ، جس نے نئی نئی ندروں کے فروغ کے لیے فضا بنا دی۔ اسی کالج سے پہلے پہل مشرق و مغرب کے صحیح مند عناصر کو یک جا کرنے کا عمل شروع ہوا۔ دہلی کالج سے منائر شخصیتوں نے سائنسی و معاصر علوم اور ادب میں ، طبیعیات ، کیمیا ، ریاضیات ، ہیئت ، سہریت و مدن ، ساسیات ، فلسفہ ، تاریخ ، سرب ، سوانح ، جغرافیہ ، صحافت ، تنقید ، ساعری ، مذکرہ نگاری ، لغت سازی ، ناول نویسی ، مکتوب نگاری اور مقالہ نگاری غرض ہر شعبہٴ علم و ادب میں کارہائے نمایاں سر انجام دے اور فکر و احساس کے انداز کو یکسر بدل دیا۔ اس لیے دہلی کالج کو محض انک درس گاہ ہی نہیں بلکہ نشاۃِ ثانیہ کے انک علمبردار اور 'محرک کی حیثیت حاصل ہے۔

دہلی کالج کی ابتدا مدرسہٴ عازی الدین کی صورت میں ۱۷۹۲ء میں دہلی کی خوبصورت تاریخی عمارت میں ہوئی جو عازی الدین خاں کے مدرسے کے نام سے مشہور ہے<sup>(۲)</sup>۔ ۱۸۲۳ء تک اس مدرسے کی کیا حالت رہی ، نظامِ تعلیم اور معیارِ تعلیم کیا تھا اس کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہیں۔ "مسٹر ایچ ٹیلر کی رپورٹ سے اذنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۲۳ء میں مدرسہٴ عازی الدین میں صرف نو طالب علم تھے اور مولوی عبداللہ ان کو تعلیم دیتے تھے"<sup>(۳)</sup>۔

مجلسِ تعلیم عامہ نے ۱۸۲۳ء میں انک گمشدہ مراسلے کے ذریعے مقامی مجلسوں سے اضلاع کے تعلیمی حالات اور تعلیمی برق کے امکانات و وسائل کے بارے میں استفسار

(۱) صدیقی الرحمن فدوائی ، ماسٹر رامچندر ، (مدرسہ) خواجہ احمد فاروق۔

(۲) کالج کی عمارت کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو صدیقی الرحمن فدوائی 'ماسٹر رامچندر'۔

ص - ۱ تا ۳

(۳) ایضاً - ص - ۵

کرتے ہوئے ان سے معاویہ طلب کیں۔ اس مراسلے کے جواب میں دہلی کی مقامی مجلس نے جس کے سکریٹری جے ایچ ٹیلر تھے، جنوری ۱۸۲۴ء میں دہلی کی تعلیمی حالت کو افسوس ناک قرار دیا اور دہلی میں کالج کے قیام کی ضرورت سفارش کی جو منظور ہو گئی۔ ۱۸۲۵ء میں دہلی کالج قائم ہو گیا اور مسٹر ٹیلر اس کے مہتمم مقرر ہوئے۔ اس وقت چونکہ اچھے استادوں اور کتابوں کی کمی تھی اس لیے جنرل کمپنی نے تعلیم سے متعلق ہدایات میں قدیم فلسفے اور فہرہ، سزاردو، فارسی اور عربی کی مدرسے کو نظر انداز نہیں کیا، البتہ ریاضی اور تاریخ و عبرہ کی مدرسے پر بھی زور دیا۔ انک پی برس میں کالج نے غیر معمولی ترقی کی۔ ۱۶ جولائی ۱۸۲۶ء کو اس کے اقامتی طلباء کی تعداد ۱۲۰ اور ۱۸۲۷ء میں مجموعی تعداد ۲۰۴ ہو چکی تھی۔

۱۸۲۸ء میں برٹش ریڈیڈنٹ کمشنر سرچارلس مٹکاف کی سفارش پر دہلی کالج میں ایک انگریزی کی جماعت کا اضافہ کر دیا گیا اور ہنٹ و ریاضی کی تعلیم بھی مغربی اصولوں کے مطابق شروع کی گئی۔ انگریزی زبان کی تعلیم کے اس انتظام پر لوگوں میں بڑی بے چینی پھیلی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے اس خیال سے اس کی مخالفت کی کہ یہ بدعت نوجوانوں کا مذہب بگاڑنے کے لیے کی گئی ہے لیکن یہ مخالفانہ رویہ آہستہ آہستہ اعتدال پر آ گیا۔

۱۸۲۹ء میں نواب اعماد الدولہ سد فضل علی خان بہادر، وزیر باساہ اودھ نے مسلمان نوجوانوں کی تعلیم کی خاطر انک لاکھ سر ہزار روپے کی رقم گورنمنٹ کو تاج فیسڈ والے قرض میں دے کر پیشکش کی۔ نواب اعماد الدولہ انک لاکھ درسگاہ کا قیام چاہتے تھے اور یہ پیشکش دہلی کے ریڈیڈنٹ کے ذریعے ہوئی۔ گورنمنٹ نے نواب صاحب کو اس بات پر متوا کیا کہ اس رقم کے ساتھ کو بھی دہلی کالج کی ترقی پر ہی صرف کیا جائے اور طے پایا کہ نواب صاحب کالج کے معاملات کے مہتمم ہوں گے۔ پروفیسروں اور طلباء کے تقرر اور وظائف ان کے نام سے ہوں گے۔ خزانہ ۱۸۳۰ء کو وقف کا وصف نامہ تیار ہو گیا جس کے مطابق نواب صاحب کے داماد سد حامد علی خان ان شرائط کے نگران مقرر ہوئے۔ اسی سال نواب صاحب کا انتقال ہو گیا لیکن یہ نو نوئی وظیفہ ان کے نام سے دیا گیا نہ پروفیسروں کا تقرر ان کے نام سے ہوا اور نہ ہی وصف کی دیگر شرائط پر گورنمنٹ نے عمل کیا، البتہ دہلی کالج کے مالی وسائل میں اضافہ ضرور ہو گیا۔

۱۸۳۵ء تک ہندوستان کے تمام سرکاری و غیر سرکاری مدارس میں مسیحی علوم اور اساتذہ شریفہ کی تعلیم مسیحی زبانوں میں ہوتی تھی۔ جہاں کہیں انگریزی زبان کی جماعت تھی وہی تو الگ بھلگ شعبے کی صورت میں بھی اور نانوی حسیب رکھتی بھی۔ ۷ مارچ ۱۸۳۵ء کو گورنر جنرل لارڈ ہلنگ نے کونسل کی منظوری سے جو احکام جاری کئے ان

کے مطابق مشرقی علوم اور دیسی زبانوں کی سرپرستی یک سر خم کر دی گئی ، تعلیمی وظائف بند کر دیئے گئے ، مشرقی زبانوں کی الگ جماعتوں کا وجود ختم کر دیا گیا اور تمام مالی وسائل انگریزی تعلیم کے لیے مختص کرتے ہوئے ذریعہٴ تعلیم بھی تبدیل کر دیا گیا ۔ گورنر جنرل کے اس حکم پر دہلی اور دوسرے مقامات میں کافی بے اطمینانی پھیلی اور اس حکم کو ناسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ۔ لارڈ آکلنڈ جب گورنر جنرل ہو کر آئے تو اس عام بے اطمینانی کو محسوس کرے ہوئے انہوں نے جنرل کمیٹی 'تعلیم عامہ' کے نام ۲۴ نومبر ۱۸۲۹ء کی یادداشت میں مسرقی تعلیم کے فروغ و ترقی دسی زبانوں میں تعلیم کی اجازت کی سفارش کی ۔

دہلی کالج کو نہ فضیلت حاصل رہی کہ لارڈ نٹشنگ کے دور میں بھی یہاں مغربی علوم کی تعلیم اردو میں ہی ہونی رہی اور اس کے سبب مشرقی کے طلباء کے ۱۸۵۶ء تک جننے بھی معائنے اور امتحانات ہوئے سب میں سائنسی علوم میں ان کی ذکاوت کو سراہا گیا اور لفٹنٹ گورنر نک نے ان رپورٹوں پر مسٹرٹ کا اظہار کیا ۔ مشرقی سبب کا تعلیمی معیار ۱۸۳۰ء سے ۱۸۴۵ء تک گر گیا تھا لیکن جلد ہی اس صورت پر قابو لیا گیا اور ۱۸۳۷ء میں اس کا معیار پھر دستی بخش ہو گیا ۔ ۱۸۴۵ء میں مسٹر نروس برنسپل نے جو رپورٹ لکھی اس کے مطابق مشرقی شعبے کے طلباء سوائے تاریخ کے اور کسی مضمون میں انگریزی شعبے کے طلباء سے کم در نہیں تھے ۔

مسٹر نروس نے ۱۸۴۱ء میں برنسپل مقرر ہونے کے بعد دونوں شعبوں کے الگ الگ وجود سے ابتدا ہونے والی دشواریوں پر غور کیا اور کوشش شروع کر دی کہ اگر دونوں شعبوں کی تعلیم بالکل یکساں نہ ہو تو کم از کم برابر ضرور ہو جائے ۔ چنانچہ ۱۸۴۳ء میں دونوں کا امتحان بالکل یکساں سطح پر لیا گیا اور اس میں مسرقی شعبے کے حوصلہ افزا نتائج کی بنا پر برنسپل نے لفٹنٹ گورنر سے ان کے باہمی انتظام کی سفارش کی جو منظور ہوئی ۔ اس سے اردو کو مزید ترقیت ملی ۔

دہلی کالج کے قیام کے بعد جب مغربی علوم کی تدریس کا منصوبہ بھی شروع ہو گیا تو سب سے بڑی دشواری دیسی زبانوں میں ان علوم کی کتابوں کا فقدان تھا ۔ اگرچہ سکول 'بک سوسائٹی' نے کچھ مفید کتابیں دیسی زبانوں میں بار کیں لیکن وہ بالکل ابتدائی نوعیت کی تھیں ۔ چنانچہ ۱۸۳۵ء میں سرکاری تعلیمی کمیٹی انہیں مسائل کے حل کے لیے وجود میں آئی ۔ کمیٹی نے ۱۸۳۵ء میں واضح الفاظ میں یہ اعلان کیا کہ دیسی علم و ادب کا بنانا اس کمیٹی کا اولین مقصد ہے ، لیکن اس اعلان کے بعد بہ کمیٹی پانچ سال تک خوابِ خرگوش میں عمو رہی ۔ ۱۸۴۰ء میں جب لارڈ آکلنڈ نے تعلیمی کتابوں کے ترجمے اور ابتدائی کتابوں کی تیاری میں دلچسپی لینی شروع کی تو تعلیمی کمیٹی پھر



یک لغت چونک اٹھی اور فوراً ایک ذیلی کمیٹی کی تشکیل ہوئی اور طے پایا کہ وہ مسائل کا جائزہ لے کر رپورٹ اور سفارسات پیش کرے۔ ذیلی کمیٹی نے انی رپورٹ میں صرف و نحو کی کتابوں کی ساری، ان کے لئے اہل افراد کے اسباب اور ذہنی ضروریوں کو ہوا کرنے کے لیے تدریجی کتابوں کی ساری کی سفارسات کی۔ لیکن یہ سب باتیں سفارسات تک ہی محدود رہیں اور کوئی سبب سے معنی مطلب عملی کام نہ ہو سکا۔

ان حالات میں بعض علم دوست حضرات نے ایک انجمن 'اساعب علوم بدریغہ السنہ' ملکی، ۱۸۴۳ء میں تشکیل دی، جس کے مقاصد میں انگریزی، سنسکرت اور عربی کی اعلیٰ درجے کی کتابوں کا اردو، سکالی اور ہندی میں ترجمہ کرنا اور دیسی زبان کی درسی کتب سے نفاذ شامل تھا۔ انجمن کے بانیوں اور معاونوں میں انگریز اور ہندوستانی برابر کے شریک تھے اور صاحبِ استطاعت محترم حضرات نے انجمن کو عطیات بھی دیئے۔ انجمن کی مجلسِ انتظامیہ مسٹر ٹی مککف، سی گرانٹ، ای سی ریونسا، ڈیلو س کوئٹین، دوارکا ناتھ لنگور اور مسٹر ایف بیروس برسرِ مسئول بھی۔ بیروس اس انجمن کے سیکرٹری اور دہلی کالج کے پرنسپل تھے۔ انجمن نے سب سے پہلے ترجمے کے لئے قواعد متعین کئے جن کی رو سے سائنس کے وہ الفاظ جن کے مرادف اردو میں نہ ہوں، انہیں خال رکھا گیا۔ مثلاً سوڈیم، کلورین وغیرہ۔ یہ بھی فیصلہ ہوا کہ جن الفاظ کے مرادف اردو میں مل سکیں ان کے سلسلے میں اردو کو ترجیح دی جائے، مثلاً سلفر کی بجائے گندھک، سمندر کے لئے طبع نامہ وغیرہ اور یہ کہ کمپسٹری کی اصطلاحات کو بحسبہ اردو میں لے لیا جائے۔ علاوہ ازیں انگریزی الفاظ کے زیادہ استعمال سے احتراز کی سفارسات کی گئی۔

اس انجمن کے سیکرٹری چونکہ دہلی کالج کے پرنسپل تھے اس لئے سارا کام دہلی کالج میں ہی ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ انجمن 'دہلی کالج ورنیکل ٹرانسلیشن سوسائٹی' بھی کہلانے لگی۔ مولوی عبدالحق 'ورنیکل سوسائٹی'، ٹرانسلیشن سوسائٹی، لائبریری آف یوزفل نالغ وغیرہ سب اس کے نام ہیں<sup>(۱)</sup>۔ ۱۸۴۵ء میں مسٹر بیروس بوجہ غائب ملازمت سے سبکدوس ہو کر وطن واپس چلے گئے تو ان کے حائسین نئے پرنسپل ڈاکٹر سپرنگر نے انجمن کے کام کو بھی سنبھالا۔ یہ سوسائٹی اگرچہ غیر سرکاری بھی لیکن حکومت نے اس کی کتابیں خرید کر بالواسطہ طریق پر اس کی معاونت کی۔ ماسٹر رام چندر نے اس سوسائٹی میں انتہائی قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔

ورنیکل سوسائٹی نے عربیاً ۱۲۸ کتابیں لکھوا کر سائے کیں<sup>(۲)</sup>۔ ان کتابوں میں تاریخ پر تقریباً ۱۵، طب، میکانیات، طبیعیات اور کیمیا پر ۲۰، ریاضیات پر ۱۰، قانون پر

(۱) مولوی عبدالحق، مرحوم دہلی کالج، ص ۱۲۷-۱۳۰

(۲) مولوی عبدالحق، مرحوم دہلی کالج، ص ۱۳۲

(۳) مولوی عبدالحق، مرحوم دہلی کالج، ص ۱۳۹ تا ۱۴۵

۱۰، جغرافیہ پر ۵، علمِ ہیئت پر ۳ اور باقی کتابیں سیاسیات، معاشیات، ادبیات، صرف و نحو، فلسفہ اور مشاہیر کے تذکروں سے متعلق ہیں۔ ان کتابوں نے پہلی بار اردو میں مغربی علوم کے فروغ کی راہ ہموار کی اور نہ صحیح طور پر نشاۃ ثانیہ کا باعث بنیں۔ سطورِ ماقبل میں مسٹر ایچ ٹیلر کا نام آچکا ہے۔ مسٹر ٹیلر مجلسِ معامی کے سیکرٹری تھے اور انہوں نے کالج کے قیام کی ہر رور سفارس کی تھی۔ کالج کے قیام کے بعد وہ اس کے سیکرٹری اور سیرٹنڈنٹ مقرر ہوئے، مگر ان کے ذمے بہت سے دوسرے کام بھی تھے اس لیے وہ بہت کم وقت نکال سکے تھے۔ معامی مجلس نے ۱۸۳۷ء میں گورنمنٹ کو یہ تجویز بھیجوائی کہ مسٹر ٹیلر کو کالج کا پرنسپل مقرر کر دیا جائے تاکہ وہ تمام وقت کالج میں صرف کر سکیں۔ بجور کو دو سال بت گئے تو ۱۸۳۹ء میں جنرل کیمٹی نے تجویز پیش کی کہ کالج کا انک پرنسپل مقرر کیا جائے، جو کالج کے انتظامی فرائض کے ساتھ مشرقِ شیعے اور انگلش اسٹیٹسمن کی عام نگرانی کرے اور انگریزی شعبے کی اعلیٰ جماعتوں میں ادب اور سائنس کا درس بھی دے۔ اس تجویز کی منظوری بر مسٹر ایف بتروس ۱۸۴۱ء میں کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔

مسٹر ایف بتروس نے مشرقِ شیعے میں دسی زبان کے ذریعے مغربی علوم کی ترویج کے لیے دیہم کونشنس کیں اور اس شعبے کو ہر اعتبار سے انگریزی شعبے کے ہم پایہ بنا دیا۔ دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی، کا قیام اور اس کی کاسپی بھی مسٹر بتروس کی مخلصانہ کوششوں کی مرہونِ منت ہے۔ ۱۸۴۵ء میں مسٹر بتروس خرائی صحت کی بنا پر ملازمت سے سبکدوس ہو کر واپس انگلستان چلے گئے۔

مسٹر بتروس کے بعد ڈاکٹر اے سپرنگر ان کے جانشین مقرر ہوئے۔ یہ بنگال سروس کے اسٹنٹ سرجن تھے، عربی زبان و ادب سے گہرا شغف رکھتے تھے جس کی وجہ سے اہلِ دہلی میں جلد مقبول ہو گئے۔ انہوں نے کالج کی ترقی اور بالخصوص شعبہٴ مشرق کی ترقی میں اور ورنیکلر سوسائٹی کے مقاصد کی تکمیل میں بڑا سرگرم حصہ لیا۔ نصابِ تعلیم کی اصلاح میں خصوصی دلچسپی لی اور خود 'ناریخِ یمنی' کو ایڈٹ کر کے شائع کیا، تاکہ اسے شاملِ نصاب کیا جا سکے۔ حاسہ اور متنبتی کے نسخے فراہم کر کے شاملِ نصاب کرائے۔ 'مطبع العلوم' کے نام سے انک پریس قائم کیا اور وہیں سے 'قرآن السعدین' نامی ایک ہفت روزہ شائع کیا۔ فروری ۱۸۴۸ء میں ڈاکٹر سپرنگر حکومت کی طرف سے ساہانِ اودھ کے کتب خانے کی فہرست تیار کرنے کے لیے لکھنؤ چلے گئے۔

ڈاکٹر سپرنگر کے بعد مسٹر ٹیلر کو جو ہیڈ ماسٹر تھے پرنسپل بنایا گیا۔ مسٹر ٹیلر کی خدمات کا ذکر قبل ازیں ہو چکا ہے۔ یہ طلبا سے اپنی شفقت اور مشرقی زبان و علوم کے فروغ سے دلچسپی کے باعث کافی مقبول تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے ہنگاموں

میں ۱۱ مئی کو حب پر طرف مل و غار حاری تھا ، مسٹر ٹلر کمانڈنٹ کی اطلاع پر رابرٹس ہسٹ ماسٹر ، اسٹوارٹ سکند ماسٹر ، اسٹر بہرد ماسٹر جان بھانے کے لیے بھاگ کر سگزین میں پہنچے جہاں باجج جج انگریز افسر اور دو بن سارجنٹ بھیے - ہندوسانی سپاہیوں نے سگزین کو گھر لیا اور حب انکریوں کی کمک کی کوئی موقع نہ رہی تو انہوں نے مسکرس کو آک لگا دی - اس میں باجج انکری بھی حل گئے اور ہندوسانیوں کا بھی از حد حای نقصان ہوا - سگزین کی دیوار بھی تو ٹلر اور اسٹر دونوں بج نکلے ، اسٹر جمننا نار مہرٹھ کی طرف نکل گئے اور بج گئے ، لیکن ٹلر کالج لوٹے - خانسامان کے ذریعے آزاد کے والد مولوی محمد نافر کے یہاں پہنچے - مولوی نافر نے ایک رات تو انہیں اپنے امام ناڑے میں رکھا لیکن دوسرے روز حب ان کے وہاں چھپنے کی خبر محفلے میں عام ہوئی تو مولوی صاحب نے انہیں ہندوسانی لباس پہنا کر رخصت کیا لیکن راہ میں لوگوں نے مہمان لیا اور لٹھ مار مار کر ہلاک کر دیا - بعد میں مولوی نافر کو اسی سلسلے میں سولی پر چڑھانا گیا اور خود آزاد کے بھی وارنٹ جاری ہو گئے تھے - مسٹر ٹلر نے ۳۲ سال دہلی کالج میں اسپہانی فائل قدر خدمات انجام دیں -

کالج کے نامور دیسی اساتذہ میں معی صدر الدین حان صدر الصدور ، مولوی مملوک علی ، مولوی امام بخش صہبائی ، مولوی سبحان بخش ، ماسٹر وزیر علی ، ماسٹر اسر علی ، ماسٹر راجندر ، مولوی (داکٹر) صاء الدین ، ماسٹر سارے لال ، مولوی دکاء اللہ اور مولوی احمد علی وغیرہ شامل ہیں -

مولوی مملوک علی عربی کے صدر مدرس اور بہت سہرے کے مالک تھے - ان کا اصل وطن نانویہ تھا ، لیکن مذہب سے دہلی میں قیام پذیر ہو گئے تھے - مولوی صاحب کے علم و فضل کا سکہ دور دور تک چلتا تھا ، وہ فارسی ، اردو اور عربی سنوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے - مولوی کرم الدین نے مذکرہ 'طبقات الشعراء ہند' میں ان کا مفصل ذکر کیا ہے اور انہیں 'کانِ علم' اور 'مخزنِ اسرار' کہا ہے - کریم الدین کے بیان کے مطابق ۱۸۴۷ء میں مولوی مملوک کی عمر ۶۰ سال بھی - ورسکر سوسائٹی کی طرف سے شائع ہونے والی 'علم ہندسہ' کی کتاب 'تحریر اقلیدس' کے چار ابواب کا ترجمہ انہوں نے کیا تھا (کل آٹھ ابواب کا ترجمہ ہوا تھا) ، علاوہ ازیں سوسائٹی کے لیے انہوں نے 'سنن برمذی' کا ترجمہ بھی کیا -

مولوی امام بخش صہبائی فارسی کے صدر مدرس ، فارسی کے بلند پایہ ادیب اور شاعر تھے ان کی کتابیں نہ صرف اس وقت بلکہ ایک صدی بعد تک شاملِ نصاب رہیں - کالج میں انہوں نے سمس الدین کی 'حدائق البلاغت' کا اردو ترجمہ کیا - 'شعراءِ اردو' کا بھی ایک انتخاب کیا جو اسی زمانے میں چھپا - علاوہ ازیں اردو صرف و نحو پر ایک کتاب

لکھی جس کے آخر میں اردو کے محاورات اور ضرب الامثال حروفِ تہجی کی ترتیب سے درج کئے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں کالج سے تعلق کی بنا پر مارے گئے۔

ماسٹر رام چندر دہلی کالج کے قدیم طالبِ علم اور دہلی کالج کے مشہور اساتذہ میں سے ہیں۔ اردو زبان و ادب اور علوم کی نساہِ ناسہ کے سلسلے میں ان کی خدمات ناقابلِ فراموس ہیں۔ رام چندر کے والد سندر لال دہلی کے پاسدے بھی اور سلسلہ ملازمت بحیثیت محصلِ دارِ نانیب میں مهم بھی رہے ہیں ۱۸۲۱ء میں رام چندر پیدا ہوئے<sup>(۱)</sup>۔ انہی نو سال کے ہی ہوئے بھی ۱۸۳۱ء میں سندر لال کا اچانک انتقال ہو گیا۔ والدہ نے بڑی عسرت میں تربیت کی۔ ۱۸۳۳ء میں مکسب کی تعلیم سے فارغ ہو کر انکس سکول میں داخل ہو گئے۔ اسی سال (گیارہ برس کی عمر میں) انک خوشحال کانسیہ گھرانے میں سادی ہو گئی، لڑکی گوئی بھری بھی۔ چھ سال سسرال کی دی ہوئی بونجی پر تعلیم اور دیگر ضروریات کے مصارف پورے کیے اور بالآخر سنگ آ کر تعلیم چھوڑ کر پھر ہو گئے۔ ۱۸۴۱ء میں پھر دہلی کالج میں داخل ہوئے اور تین سال مزدہ پڑھا۔ اس دوران میں قابلیت کا وطعہ بھی حاصل دیا۔ ۲۸ فروری ۱۸۴۴ء کو کالج کے شعبہٴ مشرقی میں بورڈ سائنس کے مدرس ہو گئے۔ انک ماہانہ رسالہ 'فوائد الساطرین' نکالا جس میں اکس علمی بحثیں ہوتی تھیں۔ بعد میں یہ سدرہ روزہ ہو گیا۔ اسی دوران میں انک رسالہ 'مختبِ ہند' بھی جاری کیا۔ ۱۸۵۲ء میں یہ دونوں رسالے بند ہو گئے۔ ۱۲ جولائی ۱۸۵۲ء کو رام چندر نے عیسائی مذہب قبول کر لیا جس پر عوام میں کافی غلط و غضب پیدا ہوا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں بڑی مشکل سے ان کی جان بچی اور ۳۱ دسمبر ۱۸۵۷ء سے یہ دہلی کالج سے الگ ہو کر رڑکی چلے گئے، جہاں جنوری ۱۸۵۸ء میں ٹامسن سول انجینئرنگ کالج کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ ستمبر ۱۸۵۸ء میں<sup>(۲)</sup> دہلی ڈسٹرکٹ سکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ ۲۴ مئی ۱۸۶۲ء سے انہوں نے سنسن کی کوسس شروع کی۔ ۱۸۶۶ء میں ریٹائر ہوئے، پھر ہتھالہ چلے گئے جہاں سر رسدِ تعلیم کے ڈائریکٹر بنا دیئے گئے۔ ۱۱ اگست ۱۸۸۰ء کو انتقال ہوا۔

ماسٹر رام چندر نے اردو زبان و ادب کی قابلِ قدر خدمات انجام دیں، انہوں نے بار بار اس خیال کا اعادہ کیا کہ اگر اعلیٰ تعلیم کو وسعت دینا ہے تو اس کے لیے اردو کو زرفی دینی ہوگی۔ اردو میں انشائیہ نگاری کا سلسلہ انہوں نے سر سب سے بھی پہلے شروع کیا، اسی طرح صحافت میں بھی انہیں سر سب پر تقدم حاصل ہے اور ترجمہ اور

(۱) مولوی عبدالحق، 'مرحوم دہلی کالج' میں یہ تاریخ سہو کتابت سے ۱۸۶۱ء چھپی ہوئی ہے ص ۱۵۲، ایڈیشن ۱۹۴۵ء

(۲) 'مولوی عبدالحق کالج' مرحوم دہلی کالج میں سہو کتابت سے یہ تاریخ ۱۸۸۵ء چھپی ہے ص ۱۶۳

تاریخ میں مولوی ذکاء اللہ ہر انہیں نفدہ حاصل ہے۔ ریاضات میں ان کی خدمات کا اعتراف برطانیہ میں بھی ہوا اور وہاں کے نصاب میں ان کی کتابوں کو شامل کئے جانے کی سفارش ہوئی۔ ’دہلی سوسائٹی‘ میں بھی ان کا سرگرم حصہ رہا اور معاشری خدمات کے سلسلے میں ’فوائد الناظرین‘ اور ’محب ہند‘ میں ان کے کثیر التعداد مضامین ان کی یادگار ہیں۔

ماسٹر رام چندر کی مصانف میں ’رسالہ اصول علم سلب و براس ہائے مخروطی و علم ہندسہ بالجبر‘ (۱۸۴۴ء)، ’اصول جبر و معادلہ‘ (۱۸۴۵ء)، ’عجائبات روزگار‘ (۱۸۴۷ء)، ’مذکرہ الکاملین‘ (۱۸۴۹ء)، ’مسائل کتاب و حرثات‘ (Maxima and Minima) (۱۸۵۰ء)، اس کتاب ہر بعد میں حکومت نے ایک خلعت پنج نارجہ اور دو ہزار روئے نقد انعام دیا، ’تفرق احصا کا ایک ناطرہ‘ (Differential Calculus)، ’سرب الفہم‘ (مبتدیوں کے لیے علم ریاضی سے متعلق)، اور ’اعجاز القرآن‘ وغیرہ شامل ہیں۔

**مولوی ضیاء الدین** (شمس العلماء ڈاکٹر)، دہلی کالج کے طالب علم بھی رہے اور پھر اسی کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر عربی اور بعد میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ مولوی صاحب عربی کے بڑے عالم تھے، ’رسوم ہند‘ کے پہلے حصے کے سوا ان کی کوئی مصنیف نہیں ملی۔

**ماسٹر ہمارے لال** دہلی کے رہنے والے تھے، دہلی کالج میں ماسٹر رام چندر اور مولانا صہبائی سے تعلیم نائی اور بعد تحصیل سر رسد تعلیم میں ملازم ہو گئے۔ گڑگانوں سکول میں ہیڈ ماسٹر رہے پھر دہلی نارمل سکول کے ہیڈ ماسٹر ہوئے۔ ۱۸۶۴ء میں بنجاب بک ڈپو کے کورپٹر ہوئے۔ بنجاب بک ڈپو کے ختم ہونے پر انسپکٹر سکولز ہو گئے۔ دہلی اور لاہور میں اپنے فنام کے دوران میں علمی ادبی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ بنجاب بک ڈپو میں مولانا حالی انہی کے توسط سے پہنچے۔ اردو کے اور بھی کئی بھی خواہ اور ادیب ماسٹر ہمارے لال کی بدولت لاہور آئے اور اس طرح بنجاب کو اردو کی ترقی کے لیے قابل قدر خدمات سر انجام دیے کا موقع ملا۔ ان کی مصانف میں ’قصہ ہند‘، ’حصہ اوّل و حصہ سوم‘، ’رسوم ہند کا ابتدائی نصف حصہ‘، ’تاریخ انگلستان (کلاں)‘، ’دربارہ ہبصری‘ ۱۸۷۷ء (ماسٹر ویلر کی تالیف کا ترجمہ) شامل ہیں۔ ’رسالہ‘ ’انالٹی‘ بنجاب کے ایڈیٹر بھی رہے اور اس میں متعدد مضامین لکھے۔ ۱۹۱۳ء میں انتقال کیا۔

**مولوی ذکاء اللہ** دہلی کالج کے اچھے طالب علموں اور اچھے اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ یکم اپریل ۱۸۳۲ء کو دہلی میں پیدا ہوئے<sup>(۱)</sup> ان کے والد حافظ ثناء اللہ بہادر شاہ کے چھوٹے بیٹے کے االبق تھے۔ دہلی کالج سے تحصیل علم کے بعد وہیں ریاضی کے استاد

(۱) ڈاکٹر مسد عبد اللہ کی کتاب اردو ادب (۱۸۵۷ء تا ۱۹۶۶ء) میں یہ تاریخ ۱۸۳۷ء بیان ہوئی ہے جو درست معلوم نہیں ہوئی۔ (ص ۳۹ - طبع مکتبہ خیابان ادب)۔

مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد آگرہ کالج میں فارسی اردو کے پروفیسر ہو گئے۔ ۱۸۵۵ء میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس بلند سہر اور مراد آباد مقرر ہوئے۔ ۱۸۶۹ء میں دہلی نارمل سکول کے مدرس اعلیٰ ہوئے۔ ۱۸۷۲ء میں اورینٹل کالج لاہور کی پروفیسری کے لیے نامزد ہوئے لیکن چارج لینے سے پہلے ہی بیور سٹریل کالج الہ آباد میں فارسی کے پروفیسر بنا دیئے گئے۔ ۲۴ برس کی ملازمت پوری ہونے پر سنسن لے لی اور اس کے بعد ۲۶ برس (۱۹۱۰ء) تک زندہ رہے۔

مولوی ذکاء اللہ ورنیکر سوسائٹی کے بڑے مؤید اور ’تہذیب الاخلاق‘ کے مسفل مقالہ نگار تھے۔ ان کی تصانیف کی تعداد ڈیڑھ سو کے لگ بھگ ہے جن میں صرف ریاضیات پر ۸۱ کتابیں ہیں۔ انہوں نے ہر موضوع پر لکھا اور کرب سے لکھا اسی لیے حالی ان کے دماغ کو ہنسنے کی دکان کہا کرتے تھے۔ مولوی ذکاء اللہ کی اہم تصانیف میں ’تاریخ ہندوستان‘ (دس جلدوں میں)، ’آئین قسری‘ (بن جلدوں میں)، ’فرہنگ شامل ہیں‘، ’تہذیب الاخلاق‘، ’سائنٹفک گزٹ علی گڑھ‘ اور ’مخزن لاہور‘ وغیرہ میں بھی کرب سے مضامین لکھے۔ ان کی تصنیفات سے تدریسی ضروریات بہت حد تک پوری ہو گئیں۔

**مولانا محمد حسین آزاد** دہلی کالج کے نامور طلباء میں سے ہیں۔ ۱۸۷۷ء دہلی میں مولوی نادر کے یہاں پیدا ہوئے، ذوق سے گہری عصب رکھتے تھے۔ جنگ آزادی کے بعد مدینوں سرگرداں رہے، ۱۸۶۲ء میں لاہور پہنچے اور بنڈ من بھول کے ذریعے سرشتہ تعلیم میں ۱۵ روپے پر ملازم ہو گئے۔ ماسٹر سارے لال حب لاہور آئے تو ان کے ذریعے ڈائریکٹر تعلیم سے ملاقات ہوئی جو آزاد کی ترقی کا داعی بنی۔ ۱۸۷۴ء میں جب کرنل ہالرائڈ ڈائریکٹر ہوئے تو آزاد نے انہیں انجمن پنجاب کی سرپرستی پر آمادہ کر لیا۔ انجمن پنجاب کے مقام میں آزاد کا خاص حصہ ہے پھر اسی انجمن کے ذریعے حالی اور آزاد کی متحدہ کوششوں سے جدید شاعری کی تحریک چلی۔ بعد میں آزاد اورینٹل کالج لاہور میں عربی اور فارسی کے استاد ہو گئے۔ ۱۸۸۷ء میں فابلٹ کے اعتراف میں شمس العلماء کا خطاب ملا، ۱۸۸۹ء سے مختلف (صدما) کی بدولت جنون کے آثار پیدا ہوئے جو آخر دم تک رہے۔ ۱۹۱۰ء میں وفات پائی۔

آزاد کی تصانیف میں ’دربار اکبری‘، ’قصہ ہند‘، ’آب حیات‘، ’نگارستان فارس‘، ’سخندان فارس‘، ’نیرنگ خیال‘، ’سپاک غمناک‘ وغیرہ کے علاوہ ریڈرن اور سکول کی کتابیں بھی شامل ہیں جن کی تعداد ۶ ہے۔ آزاد نے اردو میں نمبر کے نئے اسلوب کو فروغ دیا۔ ’آب حیات‘ ان کا ساہکار ہے، جسے اردو میں پہلی تاریخ ادب کی حیثیت حاصل ہے۔ شاعری میں انہوں نے متعدد مستویاں لکھی ہیں۔ جدید شاعری پر انجمن پنجاب کے تحت ان کے لیکچر خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

**مولوی نذیر احمد** ۱۸۳۱ء میں رہڑہ ضلع جنجور میں پیدا ہوئے۔ چھوٹی عمر میں دہلی آگئے اور پنجابیوں کے کثرت کی مسجد میں تعلیم پانے لگے۔ حسن اتفاق دہلی کالج تک جا پہنچے<sup>(۱)</sup>۔ اس وقت دکنہ اللہ حساب کی جامعہ میں اور سارے لال انگریزی کی جامعہ میں پڑھتے تھے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر حساب میں مدرس ہوئے، پھر دہلی انسپکٹر سکولز اور جیک آزادی کے بعد انسپکٹر سکولز - ۱۸۶۱ء میں انڈین نسل کوڈ کا ترجمہ (عزیز آباد ہند) کیا جو بہت مقبول ہوا اور محصلدار بنا دیئے گئے اور ری کرے کرے کانکٹر کے عہدے تک پہنچے۔

۱۸۷۷ء میں رخصت لے کر حیدر آباد چلے گئے اور غارسی ملازمت کر لی، پھر مسمل ہو گئے۔ ممبر مال کی حساب سے انک عرصے تک حسابات اعام دیں اور پھر ملازمت ترک کر کے دہلی آ گئے، جہاں ۱۹۱۲ء میں انتقال کیا۔

نذیر احمد نے اصلاحی ناول بھی لکھے، قانون کی کتابوں کے ترجمے بھی کئے، درسی کتابیں بھی تحریر کیں لیکن ان کی سہرت کا اصل سبب ان کے ناول ہونے جس کے ذریعے انہوں نے مسلمان معاشرے کی برجانی کی اور اس پر بصیرت کیا۔ اسے دہلی کالج کا اربحاطور برکھا جا سکتا ہے کیونکہ خود نذیر احمد کا قول ہے ”اگر میں کالج میں نہ پڑھا ہوتا تو بتاؤں میں کیا ہوتا؟“ مولوی ہو، تک حال، معصیت، الہل کھرا، اسے جس کے احتساب سے فارغ، دوسروں کے غیوب کا محسوس، برحود غلط، مسلمانوں کا نادان دوست، تقاضے وقت کی طرف سے اندھا مہرا“<sup>(۲)</sup>۔

مولانا کی مشہور تصانیف میں ’مراہ العروس‘، ’ناب العس‘، ’نوبہ النصوح‘، ’ابن الوہب‘، ’محضیات‘، ’انامی‘، ’روائے صادقہ‘، ’الحقوق و العرائض‘، ’امہات الامہ‘، ’اجنبیاد‘، ’صرف صغر‘، ’حمد ہند‘، ’مبادی الحکمہ‘ وغیرہ شامل ہیں۔

**پنٹ من پھول** داہ کے برہمن تھے۔ دہلی کے رہنے والے اور کالج کے قدم طلبا میں سے تھے۔ کالج کی رپورٹوں میں ان کا تعریفی ذکر ملتا ہے۔ پنجاب گورنمنٹ کے میر منشی ہو گئے تھے۔

**مولوی کریم اللہ** نانی سب کے رہنے والے تھے دہلی کالج میں تعلیم پائی اور دہلی میں ہی بس گئے آپ نے ایک مطبع بھی قائم کر لیا، نہایت محنتی اور قابل انسان تھے۔ ان کی تالیفات میں ’تعلیم النساء‘، ’گلستان ہند‘، ’مذکرہ طبقات شعرائے ہند‘، ’گلستانہ نازنیناں‘، ’مذکرہ النساء‘، ’تاریخ شعرائے عرب‘ اور ابوالفداء کی تاریخ کی پہلی، دوسری، چوتھی اور پانچویں جلد کا ترجمہ شامل ہیں۔

(۱) دہلی کالج میں داخلے کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ فرحت اللہ بیگ، ’امہات النذیر‘ اور ’نذیر احمد کی کہانی‘۔  
(۲) ایضاً - ص - ۳۳۔

جنگِ آزادی کے دوران دہلی کالج کے کئی اساتذہ اور ان کے اہلِ خانہ مارے گئے۔ کالج کے شعبہٴ سائنس میں نحرے کے تمام سامان بوڑے گئے، لائبریری لوٹ لی گئی اور کالج ویران ہو گیا۔ مدبوں اسی طرح بند پڑا رہا تاآنکہ ۱۸۶۴ء میں دوبارہ جاری ہوا۔ ۱۸۷۷ء میں یہ کالج ہمسہ ہجمنہ کے لیے بند کر دیا گیا۔



## چوتھا باب

اس دور کی نثر

(الف) رجب علی بیگ سرور

سرور رجب علی بیگ کا سہ سداش اندرونی سہا۔ یوں کی بنا پر ۱۷۸۵ء (۱۲۰۰ھ) ماس دنا گنا ہے<sup>(۱)</sup>۔ سرور نے والد سرور اصغر علی بیگ لکھنؤ کے رہنے والے تھے<sup>(۲)</sup>۔ دناسی نے کسی سماج کی بنا پر ان کو وطن دسور لکھ دنا ہے اور محمود ابر آبادی نے دلائل کے بعد ان کی ابر آبادی ثابت کرنے کی کوسر کی ہے۔ یہ دونوں ماس غلط ہیں۔

ماس دنا ہے کہ سرور کی عدم و نسب ان کے عہد کے رواج کے مطابق ہوئی اور انہوں نے عربی، فارسی اور اردو بولی، گو عربی اور فارسی میں درجہ کمال تک نہ پہنچے۔

موسیقی، نجوم، حضاطی، سہ لری کے فی سرور کے زمانے کے مسول فی تھے<sup>(۳)</sup>۔ موسیقی اور نجوم سے سرور نے علمی خاطر اور واقف کا اندازہ ان کی ان تحریروں سے ہونا ہے جن میں ان علوم کی مخصوص اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں۔ بد لڑہ بوس بھی موسیقی اور خطاطی میں ان کی مہارت کا ذکر کرتے ہیں<sup>(۴)</sup>۔

**سرور کی زندگی :** سرور ۵ ماس اور ان کی جوانی آصف الدولہ (۱۷۷۵ء - ۱۷۹۷ء) اور سعادت علی خاں (۱۷۹۸ء - ۱۸۱۴ء) کے دور میں لکھنؤ میں سر ہوئی۔ ان کی تحریروں اور خصوصاً ان کے خطوں نے حوائی سے اس اب کا اندازہ ہونا ہے کہ انہوں نے اپنی جوانی عیس و آرام سے سر کی۔ ان کے اک خط سے سہ چلنا ہے کہ ان کی دو سویاں تھیں<sup>(۵)</sup>۔ ان میں سے ایک کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے سرور نے لکھا ہے کہ اس نے انہیں لاکھوں روے بعد دے اور انہوں نے اس کی بدولت ہر طرح کا ”چن دنا“<sup>(۶)</sup>۔ لیکن سرور کی زندگی کا نہ چن اس دن رخصت ہو گنا حب عاری الدس حیدر (۱۸۱۳ء - ۱۸۲۷ء) کے

(۱) ابر مسعود رسوی، رجب علی بیگ سرور - صفحہ ۷۵ - مطبع اسرار کریمی پریس الہ آباد، ۱۹۶۷ء

(۲) رجب علی بیگ سرور دیباچہ مساندہ ععائب ”متوطن خطہ لے بطیر“۔

(۳) تفصل کے لیے دیکھئے، رجب علی بیگ سرور، مساندہ عرب، صفحات ۱۲۱ تا ۱۲۳۔

(۴) شیفہ، کشن لے حار، صفحہ ۱۳۳ اور حمغانہ جاوید، حلد چہارم صفحہ ۱۷۴۔

(۵) رجب علی بیگ سرور (خطوط کا مجموعہ) انشائے سرور، صفحہ ۷۷۔

(۶) ضیاء الدین، مولوی، انشائے اردو، صفحہ ۲۸۔

عہد میں انہیں لکھنؤ چھوڑ کر کانپور جانا پڑا (نوبہر یا دسمبر ۱۸۲۴ء - ۱۸۲۴ء) (۱)۔ کانپور جانے کے سلسلے میں دو رائے ظاہر کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ نادر شاہ کے حکم سے جلا وطن کیے گئے تھے اور دوسرے یہ کہ انہوں نے قابون کی زد سے بچنے کے لیے کانپور جا کر پناہ لی (۲)۔ غازی الدین حیدر کی وفات کے بعد ان کے بیٹے نصیر الدین حیدر (۱۸۲۷ء - ۱۸۳۷ء) محب بر بٹھے۔ ”سرور نے فسانہ عجائب کے دساجے اور متن میں نئے بادشاہ کی رعایت سے کچھ اضافے کیے (۳)۔“ اور ملازم کی درخواست کی۔ یہ بات ثابت نہیں کہ انہیں ساہی ملازم ملی یا نہیں لیکن اتنا معلوم ہے کہ سرور نصیر الدین حیدر کے زمانے میں لکھنؤ میں رہے اور ان کی وفات کے وقت لکھنؤ میں موجود تھے۔ نصیر الدین حیدر کے بعد محمد علی شاہ تخت نشین ہوئے اور ان کے نائب وزیر سرف الہ ولد نے سرور کو ملازم دے دی۔ مئی ۱۸۴۷ء کے شروع میں واحد علی شاہ تخت نشین ہوئے۔ سرور نے محب تنسی بر قطعہ تاریخ کہا، ساہی ملازم کی درخواست کی اور کامیاب ہوئے۔ اس ملازم میں سرور کو پچاس روپے مہینہ تنخواہ ملی تھی (۴)۔ اس زمانے میں آدھر نادر شاہ کی خدمت میں بارہابی کا شرف بھی حاصل ہونا تھا (۵)۔ اس طرح انہوں نے کئی برس آرام سے بسر کیے لیکن انتزاعِ سلطنت (فروری ۱۸۵۶ء) کے چند مہینے پہلے سے ان کی سچواہ ملیے میں بے فاعدگی ہونے لگی اور اس کے بعد سے ان کی زندگی برابر مالی بریسائیوں میں گئی۔ مدرجہ دہل مرآتوں کی سرپرستی کے باوجود یہ برساتان جاری رہیں۔ مرآتوں کے نام یہ ہیں: مہاراجا بنارس، مہاراجا پٹنہ، مہاراجا الور، سنگم صاحبہ بیہوال، امجد علی حاکم رئیس سندیلہ، مرزا حسین بگ بگ کامل بوس، مسجر کارنگی کے سر رسد دار سند فرمان علی، منشی سمو برائن مرستہ دار کمبریٹ، مولوی محمد یعقوب فرنگی علی اور منشی نولکھنور۔ سرور نے اپنی زندگی کے آخری گیارہ سال بنارس میں بسر کیے اور یہیں تقریباً ۸۶ برس کی عمر میں ۱۸۶۹ء (۱۲۸۶ھ) میں وفات پا گئے۔

### تصانیف

سرور کی معلومہ تصانیف کی تفصیل یہ ہے :

- (۱) ’فسانہ عجائب‘ (۱۸۲۴ء/۱۸۲۴ء) - چند دوسو کی فرمائش کی عمل اور حکیم اسد علی خاں کی بر زور نائید اس افسانے کی تخلیق و نظام کا باعث بنی۔

- 
- (۱) نیر مسعود رضوی، رجب علی بگ سرور - صفحہ ۸۵
  - (۲) نیر مسعود رضوی، رجب علی بگ سرور - صفحہ ۸۵
  - (۳) نیر مسعود رضوی، رجب علی بگ سرور - صفحہ ۸۹ نیز بحث زمانہ تالیف فسانہ عجائب یہی کتاب، صفحہ ۱۲۸ تا ۱۳۰ -
  - (۴) سرور، الشائے سرور - صفحہ ۹
  - (۵) سرور، فسانہ عبرت - صفحہ ۷۷ - ۷۸ -

(۲) 'سرورِ سلطانی' ترجمہ 'سمسر خانی' (۱۸۵۰ء/۱۲۶۷ھ) واحد علی شاہ کے حکم پر لکھا گیا<sup>(۱)</sup>۔

(۳) 'شرارِ عسی' (۱۸۵۱ء/۱۲۶۷ھ) ایک مختصر قصہ جو سگم صاحبہ بھوپال کی فرمائش پر لکھا گیا<sup>(۲)</sup>۔

(۴) 'سکوفہ' محبت' (۱۸۵۶ء/۱۲۷۲ھ) احمد علی خان رئیس سندیلہ کی فرمائش پر لکھا گیا<sup>(۳)</sup>۔

(۵) 'شرارِ سرور' (۱۸۶۳ء/۱۲۸۰ھ) 'حدائق العنسی' کا ترجمہ جو مہاراجہ انسوری برسات برائن سنگھ، ہادر والئی مارس کی فرمائش پر لکھا گیا<sup>(۴)</sup>۔

(۶) 'سلسلہ سرور' (۱۸۷۹ء/۱۲۹۷ھ) 'الب لیلہ' کا ترجمہ جو مولوی محمد یعقوب انصاری، مسی سہو برائن اور سید فرماں علی کی تحریک پر لکھا گیا<sup>(۵)</sup>۔

(۷) 'فسانہ عرب'۔

(۸) 'اسانے سرور' (حطوط کا مجموعہ)

(۹) 'نیر درہ ہزار'، مصموں دنکس نہ اہتمام سواری مہاراجا انسوری برسات

(۱۰) 'مہرب حسن سادی'، نرس آف ویلر

**فسانہ عجائب:** سرور کی سب سے مشہور اور مقبول کتاب ہے۔ لکھنؤ، کانور،

دہلی، کلکتہ، الہ آباد اور لاہور سے اس کے جو خاص انڈس جھپے ان کے علاوہ سستے سستے بے شمار انڈس سامع ہوئے۔ نو، دس مضمون انڈس، ہندی، فارسی اور انگریزی میں اس کے ترجمے اور متعدد خلاصے اس کے علاوہ ہیں<sup>(۶)</sup>۔ ایک زمانہ تھا کہ لوگوں کو 'فسانہ' عجائب پوری کی پوری زبان یاد بھی<sup>(۷)</sup>۔ اور 'لکھنؤ میں اس قصے سے ہر چھوٹا بڑا اس طرح واقف اور مانوس تھا جسے دلی میں لوگ 'ناع و ہار' سے۔

فسانہ عجائب بھی دوسری داستانوں کی طرح اس قدر قصہ ہے جس کی دلچسپی کا انحصار مافوق الفطرت احرا ہے اور اس کی ترتیب و تسکین میں ویسی ہی ناہمواریاں ہیں

(۱) اسانے سرور سبب نالیہ سرور سلطان، نز سبب تالیف سکوفہ، محبت و عروسی۔

(۲) سرور، رجب علی ہنگ، حاتمہ شرار عسی۔

(۳) سرور، رجب علی ہنگ، سبب تالیف سکوفہ، محبت، صفحہ ۷۔

(۴) سرور، رجب علی ہنگ، سبب نالیہ گنار سرور و اسانے سرور حطوط ۱۲، ۳۷، ۶۱۔

(۵) سرور، رجب علی ہنگ، شہستان سرور سبب نالیہ۔

(۶) تفصیل کے لیے دیکھئے، ڈاکٹر نر مسعود کی رجب علی ہنگ سرور، صفحات ۱۳۱ تا ۱۴۴ و

اضافہ ۴۳۹ - ۴۴۰۔

(۷) نر مسعود رضوی، رجب علی ہنگ سرور - صفحہ ۲۲۸۔

جیسی اور داسانوں میں، لیکن اس کی کئی خصوصیتیں ایسی ہیں جن کی بنا پر یہ حکم لگانا غلط نہیں ہو گا کہ 'فسانہ' عجائب کی حیثیت منفرد اور اسمازی ہے۔ اس کی پہلی امتیازی خصوصیت تو یہ ہے کہ سرور نے اصل قصے سے پہلے ایک دباجہ لکھا ہے جس میں حمد، نعت، منقبت، ساہانِ وقت کی مدح اور سببِ نالہ کتاب کے بعد انے وقت کے لکھنؤ کی تہذیبی اور معاشرتی جزئیات کی مصوری رنگین اور مرصع نثر میں کی ہے۔ موضوع کی دلکشی، موضوع کے ساتھ مصنف کی گہری جذباتی وابستگی اور برکتِ ادبی اور شاعرانہ بیان کے استزاح سے ایسی نائنہ نثر وجود میں آئی جو رنگین نائی کی ایک اعلیٰ مثال تصور کی جا سکتی ہے۔

فسانہ عجائب کا دوسرا حصہ جانِ عالم اور محسنِ آرا کا وہ قصہ ہے جس کی تسکین و ترسب کئی مشہور کہانیوں مثلاً سحر البان، گلِ سکاؤلی، نونا کہانی، ہمارے دانس، پدماو، حاتم طائی، بوسانِ حال، داسانِ امرِ حمزہ، سگھاسن سسی وغیرہ کے احزا کے اسراک اور اجتماع سے ہوئی ہے<sup>(۱)</sup>۔ لیکن سرور نے ان مشہور کہانیوں اور داسانوں سے حوا اور قول لیا اسے اپنے محل کے سانچے میں ڈھال کر ایسا قصہ بنا لیا جو بالکل اس کا اپنا معلوم ہوا ہے، اس لیے کہ فسانہ عجائب میں جہاں ایک طرف مافوق الفطرت عناصر، سحر و طلسم کی کار فرمائی اور رزمِ بزم کے رواجی اور روایتی مرقعے ہیں، دوسری طرف اس کے محفلِ حصّوں میں لکھنؤ کی معاشرتی زندگی کا مہذبی رجاؤ اس حد تک موجود ہے کہ ناع و ہمار میں بھی نہیں<sup>(۲)</sup>۔ فسانہ عجائب کے کرداروں کی گفتگو اور رسم و رواج کے سان میں زندگی کی سچائی کا گہرا رنگ اس قدر واضح صورت میں ہمیں اردو کی داسانوں میں فسانہ عجائب سے پہلے نہیں ملتا<sup>(۳)</sup>۔ سان کی سیرتی، سوخی اور سگھگی، فسانہ عجائب کے اکثر کرداروں کے روزِ مہرہ کا حروِ لائنک ہے۔ ملکہ مہر نگار، اس کی کنسرں اور خواصیں اور سہزادہ جانِ عالم سب فقرہ بازی حاضرِ خوانی اور نوک جھونک میں طاق ہیں<sup>(۴)</sup>۔ مثلاً جب مہر نگار کی خواصیں اور ہم جلسیں جانِ عالم کو دیکھتی

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے (الف) گانِ حمد، اردو کی بری داستانیں صفحہ ۱۶۸ تا ۱۷۱

(ب) فسانہ عجائب اور ناع و ہمار۔۔۔ زمانہ کالنور جون ۱۹۴۵ء اور (ج) فسانہ عجائب اور پدماو: نموس، لاہور، مارچ، اپریل ۱۹۴۹ء۔

(۲) پروفیسر وقار عظیم، ہماری داستانیں - صفحہ ۳۲۱۔

(۳) یہ شاید کلمتہ درست نہیں کہ شہسہاہ عالم کی عجائب القصص (۱۹۷۲ء) میں مفاہیم تہذیب کی بہت سی جھلکناں ملی ہیں - ..... (مدیر عمومی)

(۴) پروفیسر وقار عظیم، ہماری داستانیں - صفحہ ۳۳۱ یا ۳۳۶۔

ہیں تو آس میں ہوں حد مگوئیاں کبریٰ ہیں - احساس ملاحظہ کجیے :

”ان درخسوں سے چاند نے کہہ کیا ہے“<sup>۱</sup>

”نہیں ری ، سورج چہا ہے“<sup>۲</sup>

”اجہال جہکا ! بو ٹری خام ہارا ہے“ -

”بری خان کی قسم ! برسان کد بری زادہ ہے“ -

”چلو نردبک سے دیکھ آنکھ سنک کدر دل ٹھنڈا درس“ -

خدا جانے ہم سب کے دندوں میں حری لہاں سے چھا گئی ہے ، لہا ہوا ہے ، یہ

بو پھلا جہکا پٹا لٹا مردوا ہے“ -

خوس فعلی اور خوس وفی سب کی رنگوں کا معمول ہے اور نہ ناب اور موفعوں کے علاوہ خصوصیت کے ساتھ اس وہ بوری طرح ابھر کر سامنے آتی ہے جب سرور برسوں اور ان برسوں میں ہوئے والی رسموں کی تفصیل سنا کر لڑے ہیں - اس تفصیل میں بومہات ، عائد اور رواج کا برا صحیح اسراج ہے - سنا ادنیٰ اور ساغراندہ ہونے کے باوجود سالغے اور مصتح سے گراں ناز نہیں - فسانہ عجائب کی نسری لکچر حصص میں بہت اہم اور بعض حشمتوں سے سب سے اہم خصوصیت اس کی وہ سکسہ اسنا برداری ہے جس میں بجائے خود ایک کسے ہے - نخل کی رنگی ، اظہار کی بدرب ، غبار آرائی کی لطافت اور لفظوں اور فہروں کی برحسہ اور بر نرم در و نسب اور ان سب پر چھائی ہوئی سگفگی کی فضا اس رنگین بر کی خصوصیات میں<sup>(۱)</sup> - ملا نہ احساس ملاحظہ ہو :

”سہزادی نہ سن کر سرمندہ ہوئی بھر لڑکا گھوڑے سے لٹ کتا

بحارا نادان بانوں کا سودو زباں لچہ نہ سمجھا ، حو کچہ ناب نے

سکھانا بھا کہے لگا ، جب کہہ حک سہزادی لے سجدہ مود سے

کھسج لڑکے پر جنویک دنا ، وہ دھم سے رہن بر گر لڑا ، دانہ احل

نے کنار غاطف میں اٹھا لیا اہل مور سے ملا دنا - بھر باگ اٹھا

جل نکلی<sup>(۲)</sup>“

اور ان سب خصوصیات کی بنا پر نفاذوں نے بجا طور پر نہ رائے طاہر کی ہے کہ ”فسانہ عجائب کا ناول کے ارتقاء میں خاصا حصہ ہے“<sup>(۳)</sup> - اور ”طلسیانی داستانوں کے دور میں کم سے کم ایک کتاب اسی ظہور میں آئی جو ناول سے بہت

(۱) پروفیسر وقار عظم ، ہماری داستانیں - صفحہ ۳۸۸ -

(۲) سرور ، رجب علی بگ ، فسانہ عجائب - ص ۱۱۵

(۳) علی عباس حسینی ، ناول کی تاریخ و نشند - صفحہ ۱۶۵ -

قریب ہے<sup>(۱)</sup>۔ ”فسانہ“ عجائب کی اہمیت کا صحیح اندازہ ”فسانہ“ آزاد کا تجزیہ کر کے ہونا ہے جس میں ”فسانہ“ عجائب کی روس کی طرح قصے کی دلچسپی کا انحصار واقعات اور عمل پر نہیں بلکہ زبان و بیان کی سوخی اور مکالمے کی برجستگی پر ہے ، گو اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ سرور نے ”فسانہ“ عجائب لکھ کر جہاں ، حقیقی زندگی کی مروج کسی ، مکالموں کی دلکش ترتیب اور سنگمہ و دل آویز عبارت آرائی کے اسراج سے قصہ گوئی کے نفاصوں کو مجروح نہیں کیا ، وہاں ”بے محل اور عمر دلکش اشعار کی بھرمار ، مرآء الطیر اور لفظی تلاببات کے بھونڈا پن ، لفظی اور معنوی نعیید ، ابہام کے بصر و حال اور بیان میں آہنگ اور نوازن کی کمی<sup>(۲)</sup>“ سے جا بجا قصے کی وحدت اور روانی میں فرق آتا ہے ۔ ”فسانہ“ عجائب کے درمیان میں آنے والے کئی ضمنی قصے بھی داستان کے ہموار بہاؤ میں رکاوٹ ڈالتے ہیں اور ایک جگہ بھی مذہذب کی کسمپوشی طرح اٹھرتے نہیں دیتے ۔ مثلاً حب سہزادہ جانِ عالم پر انجمن آراء کا عسّی سوار ہونا ہے ۔ تو اس کا ہونا سہزادے کو عسّی کرنے سے روکا ہے اور ہانا ہے کہ عسّی میں انسان کی کسا کسمپوشی ہو جاتی ہے ۔ تو ملاحظہ کیجئے کہ ہونا کسا کہتا ہے :

”خدا کو مان نہ لے نام عسّی کا سرور ۔“

کہ منفع میں بھی اس کے ہیں سو ضرر ہدا  
عمل اس کام میں دور ہو جاتی ہے ، وحسب نزدیک آتی ہے ۔ لب خشک ،  
جسم نر ، چہرہ زرد ، دل حوں ہونا ہے ۔ بھوک لباس مر جاتی ہے ۔ خواب  
میں سد نہیں آتی ہے ۔ جاں سربس تلخ ہو کلمحے میں درد آخر کو حنون  
ہونا ہے ۔ ”حب جگر لٹھانا ہے ، خون دل سا ہے ، مر مر کے حسا ہے ۔  
روہوں کے طعنوں سے سسہ فکار ہونا ہے ۔ لڑکوں کے سہروں سے سرگلنار  
ہونا ہے ۔ دن کو ذلت و خواری سب کو انتظار میں احس شاری ، بفراری  
سے فرار ، سب کی نظر میں دلیل و خوار ، جنگل میں جی لگا ہے ۔  
بسی اچار معلوم ہوتی ہے“ ۔

### دوسرے قصے

(۱) ”شکوہ محبت“ : میں آرزو ساہ اور سمن رح سہزادی کا وہی قصہ ہے جو  
سہر چند کھیری نے انہی نصف ”نو آذین پیدی“ میں بیان کیا ہے ۔ سرور نے اس قصے کو  
اپنے مخصوص رنگین ادبی اسلوب میں لکھا اور اسے حسنِ فافہ سے سجانے کے علاوہ  
شاعرانہ منظر کشی ، لکھنوی معاصرے کے رسم و رواج کے ذکر اور حسبِ موقع شوخ

(۱) عزیز احمد ، نرق پسند ادب ۔

(۲) پروفیسر وفار عظیم ، ہاری داستانیں ۔ صفحہ ۳۴۸ ۔

(۳) سردار ، رجب علی سنگ ، ”فسانہ“ عجائب ۔ ص ۳۰

مکالموں کے اضافے سے زیادہ دلچسپ بنانا۔

(۲) شرارِ عشق: سارس کے ایک جوڑے کی کہانی ہے۔ بس سبکداری کے نو سارس کا سحر کیا، مادہ نے اس کے فراق میں حل کر جان دے دی۔ تمہید، قصے کے میں اور حاتم کے حالات کو ملا کر یہ جھوٹی داستان بنائی جائے گی ہزار لفظوں میں بیان ہوئی ہے۔ ”شرارِ عشق کے پورے قصے کی بنیاد اخلاقی اور اس کا انداز مرنا نا واعظانہ و ناصحانہ ہے“۔ حال آراں کے تصنیف، فاضل کی داندی اور رعاب لفظی کے الترام کے ناوجود عبارت میں زواہی ہے۔

(۳) ”شبستانِ سرور: الب لیلہ کا مختصر ترجمہ ہے جسے سرور نے اسی پریشان خاطری، ہراس سالی اور صعبِ نصر کی محسوسوں کی بنا پر آٹھ سال میں مکمل کیا۔ سرور کی دوسری تصانیف کی طرح شبستانِ سرور میں بھی فاضل داندی اور رعاب لفظی کا اہتمام ہے، کو اس اہتمام کے ناوجود عبارت میں حسنی اور روانی ہے۔ اسنادِ رداری کے روز نے البہ نہیں نہیں کی کرہ رفاہی میں حلال ڈالا ہے“۔

#### متفرق تصانیف

(۱) گزارِ سرور: بھی شبستانِ سرور کی طرح سرور کی آخری عمر کی تصانیف ہے جو انہوں نے اسے لکھنے کے سہ (۱۸۶۳ء/ ۱۲۸۱ھ - تصانیفِ محقق در مسعود) سے پہلے مکمل کی۔ سرور نے اس ردہ داستان کا ترجمہ کر کے وہ سب کی موروث کے اعتبار سے عبارت کو بھی طویل اور مختصر کیا ہے اور حالات اور سرب سبی میں بھی جا بجا تصرف کیے ہیں آلِ نصرات سے یہ حسہ مجموعی کتاب کی داخسی میں اضافہ ہوا ہے، لکن نہیں نہیں یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ یہ تصرفات اصل مطالب سے قطع نظر کر کے محض روزِ قلم ڈھانے کی عرص سے کیے گئے ہیں۔

(۲) سرورِ سلطانی: سرور کی دوسری تالیف ہے۔ بوک کی ”سمیر حانی“ فارسی میں فردوسی کے سابع کے خلاصہ ہے۔ سرور سلطانی اسی کتاب کا رنگیں اور سنگھ ترجمہ ہے۔ لکن سرور نے تاریخ کے ایک درجن سے زیادہ مآخذ کی مدد سے ترجمے میں اسی اہم معلومات شامل کر دی ہیں کہ اسے داستان کی بجائے تاریخ کی حیثیت دی گئی ہے۔

فسانہٴ عبرت: ادب کی تاریخوں میں سرور کی تصانیف میں جس کتاب کا نام نہیں لیا جاتا وہ ”فسانہٴ عبرت“ ہے۔ یہ کتاب مئی ۱۸۸۳ء میں حنفی - اسے اب سید مسعود حسن رضوی نے مرتب کر کے چھاپا ہے جو سرور کی کتاب سامعے آئی ہے۔ بقولِ مرتب :-

”معلوماتی نقطہ نظر سے سرور کی سب سے زیادہ قابلِ قدر کتاب

فسانہٴ عبرت ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے اودہ کے آخری چار ناساپوں یعنی

(۱) پروفیسر وقار عظیم، ہماری داستانیں - ص ۳۹۳۔

(۲) نیر مسعود رضوی، رجب علی سنگ سرور - ص ۳۰۰۔

نصیر الدین حیدر، محمد علی ساہ، امجد علی ساہ، واجد علی ساہ اور ان کے عہد کے وہ حالات بیان کئے ہیں جو انہی آنکھوں سے دیکھے یا انہی کانوں سے سنے تھے۔ اس میں بہت سی باتیں ایسی بھی ہیں جو کہیں اور نہیں مل سکتیں۔“

یہ کتاب بھی سرور کے رنگین مہمق اور مسجع اسلوب میں لکھی گئی ہے۔ واقعات کے بیان میں صداقت اور مبالغے کا اسراج بھی ہے لیکن اس کتاب کی مبالغہ آرائی اس لحاظ سے سرور کی دوسری تصانیف سے مختلف ہے کہ یہاں اسخاص کی توصیف و تمجید میں ذاتی پسند اور ناسید کو بے حد دخل ہے اور حال آرائی حدے کی سبب کی نابع ہے۔

**انشائے سرور :** سرور کی عرسوں اور خطوں کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے بعض خطوں کے آخر میں تاریخ اور سنہ درج ہے، اکثر خطوں میں نہ اب نہیں، اس لئے ان خطوں کی مدد سے سرور کی زندگی کے واقعات کا مرتب کرنا دشوار ہے، پھر بھی ان کی بھی زندگی، سرب اور شخصیت، تصانیف اور زمانے کے متعلق بہت سی اہم معلومات ان خطوں سے حاصل ہوئی ہیں۔ بہت سی باتیں جو انہوں نے اسی مختلف تصانیف کے ذریعے، من اور حاتمے میں کہی ہیں، نہ خط ان کی تصدیق و تائید بھی کرتے ہیں۔ خطوط میں جانچا سرور کے طریقہ حاکم کی رنگینی بھی ملی ہے لیکن زیادہ خط<sup>(۱)</sup> اسے ہیں جن میں عبارت آرائی نہیں۔ اسے خط بڑھ کر نہیں نہیں تو غالب کے خطوں کی یاد نازہ ہوئی ہے<sup>(۲)</sup> مثال ملاحظہ کیجئے :

فلان زندہ، سادگی، دس مہینے کے بعد عنایت نامہ آنا اور  
قسم کا لکھا نہ نظر آنا نہ تو اگر لکھا تو جواب آنا۔  
ایضاف فرمائے، دو خط لپٹائے میں گئے، دوسرے کا جواب آنا،  
حساب بھر نانا۔ اس ہم عنایت اس۔ اگر اب دو مہینے کے بعد بھی  
ناد فرمائیں تو سب کی حکایت انوں زبان پر لائیں۔ خدا اس کا

(۱) مجموعے میں آدھے سے زیادہ خط انشاءے سرور کے مرتب احمد علی کے نام ہیں جو ان کے متنبی تھے۔

(۲) مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ کیجئے :- (الف) نر مسعود : رحب علی بیگ صفحات ۳۰۹ - ۳۸۵ - (ب) مکاتیب مرزا رحب علی بیگ سرور : نگار، نومبر ۱۹۴۲ء (ج) انشاءے سرور، ناقدری : علی گڑھ میگزین ۱۹۴۶ء۔



عالم ہے ہم لو آت سے دعوائے نار مندی ہے ، سخن ساری نہیں ،  
مہر بازی نہیں ۔ حظ نہیں آتا ہے نو دم گھیرانا ہے (رفعہ ۱۶) ۔

### تصانیف کی اہمیت

اردو سرکی تاریخ میں سرور کو دو لحاظ سے اہمیت دی جاتی ہے ، ایک یہ  
حنبہ داستان کو ، دوسرے یہ حسب اسما بردار ۔ مصرے کے مافوق الفطرت اجزا میں  
ضمی زندگی کے مساببات اور تجربات سرور سے پہلے کسی داستان گو نے اسے  
نڑے نہائے نہ سادہ نہیں لئے تھے ۔ ہمیں ’’سادہ‘‘ عجائب‘‘ میں زیادہ اور ’’سگوفہ‘‘ محبت‘  
وعبرہ میں دم نہ درجے نہ لکھو کی معاشری اور مہدنی زندگی کی صحیح اور دلکس فضا  
ملتی ہے ۔ روزانہ کی زندگی کے معمولات کے علاوہ رسم و رواج کے نفسے پوری حرکات  
کے ساتھ پس لئے گئے ہیں ۔ برداروں کی حرکات و سکنات میں لکھو معاشری کے مزاج  
کی وارفتگی اور ان کی گفتگو میں حوس طبعی ، سوچی اور سگفگی کا رنگ بھی موجود ہے ۔  
مصرے میں انک حاس معاشری اور مہدنی کے احرا اور عناصر کو س سطر کے طور پر استعمال  
کرنے ، مکالمے سے مصرے دو لہجہ لائے ، آگے بڑھائے اور افسانوی فضا پیدا کرنے کا کام  
لئے اور زبان و نثر کو حسب ، اہام اور حوس سلفگی سے برے کا آعار سرور کے قصوں  
سے اور بالخصوص ’’سادہ‘‘ عجائب سے ہوا اور دون قصہ گوئی کی روایت میں اسے عناصر  
داخل ہوئے جن کی اساس پر آگے حل در ناول کی عمارت ڈھڑی کی گئی ۔

سرور اور ان کی تصانیف کا دوسرا اسرار ان کی وہ اسما برداری ہے ، جس کے  
نکاف ، نصیح اور آورد میں آمد کی دہش ہے ۔ سوچی اور سگفگی اس رنگین ساعرانہ نثر  
کا انک اور وصف ہے ۔ حال اور اسلوب میں دہلی اور لکھنؤ کے جس فرو کا ذکر سرور  
سے پہلے تک صرف ساعری کے سلسلے میں کیا جانا تھا اسے نثر میں سرور نے ابھارا اور  
نثر میں جس طرح نثر اس کی نثر کو دہلیوب کی علامت سمجھا جانا تھا ، سرور کی نثر کو  
لکھنؤ کا مظہر قرار دنا گنا اور اسسویں صدی کے آخر تک لکھنؤ میں اس کی نثری  
ہوئی رہی ۔ اس اسلوب سے جہاں انک طرف نہ خرابی پیدا ہوئی کہ خیال کا ابلاغ دشوار  
ہو گا وہاں یہ فائدہ ضرور ہوا کہ لکھنے والوں میں اس ذہنی کاوس کا احساس بیدار ہوا  
جس کے بعد کسی ادبی تخلیق میں معنوب اور گہرائی نہیں پیدا ہوتی ۔

سرور نے اسی بعض تصانیف میں اسے زمانے کی معاشری اور سیاسی زندگی کی جو  
معلومات جمع کی ہیں ان کی بنا پر انہیں ’’ساسی اور سماجی مؤرخ‘‘<sup>(۱)</sup> کہا گیا ہے ۔  
یہ بات اس لحاظ سے درست ہے کہ سرور کی کوئی کتاب ایسی نہیں جس میں کم یا  
زیادہ عصری ، معاشری اور مہدنی زندگی کی تفصیلات نہ ملتی ہوں اور سرور کے عہد کے

تاریخی اور سیاسی حالات کی طرف مجمل اشارے یا بعض صورتوں میں متصل بیانات نہ ملتے ہوں ۔



### کتابیات

- ۱ - ننھا ، محمد یحییٰ - سر المصنفین جلد اول ، محبوب المطابع دہلی ، بار اول ۱۹۲۳ء -
- ۲ - سرور ، رجب علی بگ - انسائے سرور ، مطبع نامی منسی نولکسور ، کانپور جنوری ۱۸۹۷ء
- ۳ - انصاف سرور سلطانی - مطبع سلطانی ، لکھنؤ
- ۴ - انصاف - سسنان سرور
- ۵ - انصاف - سرار عس - افضل المطابع نجم العلوم ، لکھنؤ ۱۸۸۹ء
- ۶ - انصاف - سگوفہ محب - مطبع نامی ، لکھنؤ ، مار سوم ۱۸۹۱ء
- ۷ - انصاف - فسانہ عرب - لکھنؤ ، دسمبر ۱۹۵۷ء
- ۸ - انصاف - فسانہ عجائب - افضل المطابع نجم العلوم ، لکھنؤ ۱۸۸۹ء
- ۹ - انصاف - گزار سرور - افضل المطابع نجم العلوم ، لکھنؤ ۱۸۸۹ء
- ۱۰ - سری رام ، لالہ - حمخانہ حاوید حلد حہارم
- ۱۱ - ساد گل حس - تذکرہ عوبہ ، سح علام علی انڈسٹر ، لاہور
- ۱۲ - سفہ - کلسن لے خار نفس اکڈمی ، کراسی ۱۹۶۳ء
- ۱۳ - صغیر بلگرامی - جلوۂ خضر - مطبع نور الانوار ، طبع اول ۱۸۸۳ء
- ۱۴ - ضیاء الدین ، مولوی - انسائے اردو ، سرکاری مطبع ، لاہور ۱۸۸۳ء
- ۱۵ - عرب احمد - برقی نسد ادب
- ۱۶ - عسکری ، مرزا محمد - تاریخ ادب اردو (برحمہ) بسرا انڈسٹریز ، مطبع نولکشور ، لکھنؤ -
- ۱۷ - علی عباس حسنی مبد - ناول کی تاریخ اور نئند - بار اول ، انڈین بک ڈپو ، لکھنؤ
- ۱۸ - عیش ، خدا علی - فسانہ دلفرب
- ۱۹ - قادری ، حامد حسن - داستان تاریخ اردو ، اردو اکڈمی ، سندھ ، بسرا ایڈیشن ۱۹۶۶ء
- ۲۰ - کریم الدین - طبقات الشعرا

- ۲۱ - ہم الدین احمد - فی داسان گوئی -  
 ۲۲ - لول ، آلس بریاد - فلسفہ نیچ  
 ۲۳ - درساں دناسی - خطاب ، حد دوم اوریک آباد ۱۹۳۵ء  
 ۲۴ - گناں حد - اردو کی سری داساس . ائمن بری اردو ، نالساں ، کراچی ،  
 ۱۹۶۴ء  
 ۲۵ - ناصر ، سعادت حال - ندیرہ حوس معرفہ ربا  
 ۲۶ - در مسعود رضوی ، دا لیر - رحب علی سک سرور ، الہ آباد ، پہلی اساعت ۱۹۶۷ء  
 ۲۷ - بروفسر وفار عظیم - پاری داساس : اردو مرذر ، لاہور ، دوسرا ایڈیشن  
 ۲۸ - A History of Urdu Literature - T. Graham Bailey' Oxford  
 University Press, London 1932.

### رسائل

- ۱ - رمانہ ، کانسور ارباں ۱۹۴۲ء (حواصہ سمس الدین احمد ، فسانہ عجائب در  
 انک نظر)  
 ۲ - رمانہ ، کانسور خون ۱۹۴۵ء (اوس احمد ادب ، فسانہ عجائب اور ناغ  
 و ہار)  
 ۳ - علی گڑھ مسکریں ۱۹۴۶ء (اسانے سرور کی ناعدری)  
 ۴ - کارواں ، لاہور ۱۹۴۴ء (سری افسانوں کا ارتقاء ، فورٹ ولیم کالج کے  
 سام نک)  
 ۵ - نفوس ، مارح ، اربل ۱۹۴۹ء (عرب احمد - فسانہ عجائب اور بدماوب)  
 ۶ - نگار ، نومبر ۱۹۴۳ء (مکاتب سررا رحب علی نگ سرور)  
 ۷ - نگار ، جنوری ۱۹۴۶ء (اردو افسانے کا تاریخی اور تصدی مطالعہ)

(ب) سر سید احمد خاں<sup>(۱)</sup>

سید احمد خان ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ انکے والد کا نام میں بھی تھا اور والدہ کا نام عزیز النساء بیگم۔ سید احمد کے سوانح نگار حالی کی یہ رائے ہے کہ ان کی تربت میں زیادہ بران کی والدہ کا حصہ ہے۔ سید احمد خاں کا گھرانہ علم و فضل اور دنیوی ثروت دونوں اعتبار سے ممتاز تھا۔ ان کے باپ اور دادا محل حکمرانوں کے درباروں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ چکے تھے۔ اس لیے ابتدا میں انہیں برائے اسلامی اصولوں پر تعلیم دی گئی۔ پہلے قرآن مجید پڑھانا گیا۔ پھر انہوں نے فارسی کتابیں 'کردہ'، 'حالی باری'، 'آمد نامہ'، 'گلستان'، 'بوسان' وغیرہ پڑھیں۔ پھر عربی کی کتابیں مثلاً 'سرح ملا'، 'سرح بہدب'، 'مسندی'، 'محضر معانی اور مطول کا کچھ حصہ پڑھا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے ماموں نواب رس العادین سے ریاضی پڑھی اور حکم علام حیدر خاں سے علمِ طب کی محصل کی۔ ان کے والد انہیں مغلیہ دربار سے واسطہ رکھنا چاہتے تھے مگر انہوں نے والد کی خواہشات کے برخلاف انگریزوں کی ملازمت کو ترجیح دی۔ ان کی ملازمت کی ابتدا ۱۸۳۸ء میں ہوئی جب کہ وہ دہلی میں سرسہ دار مقرر ہوئے۔ برقی ڈرکے ۱۸۳۹ء میں نائب مر مسی ہوئے۔ ۱۸۴۰ء میں منصفی کا امتحان پاس کرکے میں بوری میں منصف مقرر کیے گئے۔ ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۴ء تک دلی میں صدر امن رہے، ۱۸۵۵ء میں نادلہ مجبور ہوا۔ ۱۸۵۷ء میں مراد آباد کے صدر الصدور بنے۔ ۱۸۶۲ء میں عاری نور اور ۱۸۶۳ء میں علی گڑھ میں رہے۔ ۱۸۶۷ء میں ہارس کے سال کار کورٹ کے جج بنائے گئے اور ملازمت کے احسام تک نہیں رہے۔ اسی دوران اپریل ۱۸۶۹ء میں انگلستان کا سفر احبار کیا۔ جہاں جا کر انہوں نے مسطور تعلیمی اداروں کے طریق کار کو دیکھا اور جہاں وہ انڈین اورسٹل وغیرہ کی تحریروں سے معارف ہوئے۔ چنانچہ واپس آکر انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو حدود خطوط پر تعلیم دینے اور اردو نر کو زمانے کے مضامین کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کا سڑا اٹھا۔ ۱۸۷۶ء میں ملازمت سے سبکدوس ہونے کے بعد ناں عمر علی گڑھ میں گزار دی اور وہیں ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو فوہ ہوئے۔

## تصانیف

سید احمد خاں نے نثر نویسی کی ابتدا 'سند الاخبار' سے کی۔ یہ اخبار ۱۸۳۷ء میں ان کے بھائی سید محمد نے جاری کیا تھا۔ یہ ہفت روزہ اخبار تھا۔ سید احمد خاں

(۱) سر سید احمد خاں سے متعلق ایک پورا باب اردو ادب جلد چہارم (۱۸۵۷-۱۹۱۴) میں

موجود ہے۔ یہاں ان کی ان تصانیف سے بحث کی گئی ہے جو انہوں نے ۱۸۵۷ء سے پہلے

لکھی۔ . . . مدیر عمومی۔

اس کی برسات و اساعت میں سرینکے غالب کی حسب رکنے تھے۔ چنانچہ اس میں جن موضوعات پر مضامین چھپے تھے وہ سید احمد خاں کے پسندیدہ موضوع یعنی قانون اور تاریخ وغیرہ تھے۔ سید محمد ۱۸۳۶ء میں وفات پا گئے تو یہ اخبار سید احمد خاں کے اہتمام میں سائے ہوئے لگا۔ ادارت برائے نام ہو کسی اور کے سرور نہی لیکن زیادہ تر سید احمد خاں خود اس کے مضامین لکھا کرتے تھے۔

ان مضامین کے ساتھ ساتھ انہوں نے نصیب و نالہ کد سلسلہ شروع کر دیا۔ جس کا ایک مختصر سا حائرہ درج ذیل ہے۔

۱۔ **جام جم :** یہ سید احمد خاں کی پہلی کتاب ہے جو ۲۵ مئی ۱۸۳۹ء کو مکمل ہوئی اور مئی ۱۸۴۰ء میں سائے ہوئی۔ چونکہ اس زمانے میں ابھی تک اظہار کا وسیلہ فارسی کو پایا جاتا تھا اس لیے یہ کتاب بھی فارسی میں لکھی گئی۔ اس میں خاندانِ معلہ کے تمام نواسیوں کے حالات، اہر سمور سے لے کر ہادر شاہ طبرک تک، تحریر کیے گئے ہیں۔ لیکن ایسے نثر کی کتاب نہیں کہنا چاہیے۔ اس میں حدیثوں اور نفسوں کی صورت میں بعض عنوانات مقرر کر کے ان کے ماتحت ہر حکمران کے بعض حالات درج کیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں حواء، نواب فائز، کسے گئے ہیں وہ، ہیں۔ نام فرہاد روا، نام پدر، نام مادر، قوم، سال ولادت، محلِ جلوس، عمر بر ویس، جلوس، سالِ جلوس، تاریخِ جلوس، مدبِ سلطنت، مدبِ عمر، سالِ وفات، تاریخِ وفات، لقب بعدِ وفات، مدفن اور نسبت۔

۲۔ **التخاب الاخوین :** یہ رسالہ بھی 'جام جم' ہی کے زمانے میں لکھا گیا۔ اس کی ترتیب میں سید محمد بھی شامل تھے۔ اس میں فواعدِ مصطفیٰ بیان کیے گئے ہیں۔ سید نے اس زمانے میں خود منصفی کا امتحان دیا تھا۔ یہ کتاب اس امتحان میں سرکرت کرنے والوں کے استفادے کے لیے برسات دی گئی تھی۔

۳۔ **جلاء القلوب بذکر المعیوب :** یہ کتاب السور ۱۸۴۲ء مطابق (رمضان ۱۲۵۹ھ) میں سید الاخبار کے برس سے طبع ہو کر سائے ہوئی۔ یہ کتاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مختصر سوانح عمری ہے جو مسلا کی محفلوں میں پڑھنے کے لیے لکھی گئی تھی۔ سب نصیب نہ تھا کہ اس زمانے میں ان محفلوں میں ذکرِ آنحضرت کرنے ہوئے اکثر غلط، صغیر اور عمر مسند روایتیں بیان کی جاتی تھیں۔ سرسید نے ایک صحیح سوانح عمری تحریر کی مگر یہ بھی بعد ازاں ان کے خیال میں عمر مستند اور وضعی روایات کا مجموعہ نہی۔ چنانچہ اس کتاب پر انہوں نے ۱۸۷۸ء میں خود ہی تبصرہ کر کے ان تمام مقامات کی نشان دہی کر دی جو بعد میں ان کے نقطہ نظر سے

غیر مستند ہو گئے تھے۔ اس کتاب سے ابک مختصر اقباس درج ذیل ہے :

”بیانِ ولادت - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ربیع الاول کے مہینے میں پر کے دن پیدا ہوئے ہیں۔ اللہم صلی وسلم علی محمد و آلِ محمد - جس رات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہور فرمایا ، انوارِ الہی ظاہر ہوئے اور کسریٰ کہ کافروں میں بہت بڑا عظم الشان ناساہ بنا اور ہزاروں برس سے اس کے گھر میں ناساہی حلی آئی تھی ، اس کا محل لرر گنا اور چودہ کنگورے اس کے گر ٹڑے ۔ بہت :

حو صسس در افواہ دنا فناد برزل در ابوان کسری فناد

اور فارس کا آس کدہ نہ ہزار برس سے اس میں آگ جلی رہی تھی اور فارس کے آس برس اس کو بوجا کرتے تھے ، دفعاً بجھ گئی اور ساوہ کے حسمے میں انک بوند ہائی نہ رہا ۔ حلمہ بس ابی ذوب اور نوسہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دودھ دلایا اور آمِ امین نے آب کو نالا ، اللہم صل وسلم علی محمد و آلِ محمد ۔ جب کہ آپ کا س مبارک خار برس کا ہوا ، آب کی والدہ ماجدہ نے انفال فرمایا ۔ آپ کے والد آب کے پیدا ہونے سے پہلے رحل فرما چکے تھے اور عبدالمطلب آب کے دادا آب کی برورس کرنے لگے ۔ جب کہ آپ آٹھ برس اور دو مہینے کے ہوئے آب کے دادا نے بھی رحل فرمائی ۔ پھر ابو طالب آب کے حجانے آب کی برورس کی ۔ اللہم صل وسلم علی محمد و آلِ محمد ۔“

اس اقباس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سید احمد خاں نے انی نصیفی زندگی کے آغاز میں بھی سادہ اور سلس نتر کو مطمع نظر بنانا تھا اور اس زمانے میں بھی آب مروجہ نتر کے اسانس سے ہٹ کر فطری اندازِ بان کو اپنانے میں مصروف تھے ۔

۴۔ تحفۃ حسن : ۱۸۴۴ء (۱۲۶۰ھ) میں سرسند نے محفۃ حسن کے نام سے ساہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے رسالے ’محفۃ انا عشرہ‘ کے دو ابواب (دسواں اور بارہواں) کا آردو ترجمہ کیا ۔ یہ ابواب بالترسب مطاعن صحابہ کے جوابات اور نولا و تبراً کے متعلق ہیں ۔ جس زمانے میں یہ ترجمہ کیا گیا ان دنوں ہندوستان بھر کی فضا مذہبی مناظروں سے مسموم ہو رہی تھی ۔ سرسند بھی اس فضا میں مناظراتی تحریریں لکھنے پر مجبور ہو گئے ۔ چنانچہ یہ ترجمہ اسی زمانے کی یادگار ہے ۔ بعد میں سرسید احمد خاں نے ان مباحثوں اور مناظروں کو اسلام کے نزل اور بربادی کا بہت بڑا سبب قرار دیا تھا ۔ اور اپنی اس

کتاب کے بارے میں انہوں نے نہ رائے ظاہر کی، :  
 ”انسان سے غلطی اور خطا کا واقع ہونا ، خصوصاً اسی بڑی سلطنت  
 کے انتظام میں جو صحابہ کے ہاتھ میں بھی ایک ایسا امر ہے جو  
 ناگزیر ہے ۔ صحابہ معصوم نہ تھے ۔ اگر بالفرض ان سے غلطیاں واقع  
 ہوئیں تو کیا آفت ہوئی ؟ اور انہوں وہ بڑی سمجھی حاویں ۔ اگر ان  
 ہی روائوں پر جو موجود ہیں ، نکتہ حتیٰ کا مدار ہو تو اس  
 نکتہ چینی سے نہ حضرت علیؓ مرصعاً تھے ہیں نہ حلقائے بلاغہ اور  
 ہم تو باوجود سلمہ کر لیسے کے ان تمام نکتہ حسوں کے جو حوارج و  
 نواصب اور سب سے ان بزرگوں کی سب سے بڑے ہیں ان میں سے  
 کسی بزرگ کو برا اور بد حال نہیں کرتے ۔ وہ تمام واقعات اسے ہی  
 ہیں جو دنیا میں ہمیشہ سے آئے ہیں ۔ وہ ہوئے ہوں نا نہ ہوئے ہوں ۔  
 ان سے نہ ان بزرگوں کی بزرگی میں کچھ نقصان لار آتا ہے اور نہ  
 مذہب اسلام کو ان واقعات سے کچھ تعلق ہے۔“

۵۔ **نسبیل فی جبرِ تقیل :** یہ کتاب علمِ ریاضی سے متعلق ہے ۔ نہ ۱۸۴۳ء میں  
 مکمل ہوئی اور ۱۸۴۴ء میں آگرہ کے ایک چھانہ خانے میں طبع ہو کر شائع ہوئی ۔ اس  
 کتاب کے بارے میں حمیدہ معلومات سرسید احمد خاں نے آغاز کتاب میں مہیا کر دی ہیں :  
 ”جبرِ تقیل کا علم بہت عجیب و غریب ہے ۔ ساری دنیا کے کارخانے  
 اسی پر موقوف ہیں ۔ حی نہ ہے کہ اگر نہ علم نہ ہوتا تو دنیا کا  
 کارخانہ نہ چلتا ۔ اور نہ علم بہت بھوڑا ہے ۔ کل اصلِ اصول اس کے  
 پانچ کلیں ہیں اور باقی سب صورتیں انہیں ناٹ کٹوں کے ٹوڑ جوڑ سے  
 نکلی ہیں ۔ اور اس علم میں پہلے ہل انودر نام ، حکم مخالف بمن کے  
 رہنے والے نے عربی زبان میں ایک رسالہ لکھا تھا ۔ بعد اس کے ابو علی  
 نام ایک شخص عالم نے فارسی زبان میں اس کا ترجمہ بطور خلاصہ کے  
 کیا اور ’معار العقول‘ اس کا نام رکھا ۔“

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ سرسید کی ’جبرِ تقیل‘ جس کتاب سے اردو میں منتقل کی  
 گئی ہے وہ ابو علی کے فارسی رسالے ’معار العقول‘ کا ترجمہ ہے اور خود ’معار العقول‘  
 ابوذر یمنی کی ایک عربی کتاب کا ترجمہ بطور خلاصہ زبانِ فارسی ہے ۔ سند احمد خاں اپنے  
 ترجمے کا محرک دو انگریزوں ، کبیراں حارج ولہ ہمتی اور نادری خان حمس مور کو قرار  
 دیتے ہیں ۔ وہ لکھتے ہیں :

”اس رسالے کے بعض بعض قواعد میں نے ان دونوں صاحبوں کے

سامنے کہے، انہوں نے بہت حسد کیے اور وہ اس کے اردو میں ترجمہ ہونے کا باعث ہوئے۔“

اس کتاب کے موضوع کی وضاحت سرسید ہی کے لفظوں میں یہ ہے :  
 ”جریئہ سے علم کے بس کام بڑتے ہیں ، ایک نہ کہ بڑی بڑی بھاری  
 بوجھل حیرتوں کو بھوڑے رور سے اٹھانا نا ٹھسج کر ایک جگہ سے  
 دوسری جگہ لے جانا، دوسرے نہ کہ سبب سخت حمزوں کو چیرنا،  
 دوسرے نہ کہ جو حیرت کہ ان کا دانا نا بھوڑنا مشکل ہو ، ان کو  
 دانا اور بھوڑنا “

’سہیل فی حریئہ‘ کی ہر رباضی کی اصطلاحات سے گراں ناز ہے ، کیونکہ یہ کوئی  
 ادبی تصنیف نہیں ہے۔ اس کے فہروں میں تصدیق بھی موجود ہے۔ کیونکہ اس  
 کی محاورہ کا اصل مقصد مطالب کی وضاحت ہے ، اس لیے فہروں کی صاحب ہر زیادہ بوجہ  
 نہیں کی گئی۔ فہروں کے گچلک ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ نہ  
 ہر صورت ترجمہ در ترجمہ ہے۔ تاہم اس کی ہر معنی اور مسجع ہر گہر نہیں بلکہ واضح  
 طور پر ”عاری“ ہے۔

۶۔ فوائد الافکار فی اعمال العرجار : سرسید احمد خاں نے رباضی کی ایک اور  
 کتاب فوائد الافکار فی اعمال العرجار کے نام سے لکھی ہے۔ ان کے دانا فریدالدین نے ہرکار  
 مناسبہ کے اعمال ہر فارسی میں ایک طبع راد کتاب لکھی تھی۔ سرسید نے اس کا اردو  
 میں ترجمہ کیا اور سالوں کا اضافہ اپنی طرف سے کیا۔ اس کتاب کے سہ نالیف میں  
 شدید اختلاف ہے۔ رام نانو سکس نے ’ناربخ ادب اردو‘ میں ۱۸۴۶ء اور حامد حسن فادری  
 نے ’داسان ناربخ اردو‘ میں ۱۸۶۴ء لکھا ہے۔ سب محمد اسمعیل نانی ہی نے ’مطالعہ سرسید‘  
 جلد اول (مطبوعہ مجلس ہری ادب ، لاہور) میں حامد حسن فادری کی تفسیر میں ۱۸۶۴ء  
 لکھا ہے۔ تاہم یہ ہے کہ نہ بھی ’سہیل‘ کے زمانے کی تصنیف ہے۔ ۱۸۶۴ء کی  
 حدود میں سرسید کو رباضی سے زیادہ دلچسپی تھی ہی تھی ، اس لیے ’آثار الصنادید‘  
 کتاب بھی ۱۸۴۶ء ہی کی نالیف معلوم ہوتی ہے۔

۷۔ قول متین در ابطال حرکت زمین : یہ کتاب ۱۸۴۸ء میں مطبع سدالاجار میں  
 طبع ہو کر نسر ہوئی۔ اس میں زمانہ قدم کے فلسفوں اور سائنس دانوں کے تتبع میں زمین  
 کو ساکن ثابت کیا گیا ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ چاند ، سورج اور سارے زمین کے  
 ارد گرد گھوم رہے ہیں۔ مگر بعد میں وہ زمین کی حرکت کے فائل ہو گئے تھے۔ یہ کتاب  
 بھی ان کی اس دور کی دوسری تحریروں کے اسلوب سے مختلف نہیں۔ زیادہ بوجہ مفہوم کی  
 ادائیگی ہر ہے۔ اس میں عربی زبان کے مشکل الفاظ اور اصطلاحات موجود ہیں مگر قافیہ بندی



کی سموری نووس پوری کتاب میں نظر نہیں آتی۔

۸۔ **کلمۃ الحق :** (۱۸۴۹ء) نہ رسالہ نیری مریدی اور نعم کے مروجہ طریقے کی مخالف میں لکھا گیا ہے۔ سرسید احمد خاں چونکہ غیر مقلد بھی اس لیے انہیں دیر برسی کا معمولی طریقہ سمجھ رہے تھے۔ حاتمہ انہوں نے اس رسالے میں اس طریقے کی خامیاں تحریر دیں۔

۹۔ **راہ منت فی رد بدعت :** (۱۸۵۰ء) اس رسالے میں مقلدین پر اعتراضات دیے گئے ہیں اور وہابیوں کو مستعینِ سب قرار دیا گیا ہے۔ نہ رسالہ بھی سرسید کی زندگی کے ایک خاص رجحان کو ظاہر کرتا ہے، جو آئندہ صدی کی ساطرائی فضا میں ظاہر ہوا۔

۱۰۔ **نیمقہ دریان مسئلہ تصور شیخ :** (۱۸۵۲ء) نہ رسالہ فارسی زبان میں لکھا گیا۔ سرسید کے تمام رسائل میں محض رتن رسالہ ہی ہے۔ نہ ایک فرضی نا واقعی مکسوب کے طور پر لکھا گیا ہے۔ اس میں مسائیلِ نفسانہ کے تصورِ سمجھ دو درس اور مسئلہٴ محبِ خدا بنا گیا ہے۔ لیکن نہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوئی ہے چونکہ مسائیلِ نفسانہ سب کے سب اہلِ بطلان تھے۔ سائد سرسید ان کے اصلِ تصوف کو صحیح ماننے ہوں لیکن ان کے اصولِ بطلان کو غلط گردانے تھے۔

۱۱۔ **سلسلہ الملوک :** نہ دوئی الگ کتاب ہے۔ آثارِ الصنادید کی دوسری اساع میں بابِ اوّل کے ساتھ دہلی کے ۲۰۲ بادشاہوں یعنی راجا بدھستریہ سے ملکہ و شہزادیہ تک کے حالاتِ طورِ صممہ، حدودوں کی شکل میں درج کیے گئے ہیں۔ بعد میں یہ ۱۸۵۲ء میں الگ کتاب کی صورت میں بھی شائع کر دی گئی۔

۱۲۔ **کیمیائے سعادت :** (۱۸۵۳ء) انہوں نے امامِ غزالی کی مشہور کتاب 'کیمیائے سعادت' کی اسنادی میں فصلوں کو اردو میں مقلد بنا۔

۱۳۔ **ناریخِ ضلع بجنور :** حوری (۱۸۵۵ء) میں سید احمد خاں بجنور کے صدرِ امن مقرر ہوئے۔ وہاں کے کلکٹر کی فرمائش سے ضلع بجنور کی تاریخ مرتب کی۔ کلکٹر نے اسے گورنمنٹ کے پاس بھیج دیا۔ وہاں سے ابھی واپس نہ آئی تھی کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے شروع ہو گئے۔ انہی ہنگاموں کے دوران میں اس کتاب کا مسودہ غالباً آگرے میں تلف ہو گیا۔

۱۴۔ **آئینِ اکبری :** مقلد حکمرانِ ائیر کے وزیر ابوالفضل نے بادشاہ نے طریقِ سلطنت و نظامِ حکومت پر 'آئینِ اکبری' کے نام سے فارسی میں ایک کتاب لکھی تھی۔ سرسید نے بجنور میں قیام کے دوران اس کتاب کی تصحیح شروع کی۔ پہلی اور دوسری جلدیں ۱۸۵۶ء میں شائع ہو گئیں دوسری جلد کی تصحیح میں دشواریاں تھیں اس لیے اس کو مؤخر رکھا۔ جب یہ مکمل ہو گئی تو مطبع میں بھیجی گئی، مگر یہ بھی ۱۸۵۷ء کے ہنگامے

میں ضائع ہو گئی۔ حامد حسن قادری نے دعویٰ کیا تھا کہ پہلی جلد ان کے کتب خانے میں موجود ہے۔

**آثار الصنادید :** ۱۸۴۶ء میں جب سید احمد خان فوج پور سیکری سے تبدیل ہو کر دہلی آئے تو انہیں دہلی کی تاریخ اور عمارات کی تحقیقات کا سنو ہوا۔ وہ تعطیل کے دنوں میں اکثر نواحِ سہر کی عمارتوں کا مطالعہ کرنے کے لیے شہر سے باہر جایا کرتے تھے۔ ان کے ساتھ اکثر ان کے دوست مولانا صہبائی ہوتے تھے۔ عمارتوں کی تحقیق بہت دشوار تھی۔ بیسیوں عمارتیں ٹوٹ بھوٹ کر کھنڈر ہو گئی تھیں۔ اکثر عمارتوں کے کتبے پڑھے نہ جاتے تھے۔ بہت سے کتبوں سے ضروری حالات معلوم نہ ہو سکتے تھے۔ اکثر کتبے ایسے خطوں میں تھے جن سے کوئی واقف نہ تھا۔ بعض قدیم عمارتوں کے ضروری حصے معدوم ہو گئے تھے اور جو متفرق و براگندہ اجزا باقی رہ گئے تھے ان سے کچھ پتا نہ چلتا تھا کہ یہ عمارت کس بنائی گئی تھی اور اس سے کیا مقصود تھا؟ کتبوں میں جن نام لکھے تھے ان کا مفصل حال دریافت کرنے کے لیے تاریخوں کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت تھی۔ عمارتوں کے طول و عرض کی سمائس کرنا اور کچھ اوپر سوا سو عمارتوں کی تحقیقات سے عہدہ برا ہونا نہایت دشوار کام تھا<sup>(۱)</sup>۔ باوجود اس قدر مشکلات کے آثار الصنادید کا پہلا ایڈیشن ڈیڑھ برس کے اندر اندر چھپ کر مار ہو گیا۔ یہ ایڈیشن ۱۸۴۷ء میں طبع ہوا تھا۔ اس کے چار ابواب تھے۔ پہلا باب عمارات بیرونِ شہر کے سان میں، دوسرا باب لال قلعہ اور اس کی عمارتوں کے سان میں، تیسرا باب خاص شہر ساہجہان آباد (دلی) کی عمارتوں وغیرہ کے سان میں اور چوتھا باب دلی کے مشہور اور نامور لوگوں کے ذکر میں ہے جن میں سے بیشتر سرسید کے معاصرین تھے۔ عمارتوں کی تفصیل کے ساتھ ان کے کسے اور نفسے بھی دئے گئے ہیں جن سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ کتاب حب چھپ کر تیار ہو گئی تو مسٹر رابرٹس کلکٹر اور مجسٹریٹ اس کا ایک نسخہ انگلستان لے گئے اور اسے رائل اینسٹاٹک سوسائٹی کے اراکین کے روبرو پیش کیا۔ اراکین نے اردو سے نا بلد ہونے کے باعث انگریزی میں اس کا ترجمہ کرانے کی سفارش کی۔ واپسی پر مسٹر رابرٹس نے سرسید کی مدد سے ترجمہ کرنا چاہا۔ ترجمہ تو مکمل نہ ہو سکا البتہ سرسید کو فطری نانی کا موقع مل گیا۔ انہوں نے مناسب ترمیم، اصلاح اور اضافے کے ساتھ کتاب کو از سر نو مرتب کیا۔ چونکہ باب جو مشاہیر دلی کے بارے میں تھا اور کتاب کے موضوع سے مطابقت نہیں رکھتا تھا بالکل خارج کر دیا گیا۔ ان تبدیلیوں کے بعد ۱۸۵۴ء میں یہ کتاب دوبارہ چھپ کر تیار ہوئی۔ مگر ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں اس کے بیشتر نسخے تلف ہو گئے البتہ بعض

نسخے محفوظ بھی رہ گئے۔ ان میں سے ایک نسخہ دنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔

’آثار الصّادق‘ کے بارے میں تمام نقادوں، محققوں، تاریخ دانوں اور تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ پہلے اندیس کی عارب بر تکلف اور فارسی سے گراںوار بھی۔ بعض لوگوں نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ یہ اردو میں سہ ذریعہ طہوری اور اشائے ابوالفضل کے نسخ کی توسیع بھی۔ اور یہ کہ دوسرے اندیس میں جہاں مواد میں تبدیلیاں کی گئیں وہاں اندازِ سان نو بدل کر آساں اور نئے زمانے کے نفاصوں کے مطابق بنانا گیا مگر دونوں اساعوں کے اندازِ سان کا مقابلہ کیا جائے تو کوئی نمایاں فرق نظر نہیں آتا۔ دونوں اندیسوں کی سر میں سادگی اور بے تکلفی ہے۔ رنگینیِ سان اور فارسی کی بجائے سلاسی اور ’اردو‘ ہے۔ اگرچہ اساعِ بانی میں مواد کے اعمار سے قطع و برید کی کئی ہے۔ بعض حصوں میں کمی بسی کی گئی ہے لیکن جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے، اس میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ اساعِ اوّل کا صرف آخری باب، جو مشاہیرِ دلی کے بارے میں ہے، کسی قدر مختلف اسلوب میں نظر آتا ہے۔ مگر اس میں بھی نہیں نہیں فاصلہ پدی کی کئی ہے اور سر۔ یہ فاصلہ پدی اگرچہ کہیں کہیں باغ و بہار یا غالب کے خطوط کی یاد دلا دیتی ہے لیکن اس کا بہت زیادہ اہتمام نہیں کیا گیا۔ اس سلسلے میں اس باب کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ ایک روایت کے مطابق اساعِ اوّل میں حروی طور پر امام بخش صہبائی بھی سرسید کے سرنگ کار رہے ہیں۔ ماس نہ ہے کہ ’مشاہیرِ دلی‘ والا باب یا دو صہبائی نے لکھا ہے یا اس میں صہبائی کی اصلاح ہے۔ پہلی اساعِ اوّل کے حویھے باب کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے۔ اس کے بعد دونوں اساعوں کی سر کے تقابلی مطالعے کے لئے ہر اساعت سے ایک ایک اساس درج کیا جائے د :

حناب حضرت شیخ السبوح مولانا ساد غلام علی قدس سرہ :

’مبرا کیا مقدور ہے کہ آب کے کمالاتِ ظاہری اور مقاماتِ باطنی کا حال لکھ سکوں، کیونکہ حالاتِ آب کے اس سے سوا ہیں جو سان ہو سکیں اور مقامات اس سے بہت ہیں جو لکھیے میں آویں۔ سبحان اللہ! علم اور عمل اور فضل اور کمال اور تعزید اور تجرد اور حلم و کرم اور سخاوتِ ام اور انثار و انکسار آب کی دات بر جسم بھی۔ جو کچھ آتا اور جو کچھ ہوا سب نام اللہ صرف کیا اور کبھی کل کا غم نہ کیا۔ دن رات اللہ اور اس کے رسول کے ذکر میں بسر کی اور دنیا و مافسہا کی خبر نہ رکھی۔ میں آپ کے کس کس کمال کا ذکر کروں۔ علم ایسا تھا کہ کچھ کو ہونا ہے۔ زہد اور مجاہدہ ایسا کہ

بیان اس کا نہیں ہو سکتا۔ نفوی اور ورع اس درجے پر کہ سوا اس سے ممکن نہیں اور پھر اس پر عجز و سناپی، انکسار و سناپی، اتباعِ سنت اس درجے پر کہ اچھے اچھے لوگ وہاں قدم نہ رکھ سکیں۔“

(آثار الصّٰدِید ، اساعِبِ اوّل ، باب چہارم)

سرمدِ مخلص کے معارف کا آغاز نوکسی قدر قدم انداز میں کرنے ہیں مگر جلد ہی آسان عبارت لکھنے لگے ہیں۔ اس احساس کی نثر نہایت آسان ہے۔ اس میں نکتہ اور نصیحت کا ساٹھہ نکتہ نہیں۔ حالانکہ موضوع ایسا ہے کہ لغاتِ عرب اور عبارتِ آرائی کی بڑی گنجائش نکل سکتی تھی مگر اس سے اجتناب کیا گیا ہے۔ ذرا سی کاوس سے فافے کٹی گا بڑھائے جا سکیں تھے۔ موجودہ صورت میں جو فافے موجود ہیں ان میں آورد کی کیفیت نہیں بلکہ آمد اور لے ساختگی ہے۔ اس سے نہ سحرہ احد کرنا غلط نہ ہوگا کہ یہ باب بھی بہت حد تک سادہ پر کا نمونہ ہے۔

اب آثار الصّٰدِید کی اساعِبِ اوّل و دوم کے متعلق مطالعے کی غرض سے دونوں میں سے ایک ہی موقعے کا ایک ایک احساس درج کیا جاتا ہے۔ نہ امتیازِ طب صاحب کی لاٹ کے بارے میں ہے۔

#### اشاعتِ اوّل (۱۸۳۷ء)

یہ لاٹ حصہ میں ’مسجدِ قوب الاسلام‘ کا منار ہے۔ اس کی رفعت اور سان اور بلندی اور حوسپائی کا بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یہ لاٹ اس قدر بلند ہے کہ بہت دور دور کے بھرے والے بحرِ ایک آدھ جگہ کے اسی بلند عمارت روئے زمین پر نہیں سان دیتے۔ نعل مشہور ہے کہ اگر اس کے نیچے کھڑے ہو کر آوہر دیکھو تو ٹوٹی والے کو ٹوٹی اور بگڑی والے کو بگڑی دیکھنا پڑتا ہے۔ اس لائٹ سے نیچے کے آدمی ذرا ذرا سے معلوم ہوئے ہیں اور چھوٹے چھوٹے آدمی نہیں انھیں ہاتھی گھوڑے دکھائی دینے سے عجیب کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح نیچے والوں کو آوہر کے آدمی بہت چھوٹے چھوٹے معلوم ہوتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا فرشتے آسمان سے آ رہے ہیں۔ غرضیکہ لائٹ عجائبِ روزگار ہے۔

#### اشاعتِ دوم (۱۸۵۴ء)

اس عبارت کی رفعت اور سان اور بلندی اور حوسپائی کا بیان نہیں کیا جا سکتا۔ حصہ میں نہ عمارت ایسی ہے کہ روئے زمین پر ایسا مثال نہیں رکھی۔ نعل مشہور ہے کہ اگر اس کے نیچے کھڑے ہو کر آوہر دیکھو تو ٹوٹی والے کو ٹوٹی اور بگڑی والے کو بگڑی دیکھنا پڑتا ہے۔ اس لائٹ سے نیچے کے آدمی ذرا ذرا سے معلوم ہوئے ہیں اور چھوٹے چھوٹے آدمی نہیں انھیں ہاتھی گھوڑے دکھائی دینے سے عجیب کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح نیچے والوں کو آوہر کے آدمی بہت چھوٹے چھوٹے معلوم ہوتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا فرشتے آسمان سے آ رہے ہیں۔ غرضیکہ لائٹ عجائبِ روزگار ہے۔

باوجود اس قدر بلندی و عظمت کے ایسی خوبصورت اور خوش طبع نئی ہوئی ہے کہ لے اخبار دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ اس لائٹ کے نچے درجے کی ایک ایچ مدور اور ایک کمر کی بنائی ہے۔ اور دوسرے درجے کی سب نچیں مدور ہیں۔ اور دوسرے درجے کی سب نچیں کمر کی ہیں اور اوپر کے دونوں درجے گول ہیں اور تمام ہر سنگ سرخ لگا ہوا ہے مگر چوبیس درجے میں سنگ مرمر بھی ہے۔ اور ہر جگہ مناسب کاری اور گکاری اسی حوصوری سے کی ہے کہ اس کے ہر ایک بل مسلسل ہر ہزاروں معسوفوں کی زلفِ دونا فرماں ہے اور اس کے ادنیٰ سے ادنیٰ بھول سکھڑی ہر سکڑوں گل رحوں کے لبِ حال محسوس ہوتا ہے۔

عین موسم بھول والوں کی سر کا ہونا ہے، اس لائٹ پر چڑھے ہوئے ہیں۔ جب نچے آئے تو دیکھا کہ خوب منہ برس گا اور جب جانا کہ اللہ اکبر اب اس لائٹ سے نچا تھا۔ اس لائٹ کے اوپر سے بچے کے آدمی ذرا ذرا سے معلوم ہوئے ہیں، اور چھوٹے چھوٹے آدمی اور بچے نہیں ہاتھی گھوڑے دکھائی دے کے سب بڑا ہلکا معلوم ہوتا ہے، اور اس طرح نچے والوں کو اوپر کے لوگ ذرا سے معلوم ہوئے ہیں اور اس سبب بڑا ہے نہ فرسے آسان ہر سے آئے ہیں۔ عرضیکہ نہ لائٹ عجائب روزگار ہے کہ روئے زمین ہر اس مل نہیں رکھی۔ نا وصف اس قدر بلندی اور عظم کے، اسی خوبصورت خوش طبع نئی ہوئی ہے کہ لے اخبار دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ اس لائٹ میں بالکل سنگ سرخ لگا ہوا ہے اور خوبصورت درجہ سنگ مرمر کا ہے۔ ہر ہر درجے ہر آواز فرائی ٹھہری ہوئی ہیں اور جا بجا مناسب کاری کی ہوئی ہے۔ اس لائٹ کی نچیں مدور اور کمر کی اسی خوبصورت نہیں ہے کہ جس کا کچھ بیان نہیں ہو سکتا چونکہ اس کی خوبی تو ہاں سے باہر ہے۔

دونوں اساسات میں بہت سے فرق ہیں لیکن جن فرقوں میں ترمیم کی گئی ہے ان میں بھی اسلوب کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جیسا سادہ اور افغانی اسلوب پہلے اڈیشن میں ہے ویسا ہی دوسرے میں ہے اور یہی کیفیت تمام مقامات پر نظر آتی ہے۔ سرسید احمد خاں کی ان تمام ابتدائی تصانیف کو بحیثیت مجموعی دیکھتے تو انہیں زیادہ دلچسپی ناریخ، مذہبات اور ریاضی سے معلوم ہوتی ہے۔ ریاضی سے دلچسپی تو ان کا خاندانی ورثہ تھا اور یہ فن انہوں نے اپنے نانا سے سیکھا تھا۔ تاریخ سے دلچسپی

مغلیہ سلطنت کی روایات کا جزو بھی اور مذہبی بحثوں کا اس زمانے میں بہت چرچا تھا۔ نسبہ، سنی، مغلّہ، غیر مغلّہ کی بحثیں پہلے سے تھیں، ان میں عسائیت اور اسلام کی بحثوں کا نادریوں کی وجہ سے اضافہ ہو گیا تھا۔ چونکہ ۱۸۵۷ء سے پہلے ہندوستان اور بالخصوص سالی ہند کی فضا میں بھی عوامل کام کر رہے تھے اس لیے سرسید احمد خاں جسے ذہین شخص کا اس ماحول سے متاثر ہونا ضروری تھا۔ البتہ بعد میں جب زمانے کے حالات کی تبدیلی نے انہیں نہ سمجھانا کہ قدم زمانہ اور اس کے مذہبی مناظرے اور قدم سائنسی تحریریں سب نکار ہو چکی ہیں، قوم پر اپلا کا زمانہ ہے، اب قوم میں فرقہ وارانہ اختلافات بڑھانے کا نہیں، انہیں متحد کرنے کا زمانہ ہے نو ان کی کوسسں تمام پر قوم کی اصلاح پر مرکوز ہو گئیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

”اس دور میں سرسید کا نقطہ نظر علمی اور خالصاً دینی تھا۔ زندگی کی مادی قدروں کی پوری اہمیت انہی ان پر منکشف نہیں ہوئی تھی۔ وہ مسائل حاصرہ کی بجائے تاریخ کی طرف موجہ اور مجرد حقائق اور محض علمی تصورات کے دلدادہ تھے۔ چنانچہ اس زمانے میں مناظرہ اور عقائد ان کی حسحو کے خاص میدان تھے۔ اگر کبھی اس کوچے سے باہر قدم رٹھا بھی تو انہوں نے بھروں اور انتھوں کو مرکزِ نوجہ بنانا، یعنی آثارِ قدمہ کی طرف موجہ ہوئے۔ گونا گویا وہ اجماعِ انسانی کے مادی مسائل سے بہ دور تھے۔“ (۱)

البتہ ایک ناب ضرور حبران کن ہے کہ سرسید اسلوب کے اعتبار سے اپنی پرانی سے برای محرر میں بھی قدم اسلوب سے دامن کساں نظر آتے ہیں۔ اس زمانے میں اگرچہ فورٹ ولیم کالج کے باعث سادہ تر نگاری کا رواج ہونا جا رہا تھا اور غالب کے خطوط کی ادبی نثر میں بھی برصنّع نثر کی چھلکی نظر نہ آتی تھی تاہم اس دور کے بیستر لکھنے والے ابھی تک رائی لکتر نوٹ رہے تھے۔ مگر سرسید نے کچھ نو ابے موضوعات کی ضروریوں کی بنا پر اور کچھ جدتِ طبع کے بل پر قدم مسجع اور معنی نثر لکھنے سے ہمیشہ احتساب کیا۔ بلکہ بعض اعتبار سے اس دور کی نثر بعد کی نثر سے بہتر ہے۔ نہ زیادہ صاف سہری اور کم گجک ہے۔ اس میں انگریزی کے الفاظ مطلق موجود نہیں۔ ادیت نسبتاً زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں وہ تقروں کی ساحت پر زیادہ نوجہ کر سکتے تھے۔ بعد میں تو وہ مدعا نگاری اور وقت کی کمیابی کے باعث فلم برداسنہ لکھتے تھے اور نثری خوبوں کو پس پش ڈالے پر مجبور تھے۔

### مولوی کریم الدین

کریم الدین ۱۸۲۲ء (ماد سوال ۱۲۳ھ) کو ہائی دب میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد امام مسجد تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم قدم طرر ہوئی۔ پھر وہ دہلی گئے جہاں انہوں نے صرف و نحو، منطق و فلسفہ، حدیث و فقہ اور علم طب پڑھا۔ ۱۸۴۰ء میں وہ دلی کالج میں داخل ہوئے۔ ۱۸۴۴ء میں کالج کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد دہلی ہی میں بس گئے۔ یہاں 'رفاہ عام' کے نام سے ایک مطبع قائم کیا۔ انہوں نے ۱۸۴۵ء سے اپنی تمام ذمہ داریاں سنبھالنے میں دو دفعہ مساعروں کی ترانا شروع کیا۔ ان مساعروں کے کلام کو وہ 'کلاس' کے نام سے جہاں دنا کرتے تھے۔ مگر حلد ہی یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور گندسے کے کل سات سارے ہی سائے ہو سکے۔ مطبع رفاہ عام بھی خسارے کی وجہ سے چھوڑنا پڑا۔ اس عرصے میں وہ معارف ہو حکمے، صحاح، ذخائر اسمتگر نے انہیں ترجمے کے کام پر مامور کر دیا۔ اور انہوں نے کئی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ پھر وہ آگرہ کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے بمباروں کے بعد وہ لاہور کے نظامت تعلیمات سے متعلق ہو گئے۔ یہاں وہ برقی کرے کرے اسکولر آف سکولر کے عہدے تک جا پہنچے۔ اس دوران میں انہوں نے بہت سی درسی قسم کی کتابیں لکھیں۔ ۱۸۷۹ء میں وفات پائی۔

### تصانیف

مولوی کریم الدین نے جو دھچ لکھا ان میں سے سب سے زیادہ مدارس کے طلبہ کے استفادے کے لیے لکھی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا رجحان طبع تراجم کی طرف بھی رہا۔ مگر اب ان کا نام زیادہ تر 'ند درہ' طباط سمرائے ہند، اور ایک ممبلی قصبے 'خط ہند' کی وجہ سے رہا ہے۔

کریم الدین کی ابتدائی تصانیف علم عروض کی ایک کتاب 'معالہ العلالہ' اور 'ند درہ' کلاس، نارسان، ہیں۔ یہ دونوں کتابیں ۱۸۴۵ء میں سائے ہوئیں۔ اسی سال ان کی ایک اور کتاب 'ترجمہ تاریخ انوائفاد' بھی طبع ہوئی۔

**گلدستہ نازنیناں :** یہ ند درہ ۱۸۴۵ء میں سائے ہوا۔ اس کے دساحے میں فواحد و عروض کے اہم صاحب اور تاریخ شعر و اصاف سحر د کرتے ہیں۔ شعراء کے حالات زندگی بہت مختصر مگر بہت کچھ گئے ہیں، البتہ شعراء کے کلام کا اصحاب خاصا طویل ہے۔ اصحاب کرے ہوئے غزل کے علاوہ دیگر اصاف کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔

**طبقات الشعراء ہند :** یہ ند درہ ۱۸۴۷ء میں مکمل ہو کر ۱۸۴۸ء میں سائے ہوا۔ قلم بھی اس میں ان کے ہمدار تھے۔ اس میں سو سو حوستہ ساعروں کے حالات اور نمونہ کلام موجود ہے۔ اس کے دیباچے میں آردو زبان کی ہدائیں اور رسم الخط سے بھی محبت کی گئی ہے جو گارسین دیاسی کی 'ہندوستانی ادب کی تاریخ' سے ماخوذ ہے۔ اس تذکرے کو دور بندی

اور حروف تہجی دونوں طریقوں کے مطابق لکھا گیا ہے۔ مختلف شعرا کو طعنان میں تقسیم کر کے ادوار قائم کیے گئے ہیں مگر ہر دور میں حروف تہجی کی ترتیب سے شعرا کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس تذکرے میں بھی باوجود نقادوں کی تعریف و تحسین کے، وہ تمام خامیاں ماحود ہیں جو 'موضع اللسان' جسے اردو تذکروں کا طرہٴ اساس ہیں۔

**کریم اللغات (۱۸۶۰ء):** یہ لغت فارسی سے اردو میں کنانِ فکر کے حکم سے لکھی گئی۔ اس کی نالیف کا مقصد درسی کتابوں کے مشکل الفاظ سمجھنے میں طلبہ کی مدد کرنا تھا۔ یہ درمائی مطبع کے ۳۲۳ صفحات پر مشتمل ہے۔

**خطِ تقدیر:** اردو میں بعض تمثیلی قصے اسے بھی موجود ہیں جنہیں داستان اور ناول کے درمیان کی کڑی کہنا چاہئے۔ 'خطِ تقدیر' بھی ایسا ہی قصہ ہے۔ یہ کتاب ۱۸۶۲ء میں نذیر احمد کی مرآۃ العروس سے سات سال قبل سائے ہوئی بھی اور ۱۸۶۵ء تک اس کے تین ایڈیشن نکل چکے تھے۔ اس سے کتاب کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کے دساجے میں انہوں نے مافوق الفطرت اور داستانوی قصوں کی مخالف کی ہے۔ لکھتے ہیں:

”اس کی ضرورت اس واسطے دامن گیر ہوئی کہ سات سو برس سے عربی اور ترکی میں اور ایک سو برس سے ہندی یا اردو میں قصہ نویسی کا جو شوق لوگوں کو ہوا ہو اس دن سے آج تک یہ دستور رہا ہے کہ ان مصنفوں نے بادشاہوں، ناجروں یا فکروں کی کہانیاں لکھی ہیں اور کوئی قصہ مصامینِ عشقہ اور محاوراتِ واجب النعرب سے خالی نہیں ہے اور جس راہ پر اوّل مصنف چلا تھا وہی سڑک آج تک جاری ہے۔ کسی نے دوسری روش اختیار کرنے کا خیال بھی نہیں کیا،“۔

کریم الدین نے اپنے دعوے کے مطابق اس قصے کے واقعات عام زندگی سے لیے ہیں۔ غالباً تمثیلی انداز اس لیے اختیار کیا ہے کہ فارسی نظم و نثر میں تمثیلی قصے افراط سے ملتے ہیں۔ 'منطق الطیر' (عطار) اور 'مثنوی' (معنوی) (مولانا روم)، 'انوار سہیلی' اور 'اخوان الصفاء' وغیرہ اس کی اہم ترین مثالیں ہیں۔ دکنی شاعری اور نثر میں بھی تمثیلی قصے ملتے ہیں۔ میر حسن کی مثنوی 'رموز العارفین' کا بھی یہی انداز ہے۔ اسی طرح مصنف انگریزی کی بعض تمثیلوں خصوصاً 'ہلگرمز پروگریس' سے شناسائی کا بھی مدعی ہے۔ اس لحاظ سے اس نے داستان گوئی کو ترک کر کے تمثیل نگاری کی طرف جو بوجہ کی ہے اسے کوئی انوکھی بات قرار نہیں دینا چاہیے۔ 'خطِ تقدیر' میں تقدیر اور تدبیر کی ازلی جنگ کو قصے کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کے کردار عام طور پر تمثیل کے کرداروں کی طرح علامتی اور استعاراتی حیثیت رکھتے ہیں، البتہ کسی کسی کردار کو زیادہ تجریدی



ہونے سے بنایا گیا ہے ، تاہم تمثیلی کرداروں کی روانات کے عین مطابق کسی کردار کو ہم زندہ اور رور مرہ زندگی میں نظر آنے والے اسخاص کی طرح نہیں ہائے۔ اسی طرح دیگر تمام تمثیلوں کی طرح اس میں بھی یہی حکم براہِ راست اخلاق کا درس دنا گیا ہے۔

کریم الدین کی زبان میں دلکشی نہیں۔ انہوں نے اننی نصفی زندگی کا آغاز رحمے سے دیا تھا اس لیے ان کے اندازِ زبان پر بعد میں بھی رحمے کا اثر غالب رہا۔ ان کی زبان سسہ اور ناخوارہ بھی نہیں آسکتی۔ لیکن چونکہ کچھ تدریسی ضروریات کی وجہ سے اور دھچ دلی کالج کے ارباب کے ماتحت ، وہ قدیم طرز کی تربیت اور آرائشی نثر نہیں لکھے ، اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ جدید نثر کو بھلانے میں ان کا بھی اچھا حصہ حصہ ہے۔

**موضع اللسان :** اس کتاب کا پہلا حصہ انہوں نے ۱۸۵۱ء میں لکھا جس کا سبب نصف ذیل کے الفاظ میں واضح کرے ہیں :

”دو برس سے مجھ کو نہ حال تھا کہ چونکہ سرکار گورنمنٹ تریسندسی آئہ کا ارادہ زبانِ اردو کی ترویج اور بھلانے کا ہے ، تو اس ارادہ کی نائذ کے واسطے تو بھی کوسس کر۔ گرچہ سرکار عالی مقدار کے دربار میں مجھ جسے بے سار ہیں اور مل بھی مسہور ہے نہ ہمار خانے میں طوطی کی آواز کون سنا ہے ؟ پر تب بھی چونکہ تمک حوار اس سرکار فص آثار کا ہوں اور مدرسے آگرتے میں جو کہ مقام اساعب علوم و فنون کا ہے مدرسہ اول اردو کہلانا ہوں ، اگرچہ ناالصريح مامور اس اساعب کا ہیں ہوا ہوں ، پر حشف میں ارادے سرکار کے برلانے میں جو کہ مرے عہدے سے تعلق اور لگاؤ رکھتا ہے ، ضمناً مامور ہو گیا ہوں ، جس طرح ہو سکے کوسس کروں۔ نہ سوچ کر یوں ٹھہرائی کہ مبدیوں اور نوآموزوں کو اس زبان کی طاف ، تروہ ہونے اس کے قواعد کے ہو سکتی ہے اور سوائے اس کے کوئی تاب نظر نہیں آئی کیونکہ جب جڑ ہی مضبوط نہ ہوگی تو بھول بھل کس طرح سے لگیں گے۔“

**النشائے اردو :** ۴۵ صفحات پر مستمل نہ رسالہ جنوری ۱۸۶۳ء میں میجر فلر کے حکم سے پنجاب کے مدارس کے لیے تیار کیا گیا۔ اس کے چار ابواب ہیں۔ پہلے باب کی تین فصلیں ہیں۔ اس کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ بچوں کو خطوط ، درخواستیں ، سرکاری نامے وغیرہ لکھنے کے طریقے سمجھائے جائیں۔

## غلام امام شہید

۱۸۰۴ء میں پیدا ہوئے۔ غلام محمد اسٹھوی کے فرزند تھے۔ نثر نگاری کے علاوہ شعر بھی کہتے تھے۔ فارسی ساعری میں قلیل اور اردو ساعری میں مصحفی کے شاگرد تھے۔ آگرے میں سرستہ دار رہے۔ نارغ وفات میں اختلاف ہے۔ اکثر لوگ ۱۸۷۶ء کو سی وفات فرار دہے ہیں مگر عبداللہ خاں خوشگی نے ’فرہنگ عامرہ‘ کے ضمیمے میں ۱۸۷۹ء کو سال وفات پایا ہے مگر ۱۸۷۶ء صحیح معلوم ہوا ہے۔ کیونکہ غلام غوث بخبر نے ان کی وفات برجو قطعہ نارغ کہا ہے اس میں مادہ نارغ ”وائے امام شعرا“ شہد سد“ سے ۱۸۷۶ء (۱۲۹۲ھ) ہی سال وفات نکلا ہے۔

شہد نر نگاری میں قدم رنگ کی طرف میلان رکھتے تھے۔ ان کے نثر کی مشہور کتابیں یہ ہیں :

**مولا شریف شہید :** یہ کتاب محافل ملاد البی میں بڑھنے کے لیے لکھی گئی۔

حامد حسن لکھتے ہیں :

”ان کی سفسگی اور فدائیت اس درجے پر پہنچ گئی تھی کہ بجز نعت شریف لکھنے اور بڑھنے کے کوئی شغل نہ تھا۔ اس سب سے مداح نبی و عاشق رسول کے مبارک القاب سے مسہور تھے“۔

اس سفسگی اور فدائیت کا نتیجہ ’مولا شریف‘ تھا۔ یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کی تمام اساعوں کی تعداد کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اس کتاب کی تحریر میں دو طرح کے اسلوب کار فرما ہیں۔ حمد و نعت کے مقامات مقفلی، عالمانہ اور برشکوہ ہیں۔ مثلاً :

”سبحان اللہ تعالیٰ سائے، کہ ذات مستجمع صفات اس کی بری ہے سرک اور زوال سے، اور الوہیت اس کی ہاک ہے ادراک وہم و خیال سے، مسابہت اعراض اور جواہر سے قطعی مبرا اور مناسبت اوہام خواطر سے مطلقاً معرا۔ کیا معبود مطلق کہ جس نے بنی آدم کے واسطے چراغ رہنائی کا انبیاء کے ہاتھ میں دیا اور تمام عالم کو سید الانبیاء، احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سمع جال جہاں آرا سے روشن کیا“۔

اس کے بعد کا مضمون سادہ عبارت میں ہے :

”جب عمر شریف آٹھ برس کی ہوئی، عبدالمطلب کی عمر ایک سو بیس برس کی تھی۔ دریافت کیا کہ اب ایام اپنی موت کے قریب آئے۔ ابوطالب وغیرہ سے کہا کہ اگرچہ موت سب کے واسطے ہے لیکن

مجھے اس فرزندِ ہنس سالہ کی یسوی برکت نہ ابھی صبرِ بر اور سمِ مادر  
و پدر ہے ، سخت حسرت و ناسف ہے ۔ کاس میری عمر اس کی تربیت  
نک وفا کرتی ہو انے سامنے خاطرِ حواہِ تربیت اور پرورس کرنا“ ۔

**انشائے بہار بے خزاں :** ۱۸۶۶ء میں مرید اور سائے ہوئی ۔ یہ اسکا جمرِ ٹاس  
کی فرمائش سے لکھی گئی ۔ مقصد نہ نہا نہ ”لڑنے اس کو سمجھ کر پڑھیں اور اس سے  
لکھنے کی تعلیم ناویر“ ۔ نہ بڑی نفع کے ۹۸ صفحات پر مشتمل ہے ۔ حار ابواب میں  
نقسم ہے ۔ بہلا باب نظم و نر کے بنان میں ہے ، دو نرا درحواسوں اور حطون کے لکھنے  
کے قواعد کے متعلق ، نسرے میں رعباب ہیں اور حوبھے میں دساودروں کا حال درج ہے ۔  
اس کتاب سے ”روضہ گنج“ کے ناربے میں اسکا تذکرہ ملاحظہ کنجئے :

”مہاب سرو کے سانہ ہم آغوس ہے نا کوئی حواں سر رنگ دادلہ  
ہوس ہے ۔ شمار نو دیکھ کر لعل اندروں پر لولنا ہے ۔ سرے کے  
رسک سے زمرد زہر کھانا ہے ۔ نہ لالے ہیں نا آس کے بر کالے ہیں ۔  
جس کو دیکھے سے جسے کے لالے پڑے ہیں اور دل ہی دل میں چراغ  
پڑھے ہیں ۔ چاند نے سرے میں لہب لہا ہے نا سر محمل پر  
مفسر کتر کے چہرک دنا ہے ۔ کلفی کو فلم کر کے اسکا برابر کنا  
ہے کہ اس کے نرے اور بھولوں سے گونا سر اور سرح بوٹوں کا  
خالصہ بچھا دنا ہے“ ۔

غرض سہد کی نر آرائسی اور برت کلف ہے ۔ جس میں فافہ ندی ، سسپہ و اسعارہ  
اور رعاب لفظی کی نرب ہے ۔ ناہم اس میں انک روانی سی ضرور ہے ، اس لحاظ سے سہد  
بطور نر نگار ان نر نگاروں پر فائق ہیں جن کے ہاں نر کی دلاویزی کے لیے مہی حرے  
استعمال کیے جانے ہیں مگر مجموعی نادر عمر رواں اور گچلک نر کا بدا ہونا ہے ۔

### غلام غوث بیخبر

غلام غوث بیخبر کے آنا و اجداد کسمیر کے رہنے والے تھے ۔ والد سب میں حا کر  
ہس گئے ۔ وہاں سے نیال کا رح کما ۔ بخبر سال میں ۱۸۲۴ء میں بدا ہوئے ۔ ان کی  
نشو و نما بنارس وغیرہ میں ہوئی ۔ بخبر ۱۸۳۰ء میں سال مغربی صوبے میں لفٹننٹ گورنر  
کے نائب میر منشی ممر ہوئے ۔ عرصے تک ان کا نام آگرے میں رہا ۔ نھر میر منشی  
ہوئے ۔ ۱۸۵۷ء میں سرکار نے انہیں خدمات کے صلے میں تمغائے مصری دیا ۔ ۱۸۸۵ء میں  
پنشن پائی ۔ ۱۹۰۵ء میں انعال کبا ۔

بیخبر عربی اور فارسی کے عالم تھے ۔ اردو نر میں ان کی صرف ایک کتاب  
”فغانِ بیخبر“ شائع ہوئی ہے ۔ اردو نر نگاری اور خطوط نویسی کی طرف ان کی توجہ ۱۸۴۶ء

میں ہوئی۔ تقریظوں میں ان کا رنگ وہی ہے جو ”مدیم رنگ“ کے نام سے مشہور ہے، خطوط کا بھی یہی انداز ہے البتہ انشا بردازی کے جو نمونے ’مناظر‘ کے عنوان سے لکھے ہیں ان میں مفصلی اور مسجع عبارت، شیبہیں اور اسعارے ہونے کے باوجود زبان بالعموم سادہ اور رواں دواں ہے۔ مثلاً دوہر کی کیفیت ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں :

”دوہر کا وف ہوا ، آفتاب سمب الراس بر آبا ، زمین بنے لگی۔ پاؤں رکھے ہوئے خوف آنا بھا کہ چھالے نہ بڑیں۔ بٹھتے ہوئے جی ڈرنا بھا کہ سانس کی گرمی سے لب تر لب خالی نہ بڑیں۔ آسان سے وہ آس باری ہونے لگی کہ ہوا نے سعدۃ جوالہ کی صورت سدا کی۔ خاک کے ذروں نے چنگاریوں سے ہشت بدلی۔ جانوروں نے ڈر سے اڑنا موقوف کیا کہ جسم جل کر کباب نہ ہو۔ زمین کی دہنس سے سکتے کی حالت ہو گئی کہ دھوپ کی گرمی سے ہگھل کر آب نہ ہو۔“

اس عبارت میں فاصہ بندی کی گئی ہے مگر فاصے ٹھونسے نہیں گئے بلکہ ان میں بیساختگی نظر آتی ہے۔ منظر کا کچھ حصہ واقعی تفصیلات پر مبنی ہے مگر کچھ فقرات میں زور غفل دکھانے کے لیے حقیقت سے گریز کیا گیا ہے، غرض غلام غوث بخبر کی نثر رنگِ قدیم و جدید کے بن بن ہے۔

### امام بخش صہبائی

صہبائی ۱۸۰۶ء میں سدا ہوئے۔ مولد دلی تھا۔ فارسی کے عالم اور شارح تھے۔ بعض نہایت مشکل کتابوں مثلاً ’سہ نیرِ ظہوری‘ وغیرہ کی شرحیں بڑی تحفنی کے ساتھ فارسی میں لکھی ہیں۔ ۱۸۵۷ء تک دلی کالج میں پروفیسر تھے اور مول یحییٰ خاں تھا ”محمد حسین آزاد اور ماسٹر سارے لال آسوب وعرہ ان کے شاگرد تھے“ (۱)۔ شاہی قلعے سے صہبائی کی رسم و راہ بھی اور شاہی خاندان کے بعض افراد ان کے شاگرد تھے۔ ۱۸۵۷ء میں انگریز جب دوبارہ دلی پر قابض ہو گئے تو لوگوں پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ صہبائی بھی فل کیے گئے اور ان کا مکان کھود کر زمین کے برابر کر دیا گیا۔ صہبائی نے دہلی کالج کی ملازمت کے زمانے میں ۱۸۴۲ء میں منشی شمس الدین فقیر کی تصنیف ’حدائق البلاغت‘ کا اردو ترجمہ مرتب کیا۔ اس کا سببِ تالیف آغاز کتاب میں یوں بیان کیا ہے :

”نسخہ حدائق البلاغت علمِ بیان ، بدیع اور عروض میں شمس الدین فقیر رحمۃ اللہ علیہ کے قلمِ بلاغت رفیع کا ثمرہ ہے اور اس

کتاب کا اس فن کے استیعاب میں شہرہ ہے۔ صاحبِ والا منافہ بلند مراتب، حاکمِ دزدن و دھن گستر، یورس صاحب بہادر دامِ اقبالہ نے کہ سہرِ سعادت بہرِ ساہجہان آباد کے مدارس کے پرنسپل ہیں، فقیر سراپا نصیر، خاکپائے علما، گدائے سرکوچہ فضلہ، سرگشتہ وادی، نادوانائی امام بخش صہبائی کو کہ ہلبہ فارسی کی تعلیم کے لیے مدرسِ اول کے عہدے پر مشرف ہے۔ ارساد کہا کہ اگر یہ نسخہ فارسی زبان سے اردو میں ترجمہ کیا جاوے اور اس میں عربی اور فارسی مثالوں کی جگہ اسعارِ اردو، زبانِ دانانِ ہند کے مندرج ہوں، تو ان لوگوں کے واسطے کہ اردو اسعار سے ذوق رکھتے ہیں اور اس قدر اسعداد نہیں رکھتے کہ عربی اور فارسی کتابوں سے ان مطالبِ عالہ کو سمجھ لیں، بہت مفید ہوگا،۔

اس اقباس میں فقرے طویل اور بچہدہ ہیں، فافے موحود ہیں، اس عبارت کو کسی طرح بھی سادہ اور سلس نر نہیں لہا جا سکا۔ نہ عبارت صہبائی کی طبع زاد ہے، ترجمہ کی ہوئی عبارت نسبتاً سادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ترجمے میں اصل کتاب کی کچھ چھلک مل جاتی ہے۔

### مفتی صدر الدین آزرہ

آزرہ ۱۷۹۸ء میں دلی میں پیدا ہوئے۔ شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر، شاہ محمد اسحاق، فضلِ حق خبرآبادی جسے مساپرِ علما سے علومِ عقلیہ و نقلیہ کی تحصیل کی۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزی حکومت کی طرف سے دہلی میں صدرالصدور اور مفتی بھیے۔ ۱۸۵۷ء میں ان پر جہاد کا فتویٰ دینے کا الزام لگایا گیا۔ گرفتار ہوئے اور حائداد ضبط کر لی گئی۔ مگر کچھ عرصے کے بعد رہا کر دیئے گئے۔ عربی اور فارسی کی کچھ تصانیف اور فتاویٰ ان کی یادگار ہیں۔ شعر بھی کہتے بھیے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اردو شاعروں کا ایک تذکرہ زبانِ فارسی میں کیا تھا مگر اب یہ ناہید ہے۔ اب نر میں ان کی یادگار صرف چند خطوط ہیں جو انہوں نے عالہ، صہبائی اور شہبہ وغیرہ کو لکھے۔ ان کے خطوط کی عبارت میں مدعا نگاری مقدم رکھی گئی ہے اور عبارتِ آرائی سے گریز کیا گیا ہے۔

## منشی عبدالکریم

منشی عبدالکریم لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ جن دنوں وہ کلکتہ میں گورنر جنرل کے دفتر میں منشی تھے، انہوں نے مشہور عربی داستان 'الف لیلیٰ' کے اردو ترجمے کا قصد کیا مگر اس وقت کتاب نہ مل سکی۔ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد انہیں 'فاسٹر' کا انگریزی ترجمہ دستیاب ہوا۔ چنانچہ ۱۸۴۲ء میں انگریزی سے اردو ترجمہ شروع کیا جو ۱۸۴۷ء میں چھپا۔ منشی عبدالکریم کا سالِ بدائش و وفات معلوم نہیں۔ یحییٰ خان نہا نے لکھا ہے کہ "۱۸۷۸ء (۱۲۹۵ھ) تک یقیناً اب زندہ تھے"۔

انہوں نے آغازِ کتاب میں اپنے ترجمے کا تعارف ان لفظوں میں کرانا ہے۔  
 "راہم ام کو..... اسدائے سعور سے کمال سوو دیکھے کتابوں فصے  
 کہانی کا دھا اور سب فصوں میں منا الف لیلیٰ کی زیادہ رہتی تھی اور  
 وہ عربی میں 'الف لیلہ و لیلہ' یعنی ایک ہزار ایک رات ہے..... وہ کتاب  
 سوا دو سو رات کے، کہ جس کو نسخ احمد عرب بمیٰ سروانی نے  
 واسطے بڑھانے صاحبانِ عالی سان کالج کلکتہ کے نکالِ ماس عرب سے  
 منگوا کر چھپوایا تھا، مسر نہ آئی۔ آخر کار جب راہم بسببِ سببِ  
 امراض کے، بعد بفرز نشن یب السلطنت لکھنؤ میں کہ مولد اتنا  
 ہے، حانہ سنن ہوا، وہ نسخہ تمام و کمال انگریزی زبان میں مع  
 تصویر اب ہم ہنچا۔ راہم نے اس کو اول سے آخر تک بسببِ استعداد  
 سمجھے انگریزی کے دیکھا۔ از بسکہ فصے دلچسپ تھے، دو برس  
 تک ان کا ترجمہ کرنا رہا، اور ۱۸۴۲ء (۱۲۵۸ھ) میں تمام کیا۔"

منشی عبدالکریم اگرچہ لکھنؤ کے رہنے والے تھے جہاں نثر نگاری کے لیے آرائشِ بیان کو ضروری سمجھا جاتا تھا، اس کے باوجود انہوں نے آسان نثر لکھنے کی کوشش کی ہے، جس کی وجہ سادہ یہ ہے کہ ان کا تعلق کلکتہ اور سرکار انگریزی سے رہا ہے۔ اس کے باوجود ان کے ہاں فروع کی ساخت میں نقدیم و ناخبرِ الفاظ بہت زیادہ ہے اور اس حد تک لکھنوی نثر کا پر نو ان پر ضرور پڑا ہے۔

## مولوی قطب الدین دہلوی

پیدائش ۱۸۰۰ء میں بمقامِ دہلی ہوئی<sup>(۱)</sup>۔ والد کا نام محمد علی الدین احراری ہے وہ دہلی کے مشہور عالم و محدث تھے۔ شاہ عبدالعزیز کے نواسے حاجی محمد اسحاق دہلوی کے

(۱) تنہا، محمد یحییٰ، سیر المصنفین - ج - ۱ - ص - ۳۰۵۔

(۲) عبدالحکیم خاں خویشتی (مرتب)، ضمیمہ فرہنگ عامرہ۔

شاگردِ رسد بھیہ - ۱۸۷۲ء میں انتقال کیا -

ان کے دو تراجم دستیاب ہوئے ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے -

**ظفر جلیل :** یہ کتاب دمشق کے فاضی القضاہ شمس الدین محمد کی تصنیف 'حصن حصن' کا اردو ترجمہ ہے 'ظفر جلیل' تاریخی نام ہے - اس سے سالِ نالیف ۱۸۳۷ء (۱۲۵۳ھ) نکلا ہے -

**مظاہر حق :** 'مسکواہ المصابیح' کا اردو ترجمہ ہے - ترجمہ جارِ جلدوں میں بڑی بظطع کے دو ہزار صفحات بطبع ہوا ہے - 'مظاہر حق' تاریخی نام بھی ہے - اس سے ۱۸۳۸ء (۱۲۵۴ھ) سنِ ترجمہ نکلا ہے - اس کتاب کے دباچے سے اک اقتباس درج ذیل ہے :

"مسکن محمد قطب الدین ساہجہان آبادی عرض کرنا ہے کہ کتاب مسکواہ سرف علمِ حدیث میں عجب نافع کتاب ہے کہ ہر مضمون کی حدیث اس میں مندرجہ ہیں - اس کا ترجمہ عدم الظفر مرے اسادِ بزرگوار مولانا محمدا مکرنا حضرت حاجی محمد اسحاق نواسہ حضرت سیخ عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ نے بیح زبانِ ہندی کے بین السطور میں لکھا تھا ، لیکن کاتبوں سے اس کی صحت میں فرق آنے لگا - مرضی جناب موصوف کی اسی ہائی کہ اگر یہ بطور سرح کے لکھا جاوے ہتر ہے - اس لیے اس ہحمدان نے ترجمہ اس کا عبارتِ عربی سے حلیحدہ کر کے لکھا -"

مولوی قطب الدین کی عبارت آسان اور آرائس سے ناک ہے - لیکن فقروں کی ساخت میں ہرانی نثر کا رنگ بانا حانا ہے -

### منشی چرنی لال

الہ آباد کے رہنے والے بھیہ - سالِ بدائس و وفات معلوم نہیں ہو سکے - انہیں فلسفہ و ریاضی کا بہت سونی تھا - ان کی دو کتابیں معروف ہیں -

**مصباح المساحت :** ۱۸۵۴ء میں لکھی یہ علمِ ریاضی کی کتاب ہے -

**تعلیم النفس :** یہ کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے اس کا موضوع علمِ نفسیات ہے - یہ کتاب گورنمنٹ پریس میں ۱۸۵۹ء میں طبع ہوئی -

دونوں کتابیں چونکہ علوم کی ہیں اس لیے انکی نر سادہ اور بے رنگ ہے - عربی اور فارسی کی اصطلاحیں جا بجا نظر آتی ہیں - کیوں کہ ان کے بغیر علوم کی کتابوں کا ترجمہ ناممکن ہوتا ہے -

## مفتی سعد اللہ رامپوری

۱۸۰۴ء میں پیدا ہوئے اصلی وطن مراد آباد ہے۔ علمائے مصر اور مفتی صدر الدین آزاد سے تحصیلِ علوم کی۔ دہلی سے حصولِ علم کے بعد لکھنؤ گئے جہاں مدرسہ شاہی میں مدرس رہے۔ الحاقِ اودھ (۱۸۵۶ء) کے بعد رامپور چلے گئے اور وہیں ۱۸۷۶ء میں انتقال کیا۔

مفتی سعد اللہ کی تصنیفات و تالیفات کی تعداد اٹھائیس سائی گئی ہے۔ مگر صرف ایک کتاب کا نام ملا ہے اور وہ ’فقہ اکبر‘ ہے۔ نہ کسی عربی کتاب کا ترجمہ ہے۔ اس کا سالِ تحریر ۱۸۴۰ء ہے۔ ان کی اردو نثر عربی عبارت کا بڑی حد تک لفظی ترجمہ ہوتی ہے۔ ایک مختصر اقتباس بطور نمونہ درج دیں :

”یہ کتاب ہے اصلِ نوحہ اور اعتقادِ صحیح کے بیان میں، واجب ہے ہر مسلمان ہر کہ کہے صدیِ دل سے یقین لانا میں اللہ پر اور اس کے سب فرسٹوں پر اور کسانوں اور رسولوں پر اور ہماہم کے دن پر اور جلا اٹھانے پر بجھے مرنے کے اور خمر و شر کی نفی پر کہ اللہ تعالیٰ کی نائی ہے۔“

## عباس بن ناصر

عباس بن ناصر غالباً کانپور کے رہنے والے تھے ان کی بدائش اور وفات کے سنیں معلوم نہیں ہو سکے۔ ۱۸۳۳ء میں انہوں نے امام غزالی کی ایک تصنیف ’رقائق الاخبار‘ کا ترجمہ ’صبح کا ستارہ‘ کے نام سے کیا۔ نہ ترجمہ ۱۸۵۳ء میں کانپور سے شائع ہوا۔ مترجم نے لکھا ہے :

”میں نے کتاب ’دقائق الاخبار‘ کو کہ حجۃ الاسلام ابو حامد محمد بن محمد الغزالی رحمۃ اللہ علیہ نے موت کے احوال میں تصنیف کی تھی، مغربی عربی سے سلیس اردو میں ترجمہ کیا، نا فائدہ اس کا عام ہو جائے۔“

مگر مترجم کے دعوے کے باوجود اردو ترجمے کی عبارت خاصی مشکل اور ترکیب میں عربی کے فریب ہے۔

## مولوی ضیاء الدین

مولوی ضیاء الدین بستی دارا پور کے جاگیر دار شیخ غلام حسن خان کے بیٹے تھے۔ آپ دہلی میں آکر سکونت پذیر ہوئے اور مدرسہ تعلیم المعلمین (نازل سکول) میں مدرس



مقرر ہوئے۔ آپ نو علم طبعات سے زیادہ دلچسپی بھی۔ چنانچہ میجر فلر ڈائرکٹر تعلیم پنجاب کی فرمائش پر 'محزن الطبعات' کے نام سے دو حصوں میں ایک کتاب لکھی جو لاہور میں ۱۸۶۵ء میں طبع ہوئی۔ نمونہ محرر یہ ہے:

”ارباب بصرت بر طائر ہو کہ جن اجسام میں لیس اتصال اس قدر کم ہے کہ ان کے اجزاء بغیر محسوس ہوئے مراحمہ کے متحرک ہو سکے ہیں ان کو سمائل کہتے ہیں۔ اجسامِ سخت اور اجسامِ سمائل میں ٹڑا فرتی ہے کہ اجسامِ سخت کے اجزاء کو لیس اتصال، متصل اور نوسہ رلہی ہے۔“

اس عبارت میں سائنسی اصطلاحات سے قطع نظر کہ ان کی موجودگی ضروری ہے، فمروں کی برنس حدید انداز کی ہے۔ اس لیے نہ لہنا غلط نہیں ہوا کہ مولوی ضاء الدین بر کے اس انداز سے مابر ہوئے، جو فورٹ ولیم کالج کی بعض لسانیوں سے شروع ہوا اور ۱۸۶۵ء کے لک بھنگ سرسید احمد خان اور بعض دوسرے ستاروں کے زیر اثر بھلتا جا رہا تھا۔

### خواجہ امان

آپ کا نام بدرالدین خان اور عرف خواجہ امان تھا۔ ۱۸۱۷ء میں بمقام دلی پیدا ہوئے۔ سپر بھر میں حوس نوسی اور خوس ذوی کی وحدہ سے مسہور تھے۔ ریاست الور سے تعلق تھا۔ میں راجہ سودان سنگھ کے حکم سے 'نوسانِ خیال' کا ترجمہ شروع کیا۔ کام ابھی مکمل نہیں کیا تھا کہ کوچ کا حکم آگیا۔ ۱۸۷۹ء کو دنیا سے رخصت ہوئے۔

**نوسانِ خیال:** یہ فارسی رباں کی ایک مسہور داستان بھی جس کا مصنف میر بی خیال (موطن گجرات) تھا۔ اس نے نہ کتاب بعہد محمد ساء بادیساہ 'داسانِ امیر حمزہ' کے جواب میں لکھی تھی۔ خواجہ امان نے اس داستان کو آردو میں تمام و کمال منتقل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ ترجمے کی اسدا کا صحیح سال متعین کرنا نو دسوار ہے مگر غالباً ۱۸۵۷ء سے پہلے ترجمہ شروع ہو چکا تھا۔ پہلی جلد (جس میں فارسی کے دو حصے شامل تھے) پہلی دفعہ ۱۸۶۶ء میں دہلی سے سائع ہوئی۔ ۱۸۷۶ء تک بائچ جلدیں مکمل ہو چکی تھیں۔ اس کے بعد چھٹی جلد سائع ہوئی۔ سابیوں جلد کے مسودے چوری ہو گئے۔ انہوں نے نئے سرے سے اس حصے کا ترجمہ کیا لیکن ابھی اس پر نظر ثانی نہیں کی تھی کہ وفات پا گئے۔ اس کے بعد ان کے بیٹے خواجہ قمرالدین نے کام کو تکمیل تک پہنچایا۔

خواجہ امان نے ترجمے کی پہلی جلد میں داستان نگاری کے لیے بعض اصولوں کو ملحوظ رکھنا ضروری قرار دیا ہے۔ (۱) دلحسی کا عنصر (۲) طول کلامی اور تکرار سے پرہیز (۳) لطائف زبان (۴) آسان زبان (۵) خیالی واقعات کو اس طرح بیان کرنا کہ حقیقی اور تاریخی واقعات معلوم ہوں۔ اب ایک اساس ملاحظہ کیجئے جس سے یہ اندازہ ہو سکے گا کہ انہوں نے ان اصولوں پر کس حد تک عمل کیا ہے :

”سہزادے نے فرمایا 'م' نے خوب آگہ کر دیا ورنہ میں محفوظ سے ناحق آزرده ہوتا۔ وہ دعا مجھے سا دو۔ آئندہ من دائم و کار من ، یا پانا دعا کا بھی بادشاہ کی احازت پر موقوف ہے۔‘ سعد نے کہا ”نہیں، دعا محض واسطے نعام کے ہوتی ہے۔“ آخر الامر سعد نے وہ اسم بزرگ سہزادے کو پانا۔ سہزادہ دوسرے دن ناروں سے رخصت ہو کر اس بابا بیاں کی راہ سے بسالمعمور کی طرف روانہ ہوا۔ اس دفعہ انٹائے راہ میں دیکھا کہ فی الحصف وہ دسب پر خار شیر و بلینگ اور مار و کردم وغیرہ جانورانِ موذیہ کی کثرت سے آباد ہے۔ ”الا“ کوئی جانور سہزادے کے دریئے ایذا نہ ہوا۔ سہزادہ روزِ سوم نصحت و سلامت بسالمعمور میں پہنچا اور اوّل دو رکعت نماز ادا کی۔ بعد ازاں حوص میں داخل ہو کر وردِ اسم شروع کیا۔ ہنوز اعدادِ اسم تمام نہیں ہوئے تھے کہ ناگہ دروازے سے مسجد کے ایک جوان صاحبِ جال پہ لباسِ درویش مسجد میں آنا اور اس نے ساہزادے کو بہ محبت تمام سلام کیا۔ سہزادے نے جو غور سے دیکھا، کیا دیکھنا ہے کہ وہ فقیر اقبال شاہ ہے۔“

حامد حسن قادری نے خواجہ امان کے اندازِ بیان کے متعلق لکھا ہے۔

”خواجہ امان نے تمہد میں مفصل عبارت لکھی ہے اور عربی و فارسی سے کام لیا ہے۔ لیکن اصل داستان بہت سادہ اور سلیس لکھی ہے۔“

یہ صرف خواجہ امان کی خصوصیت نہیں۔ تمام ضخیم داستانوں کی یہی کیفیت ہے۔ وجہ یہ ہے کہ داستانِ نوس ہر باب کے شروع میں تکلف کا کچھ اہتمام کر سکتا ہے مگر ہزارہا صفحات میں آرائشی زبان کا التزام کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس مجبوری نے طویل داستانوں کے بہت بڑے حصے کو ہمیشہ سلیس اور سہل زبان میں لکھوایا ہے۔ بہر صورت بوستانِ خیال کے ترجمے میں کہیں کہیں قدامت پسندی کا عکس نظر آتا ہے، مگر بہت

جگہ ایسی زبان لکھی گئی ہے جس سے داسان کو سریع الفہم بنانا مقصود ہے۔ داسان کی یہی فصاحت اور روانی ہے جس نے اسے اپنے دور میں معمول بنایا۔ اگر یہ داسنان لکھنؤ میں لکھی جانی تو نثر کی شکل ساند کچھ اور ہوئی مگر حواصہ امان نے اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے مرصع زبان سے گریز کیا ہے اور اہل دلی کے مقلد ہوئے ہیں۔ ’بوسنان خیال‘ کا انک اور نمونہ دیکھیے :

”جب سب گزری وہ صبح دانہ“ ملک کی گریباں و نالان ملک ساء لے  
 ناس آئی اور کہا ”اے ساہرادۂ عالی قدر میرے وہ سب جدا جانے  
 میرے خواہر زادہ کو کیا کلاب سخ زبان سے فرمائے کہ وہ  
 اسی وہ سے غائب ہو گیا۔ اب میں اس کی مادر سوہ تو کیا  
 جواب دوں گی؟“ ساہرادہ لے کہا۔ ”واللہ میں نے کوئی کلمہ  
 سچ نہیں کہا، فقط حال دریافت کیا تھا۔ اے دایہ تو خاطر  
 جمع رکھ میں آسے نلاس کروانا ہوں۔“ بعد ازاں ملک ساء نے والدہ  
 سے کہا۔ ”اے والدہ صاحبہ وہ سب عجب انک نعاہہ نظر سے  
 گرا ہے کہ اس وہ سے میں حیرت میں گرفتار ہوں۔۔۔۔“ (۱)

### دکن کے نثر نگار

دلی اور لکھنؤ میں جہاں نثر کی بہت سی کتابیں لکھی جا رہی تھیں وہیں دکن کی آصف جاہی سلطنت کے زیرِ سادہ بھی آردو نثر کی برویج کے لیے بہت کچھ کام ہو رہا تھا۔ اس دور میں دکنی آردو نثر کی ترقی میں نواب امیر اکبر سمس الامراء بانی کی سرپرستی کا بڑا حصہ ہے۔ سمس الامراء بانی ۱۷۸۰ء میں برہان پور میں پیدا ہوئے اور ۱۸۶۲ء میں انکا انتقال ہوا۔ آصف جاہ بانی نے انہیں بہت سی جاگرت عطا کی تھی اور داماد بھی بنا لیا تھا۔ آپ چونکہ علم دوست تھے اس لیے مؤلفین و مصنفین کی حوصلہ افزائی مصیب اور نفعخواہ کی شکل میں کرتے تھے۔ آپ نے عربی زبانوں سے سائنس کی بہت سی کتابیں آردو میں ترجمہ کروائیں۔ اس کام کا آغاز ۱۸۲۶ء سے ہوا۔ گونا ورٹ ولیم کالج کے کارناموں کے فوراً بعد ان کتابوں کی تحریر و اساعت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ انہوں نے تقریباً چھتر کتابوں کو آردو میں منتقل کرا لیا۔ ان میں سے ایک کتاب (سستہ سمسبہ) کے دیباچے میں انہوں نے لکھا ہے کہ برائے زمانے میں عربی اور فارسی میں بھی سائنسی کتابیں لکھی گئی تھیں مگر اب یورپ سے جو کتابیں چھپ رہی ہیں وہ دلائل و براہین میں ہماری مدیم کتابوں سے بہتر ہیں۔ اس لیے طالب علموں کے فائدے کے لیے ان میں سے کچھ کتابوں

(۱) خواجہ امان، بوسنان خیال جلد اول - صفحہ ۱۰۳ مطبوعہ دہلی ۱۸۶۳/۱۲۸۱ھ

نوٹ : اس اقتباس میں فقط اٹنے کامے اور نشانات املا ہماری ایذاں ہیں باقی زبان ایسی ہے جیسی آج کل استعمال ہوتی ہے۔۔۔۔۔ مدیر عمومی

کو اردو میں منتقل کرایا گیا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے<sup>(۱)</sup> ان کتابوں میں سے بعض کی فہرست نشر کی ہے جو یہاں نقل کی جانی ہے :

- (۱) اصولِ علم حساب (۲) رسالہ کسور اعشاریہ (۳) ستہ شمسیہ
- (۴) رسالہ علم و اعمالِ کرہ (۵) رسالہ منجم البصر (۶) کمسٹری
- کا رسالہ (۷) رسالہ خلاصہ ادوہ (۸) نافع الامراض (۹) ترکیب
- ادویہ (۱۰) رسالہ حیواناتِ مطلق (۱۱) رسالہ موقی کے چو نکالے کا
- (۱۲) رسالہ اریمری (۱۳) سمس العلاج (۱۴) بعلم الصنان
- (۱۵) فوائد لصبان (۱۶) سمس الہبت (۱۷) رسالہ علم خراط
- (۱۸) انوارِ بدرہ (وغیرہ)۔

ان میں سے چند کتابوں کے بارے میں بعض تفصیلات درج ذیل ہیں۔

**ستہ شمسیہ :** یہ علمِ طبعا بترجہ رسالے ہیں جن کے مترجم کا نام معلوم نہیں۔ ۱۸۳۷ء میں طبع ہوئے۔ ان کا دباچہ سمس الامراء نانی نے لکھا ہے۔ عبارت کا نمونہ یہ ہے :

”اساد۔ اب میں نے ارادہ کیا ہے کہ تم کو کیفیہ و حقیق سے کلبہ عمدہ، کی آگاہ کروں، جس کو کنسٹنٹ نقل کہتے ہیں اور وہ ایک قوت ہے جس کے سبب اجسام بعدہ باہم دیگر تجاذب رکھتے ہیں اور یہ امر ظاہر ہے گرنے سے تمام اجسام نقلہ کے زمین پر۔

تلمیذ کلاں۔ گولی کا ہاتھ سے گرنا اور انٹ کا چھت سے ساقط ہونا اور سیب کا جھاڑ سے زمین پر آنا، یہ سب کیا سبب اسی قوت کے ہیں؟ اساد۔ ہاں یہ سبب اسی قوت کے ہیں جس کو ثقل تعبیر کرتے ہیں۔ بس وہ اجسام جس میں کچھ بھی مبل ہے اگر ان کو کوئی دھانسنے والا نہ ہو تو سطح زمین پر فریب عمود وار گریں گے۔“

اس عبارت میں انہی دور کی دوسری دکنی نثر کی کتابوں کے برعکس مقاسی الفاظ و اندازِ بیان غالب نہیں ہے۔ اور یہی کیفیت بیشتر دوسرے ترجموں کی ہے۔

**رسالہ اعمالِ کرہ :** اس میں جغرافیہ اور ہیئت کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ یہ ۱۸۴۱ء میں طبع ہوا۔ کتاب چار ابواب میں تقسیم ہے۔ پہلے باب میں تعریفات، دوسرے میں جغرافیہ، تیسرے اور چوتھے میں ہیئت سے بحث کی گئی ہے۔

ان تراجم کے علاوہ بعض لوگوں نے انفرادی طور پر بھی ترکی خدمت کی ہے -  
ان میں سے نسبتاً اہم مصنفین کا جائزہ مندرجہ ذیل ہے -

### غلام امام خاں ترین

آپ اس دور کے اہم مورخ ہیں - انہوں نے پہلے 'تاریخ رسد الدن خانی' لکھی - یہ ضخیم کتاب جو بڑی قطع کے ۹۰ صفحات پر مشتمل ہے ۱۸۵۳ء میں طبع ہوئی - کتاب کے میں ابواب ہیں اور انک مقدمہ اور خاتمہ - مقدمے میں راجگان ہند ، ناب اول میں سلاطین دہلی کے حالات ، ناب دوم میں اسلامی سلاطین دکن اور ناب سوم میں مسابہر کے حالات درج ہیں - ان کی دوسری کتاب 'تاریخ خورشید جاہی' ہے - اس کتاب میں سلاطین کے حالات کی بجائے صوبہ داروں کے حالات اور ان کی فتوحات کا ذکر ہے - ہندوستان کو ۲۷ صوبوں میں تقسیم کیا گیا ہے - تاریخ خورشید جاہی سے انک انبیاں بطور نمونہ ملاحظہ کیجئے :

### بارہواں شعبہ راجہ پرتھی راج کے بیان میں :

”راجہ برہمی راج مشہور رائے تھورا امر زبان ولایت مراٹھ کا تھا اور خدمت میں راجہ حنون سنگھ کے نواس رکھا تھا - راجہ چون کو غافل امور سلطنت میں سن کر وف فرصت کے لاسکر جرار سے ناگہاں سر بر آھچا اور ہنگامہ کار زار کا گرم کیا - راجہ چون سنگھ کے سامان ہکار درستی اور بارہ رکھا تھا ناب نہ لا کر بھاگا اور پہاڑوں میں جا چھا اور اسی جا ہلاک ہوا اور رائے تھورا فتح کے نفاڑے بھانا ہوا سریر آرا دہلی کا ہو - عہد میں اس کے سلطان سہاب الدن شوری نے عزیزین سے آکر کئی دفعہ معاریہ کیا - آخر کار موضع برائن عرف ہلاوری پر اس کو مار کر آپ فرمانروا ہند کا ہوا.....“ (۱)

### محمد ابراہیم بیجا پوری

اس دور کے ایک اور مرجم ہیں - انہوں نے فارسی کی مشہور کتاب 'انوار سہیلی' کا ترجمہ کیا ہے - اس کا سال طبع ۱۸۴۴ء ہے - اس کی عبارت اس دور کی سنالی ہند کی اثر سے مختلف اور قدیم پر معلوم ہوئی ہے - عبارت کا مختصر سا نمونہ یہ ہے :

”چین کے ملک کے اورس چورس میں ایک بڑا بادشاہ تھا ، اس کا نام ہایوں فال ، پور اسے ایک بڑا نکا وزیر تھا ، اس کا نام خجسہ رائے“ -

(۱) غلام امام خان ترین ، تاریخ خورشید جاہی - صفحہ ۱۵ - مطبوعہ حیدر آباد دکن

## مولوی قادر علی

انہوں نے عربی سے 'مصابح الصلوٰۃ' کے نام سے ایک کتاب دکنی اردو میں منتقل کی ہے۔ یہ کتاب ۱۸۱۶ء میں مرتب ہوئی اور 'فہ' حنفی کے بارے میں ہے۔ اس کا اندازِ بیان ابراہیم بجانوری سے مختلف نہیں۔

## سید حسین علی خاں حیدرآبادی

حسین علی اس دور کے مترجمین میں اس لیے نمایاں ہیں کہ انہوں نے داسانوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ان کا پہلا ترجمہ فارسی قصہ 'مرغوب الطبع' ہے جسے 'کا مروپ' کے نام سے ۱۸۳۲ء میں لکھا گیا ہے۔ انہوں نے ۱۸۳۴ء میں 'چار درویش' کو فارسی سے اردو میں منتقل کیا۔ اسی سال فارسی کی انک اور کتاب 'بہارِ دانش' کا بھی اردو ترجمہ 'ہمسہ بہار' کے نام سے کیا۔ حسین علی خاں حیدرآبادی کے ان تینوں تراجم کا اندازِ بیان دکنی اردو کے مطابق ہے۔ مثلاً 'ہمسہ بہار' کے دیباچے میں لکھتے ہیں :

”کئی صاحبوں نے کہا کہ اگر اس کا ترجمہ زبانِ ہندی سے ہو تو سب با علم و بے علم کی سمجھ میں جو نہ کہانیاں و نقلات جو رنگین ہیں، آئیں گی اور کئی منشموں نے بیون سی کتابیں فارسی کی، بموجب انگریزوں کے، ترجمہ ہندی سے جو فریب الفہم ہونا ہے، کیے ہیں۔“

## (۵) نثری داستانیں

### انشاء اللہ خاں

پدائس، ۱۷۹۰ء - وفات، ۱۸۱۷ء - والد کا نام ماساء اللہ خاں، دلی کی بباہی پر مرشد آباد گئے جہاں انشاء اللہ خاں پیدا ہوئے۔ انشا نعلم سے فارغ ہو کر دلی چلے آئے۔ پھر اکھنڈ چلے گئے اور بواب سعادت علی خاں کے مصاحب ہو گئے۔ وہ زیادہ تر شاعری کی وجہ سے مشہور ہیں مگر انہوں نے دو مختصر نثری داستانیں بھی لکھی ہیں۔

**سلاکِ گوہر :** اس کا صحیح سن تصنیف متعین نہیں ہو سکتا مگر اندرونی سہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۷۹۸ء کے بعد کی تحریر ہے۔ اس کہانی میں التزام یہ کیا گیا ہے کہ پورا قصہ بے نقط ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس داستان کے اسلوب میں فارسی اور عربی الفاظ کثرت سے آتے ہیں مگر اس کی تصدیق نہیں ہو سکی کیوں کہ اس کا نمونہ تک کسی نے درج نہیں کیا۔

رائی کیتی کی کہانی : یہ داستان بھی مختصر ہے ۔ بحاس ساٹھ صفحات سے زیادہ نہیں ۔ ۱۸۰۳ء کی تصنیف ہے اسے انجمن ترقی اردو ہند نے ۱۹۳۳ء میں شائع کیا تھا ۔ ابتدائی سطروں میں حمد ، نعت اور منقبت کے چند جملے لکھ کر انشاء نے کباب کا سبب تصنیف یوں بیان کیا ہے :

”ایک دن بٹھے بٹھے نہ بات اپنے دھان میں خڑھ آئی کہ کوئی اسی کہانی کہے جس میں ہندوی جھٹ اور کسی بولی سے ہٹ نہ ملے ، تب جا کر میرا حی بھول کی کلی کے روپ کھلے ۔ باہر کی بولی اور گواہی کچھ اس کے سج نہ ہو“ ۔

یہ داستان بڑی سادھی سادی ہے چونکہ انشاء نے اپنے آپ پر خود ہی پابندی لگا لی ہے کہ اس میں سوائے ہندی کے کسی اور بولی سے ’نٹ‘ نہ ملے اس لیے ان کا نخیل داسان کے واقعات کو احماد کرنے کی بجائے الفاظ کے انتخاب میں الجھ کر رہ گیا ہے ۔ اس طرح انہوں نے داسانوی عناصر کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی ۔ چنانچہ اس میں تخیل کے وہ عظیم الشان کارنامے نظر نہیں آتے جو دوسری داسانوں کا طرہ امتیاز ہیں ۔ زبان کے اعتبار سے یہ داسان بہت دلچسپ ہے ، اس میں عربی اور فارسی کا کوئی لفظ موجود نہیں ۔ اس کے باوجود ہندی کے نامانوس اور عریب الفاظ کم ہیں ۔ عبارت کا مجموعی نادر یہی ہونا ہے کہ ہم اردو کی داسان بڑھ رہے ہیں ۔ اس کی عبارت کا عام انداز اس قسم کا ہے :

”سب کوٹھوں کے ماہوں پر کسر اور چندن کے ٹبکے لگے ہوں اور خنرے ہاڑ ہارے دس میں ہوں اپنے اپنے ہی روئے سونے کے بھاڑ آئے سامنے کھڑے ہو جائیں اور سب ڈانگوں کی جوتیاں مونوں کی مانگ سے بن مانگے بھر جائیں اور بھولوں کے گھنے اور بدن واروں سے سب جھاڑ ہاڑ لدے پھندے رہیں اور اس راج سے لگا اس راج نک ادھر میں چھ سے باندھ دو ۔ جیا جیا کہیں نہ رہے جہاں بھڑ بھڑکا دھوم دھڑکا نہ ہو“ ۔

اس داستان کے مکالمے بالکل بات چیت کی زبان میں ہیں ۔ کہیں کہیں قافیہ بندی کی کوشش بھی کی گئی ہے ۔ مگر عام طور پر نثر ’عاری‘ ہے ۔ بعض بعض جگہ البتہ انشاء اپنی لگائی ہوئی پابندیوں کے ہاتھوں مجبور معلوم ہوتا ہے ۔ مثلاً اس نے ایک مقام پر قصبے کے پیرو کی خواہش کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے :

”اس کا اچھا پن اور بھلا لگنا کچھ ایسا نہ تھا جو کسی کے لکھنے اور کہنے میں آسکے“ ۔

ایسے مقامات پر یہی بات ذہن میں آتی ہے کہ فارسی اور عربی کے ان الفاظ سے جو عام بول چال میں رائج ہو چکے ہیں، اجتناب کرنا نامناسب تھا۔

### فقیرِ مجد گويا

گويا لکھنؤ کے رئیس تھے۔ شاہانِ اودھ کے زمانے میں فوج کے رسالدار رہے۔ حسام الدولہ خطاب تھا۔ یہ شاعر بھی تھے اور ان کا دیوان بھی چھپ چکا ہے۔ ۱۸۵۰ء میں وفات پائی۔ ۱۸۳۶ء میں گويا نے نثر میں ایک داسان لکھی ہے جو ’ستانِ حکمت‘ کے نام سے منسوب ہے۔ یہ فارسی کی کتاب ’انوارِ سہلی‘ کا ترجمہ ہے۔ یہ کتاب اردو میں اس سے پہلے بھی ترجمہ ہو چکی ہے۔ مگر فقیرِ مجد گويا کا ترجمہ سب سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔ فقیرِ مجد گويا لکھنؤ کے رؤسا میں سے تھے۔ اس کے باوجود ان کے ہاں اس دور کے دوسرے مصنفین مثلاً سرور کی طرح فافہ نہائی نہیں ہے۔ لیکن الفاظ و فقرات کی ترتیب میں فساد کا اثر ضرور ہے۔ مگر یہ خصوصیت اس دور میں عام تھی۔ ان کی عبارت کا ایک ٹکڑا درج ذیل ہے :

”بادشاہ نے حکم دیا کہ دمنہ کو دارالفضا میں سپرد کرو نا فاضی اس کا حال دریافت کرے کہ احکامِ سیاس میں جب تک شرائطِ سرعی تمام نہ ہوں گے، کبھی حکم نہ کیا جائے گا۔ دمنہ نے کہا کون حاکم راست کار بادشاہ سے زیادہ ہے اور کون فاضی عادل سپہ سالار سے بالاتر ہے۔ الحمد للہ کہ ضمیرِ منیر بادشاہ آئندہ ہے نا صفا بلکہ جام ہے جہاں نما، کہ صورتِ حال پر ملازم و رعایا کی اس میں ہوندا ہے۔“

### رجب علی بیگ سرور

سرور کی تصانیف ’فسانہ‘، ’عجائب‘، ’سرورِ سلطانی‘، ’سرورِ عشق‘، ’سکوفہ‘، ’محبت‘، ’گزارِ سرور‘ وغیرہ ہیں۔ سرور اس دور کی مسجع اور مفتی نثر کے نمائندہ ترین نمائندے ہیں۔ ان کی نثر میں فارسی کی طویل تراکیب، عربی کے مشکل الفاظ، الزامِ قوافی و آہنگ اور لفظی رعائتوں کی کثرت ہے۔ قصے کے دوران وہ قدرے سبک زبان لکھ لیتے ہیں لیکن اس کے باوجود جہاں موقع ملتا ہے نثر کو شاعرانہ و سبلیوں سے گرانبار کر دیتے ہیں۔ بہر صورت سرور نے چونکہ نثر کا جو اسلوب اخبار کیا اس کا تتبع عام طور پر لکھنؤ میں کیا جاتا تھا، اس لیے لکھنوی دبستانِ نثر کا اولین نمائندہ سرور کو قرار دیا گیا ہے۔ ’فسانہ‘، ’عجائب‘ کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ اس میں معمولاتِ زندگی کا



ہان لکھنؤ کی تہذیب کی آئینہ داری کرنا ہے۔ مثلاً انجمن آرا سے سہزادہ جانِ عالم کے نکاح کے بعد کا مسطر ملاحظہ ہو :

”سہزادہ جانِ عالم اسے نا ورمارہ بر سوار برابر انجمن آرا کا سکھال ، بری نمال ، ہرار ناسو کہارباں ، ساری ساری کمسن ، جسم گذرانا ، سباب چھایا ، رر نف و اطلس کے لہگے مصالحوہ ٹکا ، ململ کے دوٹے ، باریک نب گوکھرو کی کرنی ، انگا کلسانی مخملی کربان ، کندھوں بر کچھ سکھال اٹھائے نانی برا جائے ادھر ادھر جڑاؤ کڑے ملائم ہانہوں میں بڑے ، ناؤں میں سونے کے بن چھڑے ، کانوں میں سادی سادی نالیاں ، نفسہٗ حسن میں سوالیاں کسی کا کان جو آلا تھا بو حسن کی دوکان میں ناروادا کا نرح دونالا تھا۔۔۔“ (۱)

### شیخ صالح محمد عثمانی

فسانہٗ عجائب کے دریا و مد کی ایک مہابت فانی قدر کتاب ’جامع الحکایا‘ ہندی ہے۔ اس کا سن ۱۸۲۵ء ہے اور مؤلف کا نام سحیح محمد صالح عثمانی ہے۔ یہ فارسی کے مشہور مصنف عوفی کی ’جامع الحکایا‘ کے دس ابواب کی حند منتخب کہانیوں کا ترجمہ ہے۔ سحیح صالح محمد اسٹانڈا کمپنی کی فوج میں مترجم بھیے۔ یہ کتاب انہوں نے کرنل کسٹڈی کی فرمائش پر لکھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے اندازِ بیان میں نکلت اور نصتے نہیں ہے۔ کتاب رعابِ لفظی اور آرائسِ بیان سے پاک ہے۔ نمونہ یہ ہے :

”ایک روز سلطان محمود نے بسترِ راحت پر چین سے آرام کیا تھا۔ نیک آدھی رات کو آنکھ کھل گئی۔ نیند اچاٹ ہو گئی۔ کروٹیں لسا رہا بہتیرا ہی جاہا بر آنکھ ایک ہل مطلق نہ جھبکی۔ نرگسِ چسم جوں کی یوں کھلی رہی۔ سب خیال گزرا کہ ساد کوئی مظلوم خاک بر غلطان ہے ، کہ اس کے درد کی دائر نے مجھے بے گل کر دیا۔“

یہ کتاب اب پھر مجلسِ برقی ادب لاہور کے زیرِ اہتمام چھپ گئی ہے اور اسے ڈاکٹر محمد باقر نے مرتب کیا ہے۔

آپ شرفائے دہلی سے بھی - جرأت کے شاگرد تھے - نثرِ اردو میں انہیں بھی قدیم انداز پسند تھا دو کتابیں ان سے یادگار ہیں - 'گلشنِ نو بہار' اور 'نورتن' -

**گلشنِ نو بہار :** یہ کتاب ۱۸۰۷ء میں لکھی گئی - اس میں عبارتِ آرائی ملتی ہے ناہم عبارت گنجلک نہیں ہے بلکہ صاف اور واضح ہے -

**نورتن :** نورتن کا سالِ تصنیف ۱۸۱۴ء ہے - یہ کتاب ۲۰×۳۰ سائز کے تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل ہے اور اس کے نو ابواب ہیں - ہر باب میں مختلف لوگوں کے بارے میں چھوٹی چھوٹی کہانیاں درج کی گئی ہیں جنہیں مصنف نے 'علیہا' قرار دیا ہے - خلیل الرحمن داؤدی نے اس کے معلق لکھا ہے :

”یہ کتاب فسانہٴ عجائب سے پہلے لکھی گئی ... اس لیے اپنی قدامت کی وجہ سے لکھنؤ کے افسانوی ادب میں اسے ممتاز حیثیت ملنی چاہیے (۱)۔“

قدامت کے علاوہ اسلوبِ نثر کے اعتبار سے بھی یہ اہم رکھی ہے - مصنف نے کوشش کی ہے کہ اپنے زمانے کے مذاق کے مطابق اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ بنایا جائے - چونکہ اس دور میں دلکشی کا دار و مدار لفظی رعایوں پر سمجھا جاتا تھا اس لیے اس میں بھی ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے عبارت کہیں کہیں رواں دواں اور کہیں دقیق معلوم ہوتی ہے -

سید اعظم علی

آگرہ کے رہنے والے تھے - تحصیلِ علوم کے بعد من بوری میں محصلِ لگان رہے - پھر آگرہ کالج میں فارسی کے مدرس ہو گئے -

**سرور افزا :** ۱۸۲۶ء میں انہوں نے 'فسانہٴ سرور افزا' کے نام سے ایک داستان لکھی - یہ فارسی کے ایک قصے 'ماہ پیکر و جہاں ناب' سے اردو میں ترجمہ ہوئی - اس کی زبان صاف نستہ اور رواں ہے - یہ داستان ابھی تک غیر مطبوعہ ہے -

## بیم چند کھتری

یہ عام طور پر نیم چند کھتری کے نام سے مشہور ہیں، مگر محمود نفوی نے ثابت کیا ہے کہ ان کا صحیح نام 'بیم چند' ہے<sup>(۱)</sup>۔ انہوں نے ایک داستان 'قصہ گل و صوبر' لکھی ہے۔ یہ کتاب ۱۸۳۶ء میں فارسی سے اردو میں مہمل کی گئی۔ طرزِ بیان میں رنگینی اور سادگی کا اسراج ہے لیکن بحیثیت مجموعی سادگی اور بے تکلفی کا غلبہ ہے۔ قصے کا آغاز ان قمرات سے ہوتا ہے:

”حمد اس صانع کو سراوار ہے جس نے اسان کو اسرف المخلوقات  
نانا۔ عالم کو حلقہ ہستی مہنا۔ اس کے اثر احسان سے کباریاں  
عشی و صبح کی سراب ہیں اور اس کے بارانِ رحمت سے کھساں  
حسن و جمال کی ساداب۔“

اس تحریر میں قافیے موحود ہیں اور خیال سسپنس و اسعارہ کے ذریعے پس کیا گیا ہے۔ لیکن ان حصوں کی موحودگی نے بھی عبارت میں نل سدا نہیں ہوئے دیا۔

## لالہ گوہند سنگھ شاہجہان پوری

آپ دلی کے رہنے والے تھے دکنی مدب مدد تک لکھنؤ میں رہے۔ وہاں سے کلکتہ گئے جہاں ۱۸۴۵ء میں 'نغمہ' عبدالب کے نام سے فارسی کے ایک منظوم قصے 'گل و ہریر' کا اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ کتاب ۱۸۵۲ء میں طبع ہوئی اور بین سو بارہ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی عبارت نے تکلف، سادہ اور سلس ہے۔ چھوٹے چھوٹے مربوط حملے ہیں جن میں بڑی سلاست اور روانی ہے۔

## عاصی لکھنؤی

ان کا پورا نام ناوجود حسجو کے نہیں مل سکا۔ انہوں نے فارسی سے 'قصہ' اگر و گل' کا اردو ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ ۱۸۴۶ء میں پہلی بار لکھنؤ سے شائع ہوا درسانی تقطیع کے تقریباً ۱۱۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس قصے میں ایک ندرت یہ ہے کہ اس میں 'میر' داستان کی شخصیت مرد کی ہیں عورت کی ہے۔ اس میں مہاب عام داستانوں جیسی مشکل ہیں۔ ان سے کسی عورت کا کاسباب گزر جانا ہی تعجب حیر معلوم ہوتا ہے۔ عبارت کا نمونہ یہ ہے:

”وہ جوان رعنا ایسا دولہا کہ کبھی میرِ فلک نے بھی دیکھا نہ  
سنا۔ ہر کے مانند برات لیے سب براتی سارے معلوم ہوتے۔ دلہن

(۱) اردو کی نثری داستانوں کا تنقیدی مطالعہ (غیر مطبوعہ، کتب خانہ جامعہ پنجاب) ص ۱۶۹

کا گھر آیا ۔ آتش بازی چھوٹنے لگی ۔ نسرین و نسترن سے ہر کوچہ  
گسٹن ہوا ۔ چراغاں کی روشنی پر ہر ایک دل پروانہ ، تپھنائی کی آواز  
بربان سین دیوانہ نہا ۔ گل بادشاہ نے لے جا کر دولہا کو مسند پر  
بٹھایا ، سرت دلایا ، ہار پہنایا ، بان کھلایا ۔ مبارک سلامت کی  
ادھر ادھر سے دھوم دھام ہوئی ۔“

ۛ نر رواں دواں اور سلیس ہے ، کہیں کہیں فانی ضرور کی گئی ہے مگر  
مجموعی نثر ۛ نہیں بنا کہ عبارت دبی ہے ۔

## پانچواں باب

(الف) شاہ نصیر دہلوی

شاہ نصیر الدین عرف ساں کَلّو خاص، دہلی کے رہنے والے تھے۔ تاریخِ بیدائش معلوم نہیں۔ غالباً اٹھارویں صدی کے آخری ہلک میں پیدا ہوئے۔ سبقت نے اپنا تذکرہ ۱۸۳۴ء (۱۲۵۰ھ) میں مکمل کیا تھا جس میں لکھا ہے کہ شاہ نصیر ساٹھ سال سے ریختہ کہہ رہے ہیں۔ اگر ریختہ گوئی کا آغاز ندرہ سال کی عمر سے فرض کیا جائے تو تاریخِ بدائش ۱۷۶۱ء (۱۱۷۵ھ) بنتی ہے۔

شاہ نصیر کے والد شاہ عرب اللہ<sup>(۱)</sup> دہلی کے ایک دروسِ حضرت میر جہان<sup>(۲)</sup> کے سجادہ نشینوں میں تھے۔ بقول قدرت اللہ فاسم شاہ نصیر کو ان کے والد نے بڑے ناز و نعمت سے بالا اور تعلیم و تربیت کے لیے ادیب اور اساد مقرر کئے۔ والد کے انتقال کے بعد انہیں ریختہ گوئی کا سون ہوا اور میر محمدی مائل دہلوی کی ساگردی اخبار کی جو فائیم کے نلامذہ میں سے تھے۔ قدرت اللہ فاسم اور سرسید<sup>(۳)</sup> دونوں اس باب پر متفق ہیں کہ احوالِ فن و قواعدِ سخن یعنی علمِ شعر سے بہرہ کم تھا لیکن سخن بردازی کے ساتھ طبعی مناسبت رکھتے تھے۔ محمد حسن آزاد<sup>(۴)</sup> بھی اس کی تائید کرتے ہیں کہ وہ کسائی علم میں کہا حصہ، کاسیاب نہ ہوئے، لیکن طبع شعر سے اسی مناسبت واقع ہوئی تھی کہ بڑے بڑے ذی استعداد اور مستای ساعر مساعروں میں سے دیکھتے رہ جاتے تھے۔

آزاد ہی کا بیان ہے (ص ۳۹۴) کہ شاہ عالم بادشاہ کے زمانے میں شاہ نصیر کی شاعری جوہر دکھانے لگی تھی۔ شاہ عالم خود ساعر تھے اس وجہ سے شاہ نصیر کو

(۱) عام طور پر تذکروں میں صرف شاہ عرب نام ملتا ہے لیکن نساح نے اپنے 'سخن شعرا' میں (مطبوعہ لکھنؤ ۱۲۹۱ھ ص ۵۲۲) پورا نام شاہ عرب اللہ دیا ہے۔

(۲) بعض تذکروں میں یہ نام 'صدر جہان' دیا گیا ہے مثلاً مصحفی کے 'ریاض الفصحا' میں (ص ۳۳۷ مطبوعہ دہلی ۱۹۳۴ء)، شیفین کے 'کائناتِ بے حار' میں (ص ۳۱۹ مطبوعہ کراچی ۱۹۶۳ء) اور نساح کے 'سخن شعرا' میں (ص ۵۲۲) لیکن قدرت اللہ فاسم نے 'مجموعہ لغز' میں (جلد دوم ص ۲۷۲ مطبوعہ لاہور ۱۹۳۳ء) اور سرور نے 'عملہ مشغیہ' میں (ص ۵۲ دہلی ۱۹۶۱ء) میر جہان نام لکھا ہے

(۳) سرسید، آثار الصنادید، ص ۳۵۶، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۶ء

(۴) آزاد، آبِ حیات، ص ۳۹۴، مطبوعہ لاہور ۱۹۵۷ء

دربار تک رسائی میں آسانی ہو گئی اور شعرائے دربار کے ساتھ شاہ نصیر بھی طبع آزمائی کرتے رہے<sup>(۱)</sup>۔ دربار شاہی سے ان کے بررگوں کے نام چند گاؤں آل تمغا معاف تھے۔ علاوہ اس خاندانی عظمت کے اہل ہنر کو عبدوں، جسنوں میں اور ہر فصل اور موسم پر جو انعام و اکرام ملنے نہیے شاہ نصیر ان سے بھی مستفید ہوتے تھے۔ لیکن جب دہلی میں انگریزی حکومت ہو گئی (۱۸۰۳ء/۱۲۱۸ھ) تو شاہ نصیر حیدر آباد دکن چلے گئے جہاں اس وقت دیوان چندولال سادات کی عملداری کا ابتدائی زمانہ تھا۔ چندولال کی سخاوت و فباہی اور سعرا و علما کی سرپرستی ضرب المثل تھی۔ اس نے شاہ نصیر کی بڑی قدر کی اور انہیں خوب نوازا۔ تاہم بقول آزاد ”دلی کا چٹخارا بھی ایسا نہیں کہ انسان بھول جائے، اس لیے انعام و اکرام سے مالا مال ہو کر بھر دلی آئے اور بن دفعہ بھر گئے“<sup>(۲)</sup>۔ دکن میں شاہ نصیر ہر جو نوازشیں ہوتی تھیں ان کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ وہ دکن کو بہشت قرار دیتے تھے۔ آزاد نے لکھا ہے کہ جب ان کا چونی دفعہ دکن کا قصد ہوا تو سر راہ ذوق سے ملاقات ہو گئی۔ ذوق نے کہا کہ اب آپ کا سن ایسے دور دراز سفر کے قابل نہیں۔ ”فرمانا میں ابراہم“ وہ بہشت ہے بہشت، میں بہشت میں جانا ہوں، چلو تم بھی چلو“<sup>(۳)</sup>۔

مذکرہ نویس مفتی ہیں کہ دہلی، لکھنؤ اور حیدر آباد دکن، ہر جگہ شاہ نصیر نے ہمعصر ساعروں کے ساتھ مساعروں اور مطارحوں میں ادبی مقابلے کئے اور استادی میں نام پیدا کیا۔ آخر حیدر آباد دکن میں ۱۸۳۸ء (۱۲۵۴ھ) میں وفات پائی۔ ایک ساگرد نے ’چراغِ گل‘ کے الفاظ سے تاریخ نکالی۔

شاہ نصیر کی رعونت و خود سندی، زعمِ ساعرانہ و غرورِ آسدادانہ کا ذکر اکثر مذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ (مثلاً مصحفی، فاسم، یکسا وغیرہ) لیکن اس کمزوری سے قطع نظر جو اکثر ساعروں میں کم و بیش نائی جاتی ہے، شاہ نصیر کی نیک نہادی، نفاست و لطافتِ طبع، خوش ہوسی، بزرگانہ اخلاق، ستودہ کردار، ظرافت و زندہ دلی، یار باسی اور وضعداری کی بھی شہادتیں ملتی ہیں۔

شاہ نصیر کی طبعِ موزوں کو آزاد نے ایک درخت سے تشبیہ دی ہے کہ جب اس کی ٹہنی ہلاؤ فوراً بھل جھڑ پڑیں گے<sup>(۴)</sup>۔ ان کی بدیہ گوئی اور حاضر طبعی کا شہرہ

(۱) عبدالحی - گل رعنا - ص ۲۷۳، مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۳۴۳ھ

(۲) آزاد، آب حیات - ص ۳۹۵ لیکن سرسید کا بیان ہے ص ۳۵۷ (کہ شاہ نصیر جملہ تین بار حیدر آباد دکن گئے)۔

(۳) آزاد، آب حیات - ص ۳۹۸

(۴) آزاد، آب حیات - ص ۴۰۰

دور دور تک پھلا ہوا تھا۔ سرسدا کا سان ہے کہ ”اشعارِ آنداز اس پیش روِ سخنورانِ رورگار کے دو لاکھ سے زیادہ ہیں اور یہ بے سالغہ و اغراف ہے۔ صہبا آدمی جو کہ نہ جانتے تھے اور بتقریب مشاعرہ صرف انہی سے غزل کہوا لےے تھے، ہر ایک دیوان اپنے اپنے نام کا مرتب رکھتا ہے“ (۱)۔ حافظ محمد اکبر مرٹھی نے جو انتخاب ’کلیاتِ نصر‘ ۱۸۷۷ء (۱۲۹۴ھ) میں سائے کا تھا اس کے دساجے سے محمد یحییٰ سہا نے ’مرآۃ الشعر‘ حصہ اول (۲) میں ایک اہباس دیا ہے۔ اس سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ”از روئے ضخامت بصنیفاب سہا صاحب کی میر ہی کے کلمات سے کسی طرح کم ہیں“۔ یہ بات یوں بھی تعجب خیز نہیں ہے کون کہ شاہ نصر نے طویل عمر بائی بھی اور تقریباً ۶۵ سال تک شعر کہے رہے تھے۔ ”آغازِ ساعری کا کسارہ جرأت اور سدا سہا سے ملا ہوا تھا اور انجام کی سرحد ناسخ، آس، اور ذوق میں واقع ہوئی تھی“ (۳)۔ سہا نصر کا کلمات انہی تک رنور طبع سے آراسہ نہیں ہوا ہے، البتہ غزلوں کا ایک دیوان چھپ گیا ہے جس میں فصائد، طعات، رباعیات اور دوسری اصناف نہیں ہیں۔

سہا نصر کا تعلق شعرا کے اس طبع سے ہے جس کے نزدیک شعر و ساعری وجدانی و الہامی، ذوق و حدائی اہماق سے زیادہ ایک لسانی آرٹ کی حثیت رکھی ہے۔ اگرچہ شاہ نصر کے کلام میں کہیں کہیں داخلی جذبات و نابراب کا سان مل جاتا ہے لیکن بس اتنا ہی ہے جسے آئے میں نمک۔ حد مثالیں یہ ہیں :

یارو نہیں انا مجھے قابل ے سانا      جسا کہ مرے دسمن جاں دل نے سہا  
نہا ایک نو صباد گرفتارِ ففس میں      اور دوسرے آوازِ عادل نے سہا

☆ ☆ ☆

ہرگنہ بح ہم وہ اس دور میں ہی ساقی      لب تک کہو ہارے جام و سو نہ آنا

☆ ☆ ☆

ملوں نہ کون کہ افسوس میں کہ بس نظر      بھرے ہے محفلِ نارانِ رفگاں کا رنگ

جس زمانے میں شاہ نصر ے ہوس سنہالا اس زمانے کی ادبی قضا میں ساخرن شعرائے فارسی کا نام بہت اونچا تھا جو انی مضمون آفرنی، خیال بندی، عمل نگاری اور لفظی صنعت کاریوں کی خصوصیات کی وجہ سے سدا کے حائے۔ چنانچہ اردو کے جو شعرا

(۱) سر سید احمد خان، آثار الصنادید۔ ص ۶۷۰، مطبوعہ دہلی ۱۹۶۵ء

(۲) محمد یحییٰ تنہا، مرآۃ الشعر (حصہ اول) ص ۳۳۱، لاہور ۱۹۴۵ء

(۳) آزاد، آب حیات۔ ص ۳۳۴

ان خصوصیات کو اپناتے تھے وہ استاد گئے جاتے تھے۔ اسی لیے اگرچہ میں تقی میر کی عظمت عام طور پر تسلیم کی جاتی تھی لیکن ملک الشعراء سودا درار پا چکے تھے، کبھی کہ سودا کے کلام میں مذکورہ خصوصیات دوسروں کے مقابلے میں زیادہ نمایاں تھیں۔ قافہ بندی، مشکل پسندی، غزل در غزل اور خارجیت کی روایت بھی اردو شاعری میں سودا کے طفیل قائم ہو چکی تھی۔ شاہ نصیر نے اپنا رسدہ اسی روایت سے جوڑا۔ دہلی میں اس وقت اگرچہ لکھنؤ جیسی خوش عیشی و خوش معاشی نہیں تھی، تاہم شعر گوئی و شعر سازی کا رواج عام تھا، شاعروں اور مطارحوں کی گرم بازاری تھی، حرفانہ مقابلے اور مجادلے ہوا کرتے تھے۔ معاصرانہ معرکہ آرائیوں کی کمی نہ تھی جہاں ایک ایک شعر، ایک ایک حرف پر گرفت ہوتی تھی اور سند مانگی جاتی تھی۔ ایسے حالات میں شعرا کا داخلہ کے مقابلے میں خارجیت، سادگی کے مقابلے میں صنعت، آمد کے مقابلے میں آورد، ایجاز کے مقابلے میں طوالت کی طرف زیادہ مروجہ ہو جانا فطری امر تھا کہ استاد و مہارت فن کا لوہا اسی طرح منوایا جا سکا تھا۔ حناجمہ شاہ نصیر نے بھی سنگلاخ زمینوں، مشکل ردیف وائوں میں مضمون آفرینی، سبار گوئی، مسلسل نگاری اور قافہ بندی کر کے زبان و بیان پر اپنی فطرت کا مظاہرہ کیا۔ اسادانہ روس، نکمالی شاعری، فادہ الکلامی، رعایت لفظی اور مشکل زمینوں کے انتخاب کے لحاظ سے ان کا مداوی سخن بھی وہی تھا جو ادھر لکھنؤ میں انسا، مصحفی، جرأت وغیرہ نے عام کر دیا تھا۔ شاہ نصیر کے ہاں تخیل کا عنصر جو مضمون آفرینی، تمثیل نگاری اور خیال بندی میں ظاہر ہوتا ہے لیکن فکر کا عنصر مفقود نظر آتا ہے۔ لے دے کر ایک مضمون بنانا امدادی حیا کا ہے جو بالترتیب ملتا ہے اور اس کے لیے بھی بالعموم حباب کی ششہ ترقی گئی ہے۔ مثلاً:

فرست ایک دم کی ہے، جوں حباب نانی میں خاک سر ہو کیجیے سیرِ زندگانی یاں

☆ ☆ ☆

ایک دم کی زندگی پر سرکشی مت کر حباب مل گئے ہیں خاک میں یاں کا سہ سر ٹوٹ کر

☆ ☆ ☆

آہ کچھ ہم کو نہ تھی فرصتِ یک دم کی خبر اے حباب لب جو تو نے یہ عقدہ کھولا

☆ ☆ ☆

کیا خاک ہوا باندھے وہ اس بحرِ جہاں میں مانند حباب ایک نفس میں جو ہوا ہو

مصحفی کے 'تذکرۂ ہندی' اور قاسم کے 'مجموعہ نغز' میں جو علی الترتیب ۱۷۹۴ء (۱۲۰۹ھ) اور ۱۸۰۶ء (۱۲۲۱ھ) میں مکمل ہوئے، نسخ کا کوئی ذکر نہیں ہے کبوں کہ نسخ



اس وقت تک منظرِ عام پر نہیں آئے تھے۔ ان دونوں تذکروں میں شاہ نصیر کا جو انتخاب دیا گیا ہے<sup>(۱)</sup>، اس میں حسبِ ذیل سرِ ساسل ہیں اور ظاہر ہے کہ ان زمینوں کی غزلیں شاہ نصیر نے ناسخ کا غلغلہ بلند ہونے سے پہلے لکھی تھیں :

چرائی چادرِ مہتاب سب مسکن نے جھوٹے بر کٹورا صبح دوڑانے لگا خورشید گردوں پر

☆ ☆ ☆

تیرے آنے کی خبر جو گلِ ساداب اڑی بیضہ غنچہ سے اک بلبلِ بے باب اڑی

☆ ☆ ☆

شبِ دیزِ ناز پر جو چڑھا وہ کٹار بند نازِ نظر سے ہم نے لگائے سکار بند

☆ ☆ ☆

میں نے بٹھلا کے جو پاس اس کو کھلایا سڑا قتل پر میرے رفیوں نے اٹھایا بیڑا

☆ ☆ ☆

پہلو میں رکھ اس دہر کے بیکان کا لوہا اے دل وہ نگہباں ہے نری جان کا لوہا

☆ ☆ ☆

جنگجو رکھا نہ کر نو نیر سیدھے ہاتھ میں دستِ چپ میں رکھ سر، شمشیر سیدھے ہاتھ میں

☆ ☆ ☆

فبا دیکھی ہے بھلکاری کی سب کس ماہِ نارے کی فلک جو کاڑھنی سیکھا ہے بوٹی چاند نارے کی

یہ غزلوں کے اسعار اس باب کا ثبوت ہیں کہ دہلی میں بھی مذاویہ سخن کا رخ میر ، درد و فائیم کی روایت سے ہٹ کر سودا کی روایت کی سمت میں تھا<sup>(۲)</sup>۔ ناسخ کی سہرت و مقبولیت نے اس رجحان میں مرید بخکی سدا کر دی اور وہ رنگِ سخن عام ہو گیا جس کو ناسخت یا لکھنؤیت کا نام دیا گیا ہے۔ البتہ لکھنؤ کے عام معیسی برسانہ ماحول نے وہاں کی شاعری میں جو تبدل و عریانی اور ہجویہ و استہزائیہ عناصر بڑھا دیے تھے اور عورتوں کے سراپا ، زبور ، ملوسات ، چال ڈھال ، اداؤں اور گھانوں سے متعلق مضامین عام کر دیے تھے ، وہ عناصر اور وہ مضامین دہلوی شعرا کے ہاں لکھنؤ کے مقابلے میں کم رہے۔ ہاں مضمون آفرینی و خیال بندی ، تمثیل نگاری ، سنگلاخ زمینوں میں

(۱) مصحفی ، تذکرۂ ہندی - ص ۲۶۱ مطبوعہ دہلی ۱۹۳۳ء - قدرت اللہ قاسم : مجموعہٴ نفز ، جلد

دوم ، مطبوعہ لاہور ۱۹۳۳ء

(۲) شاہ نصیر ہی کا شعر ہے - نصیر اور ہے انہی گل مضمون کی بہار  
کب ہیں اس رنگ کے باغ سخن میر کے پھول

طبع آزمائی اور رعایتِ لفظی و لسانی صنعتِ کاری کی طرف دہلوی شعرا کی توجہ لکھنؤ سے کمتر نہیں رہی۔ شاہ نصیر کے ہاں موضوعات میں نئوع نہیں ہے۔ بیشتر مضامین خارجی حسن کے ہاں سے متعلق ہیں یا بھر کچھ اخلاقی مضامین نمثیلی انداز میں ملتے ہیں۔ مثلاً شاہ نصیر کی چند سنگلاخ زمینیں دیکھئے :

فقط مرگاں نہیں ہے دندہ پر آب کی لکڑی کہ ہے نہ آہ بھی ہمدم دل بے باب کی لکڑی

☆ ☆ ☆

فامتِ موزوں نہ دیکھ اس گل بدن کے رونگٹے ہو گئے یکسر کھڑے سروِ چمن کے رونگٹے

☆ ☆ ☆

رکھوں نہ سرکویوں کہ میں زیرِ قدم برائے ظالم نے رفہ رفہ نکالے ستم تراش

ایک ہی زمین میں کئی غزلیں لکھنا اور اس کا خیال رکھنا کہ کوئی فافہ جھوٹے نہ ہائے ، یہ بھی اس زمانے میں اسادی کی دلیل تھا ، چنانچہ شاہ نصیر نے اس میدان میں بھی شہسوار کی ۔ حد یہ ہو گئی کہ بقول مؤلف ”گلستانِ سخن“ (۱) شاہ نصیر نے نفس کی نیلیاں ، بس کی تیلہاں والی زمین میں قریب قریب یحیاس غزلیں کہہ کر ایک مشاعرے میں اپنے شاگردوں سے بڑھوائیں ۔ ظاہر ہے کہ فافہ بندی کی ان کوششوں سے عجیب و غریب مضامین جو قافیے کے سجھائے ہوئے ہوتے تھے ، نیز ایسے غیر سیریں الفاظ استعمال ہونے لگے جو غزل کی روح کے منافی تھے ۔

لفظی رعائتوں اور لسانی صنعتِ کاریوں کے لحاظ سے شاہ نصیر کے حسبِ دلیل شعر (مشہر نمونہ از خروارے) بلا تکلف دبستانِ لکھنؤ کے شعرا کے کلام میں ملائے جا سکتے ہیں :-

خطِ بیرا ہر روز پڑھواتے ہیں ہم  
دل اسی برج سے پرچاتے ہیں ہم

☆ ☆ ☆

چمکا ترے بلاق کا موتی یہ رات کو  
دم ناک میں ہے اخترِ دنبالہ دار کا

☆ ☆ ☆

ہے مجھے یاموب لب گراہے دکھلانے کا سوف  
رسک سے مرجاں رکھے ہے دل میں مر جانے کا سوف

تمثیل نگاری کے لیے ساہ نصیر کے یہ چند شعر ملاحظہ ہوں :

خال اس کے لبِ سرس سے جدا ہو کیوں کر  
ہے محال انگبین آلودہ مگس کی پرواز

☆ ☆ ☆

بلاسِ رُو بھی آنکھی ہے سب کو گردس میں  
نہ بھرنے سے نہ کبھو سگِ آسا ٹھہرا

☆ ☆ ☆

کیا کوئی سر بلند ترے دعویٰ عروج  
سایہ ہے بائمال سدا کوہسار کا

☆ ☆ ☆

ہے نگوں ساری بھی سا اے مردمِ دنائے دوں  
سکلِ فوارہ نہ اپنے اوج پر ہو سر اٹھا

مضمون آفرینی و خیال بندی اور نئی نئی دسیہوں اور استعاروں کی بھی ساہ نصیر کے  
یہاں کمی نہیں ، مثلاً :

لگا کا عکسِ ابرو دیکھنے دلدار نانی میں  
مہم پر موح سے چلتے لگی تلوار نانی میں

☆ ☆ ☆

یہ یادِ خالِ سان اسک کا نکلتے ہیں  
مسافر آج نہ ناروں کی چھاؤں چلتے ہیں

☆ ☆ ☆

ربنِ دل خسگان ہر سمع کب درکار ہے  
نک فلم سروِ چراغاں آہِ آس بار ہے

☆ ☆ ☆

جو مددِ آہِ دلِ عاشقان ہو پیدا  
عصائے پیری نہ آسمان ہو پیدا

☆ ☆ ☆

رکھ آئینہ نہ میرے رخِ زرد کے حضور  
ہیں حائے گا یہ برگِ خزاں دلمہ دیکھنا

ابتدال اور گھٹیا بن بھی ساہ نصیر کے کلام میں جا بجا مل جاتا ہے ، کہیں تو زبان  
بھی عامیانہ یا نسوانی برہ جاتے ہیں ، مثلاً :

کیا بوسہ رخِ لون میں کہ بالی کی برے گونج  
ہے نیس زنی میں مجھے کردم سے زیادہ

☆ ☆ ☆

ہلے ہے زلفِ رخِ ہر ، داغ چبھک کے چمکتے ہیں  
کبھو بدلی گھر آتی ہے کبھو دارے چمکتے ہیں

☆ ☆ ☆

دل کا کبا مول بھلا زلفِ چلپا ٹھہرے  
دہری کچھ گانٹھ گرہ میں ہو سو سودا ٹھہرے

☆ ☆ ☆

مامبِ موزوں کا نبرے سروِ گلشن ہے غلام  
تجھ سے ہم جشمی کرے نوگم سو کیا مُردار ہے

☆ ☆ ☆

جو وقت بوسے کے وہ آگیا دہاں منہ میں  
تو لوز بستہ بنی ہے مری زباں منہ میں

لیکن شاہ نصیر کے کلام کو دبستانِ لکھنؤ کی شاعری سے ممتاز کرنے والی خصوصیت  
یہ ہے کہ ان کی بہت سی غزلوں میں لفظوں کی موسیقی اور ردیفوں کی جھنکار سنائی دیتی  
ہے جو لکھنؤ میں اتنی عام نہیں ۔ انہوں نے مشکل پسندی ہی کے شوق میں سہی ،

لمبی لمبی ردیفیں اختیار کی ہیں جن میں بعض اوقات بڑی نغمگی ملتی ہے ، مثلاً :

پھریں گے گردش کے دن جو دلبر ، ادھر ہمارے ادھر تمہارے  
لگا ہی منہ سے رہے گا ساغر ، ادھر ہمارے ادھر تمہارے

☆ ☆ ☆

چھوڑا نہ تجھے نے رام کیا ، یہ بھی نہ ہوا وہ بھی نہ ہوا  
ہم سے تو سب کافر بخدا ، نہ بھی نہ ہوا وہ بھی نہ ہوا

☆ ☆ ☆

سدا ہے اس آہ و چشمِ نر سے ، فلک بہ بجلی زمیں پہ باراں  
نکل کے دیکھو ٹک اپنے گھر سے فلک بہ بجلی زمیں پہ باراں

☆ ☆ ☆

سب کو کیوں کر نبھ کر ہے بھبا ، سر پر طرہ ہار گلے میں  
جوں پروین و ہالہ ما بھا ، سر پر طرہ ہار گلے میں

☆ ☆ ☆

بادہ کشی کے سکھلاتے ہیں ، کیا ہی فرینے ساون بھادوں  
کفایت کے ہم نے جو دیکھا ، دو ہیں مہنے ساون بھادوں

☆ ☆ ☆

کیا خوس ہو کوئی صاحبِ دلگیر سے دلگیر  
ہنستی میں دیکھی کبھی تصویر سے تصویر

ساہ نصیر کے کلام سے نہ نادر نہیں پیدا ہونا کہ انہوں نے زندگی کے بارے میں  
کوئی نقطہ نظر فکری طور پر متعین کیا ہو ۔ جساکہ اوپر کہا گیا ہے سوائے ناپائیداری  
حیات کے اور کوئی قابل ذکر باب زندگی کے بارے میں انہوں نے نہیں کہی ہے ۔ مزید برآں  
مجاز سے حقیقت تک پہنچنے کا کوئی سراع کلام سے نہیں ملتا ۔ اکا دکا شعر ہے جو رسمی  
تصوف کے دائرے میں آ سکتا ہے اور س ، مثلاً :

دل کو اے شاہدِ معنی جو مصفا کرنا نو اس آئنے میں صورتِ بری دیکھا کرتا

شاہ نصیر کی شاعری میں لسانی اور تکنیکی فنکاری ضرور ہے مگر تعبیرِ حیات یا تنقیدِ  
حیات کی طرف ان کی توجہ مبذول ہی نہیں ہوئی ۔

محمد حسین آزاد نے شاہ نصیر کے کلام کی خصوصیات کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ”کلام کو اچھی طرح دیکھا گیا۔ زبان، شکوہ الفاظ، چستی ترکیب میں سودا کی زبان نہی اور گرمی و لذت اس میں خدا داد تھی۔ انہیں اپنی اپنی تشبیہوں اور استعاروں کا دعویٰ تھا اور یہ دعویٰ بجا تھا۔ نئی نئی زمینیں نہایت برجستہ اور پسندیدہ نکالتے تھے مگر ایسی سنگلاخ ہوتی تھیں جن میں بڑے بڑے سہسوار قدم نہ مار سکتے تھے“ (۱)۔ مولوی عبدالسلام ندوی نے شاہ نصیر کو دہلی کا شیخ ناسخ قرار دیا ہے (۲)۔ لیکن یہ درست نہیں، کیونکہ زمانی لحاظ سے شاہ نصیر کا دور ناسخ سے کچھ پہلے کا ہے۔

(۱) آزاد، آب حیات - ص ۹۹ - ۳۹۸

(۲) عبدالسلام ندوی، شعرالہند، جلد اول - ص ۲۳۱، مطبوعہ اعظم کڑہ ۱۹۴۹ء

## (ب) شیخ محمد ابراہیم ذوق

## سوانح حیات

شیخ محمد ابراہیم نام ، ذوق تخلص ، ۱۸ دسمبر ۱۷۹۵ء مطابق ۱۱ ذی الحج ۱۲۵۳ھ میں ماں محمد رمضان انک غریب سپاہی کے ہاں دہلی میں پیدا ہوئے ، جو نواب لطف علی خان کے قابلِ اعتماد ملازمین میں سہار کئے جاتے تھے ۔ ان کا مختصر سا گھر کابلی دروازے کے اندر گنجان اور نارونی علاقے میں تھا ۔ ذوق نے تمام عمر اسی چھوٹے سے مکان میں بسر کی اور (۲) ۱۵ نومبر ۱۸۵۳ء مطابق ۲۳ صفر (۵۵ کے دن) ۱۲۷۱ھ کو دہلی میں وفات پائی ۔ شیخ صاحب کے والدین ہندوستان کے باشندے تھے اسی لیے اسلام قبول کرنے کے بعد نو مسلم نا شیخ کہلائے ۔ گو ان کی تاریخِ وفات کا انک قطعہ مرزا نورالدین شاہی نے کہا ہے جس میں انہیں فرسی بیان کیا گیا ہے :

”بود ذاتس فریس و نام خلل“

ڈاکٹر ننویر احمد علوی اس مصرعے کے باوجود اپنی تحقیق کی بنا پر ذوق کو اصلاً ہندوستانی اور نسلاً کھتری کہتے ہیں ۔ حاتمہ اسے نسلم کر لیا جاوے کہ ذوق ایک نو مسلم گھرانے سے تعلق رکھتے اور شیخ کہلاتے تھے ۔

## تعلیم و تربیت

ماں محمد رمضان نے اسے شے محمد ابراہیم کو سہزادوں اور آراء کے اساد ، مسجد عزیز آبادی میں اناسٹ کرنے اور درس دینے والے حافظ غلام رسول سوف کا شاگرد بنایا ۔ حافظ صاحب اسے ساگردوں سے بڑے سار و محنت کا برناؤ کرنے کے ساتھ ساتھ شاعری میں اصلاح بھی دے اور انہیں اسے ساتھ مشاعروں میں لے جاتے تھے ۔ سہزادوں کے استاد اور انے ساگردوں میں مقبول ہونے کی بنا پر سارا سہر حافظ صاحب کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھتا تھا ۔

محمد ابراہیم نے سووی کی مناسبت سے اپنا تخلص ذوق رکھا اور اس دور میں ایسے اشعار

(۱) انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ، جلد دوم ، ۱۹۶۱ء (Fasciculus 26) محمد حسین آزاد (مرتب)

دیوان ذوق ، ص ۲۵ مطبوعہ نوائے ادب کلکتہ ۱۸۳۷ء

(۲) انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ، جلد دوم ، ۱۹۶۱ء (Fasciculus 26) دہلی آردو اخبار نے تاریخ وفات

۱۷ دسمبر ۱۸۵۳ء ، ۲۵ ماہ ربیع الاول ۱۸۵۳ء لکھی ہے ۔

کہے جو معمولاتِ زندگی پر مبنی تھے۔ مثلاً :

ہے آئینہ خانہ بھی گزرگاہِ بد و نیک  
دیکھا نہ کبھی ہم نے دلِ اہلِ صفا بند

حافظ غلام رسول سوو سے عربی و فارسی پڑھنے کے بعد ذوق نے مشقِ سخن جاری رکھی۔ نیز اپنے دور کی ساعری کو دیکھتے ہوئے ذوق اس نیچے در مہجے کہ شعر و شاعری میں ترقی کرنے کے لیے علم و لہجہ کا ہونا ضروری ہے۔ اس لیے ذوق نے عبدالرزاق عالم و فاضل، صاحبِ تدریس بزرگ سے جو ہم محلہ بھی تھے، پڑھنا شروع کیا، جہاں مولوی محمد نادر (والد محمد حسن آزاد) سے درس کی اسدا ہوئی جس کی اسدا دہلی اخبار میں کلامِ ذوق کی اساعت اور محمد حسن آزاد کا عصب و محب سے دیوانِ ذوق کا مرئس کرنا ہے۔

اسی زمانے میں مہر کاظم حسن بے قرار جو ذوق کے ہم مکتب تھے، ساہ نصیر سے اصلاح لینے لگے۔ انہیں کی وساطت سے ذوق بھی ابر ساہ نابی کے اساد ساہ نصیر کے ساگرد بنے اور ساہ ساہ ابنی علمی استطاعت میں اسافہ کرتے رہے۔ چنانچہ اس دور کے مقبول علوم مثلاً علمِ نجوم، ہشت، طب، منطق، فلسفہ، فہم، صوف، نفسیر، حدیب، تاریخ، بلکہ موسیقی اور آلابِ موسیقی کا استعمال سبھی کچھ سکھا۔ اسی لیے ذوق کے فصائد میں ان کی علمت کا اظہار نمایاں ہے۔

شاہ نصیر کا رنگِ سخن ذوق کے مزاج کے مطابق تھا، چنانچہ ساہ نصیر کے ہمراہ مشاعروں میں شرکت اور کلام پر داد بانے اور ساہ نصیر کے اصلاح دینے سے ذوق کی طبیعت میں تبری پیدا ہو گئی۔ اسی اثنا میں شاہ نصیر کے بٹھے ساہ وجہہ الدین منیر سے جو ذوق کے ہم عصر تھے، ان بن ہو گئی۔ مشکل زمینوں پر طبع آزمائی کے لیے مقابلے شروع ہوئے اور ایک جگہ بیٹھ کر غزلیں لکھنے کی شرط بندھی۔ مولانا محمد حسین آزاد نے ایسی دو غزلوں کا حوالہ دیا ہے جس سے اس دور میں ذوق کی ساعری کا اندازہ ہونا ہے۔ ان میں سے ایک شعر ملاحظہ ہو :

یاں کے آنے کا مقرر قاصدا وہ دن کرے  
جو نومانگے گا وہی دوں گا خدا وہ دن کرے

اسی دور میں سودا کی غزل پر بھی ایک غزل کہی جس کا مطلع ہے :

کیا جانے کس کی خاک ہے رکھ ہوشِ نقشِ پا  
یوں دھر قدم کہ نا نہ دے دوشِ نقشِ پا



اور ذوق نے کہا :

رکھا ہر قدم ہے وہ نہ ہوسِ نفسِ با  
ہو خاک عاساں نہ ہم آغوشِ نفسِ با

شاہ نصیر نے دوں کی غزل دیکھی تو بھول آزاد<sup>(۱)</sup> خفا ہو کر عزل بھنک دی اور کہا ”کہ اساد کی عزل پر عزل کہا ہے اب تو مرزا رفیع سے بھی اونچا اڑنے لگا“۔ غرض دوں نے ۱۸۰۳ء میں شاہ نصیر کی ساعری احسار کی اور ۱۸۱۳ء میں نہ بعلو ختم ہو گیا۔ منبر سے مقابلہ اور شاہ نصیر سے ناراضگی کے بعد ذوق کی حالت کا نفسہ ’مرآۃ الشعراء‘ میں محمد یحییٰ تنہا اس طرح کھینچے ہیں کہ<sup>(۲)</sup> ”شاہ نصیر کے دیگر شاگرد اور ان کے ہم نوا دوں کے اسعار پر اعتراض بھی کرتے لیکن وہ ان کو معمول جواب دیتے اور انہی سہرہ کی نماد رکھے جاتے تھے“۔

شاہ نصیر سے بعلناں کشیدہ ہو جانے کے باوجود دوں نے سنی سخن جاری رکھی۔ کہیں میر کلو حمبر نے ہم افرائی کی نو دہیں شاہ عبدالعزیز کے حلقہٴ درس میں شامل ہو کر زبان و بیان کی اصلاح ، روزمرہ و محاورہ ، نسیم و اسعار اور علمِ بیان کو صحیح معنوں میں برسا سیکھا۔ اسی زمانے میں شاہ نصیر کی عزل پر عزل کہی جو انہی نرم و نازک انداز کی وجہ سے بہت پسند کی گئی۔ مطلع ہے :

لکھے اسے خط میں کہ ستم اٹھ نہیں سکتا

پر ضعف سے ہاتھوں میں فلم اٹھ نہیں سکتا

اسی زمانے میں میر کاظم حسین نے فرار کی وساطت سے قلعہٴ معلیٰ تک رسائی ہو چکی تھی ، کیوں کہ مہنہ سہ ماہی جہانگیر کی بنیادی کے موقع پر ان کا ایک قصیدہ نس کیسا گیا تھا۔ چنانچہ دربار اور قلعہٴ معلیٰ کی رنگین محفلوں ، نغمہ و شعر کی دلکش فضاؤں میں ذوق کو لطیف اندوز ہونے کا موقع ملا۔ دربارِ دہلی میں کہنہ مشوق ساعر مثلاً حکیم براء اللہ خان فراہی ، میر غالب علی خان سید ، عبدالرحمان خان احسان ، برہان الدین خان راز ، حکیم قدرت اللہ خان فاسم اور ان کے صاحب زادے حکیم عزت اللہ خان عشق ، میان سکیم ساگرد میر بی میر ، مرزا عظیم نیک ساگرد سودا ، میر فخر الدین منب اور ان کے صاحب زادے میر نظام الدین مہموں وغیرہ جمع ہوتے۔ اپنا اپنا کلام سناتے ، مطلع اور مصرع طرح پر مشق کرتے۔ فی البدیہہ اسعار کہے جاتے۔ ذوق نے ان محفلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس طرح کی مشقِ سخن نے سوچ و فکر کے ساتھ ساتھ الفاظ و زبان کے استعمال کے لیے نئی راہیں کھول دیں۔

(۱) آزاد ، محمد حسین ، آبِ حیات - ص ۴۳۹

(۲) محمد یحییٰ تنہا ، مرآۃ الشعراء - ص ۴۵۸

انہی دنوں مہاراجہ چندو لال مدار اطہام حیدر آباد دکن نے شاہ نصیر کو دکن آنے کی دعوت دی تو ولی عہد بہادر شاہ ظفر بغیر اساد کے رہ گئے ، کچھ عرصہ میں کاظم حسین نے فرار سے مشورہ سخن رہا لیکن انہیں بھی انگریزوں نے شکار پور سندھ کی سفارت میں مہر منشی بنا کر بھیج دیا ۔ اسی اثناء میں ایک دن ذوق قلعہ معلی پہنچے (۱) ۔ انہیں دیکھتے ہی سکایت کرنے لگے کہ ”استاد تو دکن گئے تم نے بڑی ہمت چھوڑ دیا ۔ غرض اسی وقت ایک غزل حب سے نکال کر اساد ذوق کے حوالے کی کہ ذرا ایسے ہو بنا دو“ ۔ یہ وہی بیٹھ گئے غزل بنا کر سنائی ۔ ولی عہد بہادر بہت خوش ہوئے اور کہا بھئی کبھی کبھی تم آکر ہماری غزل بنا جایا کرو ۔ ولی عہد نے چار روپے ماہانہ پر انہیں اننا استاد مقرر کر لیا جو رفتہ رفتہ اضافہ ہو کر ۱۰۰ روپے تک پہنچ گئے ۔ گو اس ملازمت کی مخالف ذوق کے والد نے بہت کی کہوں کہ قلعہ معلی میں ولی عہد کے خلاف سازشیں ، اکبر شاہ تانی کا کبھی مرزا سلم اور کبھی مرزا جہانگیر کو ولی عہد مقرر کرنا ، باغ ہرار کی جگہ ناخ سو کا وظیفہ مقرر کر دینا ، یہ تمام باتیں میاں رمضان کے سامنے نہیں جس کی بنا پر وہ اس ملازمت کے مخالف ہوئے ، لیکن ذوق کے لیے قلعہ معلی کا ساعرانہ ماحول اور ادبی فضا حاذب نظر تھی ۔ چنانچہ والدین نے ان کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈال دے اور یہ ولی عہد بہادر کے اساد ہو گئے ۔ دربار سے انہیں رفتہ رفتہ خافائی ہند ، ملک السعراء ، عمدۃ الاساذین اور بڑھائے میں خان بہادر کا خطاب ملا ۔

ذوق کی مہولت کی بنا پر دکن سے بلاوا آنا لیکن شاہ نصیر کا انجام سامنے تھا ۔ دوسرے دن سے شاہ نصیر کے مقابلے میں ہت دم زاد راہ آیا جسے ذوق نے اپنے فن کی بوہیں جانا ۔ دوسرے ذوق اپنے مزاج کے لحاظ سے حالات سے سمجھوتہ کرنے والے ، قناعت پسند شخص تھے ، چنانچہ جواب میں کہلا دیا کہ :

ان دنوں گرچہ دکن میں ہے بڑی قدر سخن  
کون جائے ذوق ، بر دلی کی گلاں چھوڑ کر

ذوق نے ۱۷۹۰ء سے ۱۸۵۳ء تک نین نادرشاہوں کا زمانہ دیکھا ، جن کی سلطنت کی حدود قلعہ معلی تک محدود تھیں ۔ یہ نادرشاہ دہلی کو سکھ ، سرہٹے ، جاٹ اور مختلف صوبیداروں کے ہاتھوں برباد ہوتے دیکھتے تھے مگر کچھ کرنے کی سکت نہ رکھتے تھے ۔ ان ناپاہیوں نے عوام کے دلوں کو بزمردہ کر دیا ۔ آخر ۱۸۰۳ء میں انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت نے دہلی پر قبضہ کر لیا ۔ بادشاہ وظیفہ خوار ہوئے ۔ انگریز حاکم بنے تو دہلی میں وقتی طور پر امن و امان کی فضا قائم ہوئی ۔ اس ماحول میں شاہ نصیر ، بہادر شاہ ظفر

اور دہلی کے سعرا نے مساعروں میں حصہ لینا شروع کیا اور دہلی کی برم آخر میں غالب ، سومن ، سہمنہ ، حالی اور داغ نے جذبات و احساسات کی ساعری کی - ۱۸۵۴ء میں ذوق کی وفات کے تین سال بعد ۱۸۵۷ء میں ساری فضا بدل گئی - بہادر شاہ ظفر کی جلاوطنی اور ذوق سے ان کی واسطی کی سرا ان کے اکلوتے بیٹے محمد اسماعیل قزو کو بھانسی کی صورت میں ملی -

### ذوق کا مذہب

نسج محمد ابراہیم کے معلم کریم الدین احمد نے تذکرہ 'طعاب الشعراء' میں انہیں سجعہ عقیقہ رکھنے والا کہا ہے - اس سلسلے میں 'کتابِ دو' کی پہلی غزل کو دیکھنا چاہیے جو اس سان کی نفی کر دیتی ہے - اس میں حمد و منعت کے مضامین کے علاوہ اصحابِ رسواۃِ مقول کی تعریف کرتے ہوئے کہے ہیں کہ :

دکھائی مجھ کو راہِ سرع اصحابِ سب نے  
جراغِ راہ ہے اکرام اصحابِ کرم میرا

اور مقطع میں کہا ہے کہ :

سہر بعداد کا خطِ علامی دو رکھا ہوں  
نہ کموں دل اس خطِ بعداد سے ہو جامِ جم میرا

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذوق وسعِ انسرب ، خوسِ عمدہ ، فراخ دل ، فراخ نظر اور بزرگانِ دین کی تعریف و توصیف کرنے والے انسان تھے -

### ذوق کی شخصیت

ذوق کی شخصیت کی بحث سے پہلے مناسب ہے کہ ان کا سرانا بیان کیا جائے (۱) - رنگ سانولا اور چیچک کے داغ بہت تھے - کہتے تھے کہ نو دفعہ چیچک نکلی بھی مگر رنگ اور داغ کچھ ایسے مناسب اور موزوں واقع ہوئے تھے کہ چمکے تھے اور بھلے معلوم ہوئے تھے ، حلتے بہت تھے - اکثر سفید کپڑے پہنتے تھے اور وہ ان کو نہایت زیب دیتے - آواز بلند اور خوس آئند ، جب مساعروں میں غزل بڑھنے کو محفل گونج اٹھتی تھی مگر بست قامت تھے - گھر کے ماحول میں والدین کی محبت ، مکتب میں استاد کا مشفقانہ سلوک ، نواب الہی بخش خان معروف کی دردادی اور اپنی محنتی طبیعت بہتر سے

بہتر بننے کی کوشش ، فلعہء معلیٰ میں منصبِ اعلیٰ ، استاد سہ کا مرتبہ ، ملک الشعراء کا خطاب ان سب داخلی و خارجی پہلوؤں نے ذوق کی شخصیت کو جلا بخشی ۔

ساعری کے میدان میں انہوں نے مختلف معرکوں میں صبر و تحمل ، اپنی بہترین فوج برداست ، فطانت و اسفنا کے مسلک کو اٹائے رکھا ۔ انہیں کی وجہ سے دہلی کی ساعرانہ فضا خوشگوار رہی ورنہ لکھنؤ کی ممالی مصحفی و انشاء ، ناسخ و آس کے مناظرے و مقابلے کی کچھ کچھ کیفیت ساہ نصر اور ان کے سز و طرار ہٹے وجہہ الدین دہر نے پیدا کرنے کی کوسس کی بھی ، لیکن ذوق نے ساہ نصر کا ہمسہ اساد سمجھ کر احترام کیا اور اپنے مزاج کے دھمے بن سے فضا کو مکدر ہونے سے بچا ۔ ذوق خود راستی کے رستے پر چلتے اور اپنے کلام کے ذریعے دوسروں کو بھی یہی راستہ دکھانے ۔ اسی لیے ان کی شخصیت کے بوازن و اعتدال نے ان کی ساعری میں بھی خوی پیدا کر دی ۔ وہ اخلاقی موضوعات پر عور و فکر کی بنا پر نصیحت کرنے کے عادی ہیں اور یہ باب ان کی شخصیت کی برجانی کرتی ہے ۔

### فنِ قصیدہ نگاری میں ذوق کا مقام

آردو قصیدہ نگاری کی روایت عربی اور فارسی سے قصیدے کا فن لے کر دکنی دور میں سلطان محمد ملی قطب ، نصرانی اور ولی سے ہوئی ہوئی سالی ہند میں شاہ حاتم ، سودا و انشاء کو استاز بخشی ہوئی ذوق تک پہنچتی ہے ۔

ذوق کے فصائد فن کے لحاظ سے معاری قرار دیے جاتے ہیں ۔ ذوق کے خیالات نفصاف ہیں اور ان کے بستر فصائد معاصرے کی عکاسی کرتے ہیں ۔ قصیدے کا آغاز مطلع سے ہوتا ہے اور ذوق نے آردو زبان میں نرسمی و گھلاوٹ کے ساتھ ساتھ سیدھا سادہ اندازِ بیان اختیار کر کے مطلع کو بہت مؤثر بنا دیا ہے ۔ مثلاً :

ساون میں دیا بھر میر سوال دکھائی  
برسات میں عید آئی مدح کش کی بن آئی

☆☆☆

ہیں مرے آبلہ دل کے تماسا گوہر

اک گہر ٹوٹے نوہوں کننے ہی پیدا گوہر

ذوق نے سنگلاخ اور ہموار دونوں زمینوں میں طبع آزمائی کی ہے ۔ ان مطلعوں سے سامعین کی توجہ قصیدہ کے باقی حصے کی طرف خود بخود منتقل ہو جاتی ہے ۔ قصیدے میں مطلع کے بعد تشبیہ کی باری آتی ہے ۔ ذوق کو سہ دربار قصیدہ پڑھنا ہوتا تھا جہاں سخن شناس ، سخن فہم اور سخن گوہوں کا مجمع داد دینے کے ساتھ ساتھ قصیدے کو فن

کی کسوٹی پر رکھنا بھی جانا تھا ۔ اس ماحول میں ذوق کو بڑی صنّاعی اور حسن کاری سے کام لینا پڑتا تھا ۔ ایک ہمارے سبب ہے ۔ ملاحظہ ہو :

واہ وا کیا معدل ہے ناغِ عالم کی ہوا  
 مثلِ نبضِ صاحبِ صبح ہے ہر موجِ صبا  
 بھری ہے کیا کیا مسحائی کا دمِ نادِ ہمار  
 بن گیا گلزارِ عالمِ رسکِ صد دارالشفّا  
 ہے گلوں کے حق میں سنم ، مرحمِ زخمِ جگر  
 شاحِ بسکسہ کو ہے ، ناراز کا فطرہ مومیا

اس ششپ میں مبالغہ کا انداز ہے لیکن العاطفی درو سب اور زبان کے ہر لطف بیان نے ہمارے ششپ میں حانِ ڈال دی ہے ۔ ایک دوسری ششپ میں اپنی علمیت کا اظہار یوں کرے ہیں :

کہی ہمت بھی مری فاعلہ صرف میں صرف  
 کہی بھی نحو میں ہر نحو مجھے محسوس  
 کہی منطق کو نعوی نہ مرے ناطق سے  
 فوی حکم ہو یہ فر گرجہ ہے نخبِ حکمت

ششپ کے بعد گریز آتا ہے ، یہی وہ موڑ ہے جہاں قصیدہ گو کو مدح کی طرف یوں آنا ہونا ہے کہ سامعین خواہند نہ ... جنہیں بلکہ مدح کو حقیقت حائز ۔

اکبر ساہ ثانی کی ششپِ عند پر جو قصیدہ لکھا اس میں گریز اس صورت میں پس کیا ہے :

آج وہ رور بہانوں ہے جسے کہتے ہیں عند  
 بذلہ سحی میں سگفتہ ہے دلِ اہلِ مذاق  
 ذوق نے بعض فصائد میں گریز در گریز کا بھی اہتمام کیا ہے اور اس طرح اپنی قادر الکلامی کا ثبوت دیا ہے ۔ در اصل قصیدے کی روح گریز ہی میں ہوتی ہے اور اسے ذوق نے خوبی سے استعمال کیا ہے ۔ گریز کے بعد مدح کا انداز دیکھئے :

نو وہ ہے نائبِ حتمِ رسل اے سادہ حق  
 کہ نرے سادہ میں ہے گلشنِ دہن کو رونق

ذوق کو اپنے مددو حن اکبر ساہ ثانی اور ہمارے ساہ ظفر کی مالی حالت کا بخوبی علم تھا ۔ اسی لیے ان کے ہاں سودا اور انشاء کی طرح حسنِ طلب کی جگہ دعائیہ

اشعار ملتے ہیں :

ترا جو وصفِ خجستہ ساہا ، لکھے فلم کو کہاں ہے یارا  
 ثنا دعا بر ہے ختم کرنا ، جو ذوقِ نیرا ہے تہمتِ خواں  
 دعائے اشعار کے ساتھ چند مقطعے ملاحظہ کجئے جو ذوق کے حسنِ بیان کی خوبی، بندش  
 کی چستی ، روانی و موسیقی لیے ہوئے ہیں - مثلاً :  
 عد ہر سال ہو فرخ تجھے با عیس و نساط  
 نو ہمیشہ رہے خوس اور برا بدخواہ اداس

☆ ☆ ☆

ذوق کرنا ہے ثنا خم دعا بر بیری  
 کما لکھے وہ برے اوصاف کہ فاصر ہے زباں  
 دوق کے قصائد کا فنی تجزیہ کرنے کے بعد قصیدہ نگاری میں ان کا مقام متعین کرنا  
 آسان ہو گیا ہے - ذوق کا دور غزل کا دور نہا لیکن ان کے خائفی ہند اور ملک الشعراء  
 ہونے نے انہیں درباری قصیدہ گو بنا دیا - ہر سال کی چار ہر باب : (۱) عبدالقادر  
 (۲) عید الاضحیٰ (۳) جشنِ نو روز (۴) جشنِ تحفِ نسبی پر ان کے لیے قصائد لکھا  
 ضروری تھا -

ذوق کا معلیٰ معلیٰ سے بہرہا بچاس برس رہا ، چنانچہ دو سو قصائد ان قربات  
 کے اور اس کے علاوہ ناساہ یا ولی عہد کا جشنِ صحت نابی ، سہزادوں کی نادی وغیرہ پر  
 مبارک باد اور قصائد لکھنا ضروری تھا ، لیکن آج ذوق کے کلمات میں سائیس کے قریب  
 قصائد ہیں اور ان میں سے اکثر نامکمل ہیں - جس قصیدے پر حافظی ہند کا خطاب ملا  
 اس کے صرف بن اشعار باقی ہیں جو بطور نمونہ ہنسی کیے جاتے ہیں :

اشعارِ قصیدہ ہفت دہ زبان

جب کہ سرطان و اسد مہر کا ٹھہرا مسکن  
 آب و ابلولہ ہوئے نشو و نمائے گلشن  
 جوشِ روئیدگیِ سبرہ نہ باد آتی ہے  
 آیت ”انبہ اللہ نمائاً حسنأ“  
 جس طرح شعلے کا عالم ہو بہ فانوسِ خیال

خوف سے یوں نرے لرزاں ہے عدو زبرِ کفن  
 ذوق کی طبیعت قذاعتِ بسند بھی اور وضعداری کے خیال سے وہ بہادر شاہ کی  
 جاہ و حشمت کو حقیقت کے طور پر پس کرتے تھے - چنانچہ دربار سے تعلق کو انہوں نے  
 تمام عمر نبھایا -

سودا کو اقلیمِ سخن کا سہنساہ اور ذوق کا پس رو تصور کیا جانا ہے۔ دونوں کے مقام کا فرو، افتادِ طبع، مزاج اور قابلیت و استعداد کے علاوہ ماحول کا فرو بھی ہے۔ سودا کے یہاں ممدوحین کی کثرت بھی جن میں عالمگیر بانی، نسبت خان، عہد الملک سیف الدولہ، مہربان احمد خان بنگس، سجاع الدولہ، آصف الدولہ، سرفراز الدولہ، حسن رضا خان اور رچرڈ جانسن شامل تھے۔ لیکن ذوق کا میدان محدود تھا صرف دو بادشاہ ممدوح تھے۔ سودا نے بزرگانِ دین کے لیے دلی خلوص و عقیدت سے قصائد لکھے ہیں، لیکن ذوق کا صرف ایک قصیدہ سد عاسفی ہمال جسی رحمۃ اللہ کے لیے لکھا ہوا ملتا ہے۔

سودا نے مدح و دم دونوں میدانوں میں طبع آزمائی کی۔ ان کے مقابلے میں ذوق ایسے دے ہوئے دھیمے مزاج کے خاموس طبع انسان تھے، کہ وہ حالات کی ہندی و بلخی کو خاموسی سے برداشت کر لے رہے ہیں ورنہ ساند ساہ نصیر، مسر، نواب زینب محل، غالب اور نہ جانے کون کون ان کی بھوک کا ہدف بنتا۔ اس طرح سودا نے سہر آسوب لکھ کر اپنے دور کی سیاسی حالت اور عوامی زندگی کی مرعہ آرائی کی، لیکن ذوق کے زمانے میں انگریزی راج کی بدولت وہی طور پر اس و امان کی فضا نے انہیں ساہی ماحول کے نفسے، سہزادوں کی سادیاں، سہرے، بھول والوں کی سیر، باغات کی بہاریں اور محفلوں کے امیرانہ ٹھانڈے کی تصویر کسی تک محدود رکھا۔ ظاہر ہے کہ سودا کا میدان وسیع تھا اور ذوق کا محدود، مگر اس محدود زمین میں بھی ذوق نے الفاظ کے انحطاط اور سادہ تصویر نگاری سے انک نساط انگیز آئینہ کا سامان بنا کر دیا ہے۔

ذوق اور سودا کے قصائد کا مقابلہ کرنے کے بعد ڈاکٹر سد عبداللہ<sup>(۱)</sup> کی رائے پر غور کرنا ضروری ہوگا۔ ان کے نزدیک ان کے قصیدے میں عمر کا محراب کم ملتا ہے۔ لیکن سودا کی روس پر چل کر ذوق سودا کے فریب جا بھرتے ہیں۔

ذوق کے معاصرین میں غالب بطور قصیدہ نگار کے سامنے آئے ہیں۔ غالب نے چھوٹی بحر اور آسان انداز میں قصیدے لکھے، جس سے قصیدہ غزل کے فریب نہ ہو گا۔ لیکن ذوق اپنی طبعیت کے رنگ کی وجہ سے قصائد میں دقت پسندی کے قائل ہیں اور اس بنا پر رعب اور طنطنہ کی صفات بنا کرنے کی کوسس کرتے ہیں۔ غالب کے ہاں نمبر کے تجربے، اجتہاد کی جمک اور نئے انداز کے نمونے ملتے ہیں مگر چونکہ ذوق قصیدہ نگاری میں سودا کے مقلد ہیں اور غالب ایک الگ دائرہ فکر سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ان دونوں کو حریف قرار نہیں دیا جا سکتا۔ نیز غالب میں جو وسعِ نظر اور آزادی فکر بھی وہ ان کے قصائد کو بھی ایک نیا آہنگ عطا کر دیتی ہے۔ ذوق کا ذہن نہ بدلتی ہوئی

سیاسی فضا کا محاسبہ کرنے کے قابل نہ تھا اور نہ کوئی انفرادی یا انقلابی رائے قائم کر سکتا تھا ۔  
لہذا غالب فصدوں اور منہسوں میں بھی نظامِ حاکم کا ایک کائناتی تصور پس کر دیتے  
ہیں ۔ ذوق کا غزل اتنا بلند نہیں ۔

### ذوق کی غزل

ذوق کی غزل زبان و بیان کے لحاظ سے دبستانِ دہلی میں منفرد حسن رکھتی ہے ۔  
ان کی غزل میں اردو زبان کے صحیح استعمال نے الفاظ کی اہمیت واضح کی ہے ۔ نیز ذوق  
کی زبان نے دہلی کی محفلوں اور عوام کے روزمرہ اور فلعہٴ معاشی کے ٹکسال میں برست نائی بھی  
اس لیے ان کی زبان کو مسند قرار دینے میں ہمیں کوئی ناک نہیں ہونا چاہیے ۔  
ذوق نے الفاظ کی نسبت ، محاورات و امثال کے بر محل استعمال ، فنِ عروض سے  
واقفیت ، موسیقی اور موزوں موضوعات کی بدولت کلام میں بہت حسن پیدا کیا ہے ۔  
چند اسعار دیکھیے :

داعِ سبے میں رہے دل میں سدا درد رہا  
اسک آنکھوں میں رہے لب نہ دمِ سرد رہا

☆ ☆ ☆

ہم رونے بہ آجائیں تو دریا ہی بہا دے  
سبم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا

☆ ☆ ☆

سر ہونے دبح اپنا اس کے زیرِ نائے ہے  
یہ نصبِ اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

☆ ☆ ☆

کون وقت اے وائے گذرا جی کو گھبراتے ہوئے  
موب بڑتی ہے اجل کو یاں نلک آتے ہوئے

ذوق کی غزل میں خالص اردو بن ، زبان کی مٹھاس اور لوح بھی ہے ۔ مثلاً :

جس جگہ بیٹھے ہیں با دیدہ ہم آٹھے ہیں  
آج کس شخص کا منہ دیکھ کے ہم آٹھے ہیں

☆ ☆ ☆



وہ جہازے ہر مرے کس وقت آئے دیکھا  
 جب کہ اذنِ عام میرے افرنا کہنے کو ہیں  
 ذوق الفاظ کے ذریعے حُرثات کے بنان میں بڑی دسرس رکھنے ہیں۔ اس کے ساتھ  
 ساتھ طویل ردیف اور انوکھے الفاظ دو کی غزلوں کی خصوصیات ہیں۔ مثلاً :  
 جو کھل کر ان کا مجوڑا نال آئی سر سے ناؤں تک  
 بلائیں آ کے لی سو سو بلائیں سر سے ناؤں تک

☆ ☆ ☆

خیال دل میں بری نہ لاؤ، ہارے دل میں تمہارا گھر ہے  
 ہم آئے آؤ نہیں نہ آؤ، ہارے دل میں تمہارا گھر ہے  
 ذوق کے ہاں مسلسل 'انک لفسِ مراح' کی عریات بھی ملی ہیں۔ سال کے طور  
 پر یہ عزل لہجے :

وہ صبح کو آئے ہو کروں ناہوں میں دوہر  
 اور چاہوں کہ دن بھوڑا سا ڈھل جائے ہو اچھا  
 ڈھل جائے جو دن بھی ہو اسی طرح کروں سام  
 اور بھر لہوں گر آج سے کل جائے ہو اچھا  
 جب کل ہو ہو بھر وہ ہی کروں کل کی طرح سے  
 گو آج کا دن بھی ہو ہی کل جائے ہو اچھا  
 ذوق کی عزل میں جد بے کی، سب کے بجائے ریان و سنا کی حاسنی اور کہیں کہیں  
 نکھرے ہوئے جذبات، صاف و سفاک احساسات بھی اپنا رنگ دکھانے ہیں، مثلاً :  
 مسی و نا آسانی و حس و ہنگامی  
 نا بری آنکھوں میں دیکھی یا برے دیوانے میں

☆ ☆ ☆

آنے سے مرے ٹھہر گئے آپ وگرنہ  
 جانے کا ارادہ ہو کہیں ہو ہی چکا تھا

ذوق کی غزل گوئی کے متعلق 'رسالہ اردو' ۱۹۲۶ء کے گمنام اور 'سفینہ ادب' (۱) کے  
 نامور نقاد حافظ محمود سیرانی لکھتے ہیں کہ ذوق کی غزل گوئی کا عام دستور یہ ہے کہ  
 اگر قافیہ و ردیف میں کوئی فعلی جرو ہو تو اسی فعل کے ساتھ مختلف الفاظ ملانے سے جتنے

محاورے پیدا ہو سکتے ہیں وہ حتی الامکان ان تمام محاوروں کو باندھ جاتے ہیں ، مثلاً :  
 تجھے اے سنگ دل آرامِ جانِ مبتلا سمجھے  
 بڑے تھر سمجھ اپنی بہ ہم سمجھے نوکبا سمجھے  
 محاورات کے ساتھ ضرب الامثال کا استعمال بھی کرتے ہیں ، مثلاً :  
 ہے نفس سے نور اک گلشن ملک فریاد کا  
 خوب طوطی بولتا ہے ان دیوں صباد کا

☆ ☆ ☆

بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو  
 زبانِ خلو کو نفارۂ خدا سمجھو  
 مختلف بوہاں اور اوہام بھی ذوق کی ساعری میں نظر آتے ہیں ، مثلاً :  
 وعدہ ہے آنے کا اس کے ، ار کھل جائے تو آئے  
 ڈالنا ہوں دم بدم اٹھ اٹھ کے روغن آب میں  
 نواب الہی بحس خان معروف کی صحبت اور گرد و بس کے ساعرانہ ماحول کی وجہ  
 سے اخلاق موضوعاتِ ذوق کی عزل کا حروِ خاص ہے ، مثلاً :  
 بڑے موذی کو مارا نفسِ امارہ کو گر مارا  
 نہنگ و اردہا و سریر مارا نوکبا مارا

☆ ☆ ☆

جس انسان کو سگ دنیا نہ نایا  
 فرسہ اس کا ہم پانا نہ نایا

☆ ☆ ☆

اس جبر پر تو ذوق بشر کا بہ حال ہے  
 کہا جانے کہا کرے جو خدا اختیار دے  
 غزل کا موضوع عشق ہے ۔ ذوق کی غزل میں اکثر محبوب کی ایسی تصویر کشی کی گئی  
 ہے ، جس کی بنا پر مسرتی تہذیب اور اس ماحول کی صنفِ نازک کا ایک نقشہ آنکھوں کے  
 سامنے آ جاتا ہے :

کشتہ دستِ حنائی ہوں مرے مرقد پر  
 پھول دو ہانہ سے تو اپنے مری جان چڑھا

☆ ☆ ☆

دیکھنا اے ذوق ہوں گے آج نہر لا کھوں کے خون

بھر چانا اس نے لعل لب بہ لا کھا نان کا

ذوق کی غزل میں جذبات و احساسات کی آس سدا کا فدا ہے حو میں اور غالب کا خاص جوہر ہے۔ ذوق اپنی شخصیت اور ماحول کی بنا پر دے دے گھٹے گھٹے رہتے ہیں۔ ذوق کے ہاں جذباتی کسمکس کے ساتھ مایوسی و حرمان نصیبی بھی ہے، یعنی اگر ذوق کبھی کسی بردہ نسن کی طرف مائل ہوئے ہیں اور اگر کبھی محبوب کی محفل میں سریک ہو کر سار و آوار سے لطف اندوز ہوئے ہیں تو پھر اس کی لے اعبائی سے اسے دل برداستہ ہو گئے ہیں کہ جذبات و احساسات کی تلخی سے فرار احسار کر لیا اور الفاظ کی ساعری میں سہا لٹنے لگے۔ ویسے کہیں کہیں جذبہ و احساس کی کثیف کے محب بہت اچھے اسعار بھی کہہ گئے ہیں لیکن طبع کا میلان زبان کی طرف زیادہ ہے۔

### ضمیمہ

#### گروپ کہن سید فیاض محمود

ذوق کے بارے میں آج نہ خال مسلم حسب احسار کر چکا ہے کہ ان کے ہاں نہ خیالات کی بلندی ہے، نہ احساسات کی گہرائی اور نہ جذبات کی صداقت، بلکہ ان کے خیالات عامانہ اور فرسودہ ہیں اور وہ فقط اپنے زورِ نساں سے انک بوری ربع صدی کی ادبی فصاحت پر چھا لئے تھے۔ نہ بات صحیح معلوم نہیں ہوئی۔ نساں کہ ہر دور میں سخن فہم لوگوں کی سرج غالباً انک حسی ہوئی ہے، البتہ ہر دور کا مراج الگ ہونا ہے۔ کبھی نفعی نظریہ ادب پر اظہارِ برسلط ہونا ہے اور کبھی تعمیر یا تنقیدی نقطہ نظر۔ نہ درست ہے کہ ذوق معمولات سے زیادہ محب کرنے ہیں اور ذہن کو دعوتِ فکر نہیں دیتے۔ اور نہ آسودگی طلب فاری کو کوئی اعصابی صدمہ پہنچاتے ہیں۔ مگر ان کے ہاں عمقِ نظر اور سدا احساس نالکل مفقود نہیں۔ اگرچہ وہ محاورہ کی حکمتی سطحوں میں چھب ضرور حاتے ہیں مگر ذیل کے اسعار اسی آقامت کے حامل ہیں کہ وہ کسی ساعر کے لئے بھی باعِ فخر ہو سکتے ہیں :

ہے جہاں مانند مجر اور ہم مثل سپند

اب حلے جائیں گے آئے اک صدا کہنے کو ہیں

☆ ☆ ☆

دیوانہ برا قید سے ہستی کے جو چھوٹا

چڑھ جائے گا اک زلزلہ صحرائے عدم کو

☆ ☆ ☆

ہوش و خرد کو دیکھ لیا درد سر میں ذوق کے

آرام کو بھی دیکھ کہ دیوانہ بن میں ہے

عالمِ نا امدی ، دنیا سے بے زاری اور لذتِ دنیوی کے بے حقیقی پن پر بہت سے  
اشعار لکھے گئے ہیں۔ اس ضمن میں ذوق کے مندرجہ ذیل اشعار بھی قابلِ غور ہیں ، اگرچہ  
روزمرہ کا چنخارہ ان میں بھی موحود ہے :

کسا ڈھونڈنا ہے تو عملِ بغض و محبت

جلنا ہوا نعوذ سمجھ نفسِ درم کو

اسی سلسلے میں انک غزل کے دینِ شعر اور ملاحظہ ہوں :

بدبیر نہ کرنا ، فائدہ بدبیر میں کسا ہے

کچھ نہ بھی خبر ہے ، بیری بدبیر میں کیا ہے

اے اہلِ نظر ، عالمِ تصویر کو دیکھو

تصویر کا کیا دیکھنا ، تصویر میں کسا ہے

بٹھا ہے درِ کعبہ نہ حیراں برا سبدا

لسک میں کسا ہونا ہے یکبر میں کیا ہے

حنائیِ عالم کے بارے میں نہ شعر دیکھیے :

خرد نے رازِ عالم کچھ نہ پایا ذوق اگر پایا

کہ بے آغاز آیا اور بے انجام جلتا ہے

مندرجہ ذیل اشعار سے مابوسی کا کتنا شدید احساس ہوتا ہے :

میں وہ گل ہوں کہ مچھوں نہ تن سے خاک پر

جس اگر نہ مجھ کو نسیمِ بہار دے

ہو گرمی وفا سے سگفتہ نہ گل کا دل

جاں انی اس پہ بلبلِ نیندا ہزار دے

جہاں تک دنیا داری کا نعلی ہے ، جو الرام ان تر دھر دیا گا ہے اس کے بارے

میں ان کے ناثرات ان بدیہی اشعار سے ظاہر ہیں :

دنیا نے کس کا راہِ فنا میں دیا ہے سانہ

تم بھی چلے چلو یوں ہی جب تک چلی چلے

جاتے ہوئے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوق

اپنی بلا سے بادِ صبا اب کبھی چلے

دوستداری کے متعلق ذیل کے دو اسعار ملاحظہ ہوں :

حارہ گر سوزنِ نقدہر میں کچھ اور ہیں نار  
حب کے نار حو ہو ہو کے رفو ٹوٹ گئے  
ہر کھسچے بھی اگر حارہ گروں نے دل سے  
ہو کسھی جھوٹ گئیے اور کسھی ٹوٹ گئے  
بعض دفعہ ذوق الفاظ کی تکرار سے شعر کو معنہ بھی بنا دیے ہیں ، مثلاً :  
دردِ دل سے لوٹا ہوں ، میرا کس کو درد ہے  
میں ہوں حرفِ درد ، جس ہلو سے التو درد ہے

ان اسعار کے مطالعہ سے واضح ہو گا کہ ذوق کے ہاں نار بھی ہے اور جذبات کی شدت بھی ، مگر وضعداری سائد انہیں احارب نہیں دیتی بھی کہ اظہار میں سدب اور حدنات میں مسی کی کلمہ بسدا کریں ۔ اس لیے ان کے اسعار غالب کے سعلہ ہائے ستال کے سامنے بھٹکے اور سرد معلوم ہوئے ہیں ۔

سوسائٹی میں ایسے ساء کی بھی ضرورت ہے جو عوامصِ حباب اور رموزِ زندگی سے عموماً محب نہیں کرنا اور ان تماؤں اور ارزوؤں کی عکاسی کرنا ہے جو عوام کی فہم کے مطابق ہوں ۔ چنانچہ ذوق انہیں ماصوں کو نورا کرے ہیں جس کے سبب محس (۲۵) سال تک وہ عوام کے مقبول شاعر رہے ۔

ذوق کے موضوعات معمولاً زندگی سے متعلق ہوتے ہیں ۔ ہوں نظر آنا ہے جسے ان کی شاعری زیادہ تر اوسط درجہ کی سمجھنے کے لوگوں کے لیے ہے ۔ اس میں زندگی کے گھناؤں پہلوؤں سے محب نہیں ہوتی اور نہ ہی دو داسہ طور پر اسکا کرنا چاہتے ہیں ۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ماضیِ مرتب کے حالات اور ماحول کے بس نظر اکثر لوگ زندگی کے بھانک پہلوؤں اور انسانی کردار کے تاریک گوشوں سے آبرائ نہیں ہونا چاہتے تھے ۔ بلکہ سطحی حدبات کے اظہار کو شاعری کا ماحول قرار دے کر مطمئن ہو گئے تھے ۔ اگرچہ ان کے ہم عصر غالب نے اکثر انہی گہرائیوں میں عوامی کی ہے مگر ذوق اس ماحول اور اس میں رہنے والی اکثریت کے سبتوں کے حالات کے مطابق شعر و شاعری کرنے لگے ۔ ان سب باتوں کے ناوجود جو رنان ذوق نے استعمال کی وہ سائسہ لوگوں کی زبان ہے ۔ علاوہ ازیں انہوں نے اسے شعر بھی کہتے ہیں جن سے حصمت لے نفا ہو جاتی ہے اور ان کے اسے اشعار ، جو کم یاب بھی نہیں ، قاری کو اسی طرح چونکا دینے ہیں جس طرح اعلیٰ درجہ کی شاعری ۔

## کتابیات

- (۱) سنج محمد ابراہیم ذوق - حیات اور ساعری  
(بھس) استحقاق مقالہ  
راحب افزا بجاری (بنجاب یونیورسٹی لاہور)
- (۲) محمد حسین آزاد - آبِ حیات
- (۳) ویران طہر انور (مرتب) دیوانِ ذوق
- (۴) محمد حسین آزاد (مرتب) دیوانِ ذوق
- (۵) ڈاکٹر نبیر علوی - دیوانِ ذوق - جلد اول و دوم
- (۶) سر سدا احمد خان - آثار الصنادید
- (۷) کریم الدین احمد - طبقات الشعراء
- (۸) فراغ گورکھپوری - اندازے
- (۹) انسائیکلو پیڈیا آف اسلام جلد دوم ۱۹۶۱ء Fasciculus 26
- (۱۰) نواب مصطفیٰ خان سفینہ - تذکرہ گلشنِ بے خار
- (۱۱) ڈاکٹر نبیر علوی - ذوق سوانح اور انفراد .
- (۱۲) محمد محبتی ننہا - مراہُ السعرا
- (۱۳) رسالہٴ آردو ۱۹۲۶ء
- (۱۴) پروفیسر محمد احمد خان (مرتب) سفینہٴ ادب حصہ نثر
- (۱۵) رسالہٴ ساب رنگ

## (ج) بہادر شاہ ظفر

(۱۸۶۲ء - ۱۷۷۵ء)

## تاریخی و سیاسی پس منظر

ابو ظفر محمد بہادر شاہ نانی ۱۸۳۷ء میں محب نسین ہوئے۔ اس وقت اسٹک انڈیا کمپنی تقریباً دو ہائی ہندوستان پر فاض ہو چکی تھی۔ اگرچہ کمپنی کا نامہٴ مخفیہ کلکتہ ہی میں تھا، مگر دہلی میں ان کا ایجنٹ موجود رہتا تھا، بلکہ قلعہٴ ساہی کے لیے ایک عامحدہ رینڈنٹ تھا جو وہیں مقیم تھا۔ اس کے باوجود قلعہ کے اندر بہادر شاہ ظفر ہی کا سکھ چلا تھا اور انہیں اتنا دربار فائز کر دیا اور چھوٹے موٹے عہدے اور خطابات دینے کا اختیار بھی تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اگرچہ ڈیپوٹا سٹے والے بھی آواز بلند کرتے کہ ”ملک خدا کا اور حکم کمپنی بہادر کا“، مگر برصغیر میں نسے والوں کے دلوں میں حکومتِ محل بادشاہ کی ہی تھی۔ اس کا ثبوت اس طرح دیا جا سکتا ہے کہ اگرچہ محل بادشاہ کے سیاسی احکامات نہ پورے کے برابر تھے تاہم ٹراونکور کی رانی نے ایسے مسیحا کے لیے بہادر شاہ کو لکھا کہ وہ فرما دیے سننی عطا کریں۔ اس بات سے اس وقت بھی انگریزوں کو تعجب ہوا اور اس امر کا ذکر بعد کے تاریخ دان بھی بڑے تعجب کے ساتھ کرتے ہیں۔ سر ولیم سلیمان کی کتاب (۱) ”ساحل اور بادشہ“ ۱۸۳۸ء سے پہلے چھپی تھی۔ اس میں اس امر کا ذکر کرتے ہوئے وہ بڑے رخ کے ساتھ کہتے ہیں کہ جہاں کہیں لوگوں سے انگریزوں اور مغلوں کی حکومتوں کا مقابلہ کرتے کو کہا گیا، انہوں نے محلہ سلطنت اور محل بادشاہوں کی ہی تعریف کی۔ اس بات سے سلیمان نے یہ نسخہ نکالا کہ لوگوں کے دلوں میں مغلوں کی عظمت کی یاد ویسی ہی تازہ ہے، جسے پہلے بھی اور چونکہ سرولم سلیمان دربارِ اودھ میں ۱۸۳۸ء سے ۱۸۵۴ء تک بطور رینڈنٹ رہے تھے اس لیے انہیں اس اسلامی تہذیب و تمدن کو دیکھنے کے بہت سے مواقع بھی مل گئے تھے۔

مغلوں کی برتری کا یہ احساس دراصل محل تہذیب کی خوشوں کی وجہ سے تھا۔ علم و فن، اخلاق و ادب، تصوف و مذہب پر طرف لوگوں میں جو ذوق موجود تھا وہ اسی تہذیب کی بدولت تھا۔ چنانچہ ان کی سلطنت کے حلے جانے سے لوگوں کو دکھ ہوا۔ اور اس سلسلہ میں کئی دفعہ اٹھارہویں صدی میں جو بد نظمی اور خانہ جنگی ہوئی، اس سے پاکستان و ہند کی ساکھ کمزور ہو گئی۔ لوگ ان باتوں کو عذابِ خداوندی تصور کرتے تھے۔ اور اپنی اخلاقی کمزوریوں پر محمول کرتے تھے، مگر ساتھ ہی دل سے اپنی

نہذیب کے دلدادہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ بہادر شاہ ظفر نہ تو کسی کو مال و ثروت سے مالا مال کر سکتے تھے نہ ہی اسے کوئی مدد دے سکے تھے، مگر اس اجڑے ہوئے دربار اور اس بے دس و نا نام نہاد حکومت سے وابستگی لوگوں کے لیے فخر کا باعث تھی۔ عہدِ ظفر کا یہ سیاسی منظر بھا جس میں اردو شاعری کو معراج نصیب ہوا۔

### بہادر شاہ ظفر کی شخصیت

بہادر شاہ ظفر ۱۷۷۵ء میں لال پلہ میں ہی پیدا ہوئے جب ان کے دادا ظلِ سبحانی شاہ عالم الہ آباد کو چھوڑ کر نئی سال سے مسمل طور پر دہلی آگئے تھے اور اسے وفار کو بحال کرنے کے لیے کوساں بھیجے۔ اس وقت نجف خان ان کا وزیر تھا اور اس کے بندر اور عالیٰ ہمی کے نائب سلطنت کی حالت کافی سدھر چکی تھی۔ سکھ بے بسا ہوئے، حادثہ دہلی دے گئے، اگرچہ دوبارہ مضبوط ہو گیا اور مرہٹوں کو دور رکھا گیا۔ نجف خان ۱۸۸۲ء میں فوت ہوا۔ بہادر شاہ ظفر کی عمر اس وقت سات سال تھی۔ ساہرا دے کی تعلیم و تربیت کی طرف شاہ عالم خاص توجہ کر رہے تھے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے اس اطمینان بخش اور ہمہ افروز ماحول کے اثرات ساہرا دے کی سرب کا مسمل حرو نہ بن سکے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نجف خان کی وفات کے صرف چھ سال بعد بہادر شاہ ظفر نے ایک نہایت ہی المناک افتاد دیکھی۔ نجیب الدولہ کے ہوتے اور روہیلوں کے سردار علام قادر روہیلے نے سرکشی کی اور شاہ عالم سہنشاہِ دہلی کو اندھا کر دیا۔ شاہی خاندان کی بڑی تذلل ہوئی۔ ۱۷۶۳ء میں بکسری ناکام لڑائی کے بعد شاہ عالم بنگال کی دیوانی کے حقوق انگریزوں کو دے چکے تھے۔ مگر سلطنتِ دہلی ابھی تک دوآب، سلج سے اس نار اور اگرچہ تک محط بھی، اب جب آنکھیں جاتی رہیں تو روہیلوں نے خوب لوٹ کھسوٹ مچائی۔ چنانچہ نجف خان کے زمانے کے خوش آئند اثرات واثم نہ رہ سکے اور بہادر شاہ جیسا حساس سہرا دہ درد مندی اور مایوسی کے جذبات کا مسمل طور پر شکار ہو گیا۔ ۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا اور شاہ عالم کو مرہٹوں کی مدد نما سربرسی سے نجات دلائی مگر اب ان کے ہاتھ سے طاقت جا چکی تھی اور جلال الدین اکبر، ساہجہان اور اورنگ زب عالمگیر کے حاشین کے اختارات لال پلہ تک محدود ہو گئے تھے۔ شاہ عالم ساہرا دگی کے انام میں بڑے خوش طبع اور سگفتہ مزاج تھے۔ ان تمام حادثات نے انہیں محزون اور ملول بنا دیا۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت وہ دردناک سہر آسود ہے جو انہوں نے فارسی زبان میں لکھا<sup>(۱)</sup>۔ بہادر شاہ ہدائشی طور پر

(۱) پہلے دو شعر ملاحظہ ہوں :

درد بر باد سرو پرگ جہاں داری ما      صرصر حادثہ برخاست ہے خواری ما  
درد در شام زوال آہ سیہ کاری ما      آفتاب فلک رفعت شاہی بودیم



شاعر اور شعر دوست تھے۔ یہ المیہ شہر آشوب انہوں نے لازماً بڑھا ہوگا۔ اس طرح درد و غم ان کی شخصیت کا جزو لاشفک بن گیا۔

۱۸۰۷ء میں شاہ عالم کی وفات کے بعد بہادر شاہ ظفر کے والد اکبر شاہ بانی ناج و نخت کے مالک بنے۔ ناج و نخت ایک طرح کے حقیقت تھا۔ بہادر شاہ کے لیے یہ زمانہ اس لیے بھی سوہانِ روح کا موجب تھا کہ والد انہیں ولی عہد نہیں سانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ۱۸۳۷ء میں جب وہ نخت نسین ہوئے تو انگریزوں کی گرفت لال قلعہ پر اور مضبوط ہو گئی۔ وطنہ ذاتی اخراجات اور سپاہیانہ رکھ رکھاؤ کے لیے ناکافی تھا۔ اس لیے انہیں مسجع اور معفی خط انہیں بالکل بے معنی معلوم ہونے لگے اور پھر جب انہیں اس بات کا بھی علم ہوا کہ ان کا ولی عہد خطابِ ساہی استعمال نہیں کر سکے گا اور لال قلعہ سے باہر رہے گا اور ساہجہان کے شائے ہوئے جمل اور جلیل محلات میں بدعہد گورے رہیں گے تو دردِ مہدی اور بجارگی کا احساس ان کی رگ و پے میں بوس ہو گیا۔ وہ حسرتِ محسوس بن گئے۔ دل میں آرزو بھی کہ کاس میں نا افسار سہسہا ہونا مگر ساہنِ مہستانی کی پرواز ان کی قسمت میں نہیں لکھی تھی۔ اس لیے خودِ رحمی کا جذبہ ان پر مسلط ہو گیا اور یہ اسلاء اس قدر زبردست تھا کہ لہو بہہ جانی ہو جائے خود ان کی شخصیت میں لہو کوسی کا عنصر بھی دکھائی نہیں دیا۔ بلاس در لہجے ان کی فطرت میں آہ کو اہرار کا کامل فقدان نظر آئے گا۔

الہ، ایک بات ضرور ہے۔ ان کے دل میں یہ اہماد ہمیشہ موجود تھا کہ اگرچہ ملک پر انگریزوں کی حکومت ہے مگر لوگوں کے دلوں پر حکومت بہادر شاہ ظفر کی ہے۔ انہیں یقین تھا کہ ہندو و مسلمانِ مہم کے مہم دل و جان سے ان کا احترام کرتے ہیں اور انہیں آنکھوں پر نشانے ہیں۔ یہی اعزاز و تہن ان کی معنوی خودیوں کو سہارا دیا تھا ورنہ وہ مکمل طور پر منوطیت کا شکار ہو جاتے۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مہم کو اپنا فرزند سمجھتے تھے۔ وہ انسانِ دوست، عادل اور منصف مزاح تھے۔ وہ اپنے آبا و اجداد کی طرح حق گو اور سہاک بھی تھے۔ ادبِ ہواری اور شعرِ دوستی ان کا خاندانی ورثہ تھا، اسے بھی وہ عزیز سمجھتے تھے اور ان سب باتوں سے بالادِ عوام کے خلوص و محبت نے انہیں شرفِ انسانی سے مہم نہیں ہونے دیا۔ وہ ہر و بصوفِ افسار کر کے ہر انسان کی صورت میں ہماری نگاہوں کے سامنے آتے ہیں۔ شاہ عالم اور اکبر شاہ ثانی دونوں مولانا فخر الدین دہلوی (م - ۱۸۳۷/۱۱۹۹ھ) کے معتقد تھے۔ اگرچہ بہادر شاہ ظفر نے ان کی زیارت اپنے بچنے میں کی بھی پھر بھی کس عہد کے ساتھ کہتے ہیں :

جس کو حضرت نے کہا الفخر فخری ام ظفر

فخر دیں ، فخرِ جہاں پر وہ فقیری ختم ہے

حضرت مولانا کے وصال کے بعد آپ کے فرزند خواجہ غلام قطب الدین اور پوتے میاں نصیر الدین عرف کالے صاحب سے بھی ان کی عقیدت اسی طرح قائم رہی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی معنوی صفات کے لحاظ سے بہادر شاہ ظفر برصغیر کے نیموری سمنشاہوں کے ایک والا مرتبت فرزند تھے۔

### شہدِ ظفر کا ادبی منظر

یہ عجیب انفاں ہے کہ ۱۷۷۵ء بہادر شاہ ظفر کا سالِ ولادت ہے اور یہی وہ سال ہے جب آصف الدولہ کی بدولت لکھنؤ اودھ کا دارالخلافہ قرار پایا ہے۔ یعنی ظفر کی ولادت کے ساتھ اس تمدن اور معاشرت کی بھی نوبت ہوئی، جس کی تہذیب و ثقافت بعد میں لکھنؤ کے نام سے موسوم ہوئی اور اس ادب کا بھی آغاز ہوا جو آگے چل کر دسسان لکھنؤ کہلانا۔ سیاسی اور معاشی حالات نے شعرائے دہلی کو مجبور کیا کہ وہ ہلے فض آباد (۱۷۶۵ء تا ۱۷۷۴ء) جائیں، جہاں شجاع الدولہ ادب و شعر کی سرپرستی کر رہے تھے اور پھر لکھنؤ کا رخ کریں، جہاں آصف الدولہ اور ان کے بعد ان کے جانشینوں اور وہاں کے امراء و رؤسا کی وجہ سے ادب افروز اور شعر پرور ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ یہ لوگ انہی ساتھ دہلی کی مدرسے لے گئے تھے لیکن اودھ کی معاشی خوشحالی اور وہاں کے مذہبی بغاوتوں نے وہاں ایک نیا ماحول پیدا کر دیا، جس میں حسن تھا، رنگینی بھی، عشق کوئی بھی مگر شمع کا زور تھا۔ حسن اور رنگینی کے باعث ادب اور شعر میں بھٹن اور برصغیر نے رواج پایا۔ اصلاحِ زبان کی طرف توجہ بڑھ گئی۔ معنی پروری اور جذبات نگاری کی بجائے حسنِ بیان کو ترجیح دی گئی۔ یہ خالص لکھنوی اسلوب تھا اور اس کے امام نسخ (م۔ ۱۸۳۸ء) تھے۔ ان کے دل میں مرزا قتیل کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے حسنِ بیان کی خاطر عربی اور فارسی الفاظ اور ترکیبات کے استعمال کی رغبت بڑھ گئی تھی۔ اسی لیے ان کی شاعری میں بھٹن اور نکلف نو ہے مگر اعلیٰ درجے کے خیالات نہیں ملتے اور نہ سببِ جذبات۔ ان کے تمام شاگردوں بالخصوص میر علی اوسط رسک کا بھی یہی حال ہے۔

ناسخ کا اثر اہلِ دہلی پر بھی ہوا۔ شاہ نصیر دہلوی (م۔ ۱۸۴۰ء) لکھنؤ آتے جاتے رہتے تھے اور ناسخ سے ان کی ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ اسی لیے شاہ نصیر کے ہاں بھی الفاظ کی شان و شوکت ہے، نادر نشیہات و استعارات ہیں اور ردیف و قافیہ کا اہتمام بھی ہے۔ لیکن ناسخ کی طرح مضمون آفرینی اور معنی پروری ان کے کلام میں بھی نہیں ملتی۔ شاہ نصیر نے بھٹن کو ایک قدم آگے بڑھایا ہے۔ وہ سنگلاخ زبینوں کے لیے بھی شہرت رکھتے ہیں۔ ذوق شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ پھر ذوق کے بہت سے تلامذہ

تھے۔ اس لیے شاہ نصیر کا اسلوب عام ہو گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ دہلی میں ایک اور دبستان شعر بھی فروغ پا رہا تھا جس کا تعلق مرزا غالب (م - ۱۸۶۹ء) اور ان کے ہم خیال حکیم مومن خان سے ہے۔ یہ دبستان اطہار کے ساتھ خیالات کو بھی بڑی اہمیت دیتا تھا۔ مخلف ناریخی اور سماجی اسباب کے باعث معنی بروری اور خیال آفرینی دہلی کا طغرائے اسباز بھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ دبستان دہلویٹ اور لکھنویٹ کے درمیان امتزاج کا فائل تھا۔ غالب اور مومن کے ساتھ ان کے بلامدہ اسی امتزاج کی نمائندگی کرتے ہیں۔

### ظفر کے اساتذہ

شاہ نصیر کو حادثاتی و حباب حاصل بھی۔ بلکہ مرید ساعر بھی تھے۔ ان دو وجوہات کی بنا پر ان کی رسائی شاہ عالم کے دربار میں ہو گئی جو شعراء کے فدردان ہونے کے علاوہ خود بھی اعلیٰ درجہ کے ساعر تھے۔ شاہ عالم نے شاہ نصیر کو بہادر شاہ ظفر کا اسناد مقرر کیا۔ بعد میں دوں بھی بہادر شاہ ظفر کے انالق سے اور ۱۸۵۴ء میں انی وفات تک اسناد شاہ رہے۔ اس طرح ظفر کے کلام میں اسلوب شعر گوئی کے لحاظ سے شاہ نصیر کے ارباب حصہ در ہو گئے۔ شاہ نصیر کے بعد کچھ عرصہ کے لیے میر کاظم حسین سمرار بھی ظفر کے اسناد رہے۔ ’مجموعہ نعر‘ میں میر عزت اللہ عسک کو بھی ظفر کا اسناد مانا گیا ہے۔ دوں کی وفات کے بعد یہ خدمت مرزا غالب کے سپرد ہوئی لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے یہ سلسلہ درہم درہم کر دیا اور ظفر مرزا غالب سے استفادہ نہ کر سکے۔ بلکہ یہ آہما موروں رہے گا کہ جب مرزا غالب کا یہ تعلق قائم ہوا تو ظفر کی عمر ۷۹ سال تھی۔ ان کا اسلوب شعر ہو چکا تھا، پھر وہ آہا ارباب قبول کرتے؟ الٹا فلعہ میں آمد و رفت شروع ہوئی تو مرزا غالب نے سہل گوئی کی طرف زیادہ توجہ دینا ضروری سمجھا۔

### ظفر کی شاعری

سعر و ساعری سے ظفر فطری مناسب رہے تھے۔ یہ جوہر انہیں ورثے میں ملا تھا۔ علاوہ بریں انہیں اس باب کا بھی احساس تھا کہ ان کی جاہ و حشمت سراب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ کہے کو تو وہ سہسناہ تھے لیکن ان کے اختیارات معدوم تھے۔ فدرنی طور پر یہ احساس ایک کسک بن کر ان کے دل میں موجود رہتا تھا اور وہ اپنے دل کا ابال اشعار میں نکال لیا کرتے تھے۔ احساس محرومی نے زیادہ شدت کے ساتھ انہیں فقر اور بصوف کی طرف بھی مائل کر دیا تھا اور اس طرح بالخصوص

عبرت بذیری کے اشعار ان کی زبان پر رواں ہو جاتے تھے۔ ان تمام اسباب کی وجہ سے حسن و عشق کے اشعار کے علاوہ ان کے کلام میں ہمیں درد و غم، بے چارگی، مصروف اور عبرت بذیری کا اظہار ملتا ہے۔ انہوں نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن زیادہ تعداد غزلیات کی ہے : اس لیے ہم انہی میں سے نمونے کے اشعار پیش کرتے ہیں :

خدا جانے سحر کس کی گلی سے یہ ہوا آئی  
حباب آسا جو مرا ہو گا ہے درہن ٹھنڈا

☆ ☆ ☆  
ہمیشہ دلدہ غمناک سے ہیں جاری اشک  
اللہی مد نہ ناسور ہو نو کیوں کر ہو

☆ ☆ ☆  
مددوں نو نے دے ہم کو جہاں میں حکمر  
اب نو رکھ کوئی دن اے گردشِ مدبر معاف

☆ ☆ ☆  
جو دل میں انک ہو روزن نو کچھ ہو اس کا علاج  
ممام حانہ رنبور ہو نو کون کر ہو

☆ ☆ ☆  
دنا ادبی خودی نو جو ہم لے اٹھا، وہ جو بردہ سا بح میں بھا نہ رہا  
رہے بردے میں اب نہ وہ بردہ نسب، کوئی دوسرا اس کے سوا نہ رہا

☆ ☆ ☆  
مانندِ حباب انک نفس میں ہے خرابی  
اس منزلِ فانی میں ہے بنیادِ مکانِ ہمع  
کلیابِ ظفر کی چاروں جلدوں میں آب کو اسی قسم کے اشعار ملیں گے اور یہ خالصتاً  
ظفر کے انہی رنگ میں ہیں اور ان کے انہی دل کی آوازیں۔ شاہ نصیر کی طرح انہوں نے  
سنگلاخِ زمیں بھی استعمال کی ہیں۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ ان میں سے انہوں نے بعض  
اچھے اشعار نکال لیے ہیں۔ وہ مشکل فوائی کے بھی سائی ہیں اور لمبی ردیفوں سے بھی  
وابستگی رکھتے ہیں۔ جہاں صرف انک سال ہر اکسفا کی جائے گی :

گر ہو پاسِ عہدِ بشر کو، جس کا ہووے اسی کا ہو  
پھیرے نہ سوئے غیر نظر کو، جس کا ہووے اسی کا ہو

ظفر کی شاعری کی نمایاں صفت اس کی شفاف اور غنائی صداقتِ اظہار ہے۔ ان کے جتنے بھی اچھے شعر ہیں ان میں صراحت ہے، سادگی ہے اور غنائیت ہے۔ اسی لیے وہ جلدی زبان زد ہو گئے تھے، جس طرح بعد میں داغ کے کلام کے ساتھ ہوا۔ ان کے موضوعات بھی محدود نہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عسدت کے برخلوص نذرانے ہیں، ماہ سپاؤن کے لیے سادہ اور ہرخلوص لگن ہے، جو ایک بشری نفاضا ہے، حالاتِ زمانہ پر بھی تبصرہ ہے اور زندگی کی ماہیت پر بھی فکری نظر ہے، مثلاً یہ شعر کتنا بیارا ہے :

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور ہزاروں جانور  
انہی انہی بولباں سے بول کر اڑ جائیں گے

مولانا محمد حسین آزاد نے ’آبِ حیات‘ میں اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ ظفر کا کلام زیادہ تر مستعار ہے۔ اس لیے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ظفر کے کلام میں خود ان کا کتنا حصہ ہے اور اساد ذوں کا کسا، اہلِ تحقیر نے بڑا وقت صرف کیا ہے اور انہوں نے خارجی اور داخلی سواہد کو ہرکھ کر ثابت کیا ہے کہ ظفر کے کلام میں جو سادگی، صراحت، کسک اور خود جمی کی سی خصوصیات ہیں وہ ذوق کے اسلوبِ فکر و فن سے بالکل مختلف ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ظفر کی شاعری کا غالب عنصر درد مندی اور خود برسی ہے اور ان جذبات کو ان کے خلوص نے رود اتر بنا دیا ہے۔ وہ غم سے معمور معلوم ہوتے ہیں اور بھی غم ان کی شاعری کا اصل محرک دکھائی دیتا ہے۔ وہ ایک المہ کردار کے طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ مثلاً :

ہر نفس اس دامنِ مرکاں کی جیسے سے ظفر  
دل میں اک سعلہ سا بھڑکا اور بھڑک کر رہ گیا

یہ بات بھی زیرِ نظر رہنی چاہیے کہ ظفر کا ریخ و غم انفرادی ہے اور ان کے مقابلے میں ذوں کا غم ایک معاصرے کا غم معلوم ہوتا ہے۔ ظفر عظمتِ رفہ کا مربہ لکھتے ہیں اور اپنی سیاسی بے بسی اور معاشی بے جاگی کی درجانی کرتے ہیں۔ نخت و تاج اور جاہ و حشم سے متعلق اسے مسافانہ اشعار ذوق کہاں کہاں سکے تھے۔ ان میں تو صرف ظفر کی شخصیت کی عکاسی ہوتی ہے :

یا مجھے افسرِ شاہانہ بنانا ہونا      یا مرا ناچ گدایانہ بنانا ہونا  
ورنہ اسسا جو بنایا نہ بنانا ہونا

یہ تو صرف ظفر کے ذاتی تجربات ہی ہو سکتے ہیں۔ یہ ان کی واردات ہیں اور ان میں ان کی اپنی داخلیت کا شدید اثر موجود ہے۔ اگر کہیں استاد ذوق نے نوک پلک درست کر دی تو اس سے چنداں فرق نہیں پڑتا۔ اسی ذاتی درد و ناستف نے ظفر کے لب و لہجہ میں

بھی بڑی انفرادیت اور ناٹھ پیدا کردی ہے - غور فرمائیے !  
 میری آنکھ بند نہی جب ملک وہ نظر میں نورِ جلال تھا  
 کھلی آنکھ تو نہ خبر رہی کہ وہ خواب تھا یا خیال تھا  
 اس بر شاہ نصیر اور ذوق کے لہجے کا گان کرنا غلطی ہے - یہ غالب کا لہجہ بھی  
 نہیں ہو سکتا - اس میں نو ظفر کا خالص ہندوستانی آہنگ ہے - کیوں کہ غالب کے آہنگ  
 کی اٹھان تو اصفہان و شیراز سے ہوئی ہے - بنا برس اس باب کو تسلیم کرنے میں کوئی باک  
 نہیں ہونا چاہیے کہ ظفر کے کلام میں اسانڈہ کا دخل صرف ان کے انبثاع نک ہے -

### انہی عہد اور معاشرہ کی عکاسی

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بہادر شاہ ظفر روحِ عصر کے ترجان نہی  
 کیوں کہ جس دور میں شاہ عبدالعزیز جسے بزرگ ، سد احمد شہید جسے بطلِ جلیل  
 اور شاہ اسماعیل جسے جری مجاہد موجود ہوں ، جہاں غالب جیسا شعلہ نوا شاعر زمزمہ  
 پیرا ہو ، اس دور کو ذہنی تعطل کا دور نہیں کہا جا سکتا - بلکہ یہ کہنا درست ہے  
 کہ اسلامانِ برصغیر کے دل و دماغ میں اس وقت ایک ایسی حات آفرین حرکت  
 پائی جاتی تھی جس نے انجامِ کار بہاں ایک آزاد مملکت پیدا کر دی - یہ حرکت اور یہ  
 جنبش ہمیں کلامِ ظفر میں محسوس نہیں ہوتی - ان کے ہاں نہ خود اعمادی ہے اور نہ  
 عظمتِ انسانی کا احساس ، نہ انانیت ہے نہ فخرِ زست - جہاں غالب کو کائنات میں ایک آگ  
 کی لہر دوڑنی نظر آتی تھی ، وہاں ظفر کو صرف حزن و ملال کا دھواں دکھائی دیتا تھا -  
 اس لحاظ سے وہ انہی عہد کی عکاسی نہیں کرتے - ان کا اتنا ذاتی غم اس قدر ہمہ گیر ہے  
 کہ انہیں اور کچھ سوچنا ہی نہیں اور نہ ہی انہیں کچھ اور دکھائی دیتا ہے -  
 ہاں نہ ضرور ہے کہ جہاں تک نفاسنوں کا تعلق ہے وہ مغلبہ تہذیب کے تمام  
 اسالیمِ حباب کی شدت سے دہری کرتے تھے - ہفتہ وار دہلی میں سواری ، خلقت کا  
 ہجوم ، سلاطین کی سوارناں اور امراء کی قلعہ سے واستگی ، مغلبہ دور کی تہذیب و سائنس کی ،  
 آداب و رسوم ، نہ سب کچھ ظفر کے ہاں نظر آ جاتا ہے - اس لحاظ سے وہ یقیناً  
 مظہرِ تہذیب ہیں -

### ادب اور شعر پر ظفر کا احسان

زبان کو سسہ اور رفتہ بنانے میں بہادر شاہ ظفر کا بڑا ہاتھ ہے - عربی اور  
 فارسی کے الفاظ اور مرکبات کے علاوہ انہوں نے ہندی اور پنجابی کے الفاظ بھی بڑی  
 خوبی کے ساتھ استعمال کیے ہیں - انہوں نے یہ بختگی بڑے ریاض سے حاصل کی تھی اور یہ ان

کے کلام کا طفرائے استباز کہی جا سکتی ہے۔ قلعہٴ معلیٰ، روزمرہ اور محاورہ کی نکسال تھا۔ انہوں نے وہاں کے روزمرہ اور محاورہ کو بھی اپنے کلام میں محفوظ کر لیا ہے۔ اس لحاظ سے وہ شاہ نصیر اور ذوق سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ تہذیبی عناصر کی جو گونا گونی ظفر کے ہاں ہے وہ اور کہیں نہیں ملے گی۔ نظیر اکبر آبادی نے نہ گونا گونی پیدا کرنے کی کوشش کی اور ان کی شاعری واقعی عوام کی زندگی اور ان کی دلچسپیوں کا مظہر ہے، مگر ظفر کی سی نفاسیں ان کے پاس نہیں۔ ذہنی اور قلبی لحاظ سے ظفر اپنے آبا و اجداد کی اقدار کے وارث تھے اور نہ اقدار بڑے حسن کے ساتھ انہوں نے اپنے کلام میں منتقل کر دیں۔ اور اس بات کا احساس ان کے دل میں بھی تھا، حاتمہ انہوں نے بجا طور پر فخر نہ لہجے میں کہا :

ہے نقدِ سخن رائجِ عالم میں ظفر اسی  
منہ کھول دینے ہم نے مدد سے خزانوں کے

جیسا کہ بسترِ ابرس بنانا جا چکا ہے، بہادر شاہ ظفر کی انی ذات بھی انک خاص قسم کی معنویت رکھتی ہے۔ اس سے بھی ان کا کلام لبریز ہے۔ اس شعر میں وہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں :

ظفر ہو کموں کو نہ عالم بسدِ درِ سخن  
کہ ہر فکر رسا، دل صفا، دماغِ اولیٰ

انی اس معنویت کو انہوں نے حافظی، عرفی، حسرو اور میر سے استفادہ کر کے بھی حاصل نہ کیا۔ اس استفادہ کا ذکر بھی انہوں نے خلوص سے کیا ہے۔ ان کی اہمیت سے قلعہٴ معلیٰ میں مساعری ہوئے۔ سہرے مساعروں میں بھی ان کی غزلیں بڑھی گئیں۔ اس طرح ان کی فضا میں رکھ رکھاؤ اور آدابِ محفل کے علاوہ انک خاص قسم کا وفار پیدا ہو گیا اور انک اسی رست پیدا ہو گئی جس کا نقشہ مرزا فرحب اللہ بنگ نے ۱۸۴۵ء (۱۲۶۱ھ) کے مشاعرے میں کیا ہے۔ ان تمام امور کی وجہ سے بہادر شاہ ظفر کو ادبِ اردو کی تاریخ میں اک جھوٹا مگر منفرد مقام ضرور حاصل ہے۔

## (د) تلامذہ ذوق

شیخ محمد ابراہیم ذوق کے تمام سوانح نگار اور نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ ان کے یہاں غیر معمولی قدرتِ کلام پائی جاتی ہے اور ان کی مسبقہ سخنوری بے مثال ہے۔ ممکن ہے کہ تخلیقی اظہار کے ناثراتی، منطقی اور نفسیاتی تجربے کے اس دور میں ان دونوں عناصر کو کوئی خاص اہمیت نہ دی جائے اور مسبقہ و مراولت کے کمال کو محض زبان و بیان کی طلسم بندی قرار دے کر نظر انداز کر دیا جائے، کسوں کہ صرف قدرتِ کلام یا مشق محض، آفاقی صداقتوں، زندگی کے گہرے تجربوں، رومانی کرب اور رفعتِ فکر کا بدل نہیں ہو سکتی۔ لیکن نہ مشق اور قدرتِ اسنادی ساگردی کے سلسلے میں خاصی اہم ہو جاتی ہے۔ استاد کی مسبقہ اور فادر الکلامی ساگردی میں فنی یخگی کا احساس پیدا کرتی ہے۔ اساد کا کام فطری صلاحیت کو صحیح خطوط پر نسو و نما دینا، چمکانا اور ابھارنا ہے۔ وہ اپنے تلامذہ کو فن کے اصول و نکات سے نا خبر کرنا ہے، زبان و مان کی لطافتوں اور نزاکتوں سے آگاہی بخشتا ہے، نئے ذہن کو بے اصولی اور بے راہ روی سے بچاتا ہے، ”طریقہ راسخہ شعرا“ سے آسنا کرنا ہے اور نئی نسل کو پرانی نسل کے سہیلی ورے کا امن بنا دیتا ہے۔ ذوق سے اچھے اسناد کی ساری خوبیاں موحود نہیں اور ان سب پر مسزاد یہ کہ وہ کسی خاص رنگ کے پابند بھی نہیں تھے۔ کسی خاص رنگ کے پابند نہ ہونے کو انفرادیت کے فقدان سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ انفرادیت کا فقدان فن پر یقیناً اثر انداز ہوا ہے لیکن اسادی کے مرتبے کو بڑھانا بھی ہے۔ وہ اساد جو منفرد اندازِ فکر و بیان کا مالک ہوا ہے اپنے تلامذہ میں بھی وہی منفرد انداز پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کوشش کے نتیجے میں اکثر تلامذہ کی انفرادیت محروح ہوئی ہے کسوں کہ وہ خود بھی اساد کے منفرد انداز کو اپنانے پر تیار ہو جاتے ہیں اور ان کی حیثیت ایک مقلد کی سی رہ جاتی ہے۔ اردو شاعری میں اسادی ساگردی کے سلسلے میں جو اعتراض عام طور سے دہرایا جاتا ہے وہ یہی ہے کہ استاد ساگردی کی انفرادیت کا گلا گھونٹ کر اسے اپنے مخصوص رنگ کا پیرو بنا لینا ہے۔ لیکن نہ اعتراض پر اساد کے سلسلے میں درست نہیں ہے۔ وہ استاد جو بذاتِ خود کسی منفرد فکر یا انداز کا مالک نہیں ہوا، اپنے تلامذہ کو کسی خاص انداز کی پیروی پر مجبور نہیں کرنا۔ بلکہ ان کے فطری رنگ کو چمکانا ہے اور ان کی انفرادیت کو نمایاں کرنے میں معاون ثابت ہونا ہے۔ ذوق اسی نوع کے اسادوں میں تھے۔

اردو شاعری میں دو اسناد ایسے ہیں جنہوں نے اپنے تلامذہ کو ان کے فطری انداز، مزاج اور فکر کے مطابق تربیت دی۔ ان میں سے ایک شیخ غلام ہمدانی مصحفی ہیں اور دوسرے شیخ محمد ابراہیم ذوق۔ مصحفی شاعری میں کسی خاص رنگ کے پابند نہیں



تھے۔ ان کے کلام کی خصوصیت انتخابیت ہے اور ان کے ہلامذہ میں بھی ہر رنگ کے کہنے والے شامل ہیں۔ آتش، منتظر، گرم، سرور، ضمیر، خلیق، اسیر سب کا انداز اور مزاج ایک دوسرے سے الگ ہے اور یہ سب مصحفی کے تربیت کردہ ہیں۔ ذوق کے یہاں بھی یہی کیفیت ملتی ہے۔ ان کے ہلامذہ میں بھی ہر رنگ کے کہنے والے موجود تھے۔ بہادر شاہ ظفر کا اپنا مخصوص مزاج اور لہجہ تھا، داغ کی سوخی اور گرمی سب سے الگ تھی، ظہیر طرز مومن کے فدائی تھے، مداف ہدایوں بصوف کے دلدادہ تھے، انور کے یہاں ایک خاص نوع کا بیکھا پن تھا، آزاد نعل کے بندے اور سلسل کے حامی تھے۔ ذوق نے ان سب کی تربیت کی، ان سب کے انداز کو جمکایا اور انہی رنگوں کو کسی کی نبرنگی پر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جس طرح مصحفی کے ہلامذہ نے لکھنؤ میں ساعری کا چراغ روشن کیا اور اردو ساعری کو پروان چڑھانا اسی طرح ذوق کے ہلامذہ نے بھی اردو ساعری میں وسعتیں پیدا کیں۔ ذوق کے ایک چہستے ساگرد آزاد نے نظمِ اردو کو رائج اور مقبول بنانا اور سلسلہ ذوق ہی کے ایک شاعر یعنی امبال نے اردو ساعری کو وہ رنگ و آہنگ عطا کیا جو بالکل نیا اور انوکھا تھا۔ مصحفی کی طرح ذوق کے گرد بھی ہلامذہ کا بڑا حلقہ بن گیا تھا جس میں شاہِ وقت، بہادر شاہ ظفر سے لے کر عام آدمی تک سب ہی شامل تھے۔

یوں تو ذوق کے ساگردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن وہ ہلامذہ جس سے ذوق کا نام روشن ہوا اور سلسلہ ذوق کی روایت آگے بڑھی، بہادر شاہ ظفر، نواب مرزا خان داغ، محمد حسین آزاد، ظہیر دہلوی، انور دہلوی، مداف ہدایوں اور حافظ سلام رسول ویران ہیں۔ ان ہلامذہ میں بہادر شاہ ظفر نے ذوق کے علاوہ دوسرے اساتذہ سے بھی مضامین اٹھانا تھا۔ انہوں نے ابتدا میں شاہِ نصیر سے اصلاح لی۔ جب شاہِ نصیر دکن چلے گئے تو کاظم حسین بھرار کچھ دن تک یہ خدمت انجام دے رہے۔ جب وہ بھی دلی سے باہر چلے گئے تو ذوق استاد مقرر ہوئے اور وہ ابی وفات ۱۸۵۳ء (مطابق ۱۲۷۱ھ) تک اصلاحِ اسعار کی خدمت پر مامور رہے۔ ذوق کی وفات کے بعد یہ خدمت مرزا اسد اللہ خان غالب کے سپرد ہوئی۔ ۱۸۵۷ء میں یہ سلسلہ درہم درہم ہو گیا چونکہ ذوق نے عمرِ عزیز کا گراں بھا حصہ بہادر شاہ ظفر کے اسعار کی اصلاح میں صرف کیا تھا، اس لیے ظفر کو دراصل انہیں کا ساگرد سمجھنا چاہیے۔

ظفر

اردو شاعری میں ممتاز مقام اور طرزِ خاص کے مالک ہیں۔ ان کی ساعری ان کے عہد کی عام شاعری کی طرح زبان و بیان کی شاعری ہے۔ سنگلاخ زمینیں، مشکل قوافی،

ٹیڑھی ردیفیں ، روزمرہ اور محاورہ بندی کا التزام ، سیر حاصل غزلیں ، یہ ان کی شاعری کی خصوصیات میں سے ہیں ۔ لیکن ظفر کی شاعری صرف فادر الکلاسی کا مظہر نہیں اس میں کچھ اسے عناصر بھی ہیں جنہیں غالب نے ”چیزے دگر“ سے تعبیر کیا ہے<sup>(۱)</sup>۔ ظفر کی شاعری ہر ذوق کا اثر بہت گہرا اور واضح ہے لیکن اسے ذوق کا کلام نہیں فرار دیا جا سکا ۔ ظفر اور ذوق کے معاشرتی منصب ، ماحول اور مزاح میں حروف ہے وہی فرق دونوں کے کلام میں بھی نمایاں ہے ۔ دونوں کا انداز فکر واضح طور پر مختلف ہے ۔ اسی اختلاف کی روشنی میں متعدد نقاد نگاروں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ظفر کا کلام خود انہیں کی فکر کا نتیجہ ہے ۔ ظفر کی ادبی شخصیت اور ان کے کلام پر تفصیلی حصہ مچھلی فصل میں ہو چکا ہے ۔ ہاں صرف یہ عرض کرنا مقصود تھا کہ ذوق کے نلامذہ میں ظفر کو امتیازی خصوصیت حاصل بھی ، بلکہ نہ کہنا صحیح ہوگا کہ ظفر سلسلہٴ دو کی اہم ترین شخصیت تھے ۔ نلامذہ ذوق کا کوئی تذکرہ ظفر کے بعد مکمل نہیں ہو سکا ، کہ ابتدا انہیں سے ہوئی ہے ۔

### داغ

سلسلہٴ ذوق کا دوسرا اہم نام نواب مرزا خان دلع دہلوی المتوفی ۱۹۰۵ء کا ہے ۔ داغ اردو شاعری میں ایک منفرد غزل گو کی حیثیت سے بہت نمایاں ہیں ۔ ان کا تفصیلی تذکرہ جلد چہارم میں ہوگا ۔ یہاں صرف مختصر طور پر انہیں ذوق کے ایک شاگرد کی حیثیت سے پس کیا جا رہا ہے ۔ داغ کو بھی ذوق سے غیر معمولی عمدت بھی ۔ ۱۹۰۳ء کے دہلی دربار کے موقع پر عبدالرزاق کسوری داغ سے دہلی میں ملے تھے اور ان سے کچھ غزلیں بھی سنی تھیں ان کے بقول ”بس مٹ میں غزل خوانی خم ہوئی ۔ میری زبان سے برجستہ نکلا کہ آج میں نے داغ نہیں بلکہ دو عالمہ الرحمة کی زبان سے یہ غزلیں سنی ہیں ۔ ذوق کا نام لے لے ہی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ اور چند منٹ تک خاموشی رہی“<sup>(۲)</sup>۔ ذوق کا نام سننے ہی آنکھوں میں آنسو بھر لانا داغ کی عقیدت اور سبقتی کا زندہ ثبوت ہے ۔

ذوق اور داغ دونوں میں استاد ساگرد کی حیثیت سے غیر معمولی مماثلت پائی جاتی ہے ۔ دونوں کو استاد سہا ہونے کا سرف حاصل ہوا ۔ دونوں کے نلامذہ کا حلقہ بڑا وسیع تھا ۔ دونوں زبان و بیان کے ساعر تھے اور فرای گورکھپوری کے بقول ”ذوق کی اردو سے داغ کی اردو بنی“<sup>(۳)</sup>۔ دونوں میں فرق ہے تو یہ کہ ”داغ کی سوخ بیانی نے اس میں

(۱) مشہور منکر کہ در اشعار ابی قوم ۔ درائے شاعری چیزے دگر ہست  
(۲) عبدالرزاق کانپوری ، یاد ایام ۔ ص ۲۵۵ - ۲۵۶ ، عبدالحق اکیڈمی حیدر آباد دکن دسمبر ۱۹۴۶ء  
(۳) فرای گورکھپوری ، اندازے ۔ ص ۱۴۹ ادارہ فروغ اردو لاہور

(ذوق کی اردو میں) ایک شدت اور نیکھا پن پیدا کر دیا۔ داغ کے چہچہے اور معجز نما جھلاہٹ جس پر پیار کا دھوکا ہو جانا ہے داغ کی سنہا ملکیت ہے۔ داغ کی اردو ذوق کی اردو کی نرم آہنگ تثریب سے کچھ الگ ہو گئی (۱)۔ چند اسعار نمونے کے ملاحظہ کیجیے :

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان نو گیا  
جھوٹی مسم سے آپ کا امان نو گیا

☆ ☆ ☆

جانتا ہوں کہ مری جان ہے تو اور میں جان سے بیزار نہ کیا

☆ ☆ ☆

سن کے اللہ کی معرفت کہا اس بے نے  
تو نے ہم میں تو کوئی عیب نکالا ہونا

☆ ☆ ☆

جواب اس داف سے بھی فی الفور ہوگا  
دے آپ سے وہ کوئی اور ہوگا

☆ ☆ ☆

چھپایا بہت ہم نے ہلو میں دل  
کوئی لینے والا مگر لے گیا

☆ ☆ ☆

تقلید سے زاہد کی حاصل ہمیں کیا ہونا  
انساں نہ ملک بنتا بندہ نہ خدا ہونا

آزاد

بلامذہ ذوق کا تسرا نام، جس کا تفصیلی تذکرہ جلد چہارم میں ہو گا، محمد حسین آزاد المونی ۱۹۱۰ء کا ہے۔ آزاد اردو ادب میں اپنی ساعرانہ نثر کی وجہ سے ممتاز حیثیت کے مالک ہیں اور ان کا شاہز اردو نثر کے عناصرِ خمسہ میں ہونا ہے۔ آزاد کو جدید اردو شاعری کے بانی ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ انہیں کی کوشش سے نظمِ اردو

کے مشاعروں کی ابتدا ہوئی اور شعرا سنجیدگی کے ساتھ نظم گوئی کی طرف متوجہ ہوئے۔ آزاد اردو شاعری کے مروجہ انداز کو بدلنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے لیکچروں اور اپنی تصانیف میں جا بجا اس کا اظہار کیا ہے۔

ذوق کے انتقال کے بعد آزاد نے حہ دن حکیم آغا جان عس دہلوی سے بھی مسورہ سخن کا بھا<sup>(۱)</sup>۔ لیکن وہ ہمیشہ اپنے آپ کو بلمیذِ خافانی ہند ہی لکھتے رہے اور اسی نسبتِ نلمذ بر فخر کرتے رہے۔ انہوں نے ذوق کا نام بلند کرنے کی مسلسل کوشش کی۔ اس کوشش میں وہ بعض جگہ نوازن بھی قائم نہ رکھ سکے۔ استاد برستی کی دھن میں انہوں نے بعض جگہ ذوق کے معاصرین اور اسانڈہ کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور استاد کے کلام کو اسے عہد سے مطاب کرنے کے سوف میں جا بجا اصلاح سے بھی کام لیا۔ اپنی طرف سے بھی غزلں کہہ کر استاد کے دیوان میں شامل کر دیں<sup>(۲)</sup>۔ عقیدت مندی کی ایسی مثال آزاد کے سوا اور کہیں نہیں ملتی۔

آزاد ذوق سے جس حد تک سابر تھے۔ اس کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اسے اکلوتے بیٹے کا نام ابے اسناد کے نام محمد ابراہم رکھا لیکن بر بنائے احترام استاد انہیں آبرو کہہ کر نکالے تھے۔ ذوق کا قبض آزاد کی پوری زندگی میں جاری و ساری نظر آتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ آزاد جسے اسناد برست کم پیدا ہوئے ہیں۔ بین اسعار بطور نمونہ درج ذیل ہیں :

دیکھنا فیدِ بعلی میں نہ آتا آزاد  
دام آتے ہیں نظر سبجہ و زنتار مجھے

☆ ☆ ☆  
بغاضا ہے گرباں کا کہ مجھ کو چاک کر ڈالو  
تما ہے یہ دامن کی اڑا دو دہجیاں میری

☆ ☆ ☆  
صنم ہے گردشِ عالم نگاہِ مہر سے نیری  
اگر تو مہربان ہونا تو عالم مہربان ہونا

ظہیر

راقم الدولہ سید ظہیر الدین حسین ظہیر دہلوی کا شمار بھی ذوق کے

(۱) آزاد، آبِ حیات - ص ۴۰

(۲) تفصیل کے لیے دیکھئے - شمس العلماء حسین آزاد اور دیوان ذوق از حافظ محمود شیرانی شائم  
شدہ رسالہ ہندوستانی الہ آباد

ارشاد تلامذہ میں ہوتا ہے۔ ظہیر کا تعلق دلی کے ایک معزز خاندان سے تھا۔ ان کے دادا میر امام علی شاہ خطِ نسخ میں بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے اور ان کے والد شاہ جلال الدین حیدر المخاطب بہ حلاج الدولہ مرصع رقم خان بہادر بھی دلی کے مشہور خوش نویس تھے۔ ظہیر نے اپنے حالات ’داسانِ غدر یا طرازِ ظہیری‘ میں بڑی تفصیل سے لکھے ہیں۔ انہی ساعری کے ابدائی دور اور ذوق کے ساگرد ہونے کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں ”(ابدا میں) ایک دو غزلیں بھی ٹوٹی بھوٹی لکھیں اور ماں نبی بخش صاحب (نبیرہ ساہ نصیر) کو دکھائیں لکن والد صاحب منع فرمائے تھے کہ تو شعر نہ لکھا کر، حالانکہ خود شاعرِ لاجواب تھے۔ شاہ نصیر صاحب کے ساگرد تھے۔ غرضکہ انہیں ایام میں حافظ قطب الدین صاحب شہر ساگرد ساہ نصیر صاحب مرحوم نے ساہ صاحب کے مکان میں مشاعرہ قرار دیا۔ چونکہ مکانِ مشاعرہ میرے مکان سے بہت فاصلہ تھا میں سائلِ بزم ہونے لگا۔ اول غزل میں نے اسی مشاعرے میں پڑھی ہے اور جناب شیخ محمد ابراہیم صاحب ذوق خافائی ہند کا جا کر ساگرد ہوا۔ داع صاحب بھی سرکِ مشاعرہ تھے۔“

ظہیر بیرہ برس کی عمر سے بائیس برس کی عمر تک بہادر شاہ کے داروغہ فور سگی رہے۔ بہادر شاہ نے انہیں راقم الدوا، کا خطاب بھی عطا کیا تھا۔ ۱۸۵۷ء تک ظہیر نے دہلی میں بڑا اچھا وقت گزارا۔ دن رات شعر و ساعری کے حرحرے رہے۔ یہ زمانہ دہلی میں اردو شاعری کا زریں زمانہ تھا۔ ظہیر اپنے بارے میں لکھتے ہیں کہ ”۱۸۵۷ء کے چار ناخ سال کے بعد جب وہ دہلی آئے تو مفتی صدر الدین آزدہ، نواب مصطفیٰ خان شیفہ، حافظ غلام رسول صاحب ویران کی صحبت میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ ان کے ہاں شعر و ادب کا ذکر ہوتا ہی رہا تھا۔ مرزا اسد اللہ خان غالب کی خدمت میں جانے کا اتفاق بھی ہوا تھا۔ اور اگرچہ اصلاحِ سخن کسی سے نہیں لی مگر ان کا ملین کے کلام کو دیکھ کر ان سے استفادہ کیا اور اپنی طبع کے زور سے ان ستنوں اسادانِ وقت، یعنی ذوق، مومن، غالب کے کلام کا لبِ لباب اخذ کر کے انہی طرزِ جداگانہ اختصار کی۔ شیخ ذوق صاحب مرحوم کی بوزبان اور محاورات کی بروی اختصار کی۔ مومن صاحب کے مضامین اور نازک خیالی و سوز و گداز کا اساع کیا۔ مرزا غالب صاحب کی بدس و ترکبات کی تقلید اختیار کی“ (۱) ظہیر کا یہ بیان بہت اہم اور معنی خیز ہے بظاہر تو وہ ذوق و مومن و غالب سب کی خواہ چنی کے مدعی ہیں لیکن ان کے کلام در سب سے زیادہ اور گہرا اثر مومن کا ہے۔ انہوں نے خود اعتراف کیا ہے۔ مثلاً :

طرزِ مومن سے نہ آگاہ تھے جب تک کہ ظہیر

سج تو یہ ہے کہ کبھی رنگِ غزل نے نہ دیا

مومن کی نزاکتِ خیال، عشق کا پرسوز تصور، انداز کا بانکپن اور لہجے کی گھلاوٹ ظہیر کے یہاں بھی بہت نمایاں ہے۔ ان کے بعض اشعار پر مومن کا دھوکا ہوتا ہے۔ درج ذیل اشعار جو کلامِ ظہیر سے کسی خاص کاوش کے بغیر چن لیے گئے ہیں اس ضمن میں مثال کے طور پر بس کہے جا سکتے ہیں :

اعجازِ دلفریبی اندازِ دسکھنا  
ہر ادا پہ مجھ کو گمانِ نظر رہا

☆ ☆ ☆

یہ کہے اپنا ہی جی نہ چاہا، وگرنہ خوفِ رسب کبا بھا  
کہ آپ آنے کو آڑ کے آنے زمیں پہ نقشِ قدم نہ ہونا

☆ ☆ ☆

آساں نہیں ہے سرجِ بے سوریِ اسساں  
ہلے ریانِ درد ہو پیدا کرے کوئی

☆ ☆ ☆

رجِ راحت اور نہ ہو جائے  
درد کا دل میں گھر نہ ہو جائے

☆ ☆ ☆

اُسا سا حانتے ہیں وہ اہلِ حہاں کا حال  
سوخی رکھا ہے نام مرے اضطرار کا

☆ ☆ ☆

کچھ ہو ہوئے ہیں محبت میں حنوں کے آثار  
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیے ہیں

☆ ☆ ☆

کوئی یوچھے ہو سہی ہم سے ہماری روداد  
ہم تو خود سنو میں افسانہ بنے بیٹھے ہیں

ان اشعار میں طرزِ مومن کی دلبری کا اثر بہت واضح ہے۔ یہی ظہیر کا خاص رنگ ہے۔ پھگی، سوچی، سکھا بن، زبان و بیان کی دلکسی اور برجستگی، ظہیر کی غزل کے نمایاں اوصاف ہیں۔ ذوق کے بلامذہ میں ظہیر اور ان کے برادرِ خورد انور دونوں کے یہاں یہ رنگ پایا جاتا ہے اور دونوں اپنے کلام کی وجہ سے الگ بیٹھاتے جاتے ہیں۔ چنانچہ ظہیر اپنی شاعری کی وجہ سے مقبولِ خاص و عام رہے۔

ظہیر کا پہلا دیوان 'گلستانِ سخن' ۱۸۹۸ء (۱۳۱۶ھ) میں مطبعِ مفیدِ عام آگرہ سے شائع ہوا تھا۔ دوسرا دیوان 'سنبلستانِ عبرت' کے نام سے مطبعِ کریمی بمبئی سے ۱۹۱۱ء (۱۳۲۹ھ) میں شائع ہوا۔ ان کے علاوہ ظہیر کے پاس اور بہت سا کلام اور ایک جلد

مرائی ، سلام اور رباعیات کا سرمایہ موجود تھا<sup>(۱)</sup> جسے وہ شائع کرنا چاہتے تھے ، لیکن یہ تمنا پوری نہ ہوئی ۔ ظہیر کے دونوں دیوانوں کا انتخاب مولانا حسرت موہانی کے انتخاب سخن میں شامل ہے ۔

ظہیر کا ایک اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے جھوٹے بھائی امراؤ مرزا انور اور حافظ غلام رسول ویران کے استراک سے اپنے اساد ذوق کا دیوان مرتب کر کے شائع کیا تھا ۔ ظہیر نے ایک اور شعری مجموعہ ’نگارسانِ سخن‘ کے عنوان سے ۱۸۶۲ء (۱۲۷۹ھ) میں شائع کیا تھا جس کے ساتھ کالمی صفحات میں ذوق ، ہومن اور غالب کا کلام ایک ساتھ اشاعت پذیر ہوا تھا ۔ آخر کے صفحات میں ظہیر نے اپنا کچھ کلام بھی سنس کا تھا ۔ اس مجموعے میں ذوق کا کچھ اسکا کلام بھی شامل ہے جو ذوق کے کسی دیوان میں نہیں ہے<sup>(۲)</sup> ۔

### مرزا انور

سید شجاع الدین عرف امراؤ مرزا انور دہلوی ظہیر کے جھوٹے بھائی تھے ۔ انور نے اوائل مشق میں ذوق سے اصلاح لی تھی ۔ ذوق کی وفات کے بعد مرزا غالب کو بھی اپنا کلام دکھانا تھا ۔

انور خوش گو ساعر اور اچھے خوش نوس تھے ۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد کم و بیش چار سال رام پور میں مقیم رہے ۔ بعد ازاں ارسطو شاہ مولوی رحب علی کے چھائے خانے میں محاس روئے ماہوار پر بصنفہ کاتب ملازم ہو کر جگراؤں چلے گئے ۔ ظہیر جب الور میں ملازم ہوئے تو انور بھی وہیں چلے آئے اور راجہ سو دھان سنگھ کے دربار سے وابستہ ہو گئے ۔ الور سے دہلی والوں کا اخراج ہوا تو انور نے بھی ظہیر کی طرح جے پور کا رخ کیا اور نای عمر یہیں گزاری ۔ سول ظہیر ۱۸۸۳ء (۱۳۰۲ھ) میں دلی میں ان کا انتقال<sup>(۳)</sup> ہوا ۔

انور عین عالم جوانی میں دنیا سے رخصت ہوئے لیکن انہوں نے اپنی طبعی ، خوش فکری اور ذہانت سے اردو ساعری میں بلند مقام حاصل کر لیا تھا بلکہ مرتبہ اسادی کو بھی پہنچ گئے تھے ۔ بقول ظہیر ، ”انور نے متروک ساعری کے علاوہ نقب و کرہہ اور غیر فصیح الفاظ کو بھی ترک کیا ۔ ہائے مخفی کا بمقابلہ فافہ الف کے لانا بالکل ترک کر دیا اور شاگردوں سے بھی ترک کرایا اور اسباب ہا بھی ناخاطر فرار دیا ۔ سسہہ مثال کو ترک کر کے اس کے عوض

(۱) ظہیر الدین ظہیر ، داستانِ عذر - ص ۲۵۲

(۲) ذوق کا کچھ نایاب کلام شاہ عطا الرحمن کا سائے سیدہ رسالہ ’معاصر‘ - پٹنہ اگست اور دسمبر ۱۹۵۷ء

(۳) تقریباً از ظہیر دہلوی - نظم دلفروز معروف بہ دیوان انور - ص ۱۳۹ ، مطبع رفاه عام لاہور ۱۸۹۹ء

استعارہ اور ابہام کو قائم کیا“<sup>(۱)</sup> نہ سب نابینا ہی جبکہ بالکل صحیح ہیں لیکن انور کی شہرت کا سبب فنِ شعر کے اصولوں کا تعین یا اصلاحِ زبان نہیں ہے۔ ان کی شہرت کا دار و مدار طرزِ مومن سے متاثر ہو کر ایک نئی راہ نکالنے پر ہے جس میں سوخی، گرمی اور نانکین بہت نمایاں ہے۔ انور کے کلام پر ذوق، مومن اور غالب کا اثر بھی ہے۔ لیکن ان کی حشیش ایک مغلہ کی نہیں۔ وہ ہر جگہ اسی انفرادیت کا اظہار کرتے ہیں۔ قادر الکلامی و برگوئی بھی انور کی خاص خصوصیت ہے۔ مشکل اور سنگلاخ زمیوں میں انہوں نے سہ عرلے اور چو غرلے لکھے ہیں مگر برگوئی کے باوجود اسے طرزِ خاص کو ہر جگہ قائم رکھا ہے۔ انور نے اکثر غزلیں غالب اور مومن کی زمیوں میں لکھی ہیں اور ان میں خوب صورت شعر بکال لیے ہیں۔ مومن اور غالب کی زمیوں میں انور کی گل افشائی اسعہ کا نمونہ دیکھیے :

گودا کہ سب غلط میں مری بدگماں      دیکھیے سو کوئی شکل تمہاری حیا کے ساتھ  
ہیں نفس دل میں عمر کی حادو مائیں      ناموں میں اے گناہیں گھر تک لگا کے ساتھ  
آنا ہے بوئے دوست میں کافر سا ہوا      فاصلہ ہی آگ رہیب ہے اتنا حیا کے ساتھ

☆ ☆ ☆

کچھ کچھ وہ حیرتِ لطف کی کم کم عتاب میں      حی ہے اسد و دس سے کس کس عذاب میں  
انور کے بعض اسعار نے صربِ الغزل کی حسبِ احساں درلی ہے :

نہ ہم سمجھے نہ آب آئے کہیں سے      دسہ سوچھے انہی حذر سے  
☆ ☆ ☆

کسی حیا کہان کی وفا ناسِ حلق کا      ہاں نہ سہی نہ آپ کو آنا ہاں نہ بھا  
انور کو نرساں حالی اور مصائب نے ایسی فرصت نہ دی کہ وہ اپنا دیوان خود مرتب کرتے۔ ان کی وفات کے بعد لالہ سری رام نے مسعود مسودوں سے ان کا دیوان ’نظمِ دلفروز‘ کے نام سے مرتب کر کے ۱۸۹۹ء میں مطبعِ رفاهِ عام لاہور سے شائع کیا۔ لالہ صاحب کے بقول ”نہ دیوان ان کے کلام کا آٹھواں حصہ بھی ہیں اور نہ کہ انور کے دو مکمل دیوان تلف بھی ہوئے، جن میں سے ایک خاص حمد و نعت و تصوف میں تھا“<sup>(۲)</sup>۔ بہر حال اب بھی جو کلام ’نظمِ دلفروز‘ میں موجود ہے وہ انور کے نام کو

(۱) تقریظ از ظہیر دہلوی - نظمِ دلفروز معروف بہ دیوان انور - ص ۱۴۷، مطبعِ رفاهِ عام لاہور

- ۱۸۹۹ء

(۲) سری رام، خم خانہ جاوید جلد اول - ص ۸۲



زندہ رکھنے کے لیے بہت کافی ہے۔ اس دیوان کا ایک اچھا انتخاب مولانا حسرت موہانی نے 'انتخابِ سخن' میں سائے کیا ہے۔

انور نے دیوانِ ذوق کی ترتیب و اساعت میں بھی نمایاں حصہ لیا تھا۔ اس کا تذکرہ ہم طہیر دہلوی کے ضمن میں کر چکے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے تقریباً دس سال بعد دلی میں مشاعروں کا سلسلہ ارسر نو شروع ہوا تھا۔ ان مشاعروں میں مر مہدی مجروح، قربان علی بیگ سالک، ارسد مشائ، عرب و عربہم سرک ہوئے تھے۔ مگر مشاعروں کی روحِ رواں انور تھے اور ان کی عزل حاصلِ مشاعرہ سمجھی جاتی تھی<sup>(۱)</sup>۔ انور کی عمر نے وفا نہ کی، ورنہ وہ بساً عدم المال شاعر ہوتے۔ ذوق کے بلائذہ میں انہیں استاز حاصل ہے اور اردو کے حوس فکر شعرا میں بھی انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

### ویران

حافظ غلام رسول ویران ذوق کے حاضر ناس، پر وندہ کے رفیق ساتھی اور کلامِ ذوق کے حافظ تھے۔ تذکرہ نگاروں نے ویران کو در حور اعسا نہیں سمجھا، حنائیہ شعرائے اردو کے تذکرے ان کے ذکر سے حالی ہیں۔ ویران دہائی سے محروم تھے مگر بقول آزاد "خدا نے نصرت کی آنکھیں اسی روشن کی ہیں کہ نصرت کے محتاج ہیں تھے"<sup>(۲)</sup>۔ تذکرہ نگاروں کے اعراض کی وجہ سے ویران کے ذاتی حالات مظہرِ عام نہ رہیں آئے۔ ان کے بارے میں صرف اتنا علم ہے کہ وہ بھی قلعے کے سوسلس میں سے تھے اور بہادر شاہ کوہِ قطعات و فصائدِ بہت پس کرتے تھے۔ ساہتی قلعہ کے بعد لیس گنج دہلی میں رہے لگے تھے۔ ۱۸۸۷ء (۱۳۰۵ھ) میں فوت ہوئے "خاکِ سدہ حواہ" تاریخِ وفات ہے جو اپنی وفات سے دو برس پہلے کافی تھی۔ حضرت حواہ نانی ناتھ کی درگاہ میں دفن ہوئے۔ لوحِ سرار پر یہ شعر کندہ ہے:

فانجہ مرفدِ ویران بہ بھی سڑھے حاسا

ان سے کہہ دو جو ہیں اس رہ سے گرتے والے<sup>(۳)</sup>

ویران نے غالباً دیوان بھی مرتب نہیں کیا تھا۔ دراصل ان کی اہمیت ان کے کلام کی وجہ سے ہے بلکہ ان کی اہمیت کا سبب ذوق کی ہمہ وقتی رفاقت ہے۔ اس رفاقت کی وجہ سے ذوق کے دوسرے تمام بلائذہ انہیں محرم سمجھتے تھے۔ ویران کو

(۱) سری رام، خم خانہ حاوید جلد اول - ص ۳۸۲

(۲) آزاد، مرتب دیوانِ ذوق - ص ۲۸ - ۲۹

(۳) ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ذوق - سوانح اور انتاد - ص ۳۱۱، ۳۱۲ مکتوب ویران بنام آزاد - مجلس ترقی ادب -

ذوق کا پیشتر کلام بھی زبانی باد بھا - چنانچہ ظہر و انور کے ساتھ انہوں نے بھی دیوانِ ذوق کی تریب میں بڑی محنت کی تھی -

ویران اپنے استاد کے جاں نثاروں میں تھے - انہیں ذوق سے بڑی عقیدت تھی اور وہ ذوق کے خلاف ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں کرتے تھے - دلی کے ایک شخص اموجان نے ذوق کے کلام پر کچھ اعتراض کیے تھے - ویران اس سلسلے میں آزاد کو لکھتے ہیں ”اموجان کی کیفیت یہ ہے کہ ایک شخص نار علی جو ساہی مطبع میں ناساہ کے دیوان کی کاپی لکھتا تھا اس کا رسمہ دار ہے - اس کے باپ کا نام علی جان ہے - مرے بھی سسرال کے بعد رستے داروں میں ہے - مولوی امام بخش صہائی سے کچھ فارسی پڑھا ہے - مرزا سے سادہ اصلاح ہو ، اس کو محاورے سے کہا بھلی - گو مدرس ہو کر مواوی اور ولی بن جائے ، اساد پر اعتراض کرنا ہے ! منہ چھوٹا اور بات بڑی خوب نہیں - وہ آلو کا پٹھا محض آفتابِ رونس سے سرنگی کرتا ہے“<sup>(۱)</sup> - اس احساس کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں - ویران کا خلوص ، عقیدت اور اس کے ساتھ طبع کا غضب ناک انداز سب ظاہر ہے - اموجان غالب کے ساگرد تھے اور ولی مخاض کرتے تھے - ویران اساد برستی کی دھن میں غالب کو اپنے اعتراضوں کا نشانہ بنا کر دل کا بھار نکالتے ہیں - اسی تحریر میں آگے چل کر لکھتے ہیں ”حانچہ اس کے مرزا کے ہاں دیکھتے اور بوجھتے کہ وہ کہا محاورہ ہے ؟ حوزہ بہ قصہ نکلن پر کہان بچباند - نہ جساندن کہان کا محاورہ ہے - ایران کا بوراں کا نا ہندوسان کا اور ایک جگہ کی ایک عرل میں ردیف حصہ اسب ، کی ہے - اس میں ، عصاخفتہ است باندھا ہے - یہ عصاخفتہ کہان کا محاورہ ہے اور ع پہلے ٹھونکی ہے مرے ناخنِ تدبیر میں کل ، ٹھونکی ہے کہا خوب لفظ ہے ! اور ع بھوں ناس آنکھ قبلہ حاجات چاہیے ! بھوں پاس کا لفظ ہے اور قبلہ حاجات معشوق کو کہنا ! کہا ان کے والد تھے ؟ اور معنی کا فرق دیکھئے :

آنچه در جزیه گرفتند ز گبران مٹے ناب در سبِ جمعہ نماہِ رمضانم دادند

جزیہ میں شراب کہاں لیتے ہیں اور اسے صد ہا الفاظ ہیں“<sup>(۲)</sup> - غرض یہ کہ ویران کی علمیت ، مزاج اور شخصیت ان کی اس تحریر سے پوری طرح نمایاں ہے - ساعری میں ان کا کیا رنگ تھا اس کے متعلق کچھ کہنا دشوار ہے کموں کہ ان کا کلام دسساہ نہیں ہے - لیکن تلامذہ ذوق میں انہیں یقیناً اہم مرتبہ حاصل ہے -

(۱) مکتوب ویران بنام آزاد ، مکتوبات آزاد - ص - ۱۳۰ -

(۲) مکتوب ویران بنام آزاد ، مکتوبات آزاد - ص - ۱۳۰ -

## مذاق ہدایونی

موازی دلداری علی مذاق ہدایونی جو عرف عام میں مذاق میاں کے نام سے مشہور ہیں، ذوق کے علاوہ میں اسے مسرور رنگِ سخن کے علاوہ رید و ورع، عبادت و ریاضت اور بزرگی کی وجہ سے سب سے سہرے رکھے ہیں۔ آ۔ کی مدائن ۱۸۱۹ء (۱۲۳۵ھ) میں ہدایوں میں ہوئی۔ ہدایوں۔ رام پور، لکھنؤ اور دہلی میں درسات کی تکمیل کی۔ محکماتِ بررگوں سے فیض حاصل کیا اور احارب و علاوہ حاصل کی۔ ساری عمر زہد و عبادت میں کراری۔ مریدوں کے ایک بڑے حلقے نے آپ کی ذات سے فیض اٹھانا لیا۔ وفات گیارہ اکتوبر ۱۸۹۴ء مطابق دس ربیع الثانی ۱۳۱۲ھ کو ہدایوں میں ہوئی۔ مزار آج بھی مرجع خاص و عام ہے۔

مذاق میاں دو سحرگوئی کا ذوق بچپن سے تھا۔ ابتدا میں عمار نا عبار مخلص فرماتے تھے۔ ۱۸۳۶ء (۱۲۵۲ھ) میں حب پہلی دفعہ دہلی جانے کا اعلان ہوا تو ذوق کے ساگرد ہونے اور اساد کے مخلص کی مناسبت سے مذاق مخلص افسار لیا۔ روایت ہے کہ جب آپ ذوق کی خدمت میں پہنچے تو فی الحال، یہ قطعہ پڑھا جس کو سن کر ذوق نے آپ کو سنبھلے لگا لیا :

کہا دیوں عرص سسای انا      سحر کہنا عرض بہا ساق انا  
ذوق بہا یہ نرے نلند کا      نہ مخلص کیا مذاق انا

مذاق میاں ذوق کی بوجہ اور عنایت کے بڑے معترف تھے۔ انہی بلام میں انہوں نے حاجا ذوق کی اسادی کا اعتراف کیا ہے۔ فرماتے ہیں :

میر ساق ہے تو اساد مرا ذوق مذاق      سے کدے کا ہوں فخر انی گزر حام شراب

☆ ☆ ☆

شاہ نور محمد لڑیان جہاں کا ہے مذاق      ذوق اساد برا بد کا ہے خافانی

☆ ☆ ☆

سب بوجہ سے ذوق کے ہے مذاق      یہ مزا کو نرے سخن میں ہے

مذاق میاں کے ذوق شعری اور استادی کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ مرزا صاحب انہی ایک فارسی مکتوب میں مفتی سید احمد خان بریلوی کو مذاق میاں کے متعلق لکھتے ہیں ، ”دل بہ نر آغمان سنہ ام کہ بہ عظم برانم برداخت۔ مشفق مولوی محمد دلداری علی صاحب مذاق کہ بدانتہا مدہ در معنی آفرینی نا سلطان السنرا شیخ محمد ابراہیم ذوق برابر و نہ اعتماد خویش ساگرد آن دیرینہ سخوراند آخر نہ ہمد و ہمنشیں آن والا گہر اند چرا با ادساں در سخن مشورب نرود“۔ غالب کے اس خط سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ

وہ مذاق میاں کی اسادی اور فضل و کمال کے فائل بھیے اور اس کا برملا اظہار بھی کرتے بھیے۔

مذاق میاں نے ساعری کو ہمہ وقتی مسفلے کی حسب سے اختیار نہیں کیا۔ چونکہ وہ صاحب دل بزرگ بھیے اور عشق کی آغ سے آسا بھیے اس وجہ سے شلام میں ایک خاص قسم کی کشف پیدا ہو گئی ہے۔ رواد کا احترام، گرمی ریان، مان کا ناکن اور طرفگی ان کے کلام کی نما ناں خصوصیات ہیں۔ مذاق میاں کی طبع کا رجحان حمد و نعت اور بصوف کے مضامین کی طرف زیادہ تھا۔ جماعہ ان کے شلام کا راز حصہ انہیں پر مستعمل ہے۔ وسے ان کا دیوان حملہ اصاف سحر پر مستعمل ہے۔ عرل، قصدہ، مشوی، مرثیہ، سلام، رباعی، قطعہ، نارخ غرض سب نحو و موجد ہے۔ مذاق میاں کا دیوان، 'کلام دلدار علی مذاق' (اسم تاریخی ۱۲۸۱ھ) کے نام سے شائع ہو چکا ہے اور مسعد نعتیں اور منتخبں عمدہ بھی شائع ہو چکی ہیں۔ مذاق میاں حسانہ ساعری میں ذوق کی صفائی زبان و بیان کے حامل ہیں۔ کلام کا نمونہ یہ ہے :

لوئی نار آسا نہ دم آنا رہ گیا نام آشنائی کا

☆ ☆ ☆

کریں فریاد کس سے اور کہاں جا کر دہائی دنی  
جہاں جائیں وہی سرکار، اب کیجے تو کسا کیجے

☆ ☆ ☆

ہم سے وحسی نہیں ہوت کے گرفتار کبھی  
لوگ دیوانے ہیں، زنجیر لیے پورے ہیں

☆ ☆ ☆

ظلم بے حد کا سب جان لیا دل ہی دینے کے گمباز ہیں ہم

☆ ☆ ☆

لب ہلائے نہیں اسی بھی حود آرائی کا  
بات کرنے میں بگڑ جائے گی مرزائی کا

☆ ☆ ☆

دن کے دن مل بو خدا جانے کہ بھر آئیں نہ آئیں  
رات کی رات ہیں مہمان، سحر جانے ہیں

☆ ☆ ☆

## کتابیات

- ۱ - محمد حسین آزاد آبِ حیات مبارک علی لاہور طبع چہار دہم
- ۲ - محمد ابرار علی صدیقی آئینہ دلدار کراچی
- ۳ - کیفی و حق انتخاب ذوق و ظفر انجمن برق اردو دہلی
- ۴ - فراق گورکھپوری اندازے فروغ اردو لاہور
- ۵ - مالک رام نلامدہ غالب سرکر بصف و بالف
- ۶ - احمد حسین خان حیات ذوق لاہور ۱۸۹۵ء
- ۷ - لالہ سری رام حم خانہ جاوید مطبع نولکسور لاہور ۱۹۰۸ء
- ۸ - محمد حسین آزاد حصہ اول
- ۹ - ظہیر دہلوی خم کدہ آزاد آزاد بک ڈبو - لاہور ۱۹۳۲ء
- ۱۰ - محمد حسین آزاد (مرتب) داستان غدر کرمی برس لاہور
- ۱۱ - مرتب ظہیر و انور دیوان ذوق علمی برنٹشک ورکس دہلی ۱۹۳۳ء
- ۱۲ - ڈاکٹر ننور احمد علوی دیوان ذوق مطبع احمدی ۱۸۶۲ء
- ۱۳ - ظہیر دہلوی ذوق - سوانح اور مجلس برق ادب لاہور ۱۹۶۳ء
- ۱۴ - ڈاکٹر اسلم فرخی سنبلستان سرب مطبع کرمی ممبئی ۱۹۱۱ء
- ۱۵ - ظہیر دہلوی گلزار داغ نسیم بک ڈبو لکھنؤ
- ۱۶ - ڈاکٹر اسلم فرخی گلستان سخن مطبع مفید عام آگرہ
- ۱۷ - آغا محمد طاہر محمد حسین آزاد حیات اور بصائب انجمن برق اردو - کراچی ۱۹۶۵ء
- ۱۸ - انور دہلوی مکتوبات آزاد آزاد بک ڈبو - لاہور
- ۱۹ - عبدالرزاق کانپوری نظم دل افروز مطبع رفاه عام لاہور ۱۸۹۹ء
- ۲۰ - حالی یاد ایام عبدالحق اکٹھی - حیدر آباد دکن ۱۹۳۶ء
- نادگار غالب مطبع رباح ہند علی گڑھ

## رسائل

- قومی زبان - کراچی  
معاصر - پٹنہ  
ہندوستانی - الہ آباد
- جون ۱۹۶۷ء  
اگست ، دسمبر ۱۹۵۷ء  
اکتوبر ۱۹۳۳ء تا اپریل ۱۹۳۷ء

## چھٹا باب

(الف) مومن

حکیم محمد مومن خاں دہلوی ۱۸۰۱ء (۱۲۱۵ھ) میں پیدا ہوئے۔ ان کی ولادت دلی کے مسہور محلے کوچہ جیلان میں ہوئی جس میں مومن کا خاندان آباد تھا۔ ان کے والد حکیم غلام نبی خاں اسی محلے میں مطب بھی کرتے۔ مولانا شاہ عبدالعزیز کا مدرسہ بھی اسی محلے میں تھا اور ان دونوں کے آس میں گہرے تعلقات تھے۔ چنانچہ جب مومن پیدا ہوئے تو ان کے والد شاہ عبدالعزیز کو بلا کر لائے اور انہوں نے ان کے کان میں اذان دی اور حکیم غلام نبی خاں کی فرمائش پر ان کا نام بھی رکھا۔ ”آبِ حیات“ میں لکھا ہے کہ ”حب یہ پیدا ہوئے تو حضرت پی نے کان میں اذان دی اور مومن نام رکھا۔ گھر والوں نے اس نام کو ناسند کیا اور حسبِ اللہ خاں نام رکھا۔ اما لیکن شاہ صاحب کے رکھے ہوئے نام سے نام دیا“<sup>(۱)</sup>۔ عرس گباوی نے لکھا ہے کہ ”۱۸۰۰ء (۲۱۵ھ) ان کا سہ ولادت پایا جانا ہے۔ اسی محلے میں آب پیدا ہوئے۔ یہیں شاہ عبدالعزیز کا مدرسہ بھی تھا اور اسی کے قریب غلام نبی خاں کا مطب بھی، اس لیے ان حضرات میں مراسم بھی۔ چنانچہ جب مومن پیدا ہوئے تو ان کے والد شاہ صاحب کو بلا کر لائے اور انہیں سے کان میں اذان دلوائی۔ نام کے لیے لکھا تو شاہ صاحب نے مومن علی نام رکھ دیا۔ گھر والوں کی طرف سے دوسرا نام حسبِ اللہ دیا گیا۔ مگر شاہ صاحب نے فرمایا، نہیں، اسی نام سے نہ دیا میں نام دئے دے۔ آخر وہی ہوا۔ یہاں تک کہ جب شعر کہنے لگے تو تخلص بھی مومن ہی رکھا اور ان کے اسناد اور دوسوں نے بھی اسی کو سند کیا“۔

مومن نے اسنادی معلم شاہ عبدالعزیز کے مدرسے میں حاصل کی۔ یہاں انہوں نے شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالعزیز کے سامنے زانوئے ادب نہہ کیا۔ اس کے بعد وہ طب کی طرف موجد ہوئے۔ ان کے والد حکیم غلام نبی خاں اور چچا غلام حیدر خاں اس زمانے کے مسہور طبیب تھے۔ انہیں دونوں سے انہوں نے طب کی کسبیاں پڑھیں اور بہت جلد اس میں کمال حاصل کر لیا۔ طب کے ساتھ ساتھ انہیں علمِ نجوم سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اس میں بھی انہوں نے مہارت حاصل کر لی۔ ”آبِ حیات“ میں لکھا ہے ”طیب کا خاصہ ہے کہ انک فن بر دل نہیں جما۔ اس نے بزرگوں کے علم یعنی طبابت

پر تھمنے نہ دیا۔ دل میں طرح طرح کے سوق پیدا کئے۔ ساعری کے علاوہ نجوم کا خیال آیا۔ اس کو اہل کمال سے حاصل کیا اور مہارت مہم مہنچائی۔ ان کو نجوم سے قدرتی مناسبت تھی۔ اسامہ ملکہ نصیب ہوا کہ احکم سن کر بڑے بڑے منجم حیران رہ جاتے تھے۔ سال بھر میں ایک نفویم دیکھتے تھے۔ بھر برس دن تک تمام ستاروں کے مقام اور ان کی حرکات کی کیفیت ذہن میں رہتی تھی۔ جب کوئی سوال پس کرنا نہ زائچہ کھینچنے نہ نفویم دیکھتے۔ بوجھنے والے سے کہے 'خاموس رہو'۔ جو میں کہا ہوں اس کا جواب دے جاؤ۔ پھر مختلف نادیں بوجھے تھے، اور سائل اکثر تسلیم کرنا جانا تھا" (۱)۔ نجوم کے ساتھ ساتھ موسیقی سے بھی انہوں نے دلچسپی لی۔ اگرچہ معاصر تذکروں میں اس کا ذکر نہیں لیکن مولانا مساء احمد بدایونی نے کنز فاطمہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ "محترمہ کنز فاطمہ صاحبہ اسے والد سد ناصر حبیب صاحب ناصر دہلوی تبرہ موسیٰ کے حوالے سے بیان کرتی ہیں کہ مومن مرحوم کی رنگین مزاجی نے موسیقی کے فن لطیف کی طرف توجہ کی سو وہ نام پیدا کیا کہ لوگ ان کے کمال کے معترف ہو گئے۔ نظریہ دن بار نے جو اس زمانے میں اسناد تھا، ان کے انتقال پر بین اٹھا کر رکھ دی کہ اب دلی میں اس کا کوئی قدر دان نہ رہا" (۲)۔ سطرچ میں بھی انہیں کمال حاصل تھا اور وہ اس کے علمی اور فنی مہلوؤں کو سمجھتے تھے۔ عرض مومن کو مختلف علوم و فنون سے گہری دلچسپی تھی، اور وہ ان میں مہارت رکھتے تھے۔ اور یہ ان کی شخصیت کا ایک اہم مہلو تھا۔

لیکن مومن نے اپنی زندگی میں سب سے زیادہ دلچسپی ساعری سے لی۔ ان کے آس پاس اور گرد و بس جو ساعرانہ ماحول تھا، اس کے زیرِ اثر ان کی ساعری کا آغاز ہوا۔ شاہ نصر اس زمانے کے مشہور ساعر تھے۔ مومن نے ان کی ساگر دی احتشار کی۔ کریم الدین لکھتے ہیں "اصلاح اسعار کی شاہ نصر سے انہوں نے لی ہے، مگر در باب فنونِ نظمہ کے خدا نے ان کو وہ بہرہ دیا کہ ان کے آساد نصر وغیرہ تمام ابران پر سبقت لے گئے" (۳)۔ نسخا نے لکھا ہے کہ "ابک یا دو عزل میں نصر دہلوی سے اصلاح لی تھی۔ اصلاح سند نہ آئی" (۴)۔ "آبِ حیات" میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ "سعر و ساعری سے انہیں طبعی مناسبت تھی اور عاسق مزاجی نے اسے اور بھی چمکا دیا تھا۔ انہوں نے ابتدا میں شاہ نصر کو اپنا کلام دکھایا مگر چند روز کے بعد ان سے

(۱) آزاد، آبِ حیات - ص ۴۲۲

(۲) مولانا ضیاء احمد بدایونی، مقدمہ، دیوان مومن - ص ۲۵

(۳) کریم الدین - طبقات شعرائے ہند - ص ۴۴

(۴) عبدالغفور نسخا - سخن سعاء - ص ۶۷

اصلاح لینی چھوڑ دی۔ اور بھر کسی کو استاد نہیں بنانا<sup>(۱)</sup>۔ ان بیانات سے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ شاہ نصیر کے شاگرد ہوئے لیکن زیادہ عرصے تک اس رشتے کو قائم نہ رکھ سکے۔ اس کا سبب یہی ہو سکتا ہے کہ شاہ نصیر کے رنگِ شاعری سے انہیں کوئی ذہنی مناسبت نہیں تھی۔ اس لیے اصلاح کی نابندیوں سے انہوں نے اپنے آپ کو آزاد کر لیا لیکن جلد ہی خود اعتمادی پیدا ہو گئی اور بھوڑے عرصے میں وہ اپنے زمانے کے نامور شاعر شمار کیے جانے لگے۔

مومن کی زندگی میں شاعری کے ساتھ ساتھ عسقی و عاشقی کے واقعات بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کی زندگی کے بعض واقعات اس حتم کو واضح کرتے ہیں کہ وہ ایک عانس مزاج اور نرند ساہد باز تھے۔ ان کی مثنویوں میں اس عسقی و عاشقی کے مختلف واقعات کی کثیف سامنے آتی ہے۔ ان مثنویوں میں جو تفصیلات ملی ہیں اس سے ان کی شخصیت کے اس پہلو کی پوری تصویر سامنے آ جاتی ہے۔ مومن نے چھ مثنویاں لکھی ہیں، اور ان سب میں ان کی شخصیت کے اس پہلو کی نساں دہی ہوئی ہے۔ انہی پہلی مثنوی ’سکایتِ سم‘ میں انہوں نے یہ لکھا ہے کہ ان کی عمر نو سال کی تھی جب انہوں نے عشق و عاشقی کے لوحے میں دم رکھا۔ اور پھر یہ سلسلہ انک زمانے تک جاری رہا لیکن ان کے ہر عسقی ناکام ثابت ہوئے۔

ان میں سب سے اہم عسقی نو وہ ہے جس کی طرف سید نے ’دشنِ بے حار‘ میں اشارہ کیا ہے اور مومن نے بنی جگہ جگہ اپنے کلام میں جس کی وصاحت کی ہے۔ سبقتہ نے مومن کے بیان میں تو صرف اتنا لکھا ہے کہ، ”وہ وصول ناران رنگن و بہ وصل ساہدانِ سہریں عمرے حوس می گدارد“۔ لیکن امہ الفاطمہ نگم صاحبہ کا جہاں ذکر کیا ہے، اس میں اس کی لجزہ تفصیل بیان کر دی ہے۔ لکھتے ہیں ”صاحب مخلص نامس امہ الفاطمہ نگم مسہور بہ صاحب جی کہ ماہ آسماں نکوئی اسب آفتاب صفت از مسرہ بہ جانب مغرب آمدہ۔ نہ فریب مداوا با مومن خان کرس افناد و ماہے حد کار ہا در دو دوا بود۔ سالہا ہست کہ باز بہ لکھنؤ رف۔ ’مثنوی فولِ عمیں‘ کہ ار مصنفات خان معزے اللہ است سرح نسعہ حسن و جمال ہماں موروں قد اسب۔ القصہ نہ صحت شان دلس بہ شعر و شاعری صل کرد۔ از موزونی فام نہ موزونی طبع گراشدہ و از آرائش زلف پریشان بہ موسیقی اسعار بہند“<sup>(۲)</sup>۔ اس بیان سے ظاہر ہے کہ امہ الفاطمہ بیگم علاج کی غرض سے مومن خان کے پاس پہنچیں اور علاج کی نہ فریب مرضِ عشق کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ چند سال یہ سلسلہ جاری رہا لیکن بالآخر صاحب جی لکھنؤ واس چلی

(۱) آزاد، آب حیات - ص ۴۲۳

(۲) شیفہ، گلشنِ بے خار - ص ۱۶۴



گئیں۔ مومن کے فیصلے صاحب جی نے ساعری بھی شروع کر دی تھی اور وہ اچھے خاصے سرکہ بھی نہیں۔ کرم الدین نے بھی 'طبقات شعرائے ہند' اور 'گلدستہ' نازنبنان، دونوں میں، اگرچہ مومن کے حالات لکھے ہیں، مگر اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ البتہ صاحب جی کے تذکرے میں انہوں نے بھی اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں "صاحب تخلص ایک عورت امہ الفاطمہ بیگم کا ہے۔ اس کو صاحب جی بھی کہتے ہیں۔ درسان ساہجہان آباد کے حکم محمد مومن حان سے ملاقات اس کی بہ بے ریب علاج کے ہوئی تھی۔ مدد تک آسانی رہی۔ کئی سال گزرے کہ اب لکھنؤ کو جلی گئی ہے۔ وہ ایک خانگی بھی۔ 'مثنوی فولِ غم' مومن حان کی اسی محبوبہ کے حق میں ہے۔ بہ سبب فیض صاحب مومن خان صاحب کے وہ بھی سرکہ کہنے لگی تھی" (۲)۔ 'مثنوی فولِ غم' میں اس واقعے کی جھلکیاں یقیناً نظر آتی ہیں۔ لیکن اس میں سبب نہیں کہ مومن نے اس مثنوی میں جو کہانی بیان کی ہے، اس میں بعض واقعات ایسے ہیں جو محض زبِ داستان کے لیے بیان کیے گئے ہیں۔ بہر حال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ صاحب جی کا اثر ان کی شخصیت پر رہا ہے۔ اسی لیے وہ جگہ جگہ اپنے اسعار میں بھی صاحب کا لفظ اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ اس کے صحف امہ الفاطمہ بیگم صاحب جی کی جھلک نظر آ جاتی ہے۔ مثلاً یہ اسعار ہیں :

صاحبوا میرا حال مت بوجھو	بندہ سخت بے وفا ہوں میں
جھوڑ دلی کو سہسوان آنا	ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں
عذرے جا ہے سرکشی کے لیے	ساکنی بے سبب جفا ہوں میں
اک خداوند سوخ کے غم میں	قابلِ رحم ہو گا ہوں میں

مجھے پہنچا دو میرے صاحب تک

کہ غلامِ گریز پا ہوں میں

☆ ☆ ☆

تم بھی رہنے لگے خفا صاحب	کہیں سایہ مرا نڑا صاحب
--------------------------	------------------------

☆ ☆ ☆

کس پہ بگڑے بھی کس بہ غصہ نہا	رات تم کس پہ نہی خفا صاحب
کس کو دنتے بھی گالیاں لا کھوں	کس کا سب ذکرِ خیر تھا صاحب

☆ ☆ ☆

صاحب نے اس غلام کو آزاد کر دیا	لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم
--------------------------------	----------------------------------

امۃ الفاطمہ بیگم صاحبہ جی کے متعلق اس سے زیادہ تفصیل کہیں نہیں ملتی کہ وہ لکھنؤ سے دلی آئی تھیں ، علاج کے سلسلے میں مومن سے ان کی ملاقات ہوئی ، ان کا مذہب شیعہ تھا اور وہ واس لکھنؤ چلی گئیں ۔ مومن نے اپنے ایک فارسی قطع میں اس کی طرف بہت واضح اشارے کیے ہیں :

نا رفته است دلبر من از دبار من  
آن آہوئے حرم کدہ حسنِ یوسفی  
ہمراہ او نہ رفته ام از ناس عرض او  
جلاذ نم کنسہ زبانش من گذش  
اے بترہ و سپہ رخ مہروماہ سیاہ  
نے گفتہ ام بہ یار غم دل گداز خویش  
سورم بہ داغ ہجر ہاناں دل خودم  
ہزمردہ غنچہ ایس گل احترام کہ گہ  
نازم بہ سخت جانی خود زندہ ام ہنوز  
برنا قامتے شد و جام زین نہ رفت  
واماندہ ام کحاسب معام نو اے اجل  
نارب! چہ شاعری وحدہ سگس دلی اسناییں  
بے درد مومن از یے نارنج سر بہ جب

نارنج و غرجہ بہ خالس رسد و من

در سہ خاک از غم دوری کشیدہ ام<sup>۱</sup>

پر چند کہ اس قطعے میں صاحبہ کا ذکر نہیں آتا لیکن مجموعی طور پر اس کے انداز سے یہ حقیقت واضح ہو جاوے ہے کہ اس میں مومن نے جس ”آہوئے حرم کدہ یوسفی“ کا ذکر کیا ہے وہ ضرور امۃ الفاطمہ بیگم صاحبہ جی ہیں ، جن کو ناسازگار حالات نے دلی جھوڑنے پر مجبور کر دیا ۔ مومن ان کے ساتھ جانا چاہیے تھے ، لیکن چونکہ انہوں نے منع کر دیا تھا ، اس لیے وہ اس خواہش کو عملی جامہ نہ پہنا سکے ۔ رخصت ہوتے وقت انہیں اس کی صورت تک دیکھنے کا موقع نہ ملا ۔ وہ اس کے لب سے ایک حرفِ جاں فزا بھی نہ سن سکے ۔ اور ہجر میں ٹڑپنا ان کا مقدر بن گیا ۔

غرض ان کے عشق کا یہ واقعہ ان کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے ، اور ان کی شخصیت اور شاعری دونوں میں اس واقع کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں ۔

مومن نے دو شادیاں کیں۔ ان کی پہلی سادی کے متعلق اس بات کا علم نہیں ہونا کہ کہاں ہوئی تھی۔ مومن کے نوا سے عبدالحنی کا خیال ہے کہ غالباً یہ سادی سردہنہ کے کسی خاندان میں ہوئی تھی۔ پہلی بیوی سے مومن کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ کوئی اولاد بھی نہیں ہوئی<sup>(۱)</sup>۔ اس لیے انہوں نے دوسری سادی کی۔ یہ سادی خواجہ میر درد کے خاندان میں ہوئی۔ ان کی یہ دوسری بیوی میر درد بصیر بھٹی حلف مہر کاٹو نہرہ و سجادہ حسن کی صاحبزادی تھیں۔ نور الحسن خاں کے 'طور کام' میں لکھا ہے۔ کہ "میر درد بصیر بھٹی خلیہ میر کاٹو نہرہ سجادہ حسن میر درد علیہ الرحمہ۔ مومن خاں بارے نسب حوسسی و دامادی داس"۔<sup>(۲)</sup> ان کا نام انجمن النساء بیگم تھا۔ سید ناصر ندیر فراق 'میخانہ درد' میں لکھتے ہیں "انجمن النساء بیگم صاحبہ کی سادی حکم مومن خاں صاحب سے ہوئی جو مسہور شاعر تھے"۔<sup>(۳)</sup>

انجمن النساء بیگم کے بطن سے مومن کے یہاں دو اولادیں ہوئیں۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی، لڑکی کی تاریخ ولادت ۱۸۴۳ء (۱۲۵۹ھ) ہے۔ خود مومن نے اس کی تاریخ کہی بھی جو ان کے دیوان میں موجود ہے۔ اس لڑکی کا نام بھٹی بیگم تھا۔ انہوں نے طویل عمر بائی۔ لڑکے کا نام خواجہ محمد نصر خاں تھا۔ یہ زیادہ عرصے زندہ نہ رہے۔ مومن نے ان کی تاریخ وفات کہی ہے جو ان کے فارسی دیوان میں موجود ہے۔ اسعار یہ ہیں :

بخت بد میں کہ سم بن سرم	کرد جوں گنج جائے در بر خاک
مگر از بہر سال مردنِ او	کلک مومن بوس در بر خاک
خاک بر فرقِ دولہ دسا	من فساندم خزانہ بر سرِ خاک <sup>(۴)</sup>

بھٹی بیگم کی سادی عبدالحنی وکیل سیبا نور سے ہوئی۔ اس کی تفصیل مومن کے نواسے مولوی عبدالحنی نے اس طرح بیان کی ہے :

"دوسری سادی آپ کی (مومن کی) حضرت خواجہ میر درد کے خاندان میں ہوئی۔ آپ کو شاہی وم میں کچھ گاؤں ضلع غازا میں ملے تھے۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کی بیوی انجمن النساء بیگم تحصیل وصول کے لیے جانا کری نہیں۔ ان کے بطن سے ایک صاحبزادے جن کا نام

(۱) مولوی عبدالحنی انصاری کا خط راقم کے نام

(۲) نور الحسن، طور کلیم - ص ۱۱۲

(۳) سید ناصر ندیر فراق، میخانہ درد - ص ۲۰۳

(۴) مومن، دیوان فارسی - ص ۱۴۶

احمد نصیر تھا اور ایک دختر جن کا نام مہدی بگم تھا، جدا ہوئی تھی۔ (بہلی بوی سے کوئی اولاد نہیں تھی)۔ جس زمانے میں آپ کی سوی غازا تحصیل وصول کے لئے حایا کری تھیں، اس وقت میں آپ کے صاحبزادے اور لڑکی دونوں ہمراہ ہوتے تھے۔ اس زمانے میں میرے دادا حضرت مولانا فصیح صاحب رحمہ اللہ علیہ کی کراسوں کا چرچا اس اطراف میں بھلا ہوا تھا۔ اس وجہ سے انجمن النساء بگم ان سے جا کر غازی پور میں بیعت ہوئیں اور پھر دہلی میں آئیں۔ ساتھ مہدی فصیح صاحب کے بھتیجے مولوی عبدالغنی صاحب مرحوم بھی دہلی دیکھنے کے سو سو میں آپ کے ساتھ ساتھ دہلی چلے گئے۔ اس کے تھوڑے دنوں بعد حضرت مولانا فصیح صاحب بھی دہلی گئے۔ اور صاحبہ کی لڑکی مہدی بگم سے ان کا عقد کر دیا۔ چونکہ مولوی عبدالغنی مرحوم و مغفور ضلع ساہی پور میں وکالت کرتے تھے۔ اس لیے وہ انہی سوی اور سالے کو لے کر ساہی پور آ گئے۔ نای حال اب کو ڈائری کے اوراق سے ملے گا، (۱)

مولوی عبدالغنی انصاری انہیں کے بیٹے تھے۔ ان کا تمام حد سال قبل لالو کھسٹ کراچی میں تھا، اور وہیں سے انہوں نے اپنے نانا کے کچھ حالات راقم الحروف کو لکھ کر بھیجے تھے۔

مومن کی اولاد میں صرف مہدی بگم اور احمد نصیر خاں کے حالات کی کچھ تفصیل مل جاتی ہے۔ ان کے علاوہ کسی کا حال نہیں ملا۔ مومن کو انہی اولاد سے بڑی محبت تھی۔ اور وہ ان سب کا بہت خیال رکھتے تھے۔ رندی اور ساہی بازی کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی کا یہ پہلو بھی ان کی شخصیت میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

### مومن کی زندگی کا دوسرا رخ

یہ صحیح ہے کہ مومن کی زندگی کا خاص زمانہ رندی اور ساہی بازی اور شعر و ساعری کی نذر ہو گیا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہیں دین اور مذہب سے ہمیشہ دلچسپی رہی۔ انہوں نے اپنا بچپن شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر کے ساتھ گزارا اور انہیں کے زیر سایہ ان کی نشوونما ہوئی۔ اس زمانے میں جو نقوش ان کے ذہن پر ثبت ہوئے وہ بہت گہرے تھے۔ بقول مولانا ضیاء احمد بدایونی ”جس ماحول میں انہوں نے پرورش پائی۔ اس کا اقتضا

” تھا کہ ان کو مذہب سے شغف ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا“<sup>(۱)</sup>۔ اسی صورتِ حال کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ جوانی ہی میں مولانا سید احمد بریلوی کے مرید ہو گئے۔ اور اس الم با عمل کا زندگی بھر ان پر گہرا اثر رہا۔ چنانچہ اردو اور فارسی کلام میں جگہ جگہ اس کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ ایک اردو قطعے میں کہتے ہیں :

گلابِ ناب سے دھونا ہوں بغیرِ اندیشہ	کہ فکرِ مدحتِ سبطِ فسیمِ کوثر ہے
وہ کون امامِ جہان و جہانباں احمد	کہ محض ممدیٰ سنتِ بہمبر ہے
زمن کو سہرِ فلک سے ہو کون نہ دعویٰ نور	کہ اس کا راسبِ اقبال سایہ گستر ہے
ز بس کہ کام نہیں ہے اسے سوائے جہاد	جو کوئی اس سے مقابل ہے سو وہ کافر ہے
سرف ہے مہر کو اس کے زمانے سے دائم	ز بس کہ روز و سب انصاف سے برابر ہے
وہ بادشاہِ ملائکِ ساء و کوکبِ دس	کہ نورِ سمس و مریخ کی گردِ لشکر ہے
وہ سعلہ خصلتِ الحاد و سوزِ کفرگدار	کہ جس کا نفسِ قدمِ مہرِ روزِ محشر ہے <sup>(۲)</sup>

اور منوی بہ مضمون ’جہاد‘ میں مولانا سید احمد کی تعریف اس طرح کرتے ہیں :

وہ خضرِ طریقِ رسولِ خدا	کہ جو دُرو اس کا ہے سو نسوا
وہ نورِ مجسم وہ ظلِ الہ	کہ سائے سے جس کے خجلِ مہر و ماہ
زبے سید احمدؑ رسولِ خدا	سرِ آستانِ رسولِ خدا
نکو گوہری کا نہ دوحہو سرف	علیؑ و حسنؑ و حسنؑ کا خلف
رہے حسر تک زندہ وہ نبک ذاب	ہے کفّار کی موت اس کی حساب
خدا نے مجاہد بنانا اسے	سرِ قلِ کفار آسا اسے <sup>(۳)</sup>

ان قطعات سے ظاہر ہے کہ مومن در مولانا سید احمد بریلوی کی شخصیت کے اربابِ کمنے گہرے تھے۔ زندگی بھر وہ اس سمع کے پروانے رہے۔ یہ اور باب ہے کہ عملی طور پر اس جہاد میں شرکت انہیں نصب نہ ہوئی جو مولانا سید احمد بریلوی کا نصب العین تھا۔

انسویں صدی کی دلی میں یوں تو زندگی اور دین داری ساتھ ساتھ چلتی تھیں ، اور مومن کی شخصیت بھی اسی میلان کی عکاسی کرتی ہے ، اس لیے اگر مومن نے اپنی زندگی اور شاہد بازی کے ساتھ مولانا سید احمد بریلوی کی دین داری سے دلچسپی کا اظہار

(۱) مولانا صیاء احمد پدایوی ، مقدمہ دیوان مومن۔ ص ۳۰

(۲) کلیات مومن۔ ص ۱۸۴

(۳) ایضاً۔ ص ۱۸۸

کیا تو اس پر تعجب نہیں کرتا چاہئے۔ لیکن حقیقت ہے کہ آخر عمر میں ان میں مذہب کا اثر بہت بڑھ گیا تھا۔ کریم الدین جن سے مومن کے تعلقات تھے، انہی نے تذکرے میں لکھتے ہیں :

”ابتدا میں تمام اوقات سرگونی اور لہو و لعب دنیا میں صرف کرتے ، تمام مزے عاشقی کے اٹھا کر ، آبِ نوحہ کی ۔ بلکہ شعر کہنا چھوڑ دیا ہے ۔ مجھ پر کمال عنایت فرماتے ہیں اکثر شام کو نسہر کی سہر کرتے ہیں ۔ اب نابند نماز روزے کے بھی بہ نسبت سابق کے مہت ہیں“ (۱)۔

اس زمان سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن نے جوانی کا زمانہ عس و عسرت اور لہو و لعب میں گزارا لیکن بالآخر اس سے نوحہ کر لی ۔ وہ صدقِ دل سے مولانا سدا احمد بریلوی کے مرید ہوئے اور ہونے کے بعد اپنی زندگی کا حصہ انہوں نے ایک دین دار شخص کی حُسن سے بسر کیا ۔

مومن نے زندگی بھر کوئی ملازم نہیں کی ۔ کبھی کسی دربار سے کوئی تعلق پیدا نہیں کیا ۔ کچھ حاصل کرنے کے لیے کسی کی مدح نہیں کی ۔ ان کے زمانے کے امراء و رؤسا کی نہ کوسنس ضرور بھی کہ کسی طرح ان کو اپنے درباروں سے وابستہ کر لیں لیکن مومن اس کے لیے ہار نہیں ہوئے ۔ عرس گباوی نے لکھا ہے کہ ”مومن کو والٹی رام نور ، والٹی ٹونک ، والٹی بھونال ، والٹی جہانگیر آباد وغیرہ نے اپنے دوستانہ مراسم کے جال میں پھسانا چاہا ۔ مہاراجہ کپور نھلہ نے ساڑھے تین سو روپے ماہوار پر طلب کیا ، مکروہاں بھی نہ گئے رادیراہ تک واس کر کے یہ جواب لکھ دیا کہ ”جس دربار کا ایک ایک ادنیٰ گویا ساڑھے تین سو روپے ماہوار نانا ہو، وہاں میں اسی سخاوت میں نہیں آسکتا“ (۲)۔ دراصل یہ سب بھانے تھے ۔ بات درحقیقت یہی ہے کہ مومن کو ملازم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ ذہنی طور پر اس کام کے لیے تیار نہیں تھے ۔ چنانچہ زندگی بھر وہ اس سے دامن بچانے رہے ۔

دہلی کالج کی مدرسہ بھی مومن کو پیش کی گئی تھی لیکن انہوں نے اس کو بھی قبول نہیں کیا ۔ کریم الدین نے صہبائی کے تذکرے میں یہ تفصیل اس طرح بیان کی ہے :

”جس سال میں کہ لٹنٹ گورنر بہادر طامسین صاحب جو کہ عالمِ کامل ، قدر شناس اہلِ علوم کے ہیں ، شاہجہان آباد میں واسطے بندوبست مدرسے

(۱) کریم الدین ، طبقات شعرائے مند ۔ ص ۴۴۴

(۲) عیش گباوی ، حیات مومن ۔ ص ۵۳

کے شریف لائے۔ سب مدرسوں کا مع طلباء کے امتحان لیے کر یہ تجویز کی کہ ایک مدرس فارسی مدرسے کے واسطے اچھا مستعد مقرر کرنا چاہیے۔ شاہجان آباد ہی سے مسعد لوگوں کی تلاش ہوئی۔ مفتی محمد صدر الدین خان بہادر نے جو ہمارے زمانے میں شاہجان آباد کے صدر الصدور تھے جناب طامسین صاحب بہادر کی خدمت میں یہ عرض کی کہ اس سہر میں اچھے فارسی دان نین شخص منتخب روزگار ہیں۔ ایک مرزا نوسہ صاحب، دوسرے مولوی امام بخش صہائی نسرے حکیم محمد مومن خان۔ لفٹنٹ گورنر نے مومن کو بلایا۔ مرزا نوسہ صاحب نے کہ ان کو نوکری کے اسعما بھی، انکار کیا۔ مومن خان صاحب نے درخواست ایک سو روے ماہواری منخواہ کی کی۔ مولوی امام بخش صاحب نے، چونکہ کسی طرح کا وسلہ نہ جز روزگار کے وجہ معبست نہیں رکھے تھے، حسب خواہش لفٹنٹ گورنر بہادر کے حکم اجازت کے حالس روے ماہوار ان کے واسطے مقرر ہوا، مدرس اول فارسی خوانوں کے مقرر ہوئے“ (۱)۔

اس ملازمت کے لیے مومن کا سو روپہ طلب کرنا بھی در اصل سلمے سے انکار کرنا تھا۔ غرض مومن اس ملازمت سے منفر تھے، اور انہوں نے کبھی اس کی خواہش ظاہر نہیں کی۔ وہ بڑے خود دار آدمی تھے۔ اس خود داری نے انہیں ملازمت کرنے سے باز رکھا۔ آبائی جائداد سے جو آمدنی بھی اسی میں زندگی بسر کرتے تھے۔

مومن کا افعال ۱۸۱۵ء (۱۲۶۸ھ) میں ہوا۔ کوٹھے سے گرے، ہاتھوں اور پیروں میں شدید ضرب آئی۔ چند مہینے اسی تکلف میں مبتلا رہے۔ عرس گداوی نے لکھا ہے ”عسروں، ساگردوں اور دوسوں کی آمد شروع ہوئی جن میں آبی بھی تھے۔ ان کی طرف دیکھ کے، جب ہوس میں آئے تو فرمانا، ماں جو کچھ ہونا تھا وہ ہو ہوا۔ مگر میرا علم نہ لہا ہے کہ میں صرف باغ مہینے بچوں گا۔ لو میرے مرنے کی تاریخ لکھ لو۔“ ”دست و نازو سکس“۔ آخر بھی ہوا کہ جمعہ کے روز دنیا سے کوچ کیا“ (۲)۔

مومن دلی دروازے کے نابر مسہدیوں کے اس قبرستان میں دفن ہوئے جس میں شاہ عبدالعزیز صاحب کا خاندان بھی مدفون ہے (۳)۔

(۱) کریم الدین، طبیب شعرائے ہند - ص ۴۴

(۲) عرش گداوی، حیات مومن - ص ۸۱

(۳) آزاد، آب حیات - ص ۲۸

مومن نے بین مصائب اپنی یاد گار چھوڑی ہیں :

(۱) کلیاتِ مومن (آردو)

(۲) دیوانِ مومن (فارسی)

(۳) انسائے مومن (فارسی)

(۱) کلیاتِ مومن : مومن کے اردو کلام کا مجموعہ ہے۔ اس کو نواب مصطفیٰ خان سمہ نے ۱۸۲۵ء (۱۲۴۳ھ) میں جمع کیا۔ مومن نے اس پر خود نظریہ بانی کی اور بریم و اصفہ کے بعد کتاب کو مرتب کیا۔ اس کتاب کو کرم الدین نے ۱۸۳۰ء میں مطبع رفاہِ عام دہلی میں چھوا کر سائے کیا۔ سمہ نے ’کسبِ خاں‘ میں اس کی صراحت کی ہے۔ لکھتے ہیں۔ ”ہاں ہمہ صفات کے مذکور سد نے تحریک محرک بہ فکرِ سخن می بردازد۔ چنانچہ اکثر کلاس نہ حواہی داعی آئے صورت ظہور گرفتہ و ہم ندوین افکار را فسر باعث گشتہ۔ دناحہ آن کہ رنخہ خامہ میں است دراں نہ بعصیل این ماجرا بار کردہ ام“۔ اور دناحے میں حمد و نعت کے بعد مومن اور ان کے کلام کو سراہا ہے، اور پھر اس کی وضاحت کی ہے کہ کس طرح ان کی کوس اور کاوس سے مومن کا نہ کلام جمع ہوا۔ اس کا پہلا ایڈیٹر ہو وہی ہے جس کو کرم الدین نے ۱۸۴۶ء میں چھاپا تھا۔ اس کے بعد ۱۸۵۲ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن کنہیا لعل کے ایہام سے مجلس تریس دہلی نے چھاپا۔ ۱۸۵۵ء میں اس کا تیسرا ایڈیشن انڈین پنج برس سے سائے ہوا۔ پھر ۱۸۷۴ء میں اس کا چوتھا ایڈیشن نول کشور پریس نے سائے کیا۔ نہ وہی نسخہ ہے جس کو عبدالرحمن آبی نے مرتب کیا تھا اور مومن سے اس کی تصحیح کرائی تھی۔ اس کے بعد نول کشور نے اس کے کئی ایڈیشن چھاپے۔ آخری ایڈیشن نول کشور برس سے ۱۹۳۰ء میں سائے ہوا۔ مومن کا یہی کتاب آج کل رائج ہے اور اس میں غزلیات، قصائد، قطعات اور منویات شامل ہیں۔ مولانا ضیاء احمد بدایونی نے صرف غزلیات کو مرتب کر کے، ’دیوانِ مومن‘ کے نام سے ۱۹۳۵ء میں انڈین برس الہ آباد سے سائے کیا۔ ’قصائد مومن‘ بھی مولانا ضیاء احمد نے علیحدہ کتابی صورت میں سائے کر دیے ہیں۔

’دیوانِ مومن‘ اور ’قصائد مومن‘ دونوں میں صحت کا خیال رکھا گیا ہے اور یہ دونوں مجموعے محنت سے مرتب کیے گئے ہیں۔

(۲) دیوانِ مومن (فارسی) : مومن خان کے فارسی کلام کا مجموعہ ہے۔ اس کو

حکیم احسن اللہ خان نے مرتب کیا اور یہ ۱۸۵۴ء (۱۲۷۱ھ) میں مطبعِ سلطانی دہلی سے چھپ کر شائع ہوا۔ اس کے سر ورق پر یہ عبارت ملتی ہے۔



”بعون الله تعالى و حسن توفيقه نسخه الموسوم بہ دیوان مومن خان مولفہ احترام الدولہ حکیم محمد احسن الله خان بہادر در مطبع لطانی در ۱۲۷۱ھ مطبوع شد“ (۱)۔

اس کے شروع میں حکیم احسن الله خان کا لکھا ہوا نسخ لفظ بھی ہے ، جس میں مومن کے فارسی کلام اور اس مجموعے کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے ۔ اس مجموعے میں غزلیات ، قصیدے اور قطعات شامل ہیں ۔

(۳) **النشائے مومن :** یہ مومن کے فارسی خطوط کا مجموعہ ہے ۔ ان خطوط کو حکیم احسن الله خان نے مرتب کیا اور یہ بھی ۱۸۵۳ء (۱۲۷۱ھ) میں مطبع سلطانی دہلی سے چھپ کر سائے ہوا ۔ اس کے سرورق پر بھی مندرجہ بالا عبارت ملی ہے ۔

اس کا آغاز بھی حکیم احسن الله خان کے دیباچے سے ہوتا ہے ۔ اس میں مومن کے ان خطوط کی اہمیت واضح کی گئی ہے ۔

”انسائے مومن“ اس عبارت پر ختم ہوتا ہے :

”الحمد لله و المہ انشاء مومن خان در ماہ رمضان المبارک ۱۲۷۱ھ

در مطبع سلطانی واقع اور حافی برائے طبع نوسد ۔ تمت بالخیر ۔

کتبہ العبد المذنب محمد بحس عفرلہ“ (۳)

مومن کے جو فارسی خطوط انسائے مومن میں شامل ہیں ان سے مومن کی زندگی کے حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے اور ساتھ ہی ان میں ان کی شخصیت اور شاعری کو بھی سمجھنے کا بڑا سامان ہے ۔

### مومن کی شاعری

مومن آردو کے قادر الکلام شاعر تھے ۔ انہوں نے تقریباً تمام اصنافِ سخن میں ادنیٰ طبیعت کے جوہر دکھائے ہیں ، لیکن اس میں سب سے نہیں کہ غزل کی صنف ان کا خاص میدان ہے ۔ وہ غزل کی فضا میں پیدا ہوئے اور غزل کی روایت ہی میں ان کی نشو و نما ہوئی ۔ اس لیے غزل کی روایت کا رنگ ان کی شخصیت میں اس طرح رح گیا کہ یہ صنف ان کا مزاج بن گئی ۔ حناغہ انہوں نے اس کی روایت کو بڑی خوش اسلوبی سے

(۱) مومن ، دیوان فارسی

(۲) مومن ، دیوان فارسی

(۳) مومن ، النشائے مومن

(۴) ایضاً - ص ۲۵۶

برتا اور اپنے تجربات سے اس روایت میں بعض اسے اضافے بھی کئے جو انہیں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ان تجربات میں ان کی رومانیت کے ساتھ ملی جلی واقعیت پسندی اور اظہار کی پہلو دار کیفیت کے مختلف روپ خصوصیت کے ساتھ اہمیت رکھتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ مومن کی غزل میں موضوعات اور مضامین کے اعتبار سے تنوع اور رنگا رنگی نہیں ہے۔ اس میں تو صرف حسن و عسوی اور اس کے مختلف پہلوؤں کی برجائی ہے۔ اور اس برجائی میں کسی فکری گہرائی کا احساس نہیں ہوتا۔ اس میں تو انسانی زندگی کے صرف جذباتی معاملات کی تصویر کشی ہے۔ مومن نے ان معاملات کو کچھ اس طرح ساعری کے سانچے میں ڈھالا ہے کہ ان میں بہ ذاب خود وسعتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ اس کا سادی سب موسم کے رنگا رنگ تجربات ہیں۔ مومن کی انفرادیت کا راز اس میں ہے کہ انہوں نے اسے موضوعات کو جو انسانی زندگی میں بہت عام ہیں، اور جن کو ہر ساعر پر دور میں اپنی غزلوں میں پس کرتا رہا ہے، ایسی وسعتیں دی ہیں اور ان میں انسی گہرائیاں سدا کی ہیں کہ ان کی انفرادیت کا فائل ہونا بڑا ہے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جذباتی معاملات کے جن تجربات کو مومن نے پس کیا ہے وہ نہ تک وقت ان کے ذاتی اور انفرادی تجربات بھی معلوم ہوتے ہیں اور عمومی اور اجماعی بھی۔ دوسرے لفظوں میں نہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی غزلوں میں جن تجربات کی برجائی ملی ہے، ان میں ایک آفاقی رنگ و آہنگ بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ جذبات کے بہت بڑے شاس ہیں، اور ان کے تمام پہلوؤں کا سدید احساس رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جذبات کی اس دنیا میں جو کچھ بھی ہو سکتا ہے، اس کی تفصل مومن کے ہاں ملی ہے۔

مومن کی غزل میں روايت کی ساداری تو ملی ہے اور اس روايت کا رنگ بھی ان کے یہاں رچا ہوا نظر آتا ہے، لیکن اس میں وہ انفعالت پسندی نظر نہیں آتی جو غزل کی روايت میں عام رہی ہے۔ اس کے برخلاف ان کے یہاں بوفعال پسندی کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی نظر آتی ہے اور شروع سے آخر تک جذباتی اور ذہنی صحت مندی کا احساس ہوتا ہے۔ مومن کی غزلیں اس حتم کو واضح کرنی ہیں کہ انہیں زندگی سے بڑی محبت ہے۔ انہیں اس کو بسر کرنا آتا ہے۔ وہ اس کی مسرتوں کے شیدائی ہیں۔ اور ان مسرتوں سے اپنے سینے کو بھر لیتا ہی ان کے نزدیک زندگی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی غزلوں میں نسا طبع رنگ اور طریبہ آہنگ کی چاندنی سی مسکراتی ہے۔ مومن کی غزلوں میں غم نہیں ہے۔ البتہ غم کا احساس اور اس کا عرفان ضرور ہے لیکن اس غم کا تجربہ انہیں کم ہوا ہے۔ ان کی غزلیں زندگی کے حسن

اور اس کے نساٹ و انساٹ کے ساٹھ نعلی رکھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں یاسیت یا منوطب نام کو نہیں ہے۔ وہ زندہ رہے کا درس دتی ہیں اور محبوب کو ایک مسیح نور اور سرچشمہ کف و سرور بنا کر بس کرتی ہیں۔ چنانچہ ان میں عشق انسان ایک عام جذبہ ہی نہیں بلکہ عالم کف و سرور کی ایک لعری مسانہ معام ہونا ہے۔

در اصل مومن کی غزل ان کی شخصیت کا آئینہ ہے۔ ان کے مخصوص مزاج، مخصوص افناد طبع، مخصوص ذہنی رجحانات اور مخصوص جذباتی مسانات کی صحیح تصویریں ان کی غزلوں میں دکھائی دتی ہیں۔ مومن نے اپنے آپ کو صورت پرست کہا ہے۔ ان پر زندگی بھر ایک سرخوسی کی سی کسب طاری رہی ہے۔ اور ان کی غزل اسی کیفیت کا ایک حسین مرقع ہے۔ مومن کی زندگی کے بعض اہم واقعات کی جھلک بھی ان کی غزلوں میں دکھائی دی ہے۔ اگرچہ انہوں نے ان کی طرف محض اشارے کئے ہیں، لیکن ان اشاروں سے ان واقعات کا سراغ لگانا حاسکما ہے جن کو مومن نے اپنے ساعرانہ بحرے کی بھاد بنایا ہے۔ بعض مقامات ان کی غزلوں میں اسے بھی آئے ہیں جن سے ان کی افناد طبع، ذہنی رجحانات، افکار و حالات اور عقائد و بوہات کی پوری طرح عکاسی ہو جاتی ہے۔

جیسا کہ اس سے قبل بھی اشارہ کیا جا چکا ہے، مومن محسوسات کے شاعر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں حواس کو مساتر کرنے کا بڑا سامان ہے، اور اس میں سبہ نہیں کہ وہ انسان کے تمام حواس کو مساتر کرتی ہیں۔ کیونکہ ان میں حواس ہی کے مختلف پہلوؤں کی برجائی ہے۔ اسی صورت حال کا نہ سحہ ہے کہ مومن کی غزل میں، غالب کی غزلوں کی طرح ذہن میں ملنا۔ اس میں شعور کی کارفرمائی زیادہ نظر نہیں آتی۔ فکری اور فلسفیانہ پہلو بھی اس میں نمایاں نہیں ہوا۔ حیات و کائنات کے بنیادی ما بعد الطبیعیاتی اور اخلاقی مسائل بھی اس میں نظر نہیں آتے۔ دراصل بصوفیہ رائے سے بہ رجحانات اردو غزل میں داخل ہو چکے تھے اور مومن سے قبل، اور خود ان کے زمانے میں، ان سب کو غزل میں داخل کرنے کی ایک عظیم روانت اردو غزل میں قائم ہو چکی تھی۔ مگر مومن کو بصوف سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، اس لیے وہ ان پہلوؤں کو اپنی غزل میں داخل نہ کر سکے۔ ذیل کے اسعار ان کی غزلوں کے اس محسوساتی رنگ و آہنگ کے صحیح برجان اور عکاس ہیں:

اس قیامت فد کو شب دیکھا تھا ہم نے خواب میں

دل نے محشر کا سماں وقت سحر دکھلا دیا

☆ ☆ ☆

میں تو اس زلف کی بو پر غش ہوں چارہ گر مشک سنگھاتے کیوں ہیں

☆ ☆ ☆

کس کی زلفوں کی بو نسیم میں بھی ہے بلا آج ہسبح و تاب ہمیں

☆ ☆ ☆

اب شور سے مثال جو دی اس خرام کو یوں کون جاننا نہا مسامت کے نام کو

☆ ☆ ☆

خرامِ ناز نے کس کے جہاں کو کر دیا برہم  
زمین گرنی فلک پر ہے، فلک گرنا زمیں پر ہے

☆ ☆ ☆

اس غبربِ ناپید کی ہر نان ہے دپک سعلہ سا لیک جائے ہے آوار ہو دیکھو

☆ ☆ ☆

دسنامِ نار طبعِ حزیں ہر گراں نہیں اے ہمنشین! نراکبِ آواز دیکھنا

☆ ☆ ☆

آنکھوں سے جبا ٹپکے ہے انداز ہو دیکھو ہے بو الہوسوں ہر بھی ستم ناز ہو دیکھو

☆ ☆ ☆

اس دہن کو عنعنہ گل کما کہوں ڈر لگے ہے مسکرا لا جھوڑ دے

☆ ☆ ☆

نند میں یا رب دوٹہ کس کے منہ سے ہٹ گیا ہے زمیں سے روسنی افلاک نور افسناں ملک

☆ ☆ ☆

نہ کیونکر بس موا جاؤں کہ یاد آنا ہے رہ رہ کر  
وہ بیرا مسکرانا کچھ مجھے ہونٹوں میں کہہ کہہ کر

☆ ☆ ☆

کیا جلوے یاد آئے کہ اپنی خبر نہیں  
بے بادہ مست ہوں میں نسبِ ماہتاب میں

☆ ☆ ☆

بے پردہ پس چلمن یک بار تم آ بیٹھے ہے تابِ نظر کس کو کیوں جلوہ گری اننی

☆ ☆ ☆

میں اپنی چشمِ شوق کو الزامِ خاک دوں اس کی نگاہِ شرم سے کیا کچھ عیاں نہیں

☆ ☆ ☆

کیونکر نہ آدمی رات تک جاگے وہ جس کا دھبہ ہو  
آہوئے نیمِ خواب میں نرگسِ نیمِ باز میں

☆ ☆ ☆

آئے غزالِ حشمِ سدا میرے دام میں  
صیاد ہی رہا میں گرفتارِ کم ہوا

ان اسعار میں حواس کی ساعری ہے ، اور مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مومن کی غزلوں کا عام انداز یہی ہے ۔ ان میں حسن کا بیان ہے ، محبوب کی تصویر کشی ہے ، محبت کرنے والے کی مخصوص حدیابی اور ذہنی کیفیت کی مریع سازی ہے اور ان سب کے بیان میں ساعر کا نہ احساس و شعور کام کرنا ہوا دکھائی دیتا ہے کہ زندگی بسر کرنے اور برتنے کی چیز ہے اور اس کی مسرتوں کو سرخوشی بنا کر حواس پر طاری کر لیتا ہی زندگی ہے ۔

لیکن اس کا نہ مطلب یہ ہے کہ مومن کی غزل عشق و عاسمی کی گہری واردات و عمیق کشفات سے خالی ہے ۔ اس میں انسانی زندگی کے ان ارفع لمحات کی برہانی بھی ملتی ہے جو اس کو عشق و عاسفی کی اسہائی بلندیوں سے ہمکنار کر دیتے ہیں ۔ نہ حد اسعار اس صفت کے صحیح ترجمان اور عکاس ہیں :

میں ہوجھ کہ کس واسطے حب لگ گئی ظالم  
بس کا کہوں میں، کہا ہے کہ میں لحد نہیں کہتا

☆ ☆ ☆

ہو گئی دو روز کی الف میں کیا حال ابھی  
مومن وحشی کو دیکھا اس طرف سے جائے تھا

☆ ☆ ☆

نالہ' ہم سے ناں فرصت نہیں حضرتِ ناصح کرس ارشاد کیا  
جب مجھے رنجِ دل آزاری نہ ہو عے وفا پھر حاصلِ سداد کیا  
کہا کروں اللہ سب ہیں عے اسر ولولہ کیا ، نالہ کیا ، فریاد کیا

☆ ☆ ☆

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے      ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہونا  
 تم مرے پاس ہوتے ہو گویا      جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا  
 چارہ دل سوائے صبر نہیں      سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

☆ ☆ ☆

ٹکٹکی لکائی ہے اب نوگو ہو رسوائی      وہ اگر ادھر دیکھیں مجھ کو دیکھتا دیکھیں

☆ ☆ ☆

میں بھی کچھ خوس نہیں وفا کر کے      تم نے اجھا کیا نباہ نہ کی

مومن کی غزلوں میں اس قسم کے اسعار کی کمی نہیں ہے۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مومن نے باوجود اسی صورتِ درسی، رندی اور سابد بازی کے ناری عس کے پہلو کو اہمیت دی ہے مگر عس و عاسفی کے اعلیٰ معیار اور ارفع اقدار کو بھی انہی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔

اس میں سمجھ نہیں کہ مومن کی غزلوں کا مزاج یہی عس و عاسفی ہے۔ اس لیے بغزل کا رنگ اس میں پوری طرح رجا ہوا ہے۔ لیکن مومن نے اپنے زمانے میں اس ناس اور گرد و بس کی زندگی سے آنکھیں بند نہیں کی تھیں، یعنی وہ اپنے زمانے کے اجماعی معاملات و مسائل کے محض ایک خاموس ماسائی نہیں تھے۔ انہوں نے اپنے عہد کے اجماعی نسب و فراز کو دیکھا تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں کہیں کہیں اس زمانے کے اجماعی معاملات و مسائل کی برجائی بھی ملتی ہے۔ کہیں تو یہ برجائی بہت واضح صورت میں موجود ہے اور کہیں اساروں اور کسادوں میں اپنے آپ کو روٹا کرتی ہے۔ مومن کی آنکھوں کے سامنے ایک مہدیپ کی سکست و موت کا دورا نقشہ موجود تھا، جس سے اس وقت کی زندگی دو چار بھی۔ مومن اس سے خود بھی متاثر ہوئے اور انہوں نے دوسروں کو بھی اس سے متاثر ہوتے ہوئے دیکھا۔ چنانچہ یہ تجربات بھی ان کی غزلوں میں داخل ہو گئے۔ مذہبیت، دین داری، زمانے کا غم، اپنی عظمتوں کے مٹنے کا احساس، برائی اقدار کے مٹا ہو جانے کا ملال، نامال اور نا بہ زنجیر ہونے کا خیال، ایک عالم کس مپرسی اور بے بسی سے باہر نکلنے کی خواہش، انقلاب کی تمنا، کچھ کرنے کی آرزو، یہ تمام باتیں بھی جگہ جگہ ان کی غزلوں میں بکھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہ چند اسعار ان کی غزل کے اس کے رجحان کے ترجمان ہیں :

آشیاں اپنا ہوا پر باد کیا

کچھ نفس میں ان دنوں لگنا ہے جی

☆ ☆ ☆

اس لیل و نہارِ غم نے مارا ہے روزِ سہ، سیدہ تر رات

☆ ☆ ☆

یادِ ایامِ وصلِ یارِ افسوس دہر کے انقلاب نے مارا

☆ ☆ ☆

ہامال ہم نہ ہونے فقط جوڑِ جرخ سے آئی ہماری جان نہ آف کئی طرح

☆ ☆ ☆

ڈرنا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے صناد کی ناکہ سوئے آسمان میں

☆ ☆ ☆

کسا کہیں تم سے اے ہمدردوا بوجھو مت مرغانِ چم  
کھونکریاں انامِ خراں اور پچر کے دن کٹ جاتے ہیں

کچرِ ففس میں بٹھ کے گلے روئے ہیں نہائی پر  
یادِ سیرِ موسمِ گل سے گلے جی مہلاتے ہیں

☆ ☆ ☆

ایک دن گردِ اسام سے آرام نہیں  
گھر میں ہیں تو بھی ہیں دن رات سفر میں بھرتے

☆ ☆ ☆

نہ حاؤں کھونکر سوئے دامِ آسانے سے میں  
خسالتِ حسرتِ مرغانِ ہم ففسِ ٹزرت

☆ ☆ ☆

سر گرمِ رقصِ نازہ ہیں قربانوں میں ہم  
سرخی سے کس کی آئے ہیں جولانیوں میں ہم

☆ ☆ ☆

پھلی وہ بو، جو ہم میں نہاں مثلِ غنچہ نہیں  
جھونکے نسیم کے بہ نیا گل کھلا گئے

☆ ☆ ☆

ہانی کے بدلے برے کی آج آگ ابر سے  
اٹھنے ہاری خاک سے بھی کچھ بخار ہیں

☆ ☆ ☆

اے حشر جلا کر تہہ و بالا زمین کو  
گر کچھ نہیں اسد نو ہے انقلاب میں

ان اسعار میں مومن نے قفس اور آسماں ، وصلِ نار اور انقلاب ، مرغانِ چمن اور ایامِ خزاں ، کچھِ قفس اور بادِ سیرِ موسمِ گل ، بجلی اور مصاد ، محنوں اور زنجیر ، شبِ فراں اور بیرہ رورگاری ، رقصِ نازہ ، آگ اور ابر وغیرہ کے اساروں میں اس زمانے کی اجتماعی زندگی کی تصویر کشی کی ہے ۔ ان اسعار سے ظاہر ہے کہ مومن اسے زمانے کے ناسازگار حالات کے سکھ سنج تھے ۔ زندگی سیاسی انحطاط اور معاشی روال کی وجہ سے ایک کس مپرسی کے عالم میں تھی ۔ تہذیب اور معاشرت کا جِراع آندھوں کی ردِ بر تھا ۔ افراد کے لیے زندگی وبال بن گئی تھی ۔ لوگ نامال تھے ۔ ان پر ایک اضطراب کا عالم طاری تھا ۔ ستم اٹھانا اور غم کھانا افراد کا مقدر بن گیا تھا ، لیکن اس کے ساتھ ہی مومن کی نگاہیں زندگی میں ایک انقلابی کھف کے آثار بھی دیکھ رہی تھیں ۔ گلشنِ امان میں انہیں بہار آتی ہوئی نظر آ رہی تھی ۔ اور کچھ لوگ فرانبوں میں سرگرمِ رقصِ نازہ دکھائی دے رہے تھے ۔ زمین اور آسمان میں نہلکہ سا محسا ہوا تھا ۔ ہانی کے بدلے ابر سے آگ برستی ہوئی اور خاک سے بخارات اٹھتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے ۔ انقلاب کا بازار گرم تھا ۔ اس انقلاب میں انہیں اسد کی انک کرن دکھائی دے رہی تھی ۔ اور وہ اسی انقلاب کی آرزو کر رہے تھے ۔

مومن کو اسی وجہ سے ہارے ایک نقاد نے اردو کا ہلا قومی شاعر قرار دنا ہے ۔  
اور یہ بات ایسی ہے کہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔

مومن کی غزل فنی اور جمالیاتی اعتبار سے بھی ایک امسازی حسبِ رکھتی ہے ۔ انہوں نے غزل کے بسادی اصولوں کو اپنی غزل میں برنا ہے اور ساتھ ہی ان اصولوں میں کچھ اضافے بھی کیے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل میں انک نا انداز ملتا ہے ۔ اس میں داخلیت اور خارجیت کا ایک حسین اور متوازن امتزاج ہے ۔ محسوساتی انداز نے اس میں رنگینی اور رچاؤ کی کیفیت پیدا کر دی ہے ۔ اس میں ہر باب ایک نئے انداز سے کہی گئی ہے اور ہر خیال ایک نئے زاویے سے پیش کیا گیا ہے ۔ اسی لیے اس میں جُدت اور ایچ نمایاں نظر آتی ہے ۔ اسارے اور کنائے اس میں بڑا کام کرتے ہیں ، اور ان کی وجہ سے اس میں رمزیت اور ایمائیت کی فضا پیدا بھی ہو جاتی ہے ۔ اس کی حدیں ، اس میں سنہ نہیں ،



کہ کہیں کہیں ابہام سے بھی جا ملتی ہیں ، لیکن نہ ابہام لطافت کے حدود میں رہتا ہے ۔ مومن کی غزل میں ایک پہلو دار کیفیت ہے ، وہ بات تہہ داری کے ساتھ کہتے ہیں ۔ اسی لیے ان کی غزل میں یہ ابہام کا سبہ ہو جاتا ہے ۔ بظاہر تو نہ ابہام نظر آتا ہے لیکن درحقیقت اظہار کی یہ وہ پہلو دار کیفیت ہے جو غزل اور خاص طور پر انسوس صدی کی اردو غزل کے ساتھ مخصوص ہے ۔ مومن نے اس سے انہی غزل میں اظہار و ابلاغ کی وسعتیں دہا کی ہیں اور اس کو رنگین اور ہر کار بھی بنایا ہے ۔ مومن کو زبان پر قدرت حاصل ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں زبان ایک فن کی صورت اخبار کرنی ہوئی نظر آتی ہے ۔ ان کی زبان میں بڑی سادگی اور صفائی ، حلاوت اور سیرابی ہے ۔ انہوں نے الفاظ کے مناسب استعمال سے اپنی غزل میں عجب گل کاریاں کی ہیں اور لہجے کی ساعری تو ان کی غزل میں ایسی ہے جس کی مثال اردو غزل کی روایہ میں کہیں اور نہیں مل سکتی ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل فنی اور جالہاتی اعتبار سے بھی دلوں میں اترتی اور حواس پر سرخوسی بن کر چھا جاتی ہے ۔ یہ چند اسعار اس کیفیت کو واضح کرنے ہیں :

☆ ☆ ☆

سر سے سعلے اٹھتے ہیں آنکھوں سے دریا جائے ہے

سمع سے یہ کس نے ذکر اس محفل آرا کا کبا

☆ ☆ ☆

وہ ہنسے سن کے نالہ بلبل کا مجھے رونا ہے خندہ گل کا

☆ ☆ ☆

اس نے دکھا دکھا کے مجھے ، چھڑ دکھا گل پھینکے عبدلیب گرفتار کی طرف

☆ ☆ ☆

خبر نہیں کہ اسے کیا ہوا ہر اس در پر نشانِ با نظر آتا ہے نامہ ہر کا سا

☆ ☆ ☆

میں اپنی چشمِ شو کو الزامِ خاک دوں نیری نگاہِ سرم سے کبا کچھ عیاں نہیں

☆ ☆ ☆

میرے نصیرِ رنگ کو سن دیکھ تجھ کو انہی نظر نہ ہو جائے

☆ ☆ ☆

اگر نہ دیکھتے وہ پیاری پیاری صورت آہ تو ایک ایک کے منہ کو نکا نہ کرتے ہم

☆ ☆ ☆

بے پردہ ہر چلون یک بار تم آ بیٹھے ہے تابِ نظر کس کو کیوں جلوہ گری اتنی

کیا گل کھلے گا دیکھیے ہے فصلِ گلِ نو دور اور سوئے دُست بھاگے ہیں کچھ ابھی سے ہم



چلتا نو دیکھا کہ فیامت نے بھی قدم طرزِ خرام و شوخی رفتار کے لیے

ان اسعار میں علامتوں کا جو استعمال ہے، رمز و ایما کی جو پہلو دار کیفیت ہے، مصوری اور محاکب کا جو انداز ہے اور زبان و بیان کا جو جادو ہے اور لب و لہجہ کی جو سامری ہے، اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مومن فنِ غزل کے ایک بہت بڑے خالقِ جلال ہیں۔ انہوں نے اس فن کی روایت کو بڑے سلیقے سے رہا ہے اور اس میں اپنے نئے فنی تجربات سے حسن و جلال کی نئی دنیاں بھی پیدا کی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مومن کی غزل، اردو غزل کی روایت میں ایک نئی شان سے جلوہ گر نظر آتی ہے۔

مومن نے غزل کے ساتھ ساتھ قصیدے بھی کہے ہیں اور ان سے یہ قصیدے بھی انہی جگہ اہمیت رکھتے ہیں۔ ان قصیدوں کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ محض روانی انداز میں صرف مسائل کی نمنا اور حل کی نروا، کے خال سے نہیں لکھے گئے ہیں، بلکہ شاعر کا جذب و سوز ان کی تخلیق کا باعث بنا ہے۔ مومن درباروں کی دنیا کے آدمی نہیں تھے۔ وہ خواہ مخواہ کسی کی مدح نہیں کر سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بیشتر قصیدے امراء و رؤسا کی مدح میں نہیں ہیں۔ وہ تو اسی شخصوں کے بارے میں ہیں، جن کی اہمیت پاری تاریخ اور دنی روایت میں مستلزم ہے۔ مثلاً حمد و ثناء میں انہوں نے قصیدے کہے ہیں۔ بھر صحابہ کرام اور اہل سنت کی مدح میں بھی چند قصیدے لکھے ہیں۔ صرف گنتی کے حد قصیدے ان کے دیوان میں اسے ہیں جو اس زمانے کے بعض امراء کے بارے میں ہیں۔ لیکن ان میں مدح نہیں ہے۔ شاعر کے اپنے ذاتی اور انفرادی تاثرات ہیں۔ ان قصیدوں میں مومن کی سببیں شاعرانہ اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہیں اور ان میں انہوں نے اپنی طبیعت کے خوب جوہر دکھائے ہیں۔ مدح کا حصہ ان میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ مبالغہ بھی ان میں نہیں ہے۔ برخلاف اس کے ان میں مجموعی طور پر حقیقت اور واقعیت کی شان نظر آتی ہے۔ فادر الکلامی اور زبان و بیان پر قدرت ان کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ قصیدے، اردو قصیدے کی روایت میں اضافہ ہیں۔

غزل اور قصیدے کے ساتھ ساتھ مومن نے مثنویاں بھی لکھی ہیں، اور ان میں سے ہر مثنوی بقول شیفتہ ”رُشکِ گلشن اور غیرِ چمن ہے“<sup>(۱)</sup> مومن نے کل چھ مثنویاں لکھی

ہیں۔ ان کی پہلی مثنوی 'سکانتِ ستم' ہے۔ اس میں انہوں نے اپنی زندگی کے دو عشقیہ واقعات کی تفصیل پس کی ہے۔ دوسری مثنوی 'قصۂ غم' ہے اور اس میں بھی مومن نے عشق و ہوس کے بعض واقعات بیان کئے ہیں۔ دوسری مثنوی کا نام 'قولِ غمیں' ہے۔ اس مثنوی کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ یہ مومن کی صحیح داسانِ عشق ہے۔ سفتہ لے اس کے متعلق لکھا ہے کہ "مثنوی قولِ غمیں کہ از مصنفات خانِ معرے الہ اس سرح نسخہ" جمالِ ہاں صاحبِ موزوں مد است" مومن نے اس مسوی میں صاحبِ جی کے عشق کا واقعہ بیان کیا ہے۔ اور اس کے عشق میں ان کی جو کیفیت ہوئی، اس کی تفصیل پس کی ہے۔ مومن کی چوتھی مثنوی 'نفِ آسں' ہے۔ اس میں بھی عشق کے بعض واقعات اور انہی اس حالتِ زار کا بیان ہے جو عشق کے بابھوں بدلا ہوئی ہے۔ ان کی ناخوس مثنوی 'حننِ غم' کے عنوان سے لکھی گئی ہے۔ یہ مثنوی در حقیقت حوینہی مسوی کا تتمہ ہے۔ اس کا آغاز اس عم کے اظہار سے ہوتا ہے جس کا ناعب عھلی محبوبہ بھی۔ اس نے مومن سے قطع تعلیٰ کر لیا اور اس کی وجہ سے انکی زندگی لے رنگ و بو ہو گئی۔ اس میں زندگی سے برگشتہ اور سزار ہونے کا ذکر ربادہ ہے۔ مومن کی چھٹی مسوی 'آہ و رارٹی معلوم' ہے۔ اس میں محبوبہ کے نام ایک بہام اور عشق کی اہمیت کا اظہار ہے۔ اس اظہار کے لیے انہوں نے ایک نوجوان کی داسانِ عشق بھی سنائی ہے۔

مومن کی یہ مثنویاں ان کے دلی اور انفرادی تجربات کی آئینہ دار ہیں۔ اسی لیے ان میں آپ اسی کا رنگ ملا ہے۔ ان کا موضوع در حقیقت ان کی جوانی کے زمانے کے واقعات ہیں جن کو انک عالمِ سرخوسی نے پیدا کیا ہے۔ ان میں عشق کم اور ہوس کی داسانیں زیادہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں جگہ جگہ عربانی اور ابدال کا رنگ بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ لیکن اس میں سبب نہیں کہ ایسے مواقع پر واقعے اور حقیقت کچھ اس طرح اپنے آپ کو رونما کریں ہے کہ اس عربانی اور ابدال کے ساتھ مطابقت پیدا کر لینے کو جی چاہتا ہے۔

ان مثنویوں میں زندگی کے اعلیٰ معیار نہیں ہیں۔ کیونکہ ان میں سے سنہر میں عشق کی حدیں ہوس سے جا ملی ہیں۔ اور اسی ہوس کو ان مثنویوں میں عشق بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مثنویوں میں عشق کے بھی اعلیٰ معیار اور ارفع اقدار کا پتہ نہیں چلتا۔ ان مثنویوں کا بنیادی کردار ایک ایسا شخص ہے جس کی جوانی دیوانی ہے اور جس نے اس جوانی کی دل کھول کر داد دی ہے۔

یہ مثنویاں ایک مخصوص معاشرتی ماحول کی پیداوار ہیں۔ ان میں حسن سے دلچسپی لینے اور متاثر ہونے کی جو فضا ہے، محبوب کا جو مخصوص نصوّر ہے، اس کی ذات سے اکتسابِ

لذت کا جو خیال ہے ، اور عشق و عاشقی کے جو مخصوص معبار ہیں ، ان سب میں اس مخصوص معاشرتی ماحول کا عکس نظر آتا ہے جس کے سائے میں ان کی تخلیق ہوئی ہے ۔ اس معاشرے کے افراد کو حسن کا احساس اور اس کے ساتھ والہانہ انداز میں دلچسپی لےنے کا خیال ورے میں ملا تھا ۔ اس حسن کو افراد محبوب کی ذات میں تلاش کرتے تھے ۔ اور اس کی ذاب سے لطف اندوز ہونے کو عشق بصورت کرنے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس عسوی کی حدس ہوس سے ملی ہوئی نہیں ۔ اس حسن و عشق سے لگاؤ ، زندگی کے ان سنگین اور ٹھوس حقائق سے انک طرح کا فرار بھی تھا جن سے اس وقت کی زندگی دو چار بھی ۔ غالب اور مومن کی غزلوں میں بھی اس کی جھلکیاں نظر آتی ہیں اور مومن کی مثنویوں میں تو یہ رجحان اپنے سبب پر دکھائی دے رہا ہے ۔

مومن نے اگرچہ ان مثنویوں میں اپنے دلی اور انفرادی مجربات کو بس کیا ہے لیکن ان میں اس زمانے کی معاشرتی اور مہذبہ زندگی کی صحیح تصویریں نظر آتی ہیں ۔ اس زمانے میں حسن کا جو تصور تھا ، عشق و عاشقی کے جو معیار تھے ، مجلسی زندگی کی جو کیفیت تھی ، رہن سہن کے جو آداب تھے ، انفرادی زندگی کے جو جذباتی مسلات اور ذہنی رجحانات تھے ، ان سب کی تصویریں ان مثنویوں میں بے نقاب ملتی ہیں ۔ اس زمانے کی معاشرے کا غالباً سب سے اہم رجحان رندی اور دین داری کا اتصال بلکہ اسراح تھا ۔ مومن کی یہ مثنویاں اس رجحان کے مختلف پہلوؤں کی درجہ ان اور عکاس ہیں اور اس کی تفصیل و جزئیات ان میں جگہ جگہ نکھری ہوئی نظر آتی ہے ۔

یہ مثنویاں اردو مثنوی کی فنی روانت کے زیر اثر نہیں اکھی گئی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں مثنوی کی صنف کے فنی مقضبات کو تلاش کرنا بے سود ہے ۔ ان میں قصے کا عنصر نہ ہونے کے برابر ہے ۔ نہ تو صرف خند و اعباب کو بس کرتی ہیں ، جو سدھے سادھے ہیں ، جن میں کہانی کے نالٹ کی طرح نشیب و فراز اور بیچ و خم نہیں ہیں ۔ لیکن اس کے باوجود ان واعبات میں دلچسپی کا بڑا سامان ہے ۔ کیونکہ ان میں صداقت ، اصلیت اور واقعیت کے عناصر ایک ایسی فضا کو پیدا کر دیے ہیں جو اجنبی اور نامانوس نہیں ہوتی ۔ واقعہ نگاری ، منظر نگاری اور جذبات نگاری کے بعض بہت اچھے نمونے ان مثنویوں میں ملتے ہیں ۔ اگرچہ ان میں سے بیشتر کا خاتمہ عموماً ناکامی اور محرومی پر ہوتا ہے ، لیکن ساتھ ہی شگفتگی اور سادگی کی ایک فضا بھی ان میں نظر آتی ہے ، اور جگہ جگہ رنگ و نور اور کیف و سرور کا ایک دریا سا موجزن دکھائی دے رہا ہے ۔ زبان و بیان کے فنی پہلو بھی ان مثنویوں میں اپنے آپ کو ہر جگہ رونما کرتے ہیں اور مجموعی طور پر جالبی اعتبار سے ان میں ایک شان نظر آتی ہے ۔

غرض مومن انیسویں صدی کے ایک اہم شاعر ہیں، جو بہ تک وقت ایک اعلیٰ درجے کے غزل گو، ایک بلند مرتبہ فصیحہ نویس اور ایک منفرد منوی نگار تھے۔ اردو شاعری کی روایت میں ان کا مرتبہ مسلم ہے اور ان کی شاعری اس روایت میں ایک نرالی شان سے جلوہ گر دکھائی دیتی ہے۔



### کتابیات

مومن	کتاب	مطبع رفاہ عام دہلی - فروری ۱۸۴۶ء
مومن	کتاب	مجلس درس دہلی ۱۸۵۲ء
مومن	کتاب	انڈین پنچ درس دہلی ۱۸۵۵ء
مومن	کتاب	مطبع ہاسمی دہلی ۱۸۶۱ء
مومن	کتاب	نول کسور درس کانور ۱۸۶۷ء/۱۲۸۴
مومن	کتاب	نول کسور درس کانور ستمبر ۱۸۸۰ء
مومن	کتاب	نول کسور درس کانور نومبر ۱۸۸۵ء
مومن	کتاب	نول کسور درس لکھنؤ ستمبر ۱۹۰۵ء
مومن	کتاب	نول کسور درس لکھنؤ دسمبر ۱۹۱۵ء
مومن	کتاب	نول کسور درس لکھنؤ دسمبر ۱۹۳۰ء
مومن	مجموعہٴ فصائد	الناظر درس لکھنؤ ۱۹۲۲ء
مومن	دیوان غزلاب اردو	مرتبہ ضاء احمد بدایونی، ساتی برس الہ آباد ۱۹۳۴ء
ایضاً	ایضاً	مرتبہ ضاء احمد بدایونی، ساتی برس الہ آباد ۱۹۴۷ء
ایضاً	ایضاً	مرتبہ ضاء احمد بدایونی، ساتی برس الہ آباد ۱۹۵۳ء
مومن	کتاب	اردو مرکز کراچی ۱۹۵۵ء
مومن	دیوان فارسی	مطبع سلطانی دہلی جولائی ۱۸۵۵ء/۱۲۷۱
مومن	انسائے فارسی	مطبع سلطانی دہلی مئی ۱۸۵۵ء/۱۲۷۱
شیفتہ	گسن بے حار	نول کسور برس لکھنؤ ۱۹۲۵ء
کریم الدین	نذکرہ طبقات شعرائے ہند	رفاہ عالم برس دہلی ۱۸۳۸ء
کریم الدین	گلدستہٴ نازنین	رفاہ عام برس دہلی ۱۸۳۵ء

صابر، مرزا قادر بخش	گلستان سخن	مطبع مرانضوی دہلی ۱۸۶۸ء
نساخ	سخن لشعراء	نول کشور پریس لکھنؤ ۱۸۷۴ء
باطن، قطب الدین	گلستان بے خزاں	نول کشور پریس لکھنؤ ۱۸۷۴ء/۱۲۹۱ھ
صغیر ہلگرامی	جلوۂ خضر	۱۸۸۳ء
نور الحسن	طورِ کلیم	مطبع ساہجان بہونال ۱۸۷۵ء/۱۲۹۲ھ
آزاد	آبِ حیات	۱۸۸۲ء
عبدالحمی	گلِ رعنا	معارف پریس اعظم گڑھ۔ طبع سوم ۱۹۳۸ء
عبدالسلام ندوی	شعر الہند	معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۲۵ء و ۱۹۲۶ء
حالی	بادِ ذکرِ غالب	شیخ مبارک علی لاہور ۱۹۳۰ء
گارساں دی ناسی	مقالات	انجمن برقی اردو ہند ۱۹۳۳ء
گارساں دی ناسی	خطبات	انجمن برقی اردو ہند ۱۹۳۵ء
ناصر نذیر فراہ	سخنِ درد	جستہ برقی پریس دہلی ۱۹۲۵ء
غالب	عودِ ہندی	مطبع ممتاز علی مرثیہ السور ۱۸۶۸ء
غالب	اردوئے معلیٰ	اکمل الطابع دہلی اپریل ۱۸۶۹ء
امداد امام ابر	کاسف الحقائق	مکسہ معین الادب لاہور ۱۹۵۶ء
فرح اللہ بگ	دلی کا ایک نادگار مساعره	حایب اسلام پریس لاہور ۱۹۳۰ء
عرس گیاوی	حیاتِ مومن	علی پریس دہلی ۱۹۲۹ء/۱۳۴۸ھ
نور الحسن ہاسمی، ڈاکٹر دلی کا دستانِ ساعری		فروع اردو لکھنؤ ۱۹۶۵ء
مولوی عبدالحمی، ڈاکٹر خطبات		انجمن برقی اردو نا لسان ۱۹۵۲ء/۱۹۶۴ء
نیار فتح پوری	انتہادایات	نگار تک ایجسی لکھنؤ ۱۹۴۳ء
نیار فتح پوری	'نگار' اردو ساعری نمبر ۱۹۲۵ء	
نیار فتح پوری	'نگار' اصافِ سخن نمبر	
نثار فتح پوری	'نگار' مومن نمبر ۱۹۲۸ء	
رشید احمد صدیقی	جدید اردو غزل	
فراہ گور کھپوری	اردو غزل گوئی	فروع اردو لاہور ۱۹۵۵ء
یوسف حسین خان، ڈاکٹر اردو غزل		اعظم پریس حیدر آباد ۱۹۴۸ء
ابوالسلیت صدیقی، ڈاکٹر غزل اور متغزلین		اردو مرکز لاہور دسمبر ۱۹۵۳ء
محمد اکرام، شیخ	موجِ کوثر	فیروز سنز لاہور ۱۹۵۸ء
محمد اکرام، شیخ	رودِ کوثر	فیروز سنز لاہور ۱۹۶۸ء
ندوی، سید ابوالحسن علی میرٹ احمد شہید		نامی پریس لکھنؤ ۱۹۳۹ء

## (ب) شیفہ

شیفہ کا نام محمد مصطفیٰ خان تھا۔ وہ فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفہ تخلص رکھتے تھے۔ ان کی تاریخ بدائش طاعت کے ساتھ معلوم نہیں۔ نازہ برن حقیقی کے مطابق ۱۸۰۶ء میں پیدا ہوئے<sup>(۱)</sup>۔ ان کے والد نواب مرتضیٰ خان بھی جہیں گوڑگانوں کے مضافات میں ہوٹل بلول کا علاقہ بطور جاگیر ملا تھا۔ یہ مرتضیٰ خان کے انتقال پر بھی سرکار ضبط ہوگیا اور اس کے بدلے میں حاندان والوں کا بس ہرار روبہ سالانہ وظیفہ مقرر ہوا جو ۱۸۵۷ء تک جاری رہا۔ اس کے علاوہ جہانگیر آباد کا علاقہ نواب مرتضیٰ خان نے خرید کر سمنہ کے نام منسل کر دیا تھا جو آخر تک ان کی ملکیت رہا۔

نظامی ہدایوں نے سمنہ و حسرتی کے دماغ میں لکھا ہے کہ سمنہ نے دہلی کے ایک مشہور برک اور سرپرآوردہ معلم مسماں جی مالا مان سے فارسی عربی پڑھی اور علوم مروجہ حاصل کئے<sup>(۲)</sup>۔ حدیب و قرأت کا علم مولانا محمد نور دہلوی سے حاصل کیا اور جب مکے گئے تو وہاں سجع عبداللہ سراج حنفی سے اور مدینے میں سیخ محمد عابد سدھی سے حدیث پڑھی۔ مدینے ہی میں مولوی کرم اللہ سے بھی کچھ استفادہ کیا۔

نوحوانی کے زمانے میں سمنہ کی زندگی اس زمانے کے دولت مند شریف زادوں کی زندگی سے مختلف نہ تھی۔ علم و فضل اور شعر و سخن کی محفلوں میں بھی جاتے تھے، اور شاہدانِ بازاری سے بھی ربط و صلہ رکھتے تھے۔ جیسے جیسے عمر بڑھی گئی ویسے ویسے مادی و حسی لذائذ سے دور اور روحانی و ذہنی مشاغل سے قرب ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ ۱۸۳۹ء (۱۲۵۴ھ) میں حج کے لیے گئے اور حج سے واپس آکر شاہد و سراب سے بالکل کنارہ کس ہو گئے۔ خود کہتے ہیں:

اے شیفہ ہم جب سے کہ آئے ہیں حرم سے سو فی صم و حواہس صہبا نہیں رکھتے

ان کے زمانہ سباب کے معنوں میں بی رنج و نراک کا ذکر خصوصیت سے کرنا ضروری ہے جو نارنول کی ڈبرے دار بھی اور دلی آکر چرخے والوں کے محلے میں رہتی تھی۔ شیفہ نے اپنے تذکرے "گلشنِ بے خار" میں اس کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور اس کی ہمجولی جنگلو کی مستی مالی کی تاریخ بھی ایک قطعے میں نکالی ہے۔ رنجو کے نام شیفہ کے نین منظوم خط بھی ملتے ہیں۔

(۱) حبیب اشعر (مرتب) دیوان شیفہ، ص ۲۶۳، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۵ء۔ اس سے قبل عندلیب شادانی نے "تحقیق کی روشنی" نامی کتاب میں جو ۱۹۶۳ء میں لاہور سے شائع ہوئی ص ۲۰ پر تاریخ بدائش ۱۸۰۹ء/۱۲۲۴ھ دی ہے اور کلب علی خان فانی رام پوری نے اپنی کتاب "مومن" میں شیفہ کی تاریخ بدائش ۱۲۱۸ھ متعین کی ہے جو ۱۸۰۳ء کے مطابق ہے۔ فائق رام پوری کا حوالہ حبیب اشعر نے بھی دیا ہے۔

(۲) حبیب اشعر (مرتب) دیوان شیفہ (دیباچہ) ص ۲۶۵، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۵ء

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں نہ ہوا کہ ٹھاکروں نے جہانگیر آباد کے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ محلوں کو آگ لگا دی جس سے سیفہ کا تمام اثاثہ، کتب خانہ اور فنی سودا جل کر راکھ ہو گئے۔ انگریزوں نے بغاوت کا الزام لگا کر سیفہ کو مد و بند میں بھی رکھا، لیکن مراجعے میں وہ رہا ہو گئے اور سب مدارج و مناسبت بھی بحال ہو گئے۔

سیفہ ذیابطیس کے مریض تھے۔ ۱۸۶۹ء میں فوت ہوئے اور سلطان المشائخ محبوب الہی کی درگاہ میں اپنے جدِ احمَد کے مزار کے درمیان دفن ہوئے۔

سیفہ کی فارسی تصنیفات میں ایک نو 'سفر نامہ' حجاز ہے جس کا فارسی نام 'رہ آورد' اور عربی نام 'ترغیب السالک الہی احسن المسالک' ہے۔ دوسری نصف 'مجموعہ' رفاع ہے جس کا نام 'لحنِ عرا' ہے۔ اس میں غالب، آردہ، نواب عبداللہ خاں، ہومن، حکم احسن اللہ خاں، فضلِ حق خیر آبادی، فضل اللہ خاں اور میر جھو خاں کے نام ۳۳ خطوط ہیں اور باقی ۲۴ خطوط کے مکسود السہم کے نام ہیں جن کی صراحت نہیں کی گئی ہے۔ دوسری نصف سمرائے اردو کا تذکرہ ہے جس کا نام 'دکنِ بے خار' ہے۔ اس میں ۶۷ شاعروں کا تذکرہ ہے۔ دوسری نصف 'دیوانِ فارسی' ہے جس میں قصیدے، قطعے اور غزلیں ہیں<sup>(۱)</sup>۔ اردو میں سیفہ کی صرف ایک نصف ہے یعنی 'دیوانِ سیفہ'۔

سیفہ کا اردو دیوان ان کی زندگی ہی میں پہلی بار مرتبہ سے ۱۸۵۴ء میں شائع ہوا۔ دوسری اساع دہلی میں ۱۸۸۶ء میں ہوئی۔ اس کے بعد نہ دیوان کئی بار چھپا۔ نازہ نرین انڈینن جو سنٹر کے سب انڈسٹریوں سے زیادہ جامع ہے لاہور سے ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا ہے۔

'تذکرہ گلشنِ بے خار' دہلی سے ۱۸۳۷ء (۱۲۵۳ھ) میں شائع ہوا۔ انی ساعری کے بارے میں سیفہ نے جو کچھ لکھا ہے<sup>(۲)</sup>، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دیوان کا بیشتر حصہ ۳۰ سال کی عمر سے پہلے لکھا جا چکا تھا، کیونکہ وہ کہتے ہیں "اب مدب ہوئی کہ اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں" اور اگرچہ یہ تذکرہ ۱۸۳۷ء (۱۲۵۳ھ) میں شائع ہوا، خود سیفہ کے قول کے مطابق یہ ۱۸۳۴ء (۱۲۵۰ھ) میں مکمل ہو چکا تھا<sup>(۳)</sup>۔ اگر سیفہ کے بیان کو صحیح مان لیا جائے تو اس سے نہ نسخہ بھی نکلا ہے کہ وہ حج کے لیے روانہ ہونے سے پہلے ہی اشغالِ عالیہ اور فنونِ شریفہ کی طرف راغب ہو چکے تھے اور اسی لیے شعر گوئی بھی بہت کم کر دی تھی کہ اس میں انہماک ان اشغال سے باز رکھتا ہے۔ ایک شعر میں انہوں نے دعویٰ کیا ہے :

(۱) فاروق، محمد احسان الحق، (مترجم) گلشنِ بے خار، ص ۵۴۶، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۲ء

(۲) ایضاً - ص ۲۸۵

(۳) ایضاً - ص ۶۸



اے شیفہ اس فن میں ہوں اک پیرِ طریقت گو عمر ہے مبری ابھی اکس برس کی  
غزل میں فعلی کی روایت کا لحاظ کرتے ہوئے بھی قاس قائم کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے  
کہ وہ بیس اکیس برس کی عمر میں اچھے خاصے شعر کہنے لگے تھے ، خواہ لوگ انہیں  
پیرِ طریقت نہ بھی مانتے ہوں ۔ دراصل شیفہ کا دیوان بستر ایسے کلام پر مشتمل ہے  
جو ان کے عالمِ سبب میں لکھا گیا ہے ۔

مومن سے اسفادے کا تو شیفہ نے صراحت سے خود ہی اعراف کر لیا ہے ۔ اس  
کے علاوہ دیوان کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے ناسخ ، غالب ، جراب اور  
سہر سے بھی اثرات قبول کئے ہیں ۔ جس زمانے میں شیفہ نے شعر گوئی کا آغاز کیا اس  
وقت ناسخ کی ساعری کا نڑا سپرہ تھا ۔ حناخہ شیفہ کے سہ سے اشعار پر ناسخ کا  
رنگ غالب نظر آتا ہے ، مثلاً :

صبح ہونے ہی گیا گھر میں ناناں مرا      ننجہ خورے کنا خاک گرباں میرا

☆ ☆ ☆  
کچھ تو سب رس کام کر دلخی کس بدار کو      دے کفن تو عسو سریں ناف کا فرہاد کو  
ایک عزل جس کا مطلع ہے :

اے فلک یوں کاسبِ عیس کر رویر کو      خوابِ شریں بھی نہ ہو فرہادِ سور انگیز کو  
ناسخ ہی کے انداز میں لکھی ہے اور مقطع میں اس کی تصریح بھی کر دی ہے کہ زمانے  
کا مذاق بھی ہے :

اہلِ محفل کے سند طبع نہ ابدار ہے      شیفہ کس کو سنائے سحرِ درد آہز کو؟  
وسے تو الفاظ سے کھیلنے کا سووی اردو کے سب ہی شعراء کو کم و بیش رہا ہے ، لیکن  
اس میں علو کے ذمہ دار شعرائے لکھنؤ ہیں اور غالباً انہی کے اثر سے شیفہ کو لفظی  
مناسبات و رعایات اور الٹ بھر سے لے حد دلچسپی پیدا ہو گئی ۔ حناخہ نسوں تنوع  
صرف اسی سووی کا مظاہرہ کرنے ہیں ، ان سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ساعر کو کوئی  
خاص بات کہنی نہیں تھی ۔ صرف الفاظ کے کھیل سے مطلب تھا ، مثلاً :

نہا کیا ہجوم سہرِ رنار ہزار کا      گل ہو گا چراغ ہارے مزار کا

☆ ☆ ☆  
پانی پانی ہوئے مرفد بہ مرے آکے وہ جب      سمع کو نرس نہ پروانے کی گریاں دیکھا

☆ ☆ ☆  
میں سادگی سے بیان کر رہا ہوں وصفِ دہن      وہ ہونٹ کاٹتے ہیں انی نکتہ دانی سے  
شعرائے لکھنؤ کے بعض اور اثرات بھی شیفہ نے قبول کیے ، جسے علمی اصطلاحات اور  
ثقیل و نامانوس الفاظ کا غزل میں بلا نکالت استعمال ، نسوانی زبان کا استعمال ، مذہبِ کلامی ،  
واسوخت کا سا انداز ، لطفِ زبان پیدا کرنے کے لیے محاورے باندھنے کا رجحان جیسے :

صہاد کا دل اس سے پگھلنا متعذر      جو نالہ کہ آنس فگنِ دام نہ ہوگا  
 ☆ ☆ ☆  
 سو خوف کی ہو جائے مگر رندِ نظر باز      دل جلوہ گہ لاشف وشف نہیں کرنا  
 ☆ ☆ ☆  
 بیڑے صبر آرام کی جان پر      مری حالے صبر وے تاب کا  
 ☆ ☆ ☆  
 اس جنسِ ابرو کا گیلا ہو نہیں سکتا      دل گوست ہے ناخن سے جدا بہ نہیں سکتا  
 ☆ ☆ ☆  
 سح تو بہ ہے کہ بول گئے اکبر اہلِ سو      بلبل لے کی جو نالہ سرائی تمام شب  
 ☆ ☆ ☆  
 بوسہ ہنسی ہنسی میں حوکل لے لیا تو پھر      کہنے لگے بھلا ہمیں کہا مسہ لگائے  
 نسخ اور ان کے ملامتہ کے بعد سفسہ نے جرأت و موس کا اور زیادہ بول کہا ہے ، ج  
 کے نسخے میں انک نو لذت سمدانہ معاملہ بندی اور عدو کا بکرب نہ کرہ ان کے کا  
 میں ملتا ہے ۔ دوسرے براکبِ نخل ، باب کو پیچندہ بنا دینے کی صنعت بھی ان  
 موجود ہے ، مثلاً :  
 ظالم کبھی تو دادِ دل و حسمِ در ملے      مسے سے مسہ اور نظر سے نظر ملے  
 ☆ ☆ ☆  
 شرمائے اس مدر رہے کہوں آبِ راب کو      مدد میں گو ملے بھی مگر میں نا نہ ہو  
 دشمن کے فعل کی ہمیں وجہ کا ضرور      ہم سے مجھے فقط گہ دوستانہ ہو  
 ☆ ☆ ☆  
 کہنا ہوں جو غیر سے نہ ملے      کہنا ہے کہ کیا میں لے وفا ہوا  
 ☆ ☆ ☆  
 منع وصلِ غیر بر ہنس کر کہا      نارے اب تم کو بھی غبر ہو گئے  
 شہقتہ نے غالب سے بھی بہت کچھ سیکھا ہے ۔ عاشقانہ جذبات کی تحلیلِ نفسی ، نکتہ آفر  
 اور نفسانی حقائق جو غالب کی شاعری کی اہم خصوصیتیں ہیں ، اننا برنو سیفہ کے  
 و فکر پر بھی ڈالتی ہیں اور ان کے اسلوبِ اظہار کو بھی مائر کرتی ہیں ۔ کئی شعر  
 محض غالب کی آوازِ بازگشت معلوم ہوتے ہیں :  
 خلوت میں شہقتہ سے کوئی مل کے کیا کرے      وہ شخص انجمن میں بھی اور انجمن میں  
 ☆ ☆ ☆

اسبابِ عشق یہ جو مہبا ہے شیفہ کیا بردہ تم سے آنے کی ان کے خبر ہے آج

☆ ☆ ☆

بے سذر وہ کرلنے ہیں وعدہ نہ سمجھ کر نہ اہلِ مروت ہیں نقاب نہ کرینگے

☆ ☆ ☆

نہ دیا ہائے مجھے لذتِ آزار نے حق دل ہوا رنج سے خالی بھی تو جی بھر آیا  
اس کے علاوہ غالب کا اثر ان عرلوں میں بھی نظر آتا ہے جو غالب کی زمینوں میں  
لکھی گئی ہیں۔ اگرچہ نسخ، مومن اور غالب کے انداز اور میر کے انداز میں بڑا فرق ہے  
اور شیفہ نے اول الذکر شعراء کے ابرار زیادہ مول کئے ہیں تاہم میر کا طرز بھی انہیں  
کبھی کبھی تقلید پر اکسانا ہے، خود کہنے ہیں :

نرالی سب سے ہے انی روض اے شیفہ لیکن کبھی دل میں ہوائے نیوہ ہائے میر پھرتی ہے  
چنانچہ بعض اوقات میر کے رنگ میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں :

مب چھڑ کہ نار سے جدا ہوں اے موب میں آپ مر رہا ہوں

☆ ☆ ☆

آسد آمد میں اس قدر سوز دیکھے کیا کریں ہمار میں ہم  
وہ سو سوسار اخبار میں آئے پھر نہیں اپنے اخبار میں ہم

اس طرح ظاہر ہے کہ شیفہ نے اپنے رنگ مختلف رنگوں کو ملا کر اور اس آمیزے  
میں خود انی شخصیت اور انی طرزِ فکر و احساس کا عنصر داخل کر کے برسب دیا ہے۔  
شیفہ کے نظریہٴ ساعری کو سمجھنے اور نہ جاننے کے لئے کہ وہ خود انی ساعری کے  
کون سے پہلوؤں کو اہم سمجھے ہیں، ذیل کے اسعار مدد و معاون ثابت ہوتے ہیں :

معنی کی فکر چاہیے صوب سے کیا حصول کا فائدہ ہے موح اگر ہے سراب میں

☆ ☆ ☆

وہ طرزِ فکر ہم کو خوش آتی ہے شیفہ معنی سنگفہ، لفظِ خوش انداز، صاف ہو

☆ ☆ ☆

شیفہ کیسے ہی معنی ہوں مگر نامقبول اگر اسلوبِ عبارت میں متانت کم ہو

☆ ☆ ☆

یہ بات نو غلط ہے کہ دیوانِ شفتہ ہے نسخہٴ معارف و مجموعہٴ کمال



لیکن مبالغہ ہو ہے البتہ اس میں کم ہاں ذکرِ خدو خال اگر ہے نو خال خال



سُفیدہ سادہ سانی نے ہمیں چمکایا ورنہ صنعت میں بہت لوگ ہیں بہتر ہم سے



سُفیدہ اور سائنس کے نہیں ہم خواہاں ہی بس ہے کہ کہیں ہے یہ زبانِ دہلی

سُفیدہ نے جس نظریہٴ ساعری کا اظہار کیا ہے اسے اکثر و بیشتر خود بھی برنا ہے اور جو خصوصیات انہی کلام کی انہوں نے گنوائی ہیں ، وہ ان کے کلام میں موجود ہیں ۔ نہ امر واقعہ ہے کہ انہوں نے خدو خال کی باب بہت کم کی ہے ، دہلوی زبانِ برقی ہے ، اسلوب میں سانس قائم رکھی ہے ، صنعتگری کے مقابلے میں سادہ بانی میں زیادہ کامیاب رہے ہیں اور اگرچہ انہوں نے انہی کلام کو نسخہٴ معارف قرار دینے سے بظاہر انکار کیا ہے لیکن یہ انکار ایسا ہے کہ درحقیقت ان کا دعویٰ سمجھا جا سکتا ہے ۔ بالواسطہ طور پر ان کا یہ دعویٰ بھی درست ہے ۔ کیونکہ ان کا اچھا کلام حقیقت میں عقلِ سلیم کو اپیل کرنے والی حکمت کی بانوں سے سُرا ہے ۔

جہاں تک سُفیدہ کی ساعری کے مضامین و موضوعات کا تعلق ہے ، غزل کی مناسبت سے حسن و عسق کی کیفیات یا عاسق و معشوق کے معاملات کا بیان نو لازماً سب سے زیادہ ہے اور رسمی و روایتی بانوں کی بھی کمی نہیں ، تاہم خلوص و صداقت یا ندرت و جدت یا ایک خاص انفرادی روئے کا اظہار بھی سسیوں اشعار سے ہوتا ہے ، جو بڑھنے والوں کی نوجہ کو فوراً انہی طرف کھینچ لیا ہے ۔ مثلاً :

اس سے میں سکونے کی جا سکر ستم کر آنا کیا کروں بھا مرے دل میں سو زبان پر آیا



میں وصل میں بھی سُفیدہ حسرت طلب رہا گستاخیوں میں بھی مجھے باسِ ادب رہا



آشفٹہ زلف ، چاک فبا ، نیم باز چشم ہیں صحبتِ شبانہ کے ظاہر نشانِ ہنوز



اظہارِ عشق اس سے نہ کرنا تھا شفتہ یہ کیا کیا کہ دوست کو دشمن بنا دیا



ہر چند مجھ سے لے سب آزرده ہے مگر ڈرنا ہوں میں منانے سے آزاد نہ ہو

☆ ☆ ☆

لا و نعم نہیں جو تمنائے وصل پر انکار سے حجاب ہے اور ار سے حجاب  
حسن و عشق والی شاعری میں تہفہ کی وہ مسلسل غزلیں نا قطعہ بند اسعار خاص  
طور پر قابلِ لحاظ ہیں، جن میں محبوب کے روئے کی تفصیل دی گئی ہے۔ اسے اسعار  
میں معنوی لحاظ سے تضاد و تعادل اور صوری لحاظ سے روانی و مسلسل مسائر کے بغیر نہیں  
رہتا۔ مثلاً وہ قطعہ ملاحظہ کیجیے جس کا ابتدائی شعر ہے :

کہا کل میں نے اے سرمایہٴ نار بلوں سے ہے ہم کو مدعا کما  
یا پھر وہ غزل دیکھئے جس کا مطلع ہے :  
آج ہی کیا آگ ہے سرگرم کس نوکب نہ نہا سمع ساں مجبور خوئے آسب نوکب نہ نہا  
اسی طرح عاسی اور معسوی کے احوال کا تقابل اس مسلسل غزل میں دیکھئے جس کا مطلع ہے :

پھر محرک ستم سعاری ہے پھر انہیں حسجو بہاری ہے  
غرض سفسہ کی غزلوں میں حسن و عشق کا موضوع خاص اہم رکھا ہے اور جانے  
بوجھے، ہزار بار سنے ہوئے، پڑھے ہوئے مضامین بھی جب سفسہ کے دل و دماغ کے واسطے  
سے نوکِ فلم تک پہنچتے ہیں تو ان میں بھی نئی جان بڑھاتی ہے۔  
مے و نغمہ اور ساقی و سخانہ کے موضوع پر بھی سفسہ کے شعر خاصے کی چیز ہیں۔  
مثلاً نغمے کے ساتھ سراب کو جو نسبت ہے، سفسہ سے سنئے :  
ساقی کے بے مدد نہ بنی باب رات کو مطرب اگرچہ کام میں اتنے یگانہ نہا  
اور بادہ فروش کے امتحان کا معیار دیکھئے :  
شراب دیکھ کہ کس رنگ کی پلانا ہے جز اس کے اور نہیں امتحانِ بادہ فروش  
اور ذیل کے دو شعر بلا بصرہ ملاحظہ ہوں :  
کچھ درد ہے مطربوں کی لے میں کچھ آگ بھری ہوئی ہے نے میں

☆ ☆ ☆

پہنچے کہاں نصرفِ ساقی سے اہلِ بزم پہنچی نہیں سراب صراحی سے جام میں  
حسن و عشق اور خمیات کے موضوعوں کے علاوہ سفسہ کی شاعری میں زندگی کے  
دوسرے تجربات و مشاہدات کی آئینہ داری بھی ہے۔ اور مخصوص اخلاقی افکار کی شاعرانہ  
انداز میں تلقین بھی ہے۔ نفسیاتِ عامہ کی عکاسی بھی ہے اور عقلِ سلیم و فہمِ عامہ کے

نکات کا دلکش بیان بھی ہے ۔ اور شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انہی مضامین و موضوعات میں سبقت کی انفرادیت زیادہ جھلکتی ہے ۔ سیفہ کو حوادِ زمانہ کا بھی شعور ہے اور بے ثباتی حیات کا بھی احساس ہے ۔ زمانے کی ریب سے بھی وہ واقف ہیں اور دنیا میں انسان کے کردار کا بھی انہوں نے اچھا مطالعہ کیا ہے ، چنانچہ کہتے ہیں :

راب وان گل کی طرح سے جسے خنداں دیکھا      صبح بلبل کی روس ہمدِ افغان دیکھا

☆ ☆ ☆

ست الحرن میں نغمہ سادی بلند ہے      نکلا ہی بابِ مصر سے ہے کارواں ہنوز

☆ ☆ ☆

جب سے عطا ہوا ہمیں خلعتِ حیات کا      کچھ اور رنگ ڈھنگ ہوا کائنات کا

اس سلسلے میں خصوصیت سے وہ قطعہ بند شعر سبقت کے عمیق مشاہدے اور روانی و قدرتِ کلام کا نمونہ دیے ہیں ، جو اس طرح شروع ہوتے ہیں :

ساقی کو مسکدے میں سرِ ناؤ بوس ہے      صوفی کو خانقہ میں سرِ وجد و حال ہے  
اخلاقی قدروں میں سیفہ نے امد و صبر ، فقر و غنا ، ناسِ وضع اور نساٹ و رجائے  
کا خاص طور پر تذکرہ کیا ہے ، مثلاً :

اے جانِ لے فرار ذرا صبرِ حاہیے      بے سک ادھر بھی آئنگا جھونکا نسیم کا  
ہمانِ ترکِ جاہ لیا سرِ دیر نے      نہانہ دے کے بادۂ عنبرِ سمیم کا  
دیرے گدا کو سلطانِ جم سے کہا کہ ذوق      ہے کلمہ سبکستہ میں جامِ دو نم کا

جس زمانے میں سیفہ کا تصورِ حباب نہ تھا کہ :

کافی ہے خوش گزرے کو دما میں اس قدر      معشوقِ خوش مزاج ہو وجہِ کفاف ہو  
اس وقت ان سے اسلامی تہذیب و تمدن اور معاشرت و میعشت کے انحطاط اور سطنتِ مغلیہ کے زوال کے دردِ مندانہ شعور کی نوع نہیں کی جا سکتی تھی ۔ چنانچہ انگریزوں کے ہندوستان پر تسلط کی وجہ سے جو ایک قسم کا امن و سکون پیدا ہو گیا تھا ، اس کی داد ایک پر جوس قطعہ بند غزل میں سر زمینِ ہند کو ایک عشرت گاہ فرار دے کر دی ہے ۔ اس کا کوئی دستاویزی ثبوت تو موجود نہیں کہ سیفہ نے یہ غزل ۱۸۵۷ء سے پہلے کہی ہے ، لیکن فیاں یہی چاہتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد نہیں کہی ہوگی ۔ اس کا مطلع ہے :

ہند کی وہ زمیں ہے عشرت خیز      کہ نہ زاہد جہاں کریں پرہیز

یہی غزل لکھنے والے سبقتہ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی کے بعد دہلی کے بارے میں اپنا تار نوں بیان کرتے ہیں :

ویرانے کی مانند ذرا جی نہیں لگتا ہر حد کہ ہے سفہ دلی وطن ابنا  
اور اس سے زیادہ و اسگاف الفاظ میں وہ ہر درد مرثیہ لکھتے ہیں جس کا مہلا شعر ہے :

ہائے دہلی و زہے دل سدگنِ دہلی آہِ حنہ ہیں اور دل نگرانِ دہلی  
اب آخر میں سفہ کی اس خصوصیت کا ذکر ضروری ہے جس نے اردو شاعری کی تاریخ میں ان کے نام کو زندہ رکھا ہے۔ عام انسانی نفسیات اور زندگی کے روزمرہ تجربات و مشاہدات پر مبنی سفہ کے کسی ہی شعر میں جو طرزِ اظہار کی صفائی و سسٹمی اور برجستگی و بے ساختگی کی وجہ سے زبانِ ردِ عام و حاص ہو گئے ہیں ، مثلاً :

شاید اسی کا نام محبت ہے سفہ اک آگ سی ہے سننے کے اندر لکی ہوئی

☆ ☆ ☆

فسانے اپنی محبت کے سحر میں رکھ رکھ کچھ بڑھا بھی دے ہیں ہم زبِ داساں کے لیے

☆ ☆ ☆

وہ تھیستہ کہ دھوم ہے حضرت کے زرد کی میں کما کہوں نہ رات مجھے کس کے گھر ملے

☆ ☆ ☆

ہم طالبِ سہرہ ہیں ہمیں ننگ سے کسادِ بدنام اگر ہونکے ہو کسا نام نہ ہوگا

☆ ☆ ☆

انٹی نہ بڑھا پاکٹی داماں کی حکایت داس کو ذرا دیکھ ذرا بدِ فبا دیکھ

یہی نہیں اسے ہی اور نسوں شعر دیوانِ سیفہ میں ملتے ہیں حوصرب المثل بن جانے کی پوری پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان میں جذبات و حالات کی ہمہ گری اور مذاقِ سلیم کی کار فرمائی کے علاوہ اسلوبِ بیان کی اسی سادگی و لطافت ہے ، کہ سننے ہی زبان پر چڑھ جائیں اور جب کبھی ویسا کوئی موقعِ زندگی میں آئے تو فوراً ذہن میں ابھر آئیں اور نہ محسوس ہو کہ شاید یہ شعر اسی موقع کے لیے کہے گئے تھے۔ مسئے نمونہ از خروارے ایسے چند شعر ملاحظہ ہوں :

افسردہ خاطری وہ بلا ہے کہ سفہ طالع میں کچھ مزا ہے نہ لذت گناہ میں

☆ ☆ ☆

ہانی وضو کو لاؤ رخِ سمعِ زرد ہے مینا اٹھاؤ وقت اب آیا نماز کا

☆ ☆ ☆

کما ہوسکے کسی سے علاج اپنا شفتہ اس گل پہ غس ہیں جس میں محبت کی بو نہ ہو

☆ ☆ ☆

ہم آج تک چھبائے ہیں ناروں سے رازِ عشق حالانکہ دشمنوں سے یہ فصہ نہاں نہیں

☆ ☆ ☆

جو بیگانہ جانے مجھے خلق کا غم اگر آسنا آسنا جانتا ہے

☆ ☆ ☆

کرنے ہیں جور و جفا ناز و ادا لہے ہیں یہ بھی کیا لوگ ہیں کیا کرتے ہیں کسا کہہ رہے ہیں  
ایسے سر ہیں جن کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ اگر سیفتہ نے اپنے دیوان کو  
'نسخہ' معارف و مجموعہ' کہل، قرار دیا ہے تو کچھ بیجا نہیں کیا۔



### (ج) تلامذہ مومنین

مہذبہ سلسل کی بدولت انیسویں صدی کے آغاز تک نہالی ہند میں اعلیٰ درجوں کے معاشرے کی ایک مخصوص وضع بن چکی تھی جس میں وضعداری ، مہذب اور شائستگی کو خاص مقام حاصل تھا ۔ اس کا ایک پہلو یہ تھا کہ جن اشخاص سے جو تعلقات ایک نار فائیم ہو جائیں انہیں تمام عمر نباہ دنا جائے ۔ احباب نوازی ، دوسوں اور عزیزوں کا لحاظ ، چھوٹوں پر سبقت ، بزرگوں کا احترام ، نہ سب ناس اس معاشرے میں گونا قانون کا درجہ رکھتی تھیں ۔ انہیں محض آداب و رسوم نہیں سمجھتے تھے بلکہ انہیں مذہب کا سا تقدس حاصل تھا ۔ استاد کا احترام بلکہ استاد پرستی بھی انہی آداب میں داخل تھی ۔ مولانا حالی نے 'یادگار غالب' میں اسی جذبے کے عکس مرزا غالب اور ظفر کے متعلق بعض بے بنیاد باتیں لکھ دی ہیں اور اسی جذبے کے زیر اثر آزاد جسے ادیب نے اسے اساد ذوق کو تمام معاصرین پر ترجیح دی ہے ۔ اساد کے اس بڑھے ہوئے احترام کا ایک اثر یہ بھی تھا کہ شاگرد اپنے استاد کی خصوصیات فن کو فائیم رکھنے اور اس کی روایت کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتے تھے ۔

مومنین کے شاگردوں کو ان کی فنی خصوصیات عزیز تھیں اور وہ نہ کوشش کرتے تھے کہ مومنین کے اندازِ بیان اور طرزِ ادا یعنی معاملہ بندی ، نہ داری ، حدف و احوار اور عزل کے رچاؤ کو فائیم رکھیں ۔ اردو ساعری میں اسلوب اور فن کے مختلف دستان اور محفل مرکب ہیں ، لیکن اساد اور شاگرد میں وہ ہم رنگی و ہم مزاجی جو دستانِ مومن کے افراد میں نظر آتی ہے شاید کہیں اور نہیں ملی ۔ اس کی مختلف وجوہ ہیں ۔ ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ نہ شاگرد اپنے اسناد سے صرف ساعری میں ہی استفادہ نہیں کرتے تھے بلکہ دوسرے علوم و فنون اور مسغلوں میں بھی ان کے شریک تھے ۔ مثلاً حکیم سکھا ندرام ، ساعری کے علاوہ علمِ رمل اور طبابت میں بھی دخل رکھتے تھے (مومنین ان علوم میں کامل تھے) ۔ حکیم غلام مولا فلو ساعری اور طبابت کے جامع تھے ۔ سدا ، شورش ، عظم ، وحشت اور سیمہ ساعری کے دوش بدوش رنگین مزاجی اور ساہد نازی میں مومنین کے قدم بہ قدم تھے ۔

مختلف فنون میں دلچسپی لینے کی وجہ سے مومنین اور ان کے تلامذہ میں یک رنگی سی پیدا ہو گئی تھی ۔ چنانچہ استاد اور شاگرد ایک دوسرے سے بہت قریب ہو گئے تھے ۔ مومنین کے اکثر تلامذہ عربی اور فارسی علوم میں اور مذہبی تحریکوں میں ان کے پیرو تھے ۔ مثلاً بیفتہ نے مومنین کی طرح نوجوانی میں مذہبی علوم (فقہ ، تفسیر اور حدیث) کی تعلیم پائی

ہی<sup>(۱)</sup>۔ قلق اور تسکین فارسی ادب میں اعلیٰ دستگاہ رکھتے تھے۔ عباس علی خاں بیتاب مہوری اور رامپور کے بعض دوسرے پٹھان اپنے استاد مومن کی طرح سید احمد شہید صاحب ، تحریک جہاد کے علم بردار تھے۔ غرض یہ کہ اس ذہنی اتحاد کی جو ہم بلامذہ مومن ن پاتے ہیں بہت سی وجوہ موجود نہیں۔

مومن اور ان کے ساگردوں کی اس ہم مذاحی و ہم رنگی کا ایک اور سبب یہ ہے کہ مومن کے اکثر ممتاز بلامذہ جاگردار طبقے سے نعلی رکھے تھے۔ مومن کو طبقاتی احساسِ بری ضرور تھا۔ نواب مصطفیٰ خاں سفہ ، نواب اصغر علی خاں نسیم ، نواب عباس علی ان بساب ، مرزا خدا بخش مصر ، مرزا رحم الدین حا ، سب کے سب رئیس تھے یا قلعے کے سلاطین۔ شریعتِ طبعی کے افراد یا کم علم اسخاص نو مومن کے حلقہ ساگردی میں شامل ہونے کا سرف حاصل نہیں ہوتا تھا۔ ان کے اکثر ساگرد وہی تھے جو آنائی دولت و بروت کے ہمارے عس کوسی ، رنگن مذاحی اور خوش ناسی میں زندگی گزارے تھے۔ ان لوگوں کو ساوی لذتوں سے محظوظ ہونے کے مواقع حاصل ہوئے تھے ، نہ جاگردارانہ نظام کی سداوار ہے اور اس نظام کی زوال پذیری کے باوجود ان لوگوں کو "عسرب امروز" کے نفاصوں کو را کر لیسے کی سہولتیں مسر نہیں۔ ان کے نزدیک زندگی کے معنی یہی تھے کہ خوش یسی ، خوش خلفی ، خوش ناسی اور عس کوسی میں عمر بسر ہو جائے۔ رئیسوں کا اندازِ دگی غالباً ہر زمانے میں ہی رہا ہے۔ حاکم مومن اور ان کے ساگردوں کا طرزِ زندگی ، اندازِ فکر اور معیارِ حیات انک ہی جیسا معلوم ہوتا ہے۔

مومن کی خصوصیات فر میں دو چیزیں انسی ہیں جو ان کے ساگردوں کو بہت عزیز ہیں۔ انک ہر وہ رنگن معاملہ بندی جو عفت و مہذب کا باریک نقاب بڑ جانے کی وجہ سے مومن کی خاص مساع سمجھی جاتی ہے۔ دوسرے وہ ذاتی آپس جو ساعر کو دل کی بات سننے پر راغب کرتا ہے اور سننے سائے مفروضات الف نظم کرنے پر مائل نہیں ہونے دنا۔ یس کے ساگرد بالعموم ان دونوں خصوصیتوں کو قائم رکھے ہیں۔ جذبات کا رچاؤ نیز وہ داری جس سے معانی و مطالب خود بخود پھوٹتے ہیں ، ان پر مستزاد ہے۔ ان سب کے لاوہ اندازِ بیان ، حذف و ابجاز ، جدتِ براکیب ، غرض متعدد شیوے اور بھی ہیں جنکا لوہ دلی کے شعر فہموں کو مومن کے سوائے اور کہیں کم نظر آنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس ر کے رنگن مزاج شعرا مومن کے بغزل کو بہ نظر استحسان دیکھتے تھے۔ اور دوسرے تادوں کے حلقہ بلمد میں شامل ہونے کے باوجود طرزِ مومن کے عاشق تھے۔ مثلاً ظہیر گردِ ذوق۔

انسوس صدی کا معاصرہ بعض امور میں ہماری موجودہ سوسائٹی سے کافی مختلف بھی تھا اور جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے ان دنوں آداب و اخلاق کے آئین میں استاد شاگرد کے ریسے کو بندس کا درجہ حاصل تھا۔ شاگرد اپنے استاد کی خصوصیات کو قائم رکھنا فخر سمجھتا تھا۔ چونکہ نلامذہ مومن اپنے استاد کے ساتھ محبت و وابستگی رکھتے تھے، اسی لیے ان کے مخصوص انداز کو بھی ایک فنی امامت سمجھتے تھے۔ سب سے، سکین اور نسیم کا کلام بڑھے ہوئے بار بار دہن بر مومن کی شخصیت کا عکس بڑا محسوس ہوتا ہے۔ حکیم غلام مولا قلی اس رنگ میں اسے ڈوئے ہوئے تھے نہ بقول حالی اکثر اسخاص مشاعروں میں انکی عرل س لڑ نہ دھوکا لھائے تھے کہ وہ مومن سے لکھوا کر لائے ہیں (۱)۔

حسب کہ عرض کیا جا چکا ہے مومن کے اکثر شاگرد طباقی اور مراحمی اعتبار سے انہی کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ ادب کو سی اور استحصال کا رجحان سب میں ہے۔ سب احساس برتری رکھتے ہیں اور ان میں ٹو فریب کاروبار سو مسر ہے۔ بعض شاگرد مثلاً عبدالرحمن آبی حسوں نے کلمات مومن پرست دنا، ان کے رستہ دار تھے۔ (مومن کی بھانجی ان سے نہایت تھی)۔ فنِ شاعری میں بھی نہ شاگرد اپنے استاد کی روایات کو برقرار رکھتے ہیں۔ مومن کا خاص اندازِ تعزل یہ ہے کہ وہ معاملاتِ حسن و عشق بھی نہایت مہذب طریقے سے سام کرے ہیں۔ یہی وہ خصوصیت ہے جو انہیں جراب، نظر اور داع سے ممتاز کرتی ہے۔ ان کے کلام میں اسارت بھی موجود ہے۔ وہ مضامین کے بعض ٹکڑے اس سلسلے سے حذف کر جاتے ہیں کہ فاری کا ذہن انہیں بھوڑی سی کاوس سے فراہم کر لیتا ہے۔ نہ حذف و احوار اسی صعبِ شعری ہے جو ذہن کو حرکت و نمو عطا کرتی ہے اور الجھن سدا کرنے کے بجائے سرور بخشنی ہے۔ علاوہ ازیں مومن کی عزل میں حدبات کی چھن اور رھاؤ بھی نمایاں ہے۔ اسی بنا پر ان کی عرلوں میں ایک مخصوص اندازِ نظر آتا ہے اور اسی انداز کی وجہ سے مومن کے نلامذہ صاف پہچانے جاتے ہیں۔

دہسانِ مومن کے مختلف افراد میں جس ہم رنگی کا ہم ذکر کر چکے ہیں، اس کا ایک اور سبب بھی ہے۔ مومن کے بعض شاگرد مثلاً آبی، سکین، وحشت، سیفتہ، شورش، عظمت، کرم وغیرہ ان کے محرمِ راز اور ہمدم و دمسار بھی ہیں۔ نہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ مومن ۴۵، ۴۶ سال کی عمر تک دہلی کے حسینوں کی محبت میں گرفتار رہے (۲)۔ انہوں نے اپنی چھ مثنویوں میں اپنے مختلف معاشقوں کا حال درج کیا

(۱) حالی (دیباچہ)، کلیات قلی

(۲) رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو - ص ۴۰ - کریم الدین، طبقات شعرائے اردو - ص ۴۱

ہے جو فرضی داستانیں معلوم نہیں ہوئیں۔ مومن نے ان کے علاوہ بھی نہ جانے کتنے معاشقے کیے ہوں گے۔ معلوم ہونا ہے کہ کاروبارِ شرف کے اس مشغلے میں مومن کے یہ شاگرد ان کے ہم خیال و ہمدم تھے۔ فاس کہتا ہے کہ اس معاملے میں مومن ان سے کوئی بردہ نہیں رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں مومن کی دوسری نژادی جو سردہنہ میں عظیم اللہ بیگ کمدان کی دختر سے ہوئی، غلام ضامن کرم کے سلسلہ جنابی سے ہوئی تھی۔ مومن کی ایک معنوفہ حس کا نام صاحب جی تھا اور جس کے فراں میں انہوں نے 'ہولِ عمس' جیسی درد ناک مثنوی لکھی ہے (۱۸۲۱ء)، فنِ سخن میں ان سے مشورہ کری بھی<sup>(۱)</sup>۔ ان تمام تعلقات نے شاگردوں اور اساد کے درمیان بڑا مستحکم اور دلچسپ رشتہ قائم کر دیا تھا اور اسی لیے مومن کے شاگرد شعر و سخن میں ان کے رنگ کی پیروی کرتے تھے۔ صاحبِ اصغر علی دسم، علاء مولا فلق اور مر حسن بسکین وہ نلامذہ ہیں جن کی متعدد عزلی مومن کی رہن میں ہیں اور ان میں وہی خصوصیاتِ کلام ملتی ہیں جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ بلکہ یہ قدرِ مسترک انہی واضح ہے کہ بعض دفعہ شاگرد اور اساد کے کلام میں تمیز کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ یہ باب دبستانِ غالب میں نہیں ملتی۔ مرزا غالب کے شاگردوں کی بعدا۔ سو کے قریب ہے لیکن ان کے مخصوص رنگ میں شعر کہنے والا شاگرد جو ان کی نمائندگی کر سکے، ایک بھی نہیں ہے۔

ذیل کے اسعار سے یہ اندازہ لگانا جا سکتا ہے کہ ان سب کے مداح میں رکھ رکھاؤ، پردہ داری، مہذب معاملہ بندی اور ایک طرح کا مخصوص دلی آپہنگ ہے۔ یہ لوگ خنی الامکان حسن و عسوی کی فرضی روایں نظم کر دینے سے برہر کرتے اور انہی ذاتی سرگزشت ایک مہین اور مہذب برائیہ میں بیان کر جاتے ہیں۔ مثلاً ذیل کے شعر ملاحظہ ہوں:

پیتاب

پیتاب پی خدا نے دے ہیں تجھے بھی ہاتھ یہ مے ہے، یہ سو ہے، یہ سببہ یہ جام ہے

ساک

چہن چہن کے جلوے حسن کے باہر نکل آئیں گے آپ  
بیٹھے رہے یوں ہی اگر تم بردہ حائل کے یاس

☆ ☆ ☆

(۱) شیفہ، گلشن بے خار - ص ۱۱۵

یہ غالباً اس لیے ہے کہ غالب کا سا شاعرانہ انداز جس میں جذبہ فکر اور تخیل کا امتزاج اس ملتہب انداز میں ہو، ہر کسی کے ہنس کی تاب نہ لے بھی . . . . مدیر عمومی۔

## سمجھو سورتی

جامِ مے میں ہے عکسِ چہرہ دار یا چراغِ آفتاب میں روشن

## تسکین

سکین نے نام لے کے برا وقتِ مرگ آہ کہا جانے کا کہا بھا، کسی نے سنا نہیں

## شیفتہ

ہائے اس بروِ جہاں سوز بہ آنا دل کا سمجھے جو گرمی پنکھا جلانا دل کا

☆ ☆ ☆

نہ کیجو غل اے خوشوایانِ صبح نہ ہے وقت ان کے سکر خواب کا  
عجب نہ ہرگر جسائی گئی رہا دگر کی اور ہر بات کا  
پڑے صبرِ آرام کی جان پر مری جانِ بے صبر و ساق کا  
لبِ لعل کو کس کے جنس ہوئی ہوا میں ہے لہجہ رنگِ عتاب کا  
نہ کیجو حطا در نظر سمہ کہ اغماص سوہ ہے احباب کا

☆ ☆ ☆

وہ شبہ کہ دھوم بھی حضرت کے زہدی میں کیا کہوں نہ رات مجھے کس کے گھر ملیے

☆ ☆ ☆

یاد میں اس درِ دندان کی موا جانا ہوں کارِ الہاس مرے حق میں گہر کرنا ہے  
انک دن سامِ ہاری بھی سحر کردے گا وہی جو سام کو ہر روز سحر کرنا ہے  
دبکھیے آہ ہاری بھی اثر کرتی ہے سخنِ درد سنا ہے کہ اثر کرنا ہے

## شہدا

بڑے فساد اٹھیں، سیفتہ خدا نہ کرے  
کہ ان کی بزم میں ہو دخل و اختیار مجھے  
یہ امتحان ہے کیسا کہ وہ ستاتے ہیں  
جو ایک بار علو کو تو لا کہ بار مجھے

☆ ☆ ☆

## صاحب جی

کھولے ہیں اس نے پیرہنِ یوسفی کے بند  
نہ کر رکھے ، نسیم سے کہہ دو ، مائے گل

## کاظم منداوری

اے طفلِ اسک ہم تجھے آنکھوں میں یوں رکھیں  
اور نو ہارتے رار کو یوں ہر ملا کرے

## پاس

وصل کی سب کا سہاں ہے آنکھ میں چھایا ہوا  
اس طرف کو دیکھا بھی ہے نو سرمانا ہوا

## برق

واں دل میں یہ کہہ بوسہٴ ناک نہ دیجیے      یاں سوو نہ کہہ چوسے ان کی رباں ہلک

## وحشت

مہرے مرنے کی خبر عمر کو یوں دیتے ہیں      مرگیا وحسبِ جاباز ، بری جان سے دور  
یہ وہی مر غلام علی خاں وحشت ہیں جن کے معلو مرزا غالب نے نہ نفع طاہر کی  
بھی کہ :

وحشت و سفہ اب مریہ کہوین شاید      مرگیا غالبِ آسفہ نوا کہتے ہیں ۔

لیکن انفاں کہ وحسب کا انتقال مرزا صاحب سے پہلے ہی ہوا ۔ وحشت مولوی  
رنبید الدین خاں کے داماد بھی اور رنگین مزاج و ساہد برستی کے سلسلے میں سفہ کے  
گہرے دوست بھی ۔

مومن کے یہ شاگرد جو آداب دانی ، تہذیب ، مختلف علوم و فنون ، رنگین مزاجی اور  
جال ہرستی میں ان کے ہم رنگ اور ہم قدم تھے ، اپنے استاد کی طرح عمرِ طویل کے عذاب سے  
محفوظ رہے ۔ اکثر کا انتقال انیسویں صدی کے سانویں عشرے میں اور ایک آدھکا آٹھویں عشرے

میں ہوا۔ غدر ۱۸۵۷ء کی آفتیں سب نے جھلسیں۔ بلکہ نواب شہنشاہ اپنی آبائی امارت و ثروت کے باوجود کچھ دنوں کے لیے فدیہ فرنگ میں بھی مبتلا ہوئے۔ اگلے صفحات میں ان حضرات کا مختصر حال اور انتخابِ کلام درج کیا جاتا ہے۔

### عبدالرحمن خان آہی

عبدالرحمن خان آہی، حلف مر حسن نسکن۔ باپ نئے دوہوں موس کے محرم رار اور ہمدن و دمساز بھی۔ آہی موسن کی بہن کے داماد بھی تھے۔ موسن سے بہت محبت و خلوص رکھتے تھے مروجہ ’کتاب موسن‘ میں جو تعریف ان کی موجود ہے، اس کے لفظ لفظ سے مہر و محبت کی بو آتی ہے۔ اسے باب کی طرح موسن کے مخصوص فن یعنی نغزل کے رحاؤ کا ورثہ دانا بھا<sup>(۱)</sup>۔ فریہ معمر اور شعر گوئی و شعر مہمی میں طاق بھی۔ دیوان طبع نہیں<sup>(۲)</sup> ہوا۔ دربارِ رام پور سے متعلق تھے۔ ۱۸۷۵ء کے قریب انتقال ہوا۔ کلام محفل تذکروں میں موجود ہے۔ اساتذہ رنگ صاف نظر آتا ہے :

ہے غلط دھوم نہ نکلا بھا وہ گھر سے باہر      شہر میں خاک کسی کا بوگرساں ہونا  
کھل گیا دروازہ جنت بھی اسی گور میں      بر دلِ وحشی نہ کہا ہے ساہاں چاہئے  
شکوہ کہاں کا کسا کہ جی نکل گیا      سرما کے نار نے حوہی نحی نگاہ کی  
مژدہ اے ذوقِ نیدنِ خلی میں ہے آج دھوم      زہر میں خنجر کو وہ اپنے بچھا کر لے گئے  
سب کو خبر ہوئی مرے حالِ نہاہ کی      اٹھ جائے گی جہاں سے اب رسم چاہ کی

### نواب محمد اکبر خان

شہنشاہ کے چھوٹے بھائی بھی۔ آخر عمر میں راولپنڈی چلے گئے تھے اور وہیں فوت ہوئے۔ کلام کا رنگ یہ ہے :

سوچئے حضرتِ ناصح کوئی تدبیرِ وصال      حیف چارہ نہ کرے آپ سا دانا دل کا

(۱) قادر بخش، صابر، گلستانِ سخن - ص ۱۳۰  
(۲) سری رام، خمغانہ جاوید، ح ۱ - ص ۱۱۶

محفلِ غیر میں گر لگنے لگا دل تیرا ہم کو بھی غیر سے آنا ہے لگانا دل کا  
دیکھ ظالم نہیں اچھی یہ ہوا خواہی غیر سمعِ الف کو بچھا دے نہ حالنا دل کا

(ایسے معلوم ہونا ہے کہ ان تمام شعرا کا موضوع سخن ، بزمِ طرب کی لذتوں یا عشق کی گھانوں اور جسی تعلقات کے امکانات اور ان کے نسجے میں سکھ و شکایت یا حزن و یاس کے جذبات تک محدود ہے . . . . مدیر)

### میر حسین تسکین دہلوی

(۱۸۰۳ء تا ۱۸۵۲ء) مومن کے بہم و دمسار دوست اور عزیز ساگرد بھیے - نسیم کی طرح انہوں نے بھی اساد کے مخصوص فن کا ورثہ پایا ہے - فارسی میں صہبائی کے اور اردو میں شاہ نصیر کے ، پھر مومن کے ساگرد ہوئے - نسیم اور فنی کی طرح یہ بھی اساد ہی کے رنگ میں ڈوبے ہوئے بھیے ، اور ان کے موضوعات بھی وہی بھیے - مومن کو بھی ان پر اپنا اعتماد تھا کہ اکثر ساگردوں کی اصلاح ان کے سرزد کردی بھیے - نلاس معاش میں لکھنؤ اور مرٹھ گئے ، پھر رام پور میں نواب یوسف علی خان دہلوی کے ارادہ بدرجائی نوکر رکھا - مختصر سا دیوان ۷۲ صفحے کا رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے - مومن سے چند ماہ پہلے ۱۸۵۱ء (۱۲۶۸ھ) میں ۵۱ سال کی عمر میں انتقال ہوا - اسی سال نواب رن العابدین خان عارف بھی فوف ہوئے - مصرع ”ادم میں عارف و نکسن و مومن“ سے دہلیوں باکالوں کی نارغز وفات نکلی ہے - بقول عرس گداوی تسکین نے مومن کی تعلد خوب کی ہے - مومن کا مخصوص انداز ان کے کلام میں ایسا بس گیا ہے ، کہ اگر دونوں کا کلام مخلوط کر دیا جائے تو تمیز دسوار ہو جائیگی :

بیٹھے تسکین بھیے روٹھ کر وہ سوخ دے کے دو جھڑلساں اٹھا لایا

☆ ☆ ☆

اب یہ حالت ہے کہ ان سا بے درد میرے بھنے کی دعا مانگے ہے

☆ ☆ ☆

فتنہٴ محشر کا تھا سب کو گہاں تجھ کو یہ حانا نیری رفتار سے

☆ ☆ ☆

تسکین سے نام لے کے ترا وقتِ مرگ آہ کیا جانے کیا کہا تھا کسی نے سنا نہیں

☆ ☆ ☆



اس سے بہتر تھا جو دوزخ میں ٹھکانا ہونا بزمِ دشمن میں برے ساتھ نہ جانا ہونا



ابھی اس راہ سے کوئی گسا ہے کہے دنی ہے سوخی نفسِ با کی

ان کے اسعار میں بھی حس و عشق کی برائی جنگ کی جھلکماں نظر آتی ہیں اور وہی رمز و کنایہ کی بادیں ، حواسِ دسمان کے مشاغلِ ذہنی و جذباتی کا حروِ غالب بھی ۔

### مرزا قربان علی بیگ سالک

مرزا قربان علی بیگ سالک ولد مرزا عالم بیگ ، قوم کے ترک تھے ۔ والد دکن میں ملازم تھے ۔ سالک کی تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی<sup>(۱)</sup>۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں آپ نے الور میں تنہا لی اور مہاراجہ سو دھان سنگھ والی<sup>(۲)</sup> الور نے وکالت کی خدمت عطا کی<sup>(۳)</sup>۔ کچھ عرصہ بعد انہی چچا رن بہادر خاں کی برعقب سے دکن میں ملازمت کی ۔ حیدر آباد میں ایک رسالہ 'محرن الفوائد' جاری کیا ۔ 'نحوہ عرصہ' 'مکملہ' 'تعلیم' میں سر رسدہ دار بھی رہے ۔

سالک نے تندرہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا تھا ۔ اول حکیم موسیٰ خاں سے اصلاح لے رہے اور قربان مخلص تھا ، پھر جب (مومن کے مرنے کے بعد) غالب سے نلغز ہوا تو سالک مخلص اختیار کیا ۔ حوسِ مداق ، ذہن ، زود فکر ، دکی اور شعر فہم تھے ۔ مرزا غالب کے مرنے کے بعد مرزا کے کافی ساگرد ان سے ہی اصلاح لے رہے ۔ لالہ سری رام خمخانہ<sup>(۴)</sup> جاوید میں لکھتے ہیں کہ سالک نے ۱۸۷۹ء میں وفات پائی ۔ لیکن کتب علی حان فائز نے محقق کے ساتھ یہ فیصلہ کیا ہے ، کہ سالک کا انتقال ۱۸۸۰ء کے نصفِ آخر میں ہوا<sup>(۵)</sup>۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے 'ہنجار سالک' اور 'سخانہ' سالک، دو دیوان طبع ہوئے تھے مگر وہ کمابہ ہو چکے تھے ۔ مجلسِ برقی ادب لاہور نے اہل المطابع دہلی والے نسخہ کتاب کو بنیاد بنا کر نئی ترتیب سے ۱۹۶۶ء میں 'کتاب سالک' کے نام سے شائع کیا ہے ۔

سالک حملہ اصفہانِ سخن پر ویران رکھتے تھے ۔ چھوٹی بحروں میں اچھے اسعار نکال لیتے تھے ۔ نلام میں سادگی ، فصاحت ، معاملہ بندی اور سوز ہے ۔ ۱۸۵۷ء میں دہلی کی تباہی پر درد ناک سہرِ آسود لکھا تھا ۔

(۱) مولوی محمد حسن طغر صبا ، روزِ روشن - ص ۵۵۲

(۲) انجمن اسلامیہ میگزین ، کراچی جون ۱۹۵۹ء

(۳) کتب علی حان ، کتاب سالک - ص ۳۰ مجلس برقی ادب لاہور ۱۹۶۶ء

(سادگی)

دل وہ کافر ہے کہ مجھ کو نہ دیا چین کبھی      بے وفا تو بھی اسے لے کے بٹیاں ہوگا

☆ ☆ ☆

ناچار ہوا وادیِ محشر کو روانہ      جس فتنے نے بابا نہیں رستہ مرے گھر کا

☆ ☆ ☆

نئی یہ جھڑ ہے صباد کی حسرت ٹھانے کی      کہ ہر بوڑھے مرے اور ذکر کچھ جھڑا گلستاں کا

☆ ☆ ☆

(سوز)

یہ اور کون تھا جو برا خستہ جاں نہ تھا      اک نعرے بے کمن بھی کوئی نوحہ خواں نہ تھا

☆ ☆ ☆

سمد اللہ کو کہا جانے کہا آجائے اے زاہد      مجھے سرم کہہ تھو تو تکبر ہے عباد کا

☆ ☆ ☆

افروختم ز آتس دل سمع آہ را      در سمنہ سوختم نفس صبحگاہ را

☆ ☆ ☆

جانے دے اے تصویرِ جاناں نہ کر نلاس      اسا نہ ہو کہ وہ کہیں دشمن کے گھر ملے

☆ ☆ ☆

(معاملہ بندی)

کاش اے سپہر تجھ سے ہی رکھتے نوسہل نہیں      وہ خواہیں کہ رکھتے ہیں اس ہوفائے ہم

(اور ان اسعار میں بھی نلاسِ محبوب اور خواہیں وصل کے علاوہ بے چارگی اور  
حسرت کے مضمون ہی ملتے ہیں، مگر اک خاص ادا کے ساتھ اور ایک خاص ضبط و تحمل  
کو لیے ہوئے، جن میں اس زمانے کی مہذب بزمہ زندگی کا عکس صاف دکھائی دیتا ہے۔  
۔ . . . . مدیرِ عمومی)

سالک نے ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں سہر دہلی پر انگریزوں کے تسلط کے بعد مسلمانوں کی نباہی کو بہ چشمِ خود دیکھا۔ برطانوی حکومت نے اہلِ اسلام کو خصوصاً انتقام کا نشانہ بنایا تھا۔ غالب، آزرہ اور داغ نے ان مظالم کا ذکر مختلف نظموں میں کیا ہے۔ سالک نے بھی ایک سہرِ آشوب لکھا، جس میں جامع مسجد دہلی کی صطی اور مسلمانوں کی نباہی کا مفصل بیان سدھے سادھے مگر موثر انداز میں فلم بند کیا۔ صدرالصدور مفتی آزرہ اور نواب سفینہ حسے ذی جاہ اسخاص کی گرفتاری اور برسانوں کا اسارہ بھی ہے<sup>(۱)</sup> اس سہرِ آشوب کے پہلے چار بند ملاحظہ فرمائیں :

جہاں میں سہر ہیں جننے جہاں جہاں آباد      س ان بلاد میں تھا منتخب جہاں آباد  
خراب ہو کے نہ پوچھو ہوا کہاں آباد      مگر عدم کو کہا اس سے گلستاں آباد

فلک نے کس سے کہوں کسوں مٹا دیا اس کو  
ارم کا حوڑ سمجھ کر اٹھا لیا اس کو

زمین ہست ہاں کی بھی آسماں مظر      ہر ایک ذرہ ہاں کا تھا مہر کے ہمسر  
یہاں کی خاک بھی اکسب سے بھی کچھ ہتر      ہاں کے آب میں آبِ حیات کا تھا اثر

بسمِ خلد سے بہرِ سموم نہی ناں کی  
نہ وہ جمن ہے کہ دنیا میں دھوم تھی یاں کی

ہر اک مکان یہاں کا تھا اک مکانِ سرور      ہر ایک کوچہ ہاں کا تھا اک جہانِ سرور  
ہر اک دکان یہاں کی تھی اک دکانِ سرور      غرض کہ سہر نہ تھا، نہ یہ ایک کانِ سرور

جدھر کو دیکھیے آوازِ بربط و نے ہے  
نہ جاننا تھا کوئی رنج و غم کو کیا سے ہے

یہ شہر کس لیے برباد ہو گیا نا رب      لگی کسی کی یہ کہا اسی بد دعا یارب  
یہاں کے لوگوں سے کہا ہو گئی خطا نا رب      ہوئے ہیں کس لیے نہ موردِ جفا نا رب

غرض بھی غدر سے، ہوویں گناہ گار سات  
و گر نہ ہوئے نہ ہرگز سزائے دار سات

(۱) شیفٹہ، نواب مصطفیٰ خان ۱۸۰۳ء تا ۱۸۶۹ء - مومن کے خاص شاگرد ہیں اور شاعری کے علاوہ تنقید و تذکرہ نگاری میں بھی نامور ہیں - مومن کی تعلیم میں ان کے کلام میں بھی تہ داری، رنگین بیانی، لیکن متین کیفیت اور فارسی تراکمب کا استعمال ہے - اس کا تفصیلی بیان پہلے ہو چکا ہے لہذا یہاں انہی سطور پر اکتفا کی جاتی ہے -

## امۃ الفاطمہ عرفی صاحب جی

دہلی کے ایک ذی جاہ امیر کی دانستہ نہی - علاج کے سلسلہ میں حکیم مومن خاں سے رشہ الف فائم ہوا<sup>(۱)</sup> - جس کی تفصیل سنفہ نے 'گلشنِ بے خار' میں لکھی ہے - مثنوی 'قولِ غمب' جس کا سوز و گداز ایک خاص کشف کا حامل ہے ، اسی حسینہ کے افسانہ الف کی تفسیر ہے<sup>(۲)</sup> - عرس گناوی اور مولانا ابوالخیر مودودی کا بیان ہے کہ دہلی سے چلے جانے کے بعد یہ صاحبہ ایک بار بھر دہلی آئی تھیں اور مومن سے مشورہ سخن بھی کرنی تھیں اور 'مرثیہ معنویہ' حور سلیم والا ترکیب بند جس سے مومن کے جذبات کا اندازہ ہوتا ہے ، اسی کی موت پر کہا گیا تھا - اس کے اشعار سے لذت کوشی اور رنگین مزاجی کا پتہ چلتا ہے ، مگر جذبات میں سادگی، خلوص اور بے ساختگی بھی موجود ہے :

کھولے ہیں اس نے نہرینِ یوسفی کے بند	ہم کر رکھے نسیم سے کہہ دو ہائے گل
☆ ☆ ☆	☆ ☆ ☆
گنہ کا صدم کے بطارے میں راہد	حدا نے یہ جلوہ دکھایا تو دیکھا
برا ماننے میں مرے دیکھنے سے	میں حق نے اسنا نشانہ تو دیکھا
☆ ☆ ☆	☆ ☆ ☆
جو خطِ جبین کا میرے کاتب ہے اسی کو	دکھلا تو مسرہ نامہ اعمال الہی
صاحب جو بنایا ہے تو مانندِ زلخا	یوسف سا علام اک مجھے دے ڈال الہی
☆ ☆ ☆	☆ ☆ ☆
نظر ہے جاذبِ اعبار دیکھے کیا ہو	بھری ہے کچھ نظریہ بار دیکھے کیا ہو

## حکیم مولا بخش قللی میرٹھی

بارہ سال کی عمر میں ۱۸۲۶ء کے قریب تحصیلِ علم کے لیے دہلی آئے - فارسی کی تکمیل مولانا امام بخش صہبائی سے کی - طب میں حکیم غلام نسیبند خاں کے شاگرد ہوئے - شعر گوئی کا میلان طبع میں تھا - اس کی تکمیل کے لیے حکیم مومن خاں سے بلمذِ اختیار کیا اور بہت جلد اس فن میں کامیاب ہوئے - جوانی کا زمانہ دہلی میں بسر کیا - ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں یہاں سے نکل کر وطن چلے گئے اور باقی عمر وہیں بسر کی - میرٹھ میں درس و تدریس کا مشغلہ جاری رکھا - طبابت کا شغل بھی تھا اور انہی ذریعوں سے معاش حاصل کرتے

(۱) عبدالحی صفا ، شمیم سخن - ص ۱۷۰

(۲) صفدر مرزا پوری ، حسن خیال - ص ۸۹ ، شیفہ ، گلشنِ بے خار - ص ۱۱۵

رہے۔ مزاج میں غم و فناء بہت تھی۔ صاحبِ مستعار کا باقی حصہ گوشہٴ عزلت میں بسر کر کے ۱۸۸۰ء (۱۲۹۷ھ) میں دنیا سے رخصت ہوئے<sup>(۱)</sup>۔ ساری عمر کی کماؤ ایک ’کلیاتِ اردو‘ ہے، جس میں دین سو کے قریب غزلوں اور دیگر اصنافِ سخن ہیں۔ اس کی ضخامت ۲۵۶ صفحات ہے۔ ان کی وصیت کی تعمیل میں ان کے بھائی بابو عبداللہ صاحب نے مطبعِ انصاری دہلی سے ۱۸۸۳ء میں سائے کیا۔ اس میں مولانا حالی، مولوی سید احمد صاحب دہلوی، اور محوی کی ترمیمیں ہیں۔ جن سے قلم کی خصوصیاتِ کلام پر روشنی پڑتی ہے۔

حالی کا مان ہے کہ وہ فنِ شعر میں اپنے استاد کے قدم نہ قدم چلے ہیں۔ وہ مومن کے عزیز ساگرد تھے۔ مساعروں میں اساتذہ کے مقابلے میں بڑی بے باکی سے غزل بڑھتے تھے۔ اسناد کے انداز کا ان کے دہن پر اما ابر بھا کہ اکثر اسخاص دھوکا کھاتے تھے کہ نہ کلام قلم کا اپنا ہے نہ مومن سے لہلا کر لائے ہیں<sup>(۲)</sup>۔

مولوی سید احمد صاحب بھی ان کی نزاکتِ خیال، سوچنی سان، معاملہ بندی اور مساب کی تعریف کرتے ہیں<sup>(۳)</sup>۔ بعض غزلیں مومن کے سبب میں کہی ہیں جن میں کہیں کہیں اسناد کی سطح تک پہنچ گئے ہیں۔ اندازِ غزل کے علاوہ ان کی تراکیب میں بھی ندرت نائی جاتی ہے اور ان کے کلام سے نہ چلنا ہے کہ نفسانِ قلب سے بھی وہ خوب واقف تھے۔ دہلے اسعار ملاحظہ ہوں :

چراغِ دور سے حورسند کو دکھائے ہیں ہم انی سک کا ماسہ سحر کو دیکھتے ہیں  
بری بود میں پر داساں کو سننے ہیں بری اسد میں پر رہ گزر کو دیکھے ہیں  
خوشا وہ لوگ کہ دیر و حرم میں جا بٹھے نہ انک ہم کہ کھڑے بیرے در کو دیکھتے ہیں  
ذیل کی غزل بھی مومن کی زمیں میں ہے اور معاملہ بندی کی تاریکی، ربابِ لفظی اور جذبہ کی کسک مومن کی ناد دلائی ہے :

زور آزمائی کرتے ہیں نا طافی سے ہم  
تم ہو نہ اپنے س میں نہ ہم اپنے ضبط میں  
ہے رحم کی جگہ جو کچھ انصاف دل میں ہو  
ڈالو بھی خاک غبر کی صورت بہ ہم کہیں  
رستے میں عمر رفتہ گئی چھوڑ کر قلم  
ابنے ہی بارِ دوس ہیں واماندگی سے ہم  
مجبور ہم ہو غیر سے نا چار جی سے ہم  
دامنِ نرا بکڑتے ہیں کس سادگی سے ہم  
مر جائیں نا کہ رسک میں دب کر اسی سے ہم  
اب انے بارِ دوش ہیں واماندگی سے ہم

(۱) محمد یحییٰ تنہا، مرآۃ الشعراء - ص ۵۲۳

(۲) دیوانِ قلمی، دیباچہ از حالی

(۳) دیوانِ قلمی، دیباچہ دیوانِ قلمی

(۴) دیوانِ قلمی، دیباچہ از حالی

(۵) دیوانِ قلمی، دیباچہ دیوانِ قلمی

مومن کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ جنسی معاملات کا ذکر بھی متین اور سہذب طریقہ سے کرتے ہیں ، جس میں عریانی نہیں ہوتی ۔ یہ بات قلق کے کلام میں بھی پائی جاتی ہے ۔ مثال کے طور پر ذیل کے چند اسعار ملاحظہ ہوں ، ان میں سے آخری سے پہلا شعر مجاز کی حدوں کو پھاند کر معرفت کے دائرہ میں داخل ہو جاتا ہے :

کوئی کبسا ہی سابت ہو طبع آہی جانی ہے  
خدا جانے یہ کسا آفت ہے ، آفت آہی جاتی ہے

☆ ☆ ☆  
سامِ فراوان موت ہے صبحِ وصال حشر دل دے کے زندگی تو ہے مشکل سب ہی طرح

☆ ☆ ☆  
عجب وہ ہے جس میں کچھ کسی سے ہو نہیں سکا  
جو ہو سکا ہے وہ بھی آدمی سے ہو نہیں سکتا

☆ ☆ ☆  
وہی تنویرِ راہ ہے رہنا وہی جلوہ گاہ ہے رخ کشا  
وہی نرمِ ناز ہے جا بجا وہی بدِ قدم نہ مقام ہے

☆ ☆ ☆  
بھے کعبے میں بھی اپنے ہی یارانِ روسناس بھا کون سا کہ رائدہ دبرِ معان نہ بھا  
آخری شعر میں نہ داری کا لطف دیدنی ہے ۔ یعنی وہ لوگ جو کعبے میں معتکف ہیں اور جن کے بعدس کی قسم کھائی جاتی ہے وہ بھی ہمارے برائے ملے والے ہیں ۔ کبھی یہ بھی ہمارے دبرِ معان کے حلقے میں بھی لیکن اس منصب کے اہل نہ بھے ، اس لئے نکال دیے گئے ۔ اس نا اہلی کے باوجود انے حلیل المدر ہیں کہ کعبے میں معزز سمجھے جاتے ہیں ۔ یہ نہ داری جس سے مطالب و مضامین خود بخود ابھرتے چلے آتے ہیں ، مومن و غالب کی خاص جبر ہے ۔ اور مومن کے ساگردوں میں نہ ورنہ چلنا رہا ۔

اصغر علی خان ابنِ نواب آغا علی خاں قاجار نسیم (۱۸۹۳ء تا ۱۸۹۴ء)

دہلی کے ایک ذی جاہ خاندان کے چشم و چراغ بھے ۔ جب تک دہلی میں رہے ، ہرماہ محفلِ مشاعرہ بڑے اہتمام سے منعقد کرتے رہے ۔ جس میں ان کے اساد حکیم مومن خاں بھی آتے تھے ۔ آزاد نے ان مشاعروں میں مومنِ وارستہ مزاج کو درد ناک لہجے میں پڑھتے سنا ہے ۔ باب کے مرنے کے بعد بھائیوں سے ناچاق ہو گئی ، تو نسیم ترکِ وطن کر کے لکھنؤ چلے گئے ۔ وہاں کچھ عرصہ مطبع لول کشور سے متعلق ہو کر 'الف لیلہ' منظوم

کرنے کی خدمت اپنے ذمے لی۔ ایک نار مطیع کی طرف سے تقاضہ ہوا تو وہ سلسلہ ہی ختم کر دیا۔ اسی طرح نواب محمد نقی خاں افسر کے اصرار سے 'بوستانِ خیال' کو نظم کرنا شروع کیا۔ لیکن تمام نہ کر سکے<sup>(۱)</sup>۔ دیوان کافی ضخیم تھا لیکن وارستہ مذاجی کے ہاتھوں اس طرح غائب ہوا کہ حسرت موہانی ہزار جسٹجو کے بعد صرف چار سو اسعار فراہم کر سکے<sup>(۲)</sup>۔ ۳ فروری ۱۸۶۶ء (۱۴ رمضان ۱۲۸۲ھ) کو انتقال ہوا۔ منشی مظفر علی خاں اسیر نے تاریخ کہی :

سند بہ جوارانِ ارم از حمنِ دہر نسیم (۱۲۸۲ھ)

نواب محمد نقی خاں افسر، نسیم کے ساگرد اور اکثر اخراجات کے کفیل تھے انہوں نے بموہ کو حج کے لیے بھیج دیا۔ ایک لڑکا تھا وہ بھی ساتھ گیا۔ حجاز کی خاکِ دامن گریے دونوں کو وہیں رکھا۔

نسیم کے کلام میں ان کے استاد کا سا رنگین نعل، حا محاسن جیسی حسب ترکیبیں، آمد اور رعنائی خیال موحود ہے۔ ان کے ساگردوں میں عبداللہ خاں مسر، محمد بی خاں افسر اور منشی امیر اللہ سلیم زادہ مشہور ہیں۔ سلیم بی سے مومن کی روایت تغزل قائم ہوئی۔

اسعار کا انتخاب درج ذیل ہے، جس میں ان کے استاد کا رنگ صاف جھلکا ہے :

نام سرا سننے ہی سرما گئے      نیم نے تو خود آپ کو رسوا کیا

☆ ☆ ☆

حیا پڑھنے نہیں دبی ارادہ نوجوانی کا      اسارہ ہو کے رہ جانا ہے ہم بر مسرہانی کا

☆ ☆ ☆

حاجبِ سمع نہ بروائے حراعِ لحدی      پاک احسان سے مزارِ غربا ہونا ہے  
اے نسیم چمن آرائے فصاحت مجھ سے      گلشنِ معنی نوخیز ہوا ہونا ہے

☆ ☆ ☆

آنکھوں میں لحاظِ بسمِ فزا ہیں جب      سکرِ خدا کہ آج تو کچھ راہِ بر ہیں آپ

☆ ☆ ☆

ہوتی نہیں ہے کم مری ویرانہ دوسنی      جانا نہیں ہے سر سے خیالِ وطن ہنوز

☆ ☆ ☆

برف نے اک طرزِ بے بنائی مرا سکھا تو کیا      سنکڑوں بایں ہیں ایسی خاطرِ نانشاد میں

(۱) عرس گیاوی، حیاتِ مومن - ص ۷۰

(۲) محمد یحییٰ ننہا، مراہ الشعر - ص ۵۵، گل رعنا - ص ۳۸۹

وہ اپنے استاد کی طرح مختصر بحروں میں بہت فصیح اشعار کہہ جاتے ہیں۔ جہاں ان کی زبان کی سلاست ایک خاص امیازی شان سے ظاہر ہوتی ہے :

کسی صورت سے دل کو ساد کرنا      ہمیں دشمن سمجھ کر یاد کرنا  
جنازہ اٹھ چکے میرا نو م بھی      ادا رسمِ مبارک باد کرنا

☆ ☆ ☆

باتھ میں خنجر کدر میں سغِ تیز      یہ ارادے ایک مشتِ خاک پر

☆ ☆ ☆

سینے میں سے بھر کچھ آئی آواز      پھوٹا کوئی آبلہ جگر کا

☆ ☆ ☆

جی ہی سوچے کتنا عجب بہل جائے      کچھ ذکر کرو ادھر ادھر کا

☆ ☆ ☆

کہے دیسی ہیں یہ نجی نگاہیں      کہہ بالائے زمیں کیا کیا نہ ہوگا

نسیم کے کلام میں لکھنؤ اور دہلی کے رنگ کا دلکش امتزاج ہے۔ وہ آس و ناسخ کے ساگردوں کے ہم عصر تھے اور وہاں کی محفلِ شعر میں دہلی کے نام کو روشن کرتے تھے۔ منشی امیر اللہ سلیم جو ان کے ساگردوں میں نامور ہوئے، نسیم کے مخصوص دہلوی انداز سے بہت متاثر تھے، چنانچہ کہتے ہیں :

ہم نو ہیں تسلیم ساگردِ نسیمِ دہلی      ہم کو طرزِ شاعرانِ لکھنؤ سے کیا غرض

## دیگر شعرا

شیفتہ، سالک، فلق اور نسیم، مومن کے خاص ساگرد ہیں۔ ان کے علاوہ فاضی نجم الدین بڑی، غلام علی خاں وحشت، خیر الدین یاس، عباس علی خان بیتاب، نواب محمد اکبر خاں (شیفتہ کے چھوٹے بھائی جن کی لیاقت اور شعر گوئی کے سرسید بہت مداح ہیں)، مرزا شمشاد علی بگ رضوان، غلام فخر الدین تھور۔ مرزا رحیم الدین حیا، غلام ضامن کرم، نواب یوسف علی خاں ناظم، شیخ علی بخش بہار وغیرہ ایسے بلامذہ ہیں جن پر مومن بجا طور پر ناز کر سکتے ہیں۔ یہ وہ باذوق اشخاص ہیں جو اپنے استاد کے سوز و گداز، عشقِ کامران، معاملہ بندی، اور اشاریت پر عاشق تھے اور اس خاص رنگ کی پیروی کو فخر سمجھتے تھے۔ عرض نے اسی بنا پر لکھا ہے کہ ”مومن اپنی مٹے دو آتشہ میں ہانی ملانا گناہ سمجھتے تھے اور ان کی بھی میں صرف ”آں مے کہ دہقان پرورد“ کے



طالب نظر آئے تھے“<sup>(۱)</sup>۔ دبسانِ مومن کے افراد میں جو ہم رنگی و ہم آہنگی ہے اس کا راز یہی ہے کہ اساد اور ساگردوں میں صرف ایک رسم نہیں بلکہ کئی طرح کے تعلق تھے جن کا ذکر صفحاتِ گزشتہ میں ہو چکا ہے۔

مذکورہ بالا نلامذہ کے علاوہ مذکوروں میں مومن کے بعض غیر معروف ساگردوں کا ذکر بھی ملا ہے۔ سلا منور علی حان آسفہ ، عبداللہ خاں راسوری ، غائب علی خاں رام پوری ، خورسد احمد لکھنوی ، حسام علی خاں موجد ، محمد بخش بروہ ، محمود بیگ راحت ، مرزا خدا بخش قصیر۔ ان کے علاوہ کچھ اسخاص اسے بھی ہیں جو رسمی طور پر کسی اور کے ساگرد ہیں ، لیکن ان کے اندازِ غزل اور طرزِ فکر کا سلسلہ مومن سے ملا ہے۔ سد طہیر الدین ظہیر دہلوی جو خطاطی میں بہادر شاہ ظفر کے اساد اور ساعری میں ذوق کے ساگرد تھے ، طرزِ مومن کے عاشق تھے اور ان کے انداز بلکہ ان کی زستوں میں غزلیں کہہ کر مومن پرستی کا اعلان کرتے تھے۔ ذیل کے مطبع اس رحمان کے آئینہ دار ہیں :

طرزِ مومن سے نہ آگاہ تھے جب تک کہ طہیر سح بویہ ہے کہ کبھی رنگ غزل نے نہ دیا



کا نبائی طرزِ مومن اے طہیر طاق ہیں لاریب انے فر میں ہم



### کتابیات

- ۱۔ آزاد ، محمد حسن۔ آبِ حیات طبع سائز دہم۔ لاہور
- ۲۔ ننہا ، محمد مجبئی ، مرآۃ السعرا ، سارک علی ۱۹۵۴ء
- ۳۔ سبغتہ۔ گلشنِ بے خار طبع کراچی ۱۹۶۵ء
- ۴۔ سری رام ، خمخانہ جاوید۔ جلد چہارم ۱۹۱۱ء تا ۱۹۱۹ء
- ۵۔ صابر فادر بخش ، گلستانِ سخن نولکسور ۱۸۸۲ء
- ۶۔ عبادت بریلوی ، ڈاڈٹر۔ کتابِ مومن اردو۔ اردو مرکز ۱۹۵۵ء
- ۷۔ عبدالجلی ، گلِ رعنا ، طبع چہارم اعظم گڑھ
- ۸۔ عرس ، ضمیر الدین احمد ، حیاتِ مومن ، دہلی ۱۹۳۲ء
- ۹۔ کلب علی خاں ، کتابِ سالک مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۶ء
- ۱۰۔ نساخ ، عبدالغفور ، سخنِ شعرا نولکسور ۱۸۹۱ء

## مرزا اسد اللہ خاں غالب

### ذاتی حالات

مرزا اسد اللہ خاں غالب شرفائے دہلی میں سے تھے۔ ان کے والد مرزا عبداللہ بیگ ایک فوجی دستہ کے کمان دار تھے۔ اور ان کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ اپنی ممتاز فوجی خدمات کے عوض پنشن اور جاگیر پا چکے تھے۔ ان کے ننھیال آگرہ کے ایک باوقار مغل خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور بڑے اثر و رسوخ کے مالک تھے۔ مرزا کے سسر نواب الہی بخش معروف دہلی کے بڑے رئیس تھے۔ غرض مرزا کا اپنا خاندان اور ان کے دوسرے اقارب اس وقت کی سوسائٹی میں کئی اعتبار سے بہت ممتاز تھے۔

مرزا غالب نے اپنی زندگی میں کئی نسب و فراز دیکھے۔ وہ باغ برس کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اور وہ انہی والدہ کے ساتھ ننھیال میں رہنے لگے۔ چچا نصر اللہ بیگ سر پرست تھے۔ ننھیال میں اگرچہ مرزا کی بہت خاطر مدارات ہوتی تھی مگر یہ ناممکن ہے کہ انہیں اپنے یم ہونے کا احساس نہ ہو۔ ان کی بیوہ ماں اپنے والدین کے ہاں عزت سے رہتی تھیں مگر ایسے حالات میں مرزا کسی طرح بھی اپنے ماحول سے مطمئن نہیں ہو سکتے تھے۔ جب نو سال کے تھے ان کے چچا بھی وفات پا گئے، اس وقت ان کی زندگی میں ضرور ایک خلا پیدا ہو گیا ہوگا۔ ہمارا خیال ہے کہ اس خلا کے گہرے احساس نے غیر شعوری طور پر ان کے مزاج پر اثر کیا۔

مرزا کی شادی ابتدائے جوانی میں ہو گئی اور وہ سسرال میں رہنے کے لیے دہلی آ گئے۔ یہاں کا ماحول بھی کچھ ایسا سازگار نہ تھا۔ بچپن کا ماحول بھلا بھی موجود تھا۔ وہ عہد طفلی سے شعر کہہ رہے تھے مگر دہلی میں ذوق کی شاعری کا چرچا تھا اور غالب کی شاعری کی طرف بے لوث تعلق تھا۔ علاوہ بریں ایک طرف رئیسانہ ماحول کی پابندیوں اور مصنوعی آدابِ مجلس کا دباؤ تھا اور دوسری طرف غالب کی فطری آزاد روی اور بے باکی تھی۔ غرض ماحول کا یہ تضاد ان کی ذہنی کشمکش کا باعث ضرور بن جاتا ہوگا۔ مگر احساسِ کمتری کے برعکس ان کے اندر مدافعت بلکہ مفاومت کا جذبہ گہرا ہوتا گیا اور یہ بات ان کے دل میں راسخ ہو گئی کہ اس ماحول کو بدل دیں اور اپنی فطری صلاحیتوں کو اس کام میں لائیں۔

مرزا نصر اللہ بیگ کی وفات کے بعد نواب احمد بخش والی فیروز پور جھڑکے مرزا غالب کی پنشن جو انہیں اپنے چچا کا وارث ہونے کی وجہ سے ملتی تھی کم کر دی مگر کبھی کبھی انہیں مزید رقوم بھیجتے رہے۔ مرزا بچپن سے خراج تھے، اس لیے ان کی شریفانہ گزران مشکل ہو گئی۔ مرزا نے والی فیروز پور جھڑکے سے

مصالحت کی کونسل کی مگر وہ ناکام رہے۔ جب ان کے سرسرفوت ہو گئے تو وہ نواب احمد بخش کے خلاف مقدمہ دائر کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اس مقدمہ کی پیروی میں انہوں نے کلکتہ کا طویل سفر اختیار کیا۔ اس سفر کے دوران میں، خاص طور پر کلکتہ میں، جو ان پر گزری وہ ایک آفت سے کم نہ تھی۔ ایک نوکلکتہ کے ادبی حلقے کی مخالفت دوسرے مقدمہ میں ناکامی۔ گویا کلکتہ کا امام مرزا کے لیے بڑی آزمائش کی گھڑی تھی۔ دو سال کے بعد مرزا دہلی واپس آئے تو کئی بلخوں سے آشنا ہو چکے تھے۔

ان سب میں بڑی دلخیز کچھ دیر بعد مرزا کا جبل جانا تھا۔ کوہوال سے مخالفت بڑی سہنگی پڑی اور غالب کو ہار نازی کے الزام میں مد کی سرا ہو گئی۔ اس حادثہ میں حساس شاعر کی طبیعت پر بہت گہرا اثر ہوا جس کا رنگ ان کے فارسی کلام میں نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ اگر غالب ایک عام آدمی ہوتے اور فطرت کی طرف سے انہیں پانچ نمایاں عطیے حاصل نہ ہوتے یعنی فطرتِ سلم، بے سناہ فوجِ معادلہ، زبردست فہمِ صالح، مزاج کی سگفتگی اور حود غسلی، تو انہوں سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شخصیت اپنے ماحول میں دب کر فنا ہو گئی ہوگی۔ مخالف حالات کا معاہدہ نہ تو میر تقی میر کر سکے اور نہ خواجہ میر درد۔ میر صاحب پر چر سے کنارہ کس ہو کر سڑی بن کا ننگار ہو گئے اور خواجہ میر درد۔

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے

ہم سو اس جسم کے ہاتھوں میں چلے

کہتے ہوئے بصوف کی آغوش میں سناہ گریں ہو گئے۔ برعکس ان کے مرزا غالب ایک بھرپور زندگی گزار سکے اور اپنے فکر و نظر کا نفسِ دوام دنیا میں جھوڑ گئے۔ یہ سب مندرجہ بالا پانچ عطیوں کے طفل تھا۔

مرزا کا ماحول

مرزا غالب کا عمومی ماحول بڑی عجیب خصوصیات کا حامل ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ان کے فن و فکر کے مطالعہ سے بیستر اس ماحول پر نظر ڈالی جائے۔ سب سے پہلے اس ماحول کی جغرافیائی حبیب ہمارے سامنے آتی ہے۔ بسترِ صغیر میں قدرت فراخ دست ہے، نہوڑی محنت سے گزر اوقات ہوسکتی ہے۔ اس لیے لوگ طبعاً آرام پسند ہیں اور کڑی محنت ان کے لیے ناگوار ہے۔ پھر موسم کی بد خوئی نے لوگوں کو زیادہ جذباتی بنا دیا ہے۔ گرمی پڑے تو چیخ اٹھتے ہیں، لو چلے تو سہم جاتے ہیں، زور سے بارش آئے تو چلاتے لگتے ہیں۔ گویا طبع نہایت سریع القبول ہے اور جذبات پر قابو کم

ہے۔ خود غالب کے خطوط میں کئی ایسے واضح اشارے ملتے ہیں جن سے ان کی سادتِ احساس اور طبعیت کے لابلایانہ بن کا ہتہ جلتا ہے۔ ذرا ان کی غذا پر ہی غور کیجئے تو ان کے مزاج کا ہتہ چل جاتا ہے۔ گوشت کا ہانی، بھنا ہوا گوشت، کباب، آم، شراب غالب کی پسندیدہ چیزیں ہیں اور ان کا جو اثر مزاج پر ہوتا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

### سیاسی ماحول

سیاسی اعتبار سے غالب کا ماحول بڑی حد تک برسکون تھا۔ غدر سے پہلے بھی امن و امان تھا اور غدر کے بعد نو حالات اور بھی اچھے ہو گئے۔ اس ماحول میں جاگیرداری ایک اہم چیز تھی۔ مگر نہ جاگیردارانہ نظام بڑی حد تک کھوکھلا ہو گیا تھا۔ اس ماحول میں نئی اور نرانی اقتصادی اقدار کی کنسمکس بھی جس کی وجہ سے ایک عام لے جتنی سدا ہو گئی تھی۔ خود مرزا غالب بھی اس لے چینی کا سکار تھے۔ وہ ایک خود دار آدمی کی مانند اقتصادی خوس حالی حاصل کر کے اننی سماجی جبنیت قائم رکھنے کی سرنوڑ کونس کر رہے تھے اور اسی لے اکثر نرسان رہے تھے۔ گونا سیاسی ماحول کے سس سنت بدلتی ہوئی مدرس اور متصادم خالاب تھے حز سے مرزا کو دوچار ہونا پڑا۔

### علمی ماحول

علمی اعتبار سے نہ ماحول بہت ررخز تھا۔ بڑے بڑے ساعر، بلند مرتبہ علما، عظم اور یر ومار حکم اور طبیب دہلی میں موجود تھے اور ان کے فبض کے چشمے جاری تھے۔ لوگ ان سے فبض ناب ہو رہے تھے۔ دریس کے فیم نے کتابیں نسبتاً عام کردی تھیں اور مطالعہ کا شوق بڑھ گیا تھا۔ فارسی کی جگہ اننی ملکی زبان اردو لسنے لگی تھی۔ ظاہر ہے کہ اردو میں اننے فومی سعوں کا رنگ غالب تھا۔ اسی لے یہ ادبی تخلیق کے لے زیادہ موزوں تھی اور اب اس میں ادبی تخلیقات دل کھول کر کی جانے لگیں اور عام آدمی تک ادبی تخلیقات سے فائدہ اٹھانے لگا۔ مولانا حالی نے تعلیم و بعلم کے معیار کا بڑی وضاحت سے ذکر کیا ہے اور بنایا ہے کہ کس مرتبہ کے علما اس وقت دہلی میں موجود تھے۔ سرسید نے 'آثار الصنادید' میں دہلی کے علما، فضلا، بزرگانِ دین، شعرا، اطبا اور فن کاروں کا ذکر جس ذوق و شوق سے کر چکے تھے، اس سے اس زمانہ کی ثقافتی زندگی کی تصویر واضح طور پر سامنے آ جاتی ہے۔ حالی نے بھی ایسی ادبی صحبتوں کا ذکر کیا ہے، جن کے طفیل اردو زبان کو جلا نصب ہوئی۔ غرض یہ کہ علمی ماحول کچھ ایسا بن گیا تھا کہ اس سے ہر آدمی مستفیض ہو سکتا تھا۔

## مذہبی ماحول

اس دور کے مذہبی ماحول میں بھی اقدار کا نصادم تھا۔ روایت پرستی اور توہم پرستی کے خلاف ولی السہی خاندان کی مہم جاری تھی۔ اس کا اندازہ شاہ اسمعیل شہید کی کتاب 'نقویت الایمان' (۱۸۲۵ء) سے ہو سکتا ہے۔ سید احمد بریلوی کی تحریک، فعالیت کی اعلیٰ مثال تھی۔ لوگ تعدیر پرست بھی تھے مگر ان میں ادیان کی حرارت بھی موجود تھی۔ گویا اس نصف صدی (۱۸۰۳ء - ۱۸۵۷ء) میں انفعالی رجحانات اور عمل پرستی میں زبردست جنگ تھی اور یہ جنگ بالآخر ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں مشت طور پر نمودار ہوئی۔ مرزا تقلید کے خلاف تھے۔ اس لیے فطری طور پر بھی وہ غیر مقلد تھے اور کہا کرتے تھے:

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

مگر ساتھ ہی اہل بت اور خصوصاً سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے والہانہ عشق رکھتے تھے۔ گویا یہ تضاد خود ان کی طبعیت میں موجود تھا۔ اس ماحول کا معاصر رنگ پرانی اقدار کا حاصل تھا۔ خدا کی مخلوق طبقات میں تقسیم ہو چکی ہوئی تھی اور ہر طبقہ کے درمیان ایک خلیج حائل تھی۔ عام طور سے ایک طرف وہ لوگ تھے جو سببی اور خاندانی شرافت کو معیار سمجھتے تھے اور دوسری طرف سرکاری ملازمین کا سما طبقہ تھا، جس کا سارا اثاثہ اقتدار پر مبنی تھا۔ مگر عوام میں ذاتی وفار کا احساس بھی جاگ اٹھا تھا۔ چنانچہ یہ تصادم بڑی دیر تک چلتا رہا۔ اس ماحول میں ہندو مسلم مسل جول زیادہ بھی تھا اور برادرانہ بھی۔ چنانچہ غالب کے خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ ہندو مسلم تعلقات کی نوعیت کیا تھی اور دونوں ایک دوسرے کے کتنے فریب تھے۔ مصلحت اقتدار قائم کرنے کی جو آخری بار کوشش ہوئی تھی اس میں وحدت مقاصد کے ساتھ وحدت عمل بھی موجود تھی۔ اور ایک ملکی حکومت کا تصور پہلی مرتبہ اس برصغیر کے باشندوں میں پیدا ہوا تھا۔ اس ماحول میں رہنے سہنے کا معیار بہت اونچا تھا۔ مسلمان ایک طویل عرصہ تک حکمران رہے تھے، انہیں دولت سے زیادہ اقتدار سے پیار تھا۔ دولت کو وہ محض ایک وسیلہ سمجھتے تھے، زندگی کی آسائشیں خریدنے کا اور امداد حاصل کرنے کا۔ لہذا عام آدمی بھی اپنی حبش سے بڑھ کر خرچ کرنا تھا تاکہ معیار زندگی قائم رہے اور وہ سرفا میں شمار ہو۔ خود غالب کا ذہن بھی اسی قسم کی کشمکش میں گرفتار رہا اور ان کی حساس طبیعت پر اس کا گہرا اثر پڑا جو ان کے کلام میں نمایاں ہے۔

اس عمومی ماحول کا مرزا غالب کی شخصیت کی تعمیر میں کس قدر حصہ ہوا اس کا اندازہ ہم آگے چل کر لگائیں گے۔

## مرزا کی تعلیم

مرزا غالب کی ابتدائی تعلیم رسمی قسم کی تھی۔ انہوں نے کئی ایک عام اساتذہ سے بھی درس لیا تھا۔ ان کے انئے خیال کے مطابق یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ ہرمزد ایرانی دہلی آنکلیے اور انہیں ان سے درس لینے کا موقع ملا۔ اس ایرانی النسل اسناد بر وہ فخر کرتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے فارسی زبان کے غوامض انہیں سے سیکھے تھے۔ اس روایت کی حقیقت کچھ بھی ہو، اس سے اتنا یہ ضرور چلتا ہے کہ مرزا غالب کی نظر فارسی زبان کی باریکیوں اور اس کے لطیف پہلوؤں پر ابتدا ہی سے تھی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے فارسی کلام میں وہ بات پیدا ہو گئی جو خالص ایرانی شاعروں کے ہاں پائی جاتی تھی۔ زبان کی حسن شناسی نے انہیں نئی طرح کا نادشاہ بنا دیا۔ لیکن مرزا کی علمی حیثیت کا محض اس ایرانی استاد یا دوسرے اساتذہ کی تربیت پر انحصار نہ تھا۔ اس دور کے علمی ماحول نے جو ہوا کا رنگ بنا دیا تھا وہ اس قدر برناتیر تھا کہ ایک بالغ نظر شخص پر سانس کے ساتھ علم کی روسنی جذب کر لیا تھا۔ غالب بھی اس علمی ماحول اور اس کی ادبی صحبنوں سے بوری طرح مستفہض ہوئے تھے، چنانچہ اس استفادہ کا ثبوت ان کے افکار میں جا بجا ملتا ہے۔

غالب کے دور میں بین عظیم ہسیاں سر بر آوردہ نظر آتی ہیں اور وہ ہیں شاہ اسمعیل شہید، مولانا فضل الحق خیر آبادی اور سر سید احمد خان۔ غالب نے ان تینوں سے فضل حاصل کیا۔ تقلید کے نو وہ پہلے ہی روز سے فائل نہ تھے۔ شاہ اسمعیل شہید کے خیالات نے انہیں اور بھی زیادہ تعلید سے منفرد کیا۔ ان کی فکر آزاد فضاؤں میں پرواز کرنے لگی اور وہ اشیا اور واقعات کے حسن و قبح کا فیصلہ اپنی سوح کے مطابق کرنے لگے۔ یہی وجہ تھی کہ انہیں مولانا فضل الحق خیر آبادی کا طرز عمل بہت پسند آیا۔ مولانا کی سیاسی روش کا تو وہ ساتھ نہ دے سکے لیکن مولانا کی حب الوطنی اور اسلام دوستی کے وہ ہمیشہ گرویدہ رہے۔ چنانچہ وہ سانحہ غدیر کو بالکل اسی نظر سے دیکھتے ہیں جس نظر سے کہ مولانا خیر آبادی نے دیکھا تھا۔ یعنی استعمار غیر کا انہیں بھی شدید احساس تھا اور وہ بھی اپنی بزم کے اٹھ جانے سے سخت دل گرفتہ تھے۔ مگر غالب کی گہری نظر کے سامنے کئی بنیادی حقیقتیں تھیں۔ اس لیے وہ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے الم ناک پہلوؤں سے بہت آگے دیکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ یہاں ان کا مسلک سر سید احمد خان سے ملتا جلتا ہے۔ وہ مشرق اور مغرب کے اس تصادم سے مایوس نہیں ہوئے تھے۔ انہیں نیا جہان ابھرتے ہوئے دکھائی دے رہا تھا اور وہ اس جہان نو کی تعمیر میں اپنی بساط کے مطابق حصہ لینا چاہتے تھے۔ ہارا خیال ہے کہ ان کے کلام

میں وہ سب کچھ ہے جو انک نئے جہان کی تعمیر میں کام آسکا تھا۔ اس نسبت سے وہ سرسبز اور ان کے ساتھیوں کے ہم نوا تھے۔

### ماحول کے اثرات غالب پر

اس وقت تک ہم نے مرزا غالب کے خاندان، ان کی ابتدائی زندگی کے حالات، ان کی برساتوں اور الجھنوں، ان کے ماحول کی مختلف خصوصیتوں اور ان کی تعلیم کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ اب یہ ضروری نظر آتا ہے کہ شاعر کے شخصی ماحول اور عمومی ماحول نے جو اثرات شاعر کی ذات پر مرتب کیے ہیں، ان کا جائزہ لیا جائے۔ نا کہ ان کی شخصیت پوری فائیت کے ساتھ نظر آئے۔ جغرافیائی ماحول کا ذکر کرتے ہوئے ہم نے یہ تالانا تھا کہ آب و ہوا اور غذا کا اثر واضح طور پر غالب کی ذات پر ہوا۔ اگر ہم اس اثر کو دو بی لفظوں میں بیان کرنا چاہیں تو وہ دو لفظ ہونگے ”ہجانی جذبہ“۔ گویا اس جغرافیائی ماحول کے اثر کا خلاصہ ہجانی جذبات کی پرورش ہے۔ ظاہر ہے کہ ہجانی جذبہ انہی جگہ پر فرسِ بختی کو مہمزد دینے میں کام آتا رہا۔ اور غالب کا یہ فطری عطیہ انہی جذبات کے طفیل پروان چڑھتا رہا۔

### سیاسی ماحول کا اثر

سیاسی ماحول کا اثر ذہنی کشمکش کی صورت میں نمودار ہوا۔ یہ ذہنی کشمکش نئی اور پرانی قدروں کے تصادم سے پیدا ہوئی۔ حانچہ اس سے دو مسئلہ نیچے نکلے، جو غالب کی شخصیت کی تعمیر پر اثر انداز ہوئے۔ ایک طرف ان کا مسلک تھا۔ یعنی وہ بہت سی پرانی روایات کو کرایدے میں مصروف رہے اور ان کے بارے میں شک کرتے رہے۔ اور دوسری طرف وہ ”خذ ما صفاغ ماکدر“ کے اصول کے فائل ہو گئے۔ وہ دیکھے تھے کہ بہت سی پرانی روایات حقیقت سے خالی ہو گئی ہیں اور کئی نئے خیالات نے حقیقت کو اپنی آغوش میں لے لیا ہے۔ لہذا وہ نئی صورتوں کے فائل ہو گئے۔ ماحول کی معاشری کشمکش نے ان پر یہ اثر کیا، کہ وہ طبقاتی نا ہمواری سے نفرت کرنے لگے۔ وہ خود صاحبِ جوہر تھے اور انہیں جہاں کہیں وہ جوہر نظر آتا، اس کی قدر کرنے۔ اس طبقاتی نا ہمواری کا ردِ عمل یوں ہوا کہ وہ نہایت وسیع المشرب بن گئے اور انسانیت کے بلند مقام سے سوچنے لگے۔ دوسری طرف اس طبقاتی نا ہمواری کا ان پر یہ اثر ہوا کہ وہ آدمی آدمی کے درمیان فرق کرنے پر جھٹلا اٹھتے تھے اور اسی سے ان کے کلام میں تلخ نوائی پیدا ہو گئی۔

## مذہبی ماحول کا اثر

ماحول کے مذہبی پہلو نے انہیں ایک خاص قسم کی روحانی کشمکش میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ عام شاعروں کی طرح واعظ کے دین سے بیزار نہ تھے بلکہ وہ دین کی صورت اور اس کی روح میں تمیز کرنا جانتے تھے۔ وہ صورت سے متنفر نہیں تھے وہ چاہتے تھے کہ صورت میں روح ضرور قائم رہے۔ تا کہ وہ صورت انسانی زندگی پر اثر انداز نہ ہو سکے۔ اس انداز فکر کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک تو ان کے ترکِ تقلید کے مسلک میں پختگی آ گئی، یعنی وہ سنی سنائی بات سے زیادہ اپنے تجربہ اور مشاہدہ پر بھروسہ کرنے لگے۔ دوسرے یہ کہ ان کی 'پیگن' وسیع المشرب میں ایک خاص قسم کا ضبط نمودار ہو گا۔ اگر غالب عام شاعر ہوتے تو واعظ کے دین کو ٹھکرا دیتے اور اس دین کی صورت اور ماہیت پر غور نہ کرتے اور لازماً 'پیگن' وسیع المشرب میں ڈوب جاتے۔ انسان سے خدا کا تعلق، کائنات میں انسان کا مقام، زندگی کی حقیقت، ان سب چیزوں پر ان کی نظر اس لیے بڑی اور ان کی ماہیت کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش انہوں نے اس لیے کی، کہ مذہب کی روح انہیں ایک عظیم چیز نظر آتی تھی۔

## شخصی ماحول کے اثرات

غالب کے شخصی ماحول کے اثرات بھی غور کے قابل ہیں۔ اس کی زندگی کا سب سے پہلا حادثہ ان کے والد کی وفات بھی۔ اس کا فوری اثر ہمارے خیال میں احساسِ کمتری اور بے حارگی تھا۔ اس حادثہ نے ان کی زندگی میں ایک خلا پیدا کر دیا۔ جس کا احساس انہیں عمر بھر رہا۔ وہ ہمیشہ اس خلا کو پر کرنے کی کوشش اپنے طور پر کرتے رہے۔ چنانچہ کہیں وہ کسی نواب کو اپنا مربی بنانے کی کوشش کرتے ہیں نو کہیں کسی لائٹ بھادر کو۔ دوسرا بڑا واقعہ غالب کا ننھیال میں جا کر رہنا تھا۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے امیرانہ زندگی کے ٹھانڈے دیکھے، نوابزادوں کی لا ابا لیاں دیکھیں۔ عیش و عشرت کے فریضے دیکھے۔ ظاہر ہے کہ ان چیزوں کا اثر ان پر بھی ہوا۔ ایک طرف تو ان کی طبیعت میں مخصوص رنگ کی دنیا داری آ گئی جسے ان کی خود داری نے بہت کم گوارہ کیا۔ لیکن زمانے کی گردشوں نے انہیں اس پر مائل رکھا۔ دوسری طرف وہ اس بورژوا سوسائٹی کے سفلی رجحانات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ محبت کے ازلی جذبہ سے محروم ہو گئے اور ان کی محبت بھی ایک جاگیردار کے آقاخانہ پیار کی صورت اختیار کر گئی۔

شادی کے بعد نواب الہی بخش معروف کے ہاں رہنا نصیب ہوا۔ یہاں کی امیرانہ زندگی میں رہ کر ان کے اندر اپنی بے مائیگی کا احساس ضرور پیدا ہو گیا ہوگا۔ اغلباً اس رئیسانہ



ماحول میں انہیں سکون کی بجائے ذہنی کشمکش سے دوچار ہونا پڑا۔ نواب الہی بخش اور ان کے ہم نشین ذوق کی شاعری کے گرویدہ تھے۔ جو اپنی تمام خوبیوں کے باوجود غالب کو ناپسند تھی۔ غالب کو اپنے کلام کی داد تو کما ملتی، الٹا اعتراضات ہوئے۔ انہیں سہمیل گو فرار دے دیا گیا۔ چنانچہ ان کے دل میں ایک ردِ عمل پیدا ہوا اور سب سے پہلے وہ روایت سے سزا ہو گئے۔ ایسی روایت جو ذوق کے لیے مایہ ناز تھی۔ اس ذہنی کشمکش کا دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ غالب نے رنگِ بددل میں لکھنا دشوار سمجھا اور اسے ترک کرنے کی ٹھان لی اور پھر ان دونوں بادوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ شاعر غالب نے شعوری اور غیر شعوری دونوں طریقوں پر اپنی ادبی شخصیت کی نلاس شروع کر دی۔ یہ ایک راستہ تھا جس پر مرزا غالب اپنے مقام تک کبھی نہ پہنچے۔

اس کے بعد جاکر کا قفسہ بس آیا اور انہوں نے سفرِ کلکتہ اختیار کیا۔ یہ دو سال کا سفر اور وطن سے باہر مقام غالب کی شخصیت پر کئی طرح سے اثر انداز ہوا۔ غالب نے اس دوران میں کئی دہنی ٹھوکریں کھائیں اور وہ شدید احتیاج سے آشنا ہوئے۔ دوست دشمن کی ہرکھ، اپنے اور برائے کی آزمائش اسی وقت ہوئی۔ اس سارے واقعے کے دو متضاد اثر ہیں۔ اس کا پہلا اثر یہ معلوم ہوتا ہے کہ احتیاج نے غالب کی شاعری میں ریا کا عنصر پیدا کر دیا۔ گویا جس کی خود داری یہ کہا کرتی ہے:

اٹھے بھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

یہ عنصر خوانِ نعمت تک پہنچانے کے لیے ان سے قصائد لکھانے لگا۔ دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے ذہنی افق پر جو بادل منڈلا رہے تھے وہ چھٹ گئے اور کلکتہ والوں کی مخالفت نے جو چنگاریاں آڑائی تھیں ان سے غالب کے ہاں مزید اجالا ہو گیا۔ گویا جہاں مالی مشکلات نے غالب کو اپنے مقام سے نیچے اترنے پر مجبور کر دیا، وہاں علمی مشکلات نے غالب کو مزید بلندیوں تک پہنچنے کی ہمت عطا کر دی۔ 'قاطعِ رہان' اس کا ثبوت ہے۔

قید کی سزا ایک الم ناک حادثہ تھا۔ اس حادثہ نے غالب کے اندر اپنی رسوائی کا جانِ گداز احساس پیدا کر دیا۔ غالب جو اپنی انا کے جال میں محبوس تھے، یکسر تھڑا اٹھے اور تھوڑے وقت کے لیے یاس و موہیت کے شکار ہو گئے۔ مگر شاعر کی زبردست فہمِ صالح کام آئی اور آہستہ آہستہ اس حادثہ نے اس کے اندر ایک دوامی شانِ بے نیازی پیدا کر دی۔ کالجی شاہ صاحب کے ہاں غالب پہنچے تو وہ ایک اور غالب تھے۔ جیل کی سنگین دیواریں دراصل غالب کے لیے ایک دھکتی ہوئی بھٹی ثابت ہوئیں جس نے انہیں

کندن بنا دیا۔ اب غالب ایک مکمل شخصیت کے مالک تھے۔ اور وہ یہ کہتے سنائی دے رہے تھے :

ایس سوز طبیعی نہ گدازد نفس را  
صد شعلہ بفسشار و بہ مغز شرم ریز  
مسکین خبر از لذت آزار نہ دارد  
خارم کن و در رہ گزر چارہ گرم ریز

### فکرو فن

غالب کی ابتدائی زندگی اور ان کے ماحول کے مطالعہ کے بعد اب ہمارے لیے ان کے فکر و فن کا جائزہ لینا کسی قدر آسان ہو گیا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے ہم غالب کے کلام میں ان کے افکار پر نگاہ ڈالیں۔ اور یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ غالب زندگی کے اہم مسائل کے متعلق کس طرح سوچتے ہیں۔ غالب، جیسا کہ انہوں نے خود کہا ہے، ایک شعوری فنکار ہیں۔ انہوں نے شعر و سخن کا میدان اپنے لیے خود مسخ کیا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں :

”ذوق سخن کہ ازلی آوردہ بود رہنی کرد و مرا بدان فریفت کہ  
آئندہ ز دودن و صوبِ معنی نمودن نیز کارِ نمایاں است۔ سرلسکری و  
دانشوری خود نیست۔ صوفی گری بگزار و بسخن گستری رو آر۔ ناگزیر  
ہم چنان کردم و سفتہ در بحرِ شعر رواں کردم۔“

یہ آواز واقعی ایک شعوری فنکار کی آواز ہے۔ عام فکروں سے وہ اس لیے ممتاز ہیں کہ اپنی تخلیقات میں وجدان کے ساتھ دہن کی تمام قوتوں کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کی تخلیق اپنے اثر میں زیادہ ہمہ گیر ہوتی ہے۔ جب غالب کی نظر کائنات پر پڑتی ہے تو وہ اس کی علت العلل یعنی ذابِ باری تعالیٰ کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں اور ان کا ذہن رسا فوراً اس نقطہ تک پہنچ جاتا ہے :

ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر  
یاں کیا دہرا ہے فطرہ و موج و حباب میں

☆ ☆ ☆

ہے وہی بد مستی پر ذرہ کا خود عذر خواہ  
جس کے جلوے سے زمیں نا آہاں سرشار ہے

گویا غالب وحدت الوجود کے قائل ہیں اور جو کچھ انہیں انے ارد گرد نظر آ رہا ہے ، وہ اسے اصنامِ خیالی سمجھتے ہیں ۔ ان کے خیال میں ذابِ حق سے مہجوری کا باعث یہی اصنامِ خیالی ہیں ۔ چنانچہ جب وہ کہتے ہیں :

کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے

نو اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں اپنی ذاب کے مقام سے مسکرنانے والے ہی اصنامِ خیالی ہیں ، ورنہ وہ نوعین ذاب میں سربک ہیں ۔ لیکن یاد رہے کہ غالب کے نظریہٴ وحدت الوجود اور عام صوفیوں کے نظریہ میں بہت فرق ہے ۔ اور اس فرق کی بصادی وجہ ان کا بے پناہ ذوقِ ہستی ہے ۔ یہی انا کو برقرار رکھنے کا سوو انہیں مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیں ۔ پہلا حصہ عالمِ انفس کی زندگی ہے جس میں وہ اپنے آپ کو سب پر غالب سمجھتے ہیں ۔ دوسرا حصہ عالمِ آفاق کا ہے ۔ یہاں پہنچ کر انہیں کسی اور کی فوقیت کا احساس ہونا ہے اب وہ لازمی سمجھتے ہیں کہ اس قوی پر ہستی کے ساتھ گہرا تعلق جوڑ لیں ۔ پھر جب کائنات انی وسعت اور عظمت کے باعث ان کے بستی وجود کو حصر بنا دیتی ہے تو وہ فنائے خوف سے اس نات پر آمادہ ہو جاتے ہیں کہ انے آب کو اس قوی پر ہستی میں جذب کر دیں ۔ گویا اس طرح وہ اپنی ہستی کو برقرار رکھنے کی سعی کرتے ہیں ۔ اسی کسمکس کا اظہار انہوں نے یوں کیا ہے :

اے اہلِ نظر کون سنئے طعنہٴ نا نافت

دیکھا کہ وہ ملنا نہیں انے ہی کو کھو آئے

گویا غالب کے یہاں ایک اجماعِ ضمدین ہے ۔ وہ خودی کو چھوڑ نہیں سکے کیونکہ ان کا ذوقِ ہستی اس کی اجازت نہیں دیتا ۔ عالمِ آفاق میں ان کی خودی انے وجود کو سہارا نہیں سکتی ، لہذا وہ قوی پر ہستی یعنی خدا کا سہارا لیتی ہے ۔

### مرزا کے نزدیک زندگی کی خصوصیتیں

مرزا غالب نے زندگی پر گہری نظر ڈالی ہے اور انہوں نے اس کی سات خصوصیتیں

بتائی ہیں :

۱ ۔ ان کے نزدیک انسانی زندگی کی پہلی خصوصیت اس کا اختصار ہے ۔ کہتے ہیں :

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل

گر بنی بزم ہے اک رقصِ سر ہونے تک

زندگی کا یہ اختصار انہیں کسی طرح بھی پسند نہیں ۔ کہتے ہیں :

خون ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ

رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کالم بہت ہے

انہیں حسرت ہے کہ وہ اپنے عظیم ارادوں کی تکمیل نہیں کر سکیں گے اور دامنِ حیات ان سے جلد چھوٹ جائے گا۔

۲ - زندگی کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ تعمیر و تخریب کے دونوں عنصر ان کے اندر موجود ہیں۔ انہیں باہر سے کسی مدد کی ضرورت نہیں، چنانچہ کتنی نکتہ رس بات کہی ہے :

میری تعمیر میں مضمحل ہے اک صوبہ خرابی کی

۳ - زندگی کی تیسری خصوصیت ان کے نزدیک یہ ہے کہ وہ نمود و آرائس کا سامان خود کرنی ہے۔ فرمایا ہے :

غافل بوبہم خویش خود آرا ہے ورنہ یان بے ساندہ صبا نہیں طرہ گیاہ کا  
۴ - زندگی کی چوتھی اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ ہر شے کو اپنی زندگی سے محبت ہے اور اس کے انسار سے نفرت ہے، جینے کا ذوق ہر مشکل کو آسان کر دیتا ہے۔ یہی جینے کا ذوق مرزا سے کہلوانا ہے :

مٹا ہے فوبِ فرصتِ ہستی کا غم کہیں

عمرِ عزیز صرف عبادت ہی کون نہ ہو

۵ - زندگی کی ہاتھوں خصوصیت اس کی ارقا بذیری ہے۔ چنانچہ اس خصوصیت کو یوں بیان کیا ہے :

آرائسِ جال سے فارغ نہیں ہنوز

پسِ نظر ہے آئینہ دائمِ نفاق میں

گویا زندگی ارسا کی ہر اگلی منزل میں زیادہ نکھار کے ساتھ سامنے آنے کی سعی میں مصروف ہے۔

۶ - زندگی کی چھٹی خصوصیت سادی و غم کا ناہم مربوط ہونا ہے۔ انہیں الگ

الگ سمجھ لینا بالکل غلط ہے۔ چنانچہ مرزا کہتے ہیں :

سادی سے گزر کہ غم نہ ہوئے

آردی جو نہ ہو نو دے نہیں ہے

۷ - زندگی کی ساتویں خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک دوامی حرکت میں مبتلا ہے۔

کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ حرکت کس رخ چلے گی۔ کہیں یہ حرکت بھمے گی بھی یا جاری ہی

رہے گی۔ اس کی روح سے واقفیت کم ہی لوگوں کو ہے اور جنہیں واقفیت ہے وہ بھی اس کی جولانیوں کو سنبھال نہیں سکتے۔ اس خصوصیت کو غالب نے یوں پیش کیا ہے :

رو میں ہے رخنہ عمر کہاں دیکھیے تھمے

نے پانہ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

مختصر یہ کہ فکرِ غالب اپنی پرواز میں زندگی کے محیط پر سے گذری ہے اور اسے زندگی کی سات بنیادی خصوصیتیں نظر آئی ہیں جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے ۔

### فضیلتِ انسان

غالب نے اپنے ماحول میں انسان کو بہت بست اور ذلیل پانا بھا ۔ زندگی کے طوفان میں وہ اپنے آپ کو ایک لے بس تنکے کی مانند بہتے ہوئے دکھائی دیتے تھے ۔ اس ہستی کے احساس کے باوجود غالب کو انسان کی فطری شرافت و فضیلت سے کبھی انکار نہیں ہوا ۔ چنانچہ وہ انسانی ذلت کا منظر دیکھ کر بڑی شوخی سے فاطرِ ارض و سما سے بوچھتے ہیں :

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ بھی بسند  
گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں  
ذرا غالب کی آس مشہور عزل بر نظر ڈالیں ، جس کے بین شعریہ ہیں :

یا رب زمانہ مجھ کو مٹانا ہے کس لیے  
لوحِ جہاں نہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں  
رکھتے ہو تم قدم میری آنکھوں سے کیوں دریغ  
رنجے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں  
کرنے ہو مجھ کو منع دم بوس کس لیے  
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

گویا غالب کا انسان نہ تو لوحِ جہاں پر حرفِ مکرر کی حیث رکھتا ہے ۔ نہ رنجے میں مہر و ماہ سے کم در ہے اور نہ ہی نہ کہ آسمان کے برابر نہیں ۔ انسان خدا کا خلیفہ ہے ۔ اور اس کی عظمت ہر لحاظ سے مسلم ۔ اپنے اس خیال کی تائید میں غالب نے انسانی ہستی کی کئی خصوصیات بے نقاب کیں ۔ ایک جگہ کہتے ہیں :

نگہ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسد  
ہے چراغاں خس و خاساک گلستاں مجھ سے

یعنی انسان کی نگاہ گرم گلشن اور خس و خاساک تک کو گرم کر دیتی ہے ۔ غالب انسانی ہمت کے بڑے فائل ہیں ۔ ان کے نزدیک جذبہٴ تخلیق کی یداری کا نام ہمت ہے ۔ کس جوش سے کہہ اٹھتے ہیں :

ہمت اگر بال کشائی کند      صعوہ بواند کہ ہائی کند  
نیرِ توفیق اگر بر دمد      لالہ عجب نبست کز اخگر دمد

گویا ہمت کے بل بوتے پر غالب کا انسان قضا نک سے الجھ پڑتا ہے - فضا کا مقابلہ اسی کا حصہ ہے - کہتا ہے :

می ستیزم با قضا از دیر ناز      خویش را بر تیغِ عریاں می زخم  
لعب با سمشیر و خنجر می کنم      بوسہ بر ساطور و ہماں می زخم

غالب کے نزدیک انسان کے اندر بے پناہ ذوقِ ہستی موجود ہے - یہی ذوقِ ہستی اسے ہر مشکل کا مقابلہ کرنے پر آمادہ کرتی ہے ، کہا ہے :

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا  
حبابِ موجدہ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

گویا انسان اپنی منزل کی طرف بے دریغ بڑھتا چلا جا رہا ہے - حالانکہ اسے نسبہ و تقدیر دو عالم کی حقیقت معلوم ہے - اس کی ہمتِ عالی ہی اسے آگے بڑھنے پر مجبور کرتی ہے :

نسبہ و تقدیر دو عالم کی حقیقت معلوم  
لے لہا مجھ سے میری ہمتِ عالی نے مجھے

غالب کے نزدیک انسان کی ہستی ایک کائنات پر دوسرے ہستی ہے - وہ کائنات کی مانند اصول کی پابند ہے - لیکن اس کے اصول خود اس کی ذات سے ابھرتے ہیں - وہ اپنے لیے قانون خود بناتی ہے - اسے قانون توڑنے میں وہی مزا آتا ہے ، جو نئے قانون بنانے میں آتا ہے - وہ کارِ خلق میں خالی کائنات کا سربیک ہے - دیکھیے ساعر نے انسانی ہستی کو کس خوبی سے نس کیا ہے :

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال  
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

یہ انسان نیرنگ تمنا کا نمایشی ہے - وہ قسم قسم کی آرزو پالتا ہے - اس کے دل میں گونا گوں نصورات ابھرتے ہیں - وہ رنگ رنگ کے نقشے بناتا ہے - لیکن وہ کسی ایک مقام پر اکتفا نہیں کرنا - اگر آپ غالب کی اس مشہور غزل ، جس کا مطلع ہے :

بازچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے  
ہونا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے

پر اچھی طرح غور کریں تو یہ واضح ہو جائے گا کہ انسانی ہستی کے آگے مظاہرِ فطرت پیچ ہیں - ان کے مقدر میں تسخیر لکھی ہے اور اس کی تدبیر ہے کائنات کو مسخر کرنا !

## غالب کے انسان کو اپنی بشریت پر لازم

اگرچہ غالب کا انسان اپنے وجود کو نفسِ ناتمام سمجھتا ہے اور اس کے لیے نقشِ گرِ کائنات کا سکونہ سنج ہے ، پھر بھی اسے اپنے وجود سے پیار ہے اور وہ اپنی بشریت پر نازاں ہے ۔ اس میں اسی کی انفرادیت کا راز ہے ۔ چنانچہ غالب بڑے جذبے سے کہتے ہیں :

خوئے آدم دارم آدم زادہ ام آسکارا دم ز عصیاں می زَم

عصاں سے انہیں اس لیے لگاؤ ہے کہ وہ ان کی اپنی خلق ہے ۔ یہ غلط سہی مگر یہ ایسا نفس ہے جو ان کے اپنے ارادے سے ابھر آتا ۔ بشریت کی ہی لیے سازِ غالب کی سب سے زیادہ مربوط ہے اور اسی لیے ان کے کلام کو خلوص کا رنگ دے کر انسانیت کا آئینہ دار بنا دیتی ہے ۔ غرض یہ کہ انسانی ہستی پر مرزا نے یہ غور کیا ہے اور وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ نہ تو یہ محض حیوان ہے اور نہ محض فرسہ ۔ حیوان اور فرسہ کے امتزاج سے انسانی سبب وجود نذر ہوئی ہے ۔ فوجِ تخیلی انسانی سبب کا طرہ امتزاج ہے ۔ یہ چیز صرف انسان ہی کو عطا کی گئی ہے ۔ اس لیے بشر دونوں ، یعنی فرستہ اور حیوان سے بلند تر ہے ۔ اگر ہم غالب کے ان مردانِ کامل پر نظر ڈالیں جن کے بارے میں وہ کہتے ہیں :

دل نہ بندند نہ بیرنگ و دریں دیر دورنگ  
ہر چہ سنند بعنوان تماشا سنند  
ہر چہ در سونواں یافت بہر سو یابند  
ہر چہ در جانتوان دید بہر جا بنند

یہ صاف دکھائی دے گا کہ غالب کے نزدیک انسان واقعی خدا کا جانشین ہے اور یہ جہلی مثبت آواز ہے جو سرور و سخن کے ایوان میں سنائی دے رہی ہے ۔

## غالب کے نزدیک انسانی ہستی کا محور

اس عظیم مخلوق میں جو ایک طرح سے زندگی کی خالق بھی ہے ، ضرور کوئی ایسا جوہر ہے جو اس کی پوری شخصیت کے لیے محور کا کام دیتا ہے ، غالب کے نزدیک انسانی ہستی کا یہ جوہر اس کی خودی ہے ۔ اس جوہر کو براسنے کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ اسے پوری پوری جلا ملے ۔ براسنے کا یہ عمل اکثر سرد و گرم روزگار کے ذریعے ہوتا ہے ۔ اگرچہ انسان فطرت کی آغوش میں پیدا ہوا ہے اور وہیں اس نے زندگی گذارنی ہے لیکن اس کا جوہر فطرت کی مشیت کے کبھی طابع نہیں ہوسکتا ۔ انسانی ہستی کی اپنی مشیت ہے اور وہ ہمیشہ موجود سے ٹکراتی ہے اور عالمِ امکان کی طرف بڑھتی رہتی ہے ۔ جب کبھی انسان نے اپنی مشیت کو کسی دوسری مشیت کے تابع کر دیا ، تو اس کی

زندگی کا مقصد فوت ہو گیا۔ غالب نے گلستانِ فطرت کو بڑے غور سے دیکھا ہے اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس کے جلوؤں سے انسان کے ذوقِ تماشا کی پرورش ہوتی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں :

بخسے ہے جلوہٴ گل ذوقِ تماشا غالب  
چشم کو جاہے ہر رنگ میں وا ہو جانا

یہی نہیں بلکہ غالب کا انسان نو بخشے ہوئے دو جہانوں پر بھی رضامند نہیں، کہا ہے :

دونوں جہاں دے کے وہ سمجھے کہ خوش رہا  
یاں آ بڑی یہ سرم کہ بکرار کسا کریں

ویا انسانی خودی انی ہی مشیت کے بل بوئے ہر عالم۔ اسکان کو وجود میں لانے کی کونسی کرتی ہے، جو اس کے نزدیک بخشے ہوئے جہانوں سے کہیں بہتر ہے۔ وہ انہی سوا کسی اور کا سہارا قبول کرنے کو تیار نہیں اور تار تار کہتی ہے :

انی ہستی بسی سے ہو جو کچھ ہو  
آگہی گر نہیں غفل ہی سہی  
وہ جہاں تک خود نگر ہے کہ انفعال تک کو گوارا نہیں کرتی، چنانچہ مرزا کہتے ہیں :

بہ گاہِ رسوائی ہمت ہے انفعال  
حاصل نہ کیجئے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

خود سیردگی عبادت کا بنیادی اصول ہے۔ اس کے بغیر عبادت میں روح پیدا نہیں ہوسکتی، لیکن غالب کے انسان کو انی خودی سے اس قدر تیار ہے کہ وہ عبادت کے دوران بھی اس پر آج نہیں آنے دے۔ کہتے ہیں :

بندگی میں بھی آزادہ و خود بین ہیں کہ ہم  
الٹے بھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

خودی کا جوہر جہاں موجود ہے وہاں اسے انی ذات سے باہر جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ خود اپنے اندر سب کچھ موجود ہے نو دوسروں کی طرف کیوں نظر اٹھائیں۔ چنانچہ کہا ہے :

سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جو یا ہوں جواہر کے  
جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو

جگر کی تابش سے جو فیض حاصل ہو سکتا ہے وہ کسی معاون سے حاصل نہیں ہو سکتا۔



### جلوۂ حق کا صحیح مقام

خودی کا چراغ روشن کر لینے کے بعد انسانی ہستی میں انی سکت آ جاتی ہے کہ وہ جلوۂ حق کی بناس میں دکھی ہے اور جب جلوۂ داب اس کے سننے پر پڑنے کی بجائے کسی پہاڑ پر گرنا ہے نو انسان نکار اٹھتا ہے :

گرنی بھی ہم نہ برقیِ نجلی نہ طور پر دسے ہیں نادہ طرفِ ودحِ خوار دیکھ کر اس جلوئے کے لیے صحیح مقام کا ہونا ضروری تھا اور وہ مقام تھا ”دل“۔ انسان کو چھوڑ کر پہاڑوں کو آزمانا کہاں کی دانائی ہے ؟ خود سکن و خود نگر انسان انی خودی کے سہارے پر ماحول میں ایک نئی دنیا بسا لسا چاہتا ہے۔ وہ کوبر کے کنارے آگ روشن کر لیتا ہے۔ سعلہ کی طرح آگ میں رقص کرنا ہے اور طوفانوں میں درورس ہانا ہے اس کی زبان سے ساعر کہا ہے :

بہ خلد از سردیٰ ہنگامہ خواہم	بر افروزم نہ گرد کوبر آس
بسانِ موج می بالم بہ طوفان	درتک سعلہ سے رقصم در آس
خنک شوق کہ در دوزخ بغلطد	می آنس ، سسہ آس ، ساعر آس

مختصر یہ کہ مفکر غالب ابابِ خودی کے فائل ہی نہیں ، وہ نواسے زندگی کا جوہر سار کرتے ہیں۔

### غالب اور تصورِ عشق

مرزا جانتے ہیں کہ انسانی خودی کی مکمل ہی میں اس کی ابدی مسرت کا راز ہے۔ چنانچہ وہ اس مکمل کے لیے عس کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں عس کی راہنائی میں انسانی خودی انی منازل اچھی طرح طے کر سکتی ہے۔ لیکن غالب کا تصورِ عس عام مشرقی سعرا کے بصوراب سے بہت مختلف ہے۔ اس لیے مناسب ہے کہ مرزا کے تصورِ عشق کا جائزہ لیں۔

### اس تصور کی خصوصیات

۱۔ غالب عشق کی اہمیت کے اس قدر قائل ہیں کہ وہ اس کے بغیر انجمنِ ہستی کو بے رونی سمجھتے ہیں۔ کہا ہے :

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے  
انجمنِ بے شمع ہے گر برقِ خرمن میں نہیں

غالب کو اس بات کا بڑا قلق ہے کہ وہ عشق کی بزم آرائی نو عمر بھر کرتے رہے لیکن عشق کی راہ میں حقیقی قربانی ایک بھی نہ دے سکے اور وہ غالباً اس لیے کہ ان کے پاس عشق کے حضور میں پس کرنے کو کچھ بھی نہ تھا - کہتے ہیں :

ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے نرمنده

سوائے حسرتِ تعمیرِ گھر میں خاک نہیں

غرض فکر و نظر کا نہ ناساہ مملکتِ عشق کی حیثیت جانتے ہوئے بھی اس میں داخل نہیں ہو سکا -

۲ - غالب کے نزدیک عشق کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ہونا نہ ہونا آدمی کے س کی بات نہیں - ایک خاص ذہنی افتاد اور ایک خاص جذباتی کیفیت کی ضرورت ہے کہ آدمی عشق سے فیض پاسکے - اور نہ افتاد اور یہ کیفیت ہر ایک کو حاصل نہیں ہو سکتی - کیا خوب کہا ہے :

عسویٰ زور نہیں ہے یہ وہ آس غالب کہ لگائے نہ لگے اور بچھائے نہ بنے

۳ - عشق کی تیسری خصوصیت اس کی آفاق گہر وسعت ہے - عشق ایک ایسی قوت ہے جو وجدان کی پرورس کرنی ہے اور قلب و نظر کو بڑی جولانی عطا کر دیتی ہے - یہی ذرے کو صحرا اور قطرہ کو دریا کی وسعت بحسب دینی ہے - کہتے ہیں :

سو ہے سامان طرازِ نازِ اربابِ عجز درہ صحرا دسگاہ و قطرہ دریا آسنا

اربابِ عجز یعنی ملندہ رصف لوگ عشق ہی سے انہی قوت حاصل کرتے ہیں - ایسی قوت جو ذرہ کو صحرا اور قطرہ کو دریا بنا سکتی ہے -

۴ - عشق کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ جننے کا مزا عشق ہی سے ملتا ہے - یہ ایک ایسا درد ہے جس کا کوئی علاج نہیں - لیکن نہ خود ہر دوسرے درد کا علاج ہے - گویا جس طبیعت میں عشق رچ گیا ہو وہ زندگی کے ہر مقام سے فیض حاصل کر سکتی ہے - ہر گزار سے بھول جاتی ہے ، ہر راہ گزار سے کانٹے بٹاتی ہے اور ہر ظلمت میں اجالا کر دیتی ہے - چنانچہ کہتے ہیں :

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا

درد کی دوا ہائی دردِ لا دوا پایا

۵ - عشق کی پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسان کو ہر بندھن سے آزاد کر دیتا ہے ، جو اسے زندگی کی عام سطح سے اٹھنے نہیں دیتی - انسانی شخصیت کو ایک مرکز حاصل ہو جاتا ہے - اور وہ ہے ”محبوب کی ذات“ - حسن و رنگینی کے اس مرکز سے اسے

اس قدر حاصل ہونا ہے کہ اسے دوسری طرف دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی ۔ غالب کا ارشاد ہے :

سطوب سے درے جلوۂ حسنِ غبور کی      خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادا سے گل

یعنی حسنِ محبوب نے انہیں ایسی بلندیٰ نظر عطا کر دی ہے کہ وہ عام رنگینوں میں نہیں الجھتے اور زندگی کی اصل تک بروار کی کوسس کر رہے ہیں ۔

۶ ۔ عشق کی چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ کچھ بھی ہو عشق ادا اور کسے بغیر رہ نہیں سکتا ۔ یہ انک ایسی آگ ہے جو اپنے ماحول کو ضرور کرم کر دیتی ہے ۔ یہ ایک ایسا سعلہ ہے جو اپنی سس سے سسِ خام کو کندن بنا دیتا ہے ۔ اس لیے نہ کہنا کہ یہ بے اثر چیز ہے غلط ہے ۔ غالب کا یہ دعویٰ ہے :

کہا ہے کون نالہٗ بلبل کو لے ار  
پردے میں گل کے لاکھ جگر حاک ہو گئے

۷ ۔ پھر آخر میں مرزا اس باب کا اقرار کرتے ہیں کہ عشق کے بغیر زندگی گزارنا عیب ہے ۔ بلکہ عشق سے خالی ہو کر زندگی ایک مسلسل عذاب بن جاتی ہے اور انسان کی حشمت ایک ادنیٰ نکتے کی سی ہوتی ہے جسے ہوا کا ہر سز جھونکا اڑائے بھرنا ہے ۔ مگر شاعر کو اس باب کا افسوس ہے کہ وہ اس مبدان میں اترنے کے قابل ہی نہیں ۔ وہ لذتِ آزار کی طاقت بھی نہیں رکھتے ۔ چنانچہ کہا ہے :

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور ہاں  
طاف بہ قدرِ لذتِ آزار ہی نہیں

### غالب کی وسیع المشرب

عام طور پر ہمارے شعراء کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے لیے خیال کی دنیا آباد کرتے ہیں اور حقیقت کی دنیا سے دور رہتے ہیں ۔ وہ اپنے ماحول کی خرابیوں کو دیکھتے ہوئے بھی ان سے چشم پوشی کر لیتے ہیں اور زندگی سے گریز کو اپنا مسلک بنالیتے ہیں ۔ یہ الزام بالکل غلط ہے ۔ شاعر کا حساس دل ہر کانٹے کی چبھن محسوس کرتا ہے ، اور ہر گل سے پیار کرتا ہے ۔ غالب زندہ احساس کے مالک شاعر نہیں ، اور ایک شعوری فنکار بھی ، چنانچہ انہوں نے اپنے زمانے کی جماعتی قدروں کا اندازہ بھی کیا ہے ۔ اور ایسی جماعتی قدریں بھی پیش کی ہیں جو انسانی سوسائٹی کو بلند مقام تک پہنچا سکتی ہیں ۔ غالب کے ہاں سب سے زیادہ جماعتی قدر وسعتِ مشرب ہے ۔ ان کے

نزدیک مذہب کی یہی وسع ہے۔ مذہب چار باتوں کی تعلیم دینا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

دل الفت نسب و سینہ بوحید فضا

نگاہ جلوہ برس و نفس صدق گزین

محبت کرنے والا دل ، بوحید سے معمور سینہ ، جلوۂ ذاب کی طالب نگاہ اور سچائی سے اسنا زبان ۔ ان چار باتوں کا یکجا ہونا اس بات کا ضامن ہے کہ انسان قلب و نظر دونوں کے اعتبار سے واقعی وسیع المسرب ہے ۔ آگے جل کر انک جگہ وہ انی وسع المستربی کا یوں اظہار کرتے ہیں :

کعبہ میں جا رہا ہوں نہ دو طعنہ کہا کہیں

بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنست کو

اور پھر اس جذبہ کا اقرار کرتے ہیں :

گو واں نہیں نہ واں سے نکالے ہوئے ہو ہیں

کعبہ سے ان بیوں کو بھی نسب ہے دور کی

اور پھر ان کی وسع المستربی کی نان بہاں آکر ٹوٹی ہے :

وفاداری شرطِ استواری اصلِ ایمان ہے

مرے بت خانہ میں بوکعبہ میں گاڑو برہمن کو

صحابِ اہلِ کنست کو نہ بھولنا ، کعبہ سے بیوں کی نسب قائم کرنا ، وفادار برہمن کو کعبہ میں گاڑنا ، ایک ایسے وسع المسرب انسان کا فعل ہوسکتا ہے جو حقیقت کو ہر گوشہ میں جلوہ پیرا دیکھتا ہے ۔

**ترکِ تقلید**

فکرِ غالب میں دوسری نمایاں جاغتی قدر ترکِ تقلید ہے ۔ انہیں اس بات کا گلہ ہے کہ آدمِ عام رسومات میں گھرا ہوا ہے ۔ نہ لے ہودہ رسومات اس کی شخصیت پر بوجھ ہیں ۔ چنانچہ وہ اہلِ خرد کو للکارتے ہیں :

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں ؟

اور پھر نہایت زور سے ترکِ رسوم کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں :

فرسودہ رسم ہائے عزیزاں فرو گزار

در سورنوحہ خواں و بہ بزمِ عزا برقص

گویا غالب کی آزادہ روی کسی حال میں بھی تقلید کی حامل نہ ہو سکی۔ اس سلسلے میں انکا عام اصول یہ ہے :

لازم نہیں کہ خضر کی ہم ندروی کریں      مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

### غالب اور تقسیمِ دولت

جامعی زندگی، میں دولت کے صحیح مفہوم کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جہاں کہیں بھی دولت کا صحیح مفہوم نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے سوسائٹی میں انسان رونما ہو جاتا ہے۔ غالب زر کو برا نہیں کہے، مگر ہوس زر کو وہ ایک جماعتی برائی قرار دیے ہوئے لکھے ہیں :

بسکہ ہر مال و جاہ مغروری      نسیم خوس ازس اداٹے نو من  
چہ کنی این فسادِ سم و زرسف      واٹے من گر نوم بجائے نو من  
ہو ہرگز نداد مے زر و سم      خواجہ گر بود مے خدائے نو من

گویا دولت کی نسیم اگر غالب کے ہاتھ میں ہو تو وہ خواجہ کو اس قدر ڈھروں دولت نہ دے کیونکہ اس غلط نسیمِ دولت سے، دولت موجبِ فساد بن جاتی ہے۔ غالب کا عقیدہ ہے کہ اگر ہوس زر انسان کو گمراہ نہ کرے تو کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ اسکی زندگی اطمینان سے نہ گزرے۔ حناچہ بڑے حسنِ انداز میں کہا ہے :

غارب گر ناموس نہ ہو گر ہوس زر

کون ساہدِ گل باغ سے بازار میں آوے

یہی ہوس زر ہماری اکثر جماعتی حراموں کا موجب ہے۔ اس لیے اس سے احتراز کرنا لازمی ہے۔ غالب کے ہاں ایک سہری جماعتی قدر ہوں ناناں ہوتی ہے، وہ چیرہ دستوں کے غاصب ہاتھوں میں دولت جمع ہوجانے کے خلاف ہیں۔ اسے لوگوں کا کوئی حق نہیں کہ وہ دولت سدا کرنے والے مسائل پر قابو نالیں اور مخلوقِ خدا کو عذاب میں ڈال دیں۔ چنانچہ وہ مخلوق کو قوب کا احساس دلانے ہوئے یوں کہتے ہیں :

نہ جنگ باج سنانِ ساخساری را

مہی سبد زرِ درِ گلستان بگردانیم

نہ صلح بال فنانانِ صبحِ گاہی را

زرِ ساخسار سوئے آشیان بگردانیم

زحیدِ ریم من و نو زرِ ما عجب نبود

گر آفتاب سوئے خاوران بگردانیم

زور بازو سے دوسروں کے مال و متاع پر قبضہ کرنے والوں کے خلاف کس حسین انداز میں جنگ کا درس دیا گیا ہے۔ یعنی ”درِ گلستان“ سے ان ظالموں کو نامراد لوٹانا انکا مطمحہ نظر ہے۔

### ملت سے وابستگی

ملت کے افراد میں رابطہ اور یگانگت مرزا کا خاص موضوع ہے وہ اس امر کے فائل ہیں کہ چیز وہی بھلی ہے جو اپنے ٹھکڑے پر ہو۔ آدمی وہ بہتر ہے جو ساج میں اپنا مقام پہچان لے اور پھر اس جگہ پر قائم رہے۔ کہتے ہیں :

آبرو کا خاک اس گل کی جو گلشن میں نہیں ہے گریباں نگہ براہن جو دامن میں نہیں  
یعنی فرد کی آبرو اسی میں ہے کہ وہ دامنِ ملت سے وابستہ رہے۔ پھر اس خیال کو اور زیادہ قوت کے ساتھ پیش کیا ہے :

ہم موحّد ہیں ہمارا کبش ہے ترکِ رسوم ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں  
گویا ملت سے وابستگی ابتدائی منزل ہے اور ملموں کا ایک امب کی شکل میں ابھرنا دوسری منزل ہے۔ ملت کے افراد میں عمل کی یک رنگی ہونی چاہیئے اور یہی موحّد کا تقاضا ہے۔ اپنی اسواری کے بعد ملتیں سپہم مربوط ہو کر ایک بلند مقصدِ حیات اپنے سامنے رکھ لیں تو وہ ایک امت کی صورت میں موحّد عمل اور موحّد مقاصد حاصل کر لیتی ہیں۔

جیسا کہ ایک مقام پر ہم پہلے بھی کہہ آئے ہیں ”خذ ما صفادع ما کدر“ کو مرزا ایک نہایت صحت مند روس قرار دیتے ہیں۔ اسی جذبے کے تحت ان کی نظم ”آئینِ مغرب“ لکھی گئی ہے۔ اگر اس نظم کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ غالب نئے حاکموں کے بنائے ہوئے آئین کو اس لیے پسند کرتے تھے کہ اس میں ”داد و دانش“ کی خصوصیات یکجا ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ساعر کا کلام اس لیے نہیں ہوتا کہ وہ کسی ایک موضوع پر مبسوط رائے زنی کرے۔ خاص طور سے سیاسی اور جماعتی موضوع کے بارے میں تو وہ اکثر بلیغ اشاروں سے کام لےا ہے۔ مگر یہ کہنا بھی غلط نہیں کہ جماعتی زندگی کے عوامل پر مرزا غالب گہری نظر رکھتے ہیں اور ان میں سے بعض کو بڑی بصیرت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

### غالب اور فن

غالب کے فکر پر ایک سیر حاصل تبصرہ کی ضرورت تھی۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ اپنی طرف سے اس کے مختلف پہلوؤں پر سے نقاب اٹھائیں، مگر اس سے زیادہ

بحث مہاں ممکن نہیں ، چنانچہ اب ہم غالب کے فن کے بارے میں کچھ تحریر کریں گے ، مگر فن کے رومانی ، یا کلاسیکی یا خالص اظہار کے ادبی پہلوؤں سے بھی یہاں بحث نہیں ہو سکے گی ۔ سب سے پہلے ہم غالب کے ذوق سے متعلق دو شعر پیش کرتے ہیں ، جن میں غالب نے اپنی شعر گوئی کا مقصد بیان کیا ہے ۔ کہتے ہیں :

مجھے انتعاشِ غم نے پے عرضِ حال بخشی  
ہوسِ غزلِ سرائی پیشِ فسانہ خوانی  
یہی نار نار جی میں مرے آئے ہے کہ غالب  
کروں خوانِ گفگو ہر دل و جاں کی سہانی

غالب کے لیے ہوسِ غزلِ سرائی اور نسِ فسانہ خوانی انتعاشِ غم کا نسخہ ہیں ۔ وہ انہی واردات کو بیان کر کے دوسروں کو اسے مجربات میں شامل کرنا چاہتے ہیں ۔ انکا خیال ہے کہ اس بیان سے دل و جاں دونوں فضا ناب ہوسکیں گے ۔ ظاہر ہے کہ خوانِ گفگو ہر سہانی دل و جاں کی ہو رہی ہے ۔ دل ان تمام جذبات و محسوسات کا مرکز ہے جن سے انسانی زندگی حرارت حاصل کرتی ہے اور جاں مرکز ہے انسان کی پوری شخصیت کی ۔ گونا گونا گویا اپنے بیان سے دل کی پرورس اس لیے کرنا چاہتا ہے کہ انسان کے قلب و نظر میں وسعت آئے اور وہ زندگی کو ایک مربوط شکل میں دیکھنے کی اہلیت حاصل کرے ۔ اور وہ جاں کی پرورس اس لیے کرتے ہیں کہ انسانی روح جو دراصل انسان کی جاں ہے ، انہی پرواز میں آفاقی صفت قائم رکھے ۔ چنانچہ اس نظریہ کے حامل ہو کر وہ ہکا بکا کر کہہ رہے ہیں :

دیدہ و ر آن کہ دل نہد چوں بہ نہارِ دلبری  
ہر دلِ خاک بنگرد رقصِ سانِ آذری

یعنی دیدہ و ر فکار حسن کو خاک کی دسڑھوں میں بھی دیکھ جاتا ہے ۔ وہ اسکی حرکت اور عمل کو اپنے سننے والوں تک پہنچا دیتا ہے نہ فنکار گونگے بھولوں کو زبان اور اندھی نرگس کو آنکھ بخش دیتا ہے ۔ نہ فن کی معراج ہے ۔ جہاں پہنچ کر انسان احسن الخالص کا سرویک کار بن جاتا ہے ۔ ایسے ہی فنکار کے نازے میں مرزا کہتے ہیں :

گل را نوا ، نرگست را ناسا  
تو داری بہارے ، کہ عالم ندارد

اور یہ سب غالب کے نزدیک جب ہی ممکن ہے جب کہ فکار اپنی ذات کی گہرائیوں سے نئے جہان کے نقشے ابھارے اور اپنے خلوص کے بل بوتے پر اپنے جگر کے خون سے ان نقشوں

میں رنگ بھرے۔ غالب کے نزدیک خلوص فن کی جان ہے، خلوص کے بغیر کوئی فن پیدا نہیں ہو سکتا۔ کہا ہے :

چہ خرد سخنے کز درونِ جاں نہ بود  
بریدہ باد زمانے کہ حونحکاں نہ بود

اسی بُر خلوص فکر کا جذبہ سوو اپنا مؤثر ہونا ہے کہ وہ بے جان چیزوں میں جان ڈال دیا ہے۔ اس جذبہ سوو کا ذکر درے ہوئے مرزا کہے ہیں :

جذب سووس ہی نہ در ہدم بر گسین ر دید  
در فضائے خووسن ب را ہرفار آورد

یہاں تک ہم نے جو کچھ لکھا، غالب کے نظریہ شعر کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ انہوں نے اپنے ’کلام فارسی‘ کے دباخانے میں صاف لکھ دیا ہے :

”نہ آندہ نائے حادثہ صنائع و نہ گوہر آمائے رسدہ بدائع۔ نبات گرمی آتش لے دود۔ با رسم و حراہ بلخی نادر و برور معی“۔

یعنی کہ، ساعر صنائع بدائع کا ملا سی ہیں، وہ سخن نارس کی گرم بوائی کا سدا ہے اور حقیقت کو لے نقاب دیکھنے کا معنی !

بے شک قدرت کے مبدأ فباص سے غالب کو بہت کچھ ملا تھا۔ ان عطیوں کو کام میں لانے کے لیے جس محنت و تدبیر کی ضرورت تھی وہ غالب نے پوری طرح سے کی۔ غالب نے فارسی شعراء میں سے حرر، عری، بطری، ظہوری اور صائب کا بڑی اچھی طرح مطالعہ کیا تھا۔ ایک عرصہ تک غالب کے ہاں ان کا کلام نمونہ بنا رہا۔ کہے ہیں :

ذوہ فکر غالب را بردہ را احسن سروں

یا ظہوری و صائب معوی ہمرایہا ہست

یعنی ذوہ فکر ہی غالب کو اپنی ہمدی برادری کے شعراء سے باہر لے گیا۔ ذوقِ فکر کے الفاظ غور طلب ہیں اسی طرح انک اور مقام پر کہا ہے ۔

رو نبوہ نظری و طرز حزین ساس

پھر مرزا بسند کس کو کرتے ہیں؟ ۔ وہ مبر کو، مومن کو، سودا کو بسند کرتے ہیں، لیکن ذوہ اور اس قبیل کے دوسرے شعراء کو بسند نہیں کرتے۔ کیونکہ ان کے ہاں فن کا وہ معیار نہیں ملا جسکے وہ طالب ہیں۔ اسکے علاوہ غالب نے ہم عصروں کے بارے میں جہاں بھی اظہارِ خیال کیا ہے وہ قابلِ غور ہے۔ ایک کے قصیدہ کے بارے میں لکھتے ہیں :



”زبان باکبزہ ، مضامین اچھونے ، معانی نازک ، مطالب کا بیان دلنشین“

یہ بات خاص طور پر قابلِ غور ہے کہ شاعر نے ”دل نشین“ کہا ہے۔ ذہن نشین نہیں کہا۔ غالب نے فنِ شعر کی تکمیل کے لیے دل و دماغ دونوں کی صلاحیتوں کو ضروری سمجھا ہے۔ اس حقیقت کو کس انوکھے انداز میں بیان کیا ہے :

شعر کی فکر کو اسد چاہیے ہے دل و دماغ

حذر کہ نہ سرزد دل لے دل و لے دماغ ہے

یعنی شعر کی تخلیق میں دل و دماغ کا برابر کا حصہ ہے۔ ایک صالح حدیث فراہم کرنا ہے ، اور دوسرا بلند فکر۔ جس میں سے ایک میں لمبی واقع ہو جائے تو شعر اپنی بلندی تک نہیں پہنچ سکا۔ غالب کے نزدیک جسمی آرٹ تفریح اور بڑبڑ کی دوا سے وجود نڈیر ہوتا ہے۔ وہ خونِ جگر بر ملتا ہے ، آہوں کی بوا میں سانس لیا ہے اور آنسوؤں کے آئینہ میں رخِ حجاب دیکھا ہے۔ خناخہ اس نکتہ کی وضاحت میں غالب کہتا ہے :

ہنرم را نواں کرد نہ خسن صنائع

خسنگی عازۂ روئے ہنر آمد گوئی

عمِ دل داسم انک غمِ جانم دارند

زخم را زخمِ دگر بر ابر آمد گوئی

صاف یہ حکم ہے کہ غالب فن کی پرورش کے لیے ناسازگار ماحول کو ضروری سمجھے ہیں۔ وہ زخمِ دل سے زخمِ جان کی منزل تک کچھ اس طرح پہنچتے ہیں کہ زخمِ بر زخم کھائے ہیں اور رخِ حجاب کو سنوارا ہے۔

### فنِ شعر میں غالب کے کمالات

اس کے بعد اس بات کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ مرزا نے اپنے نظریہٴ شعر کو عملی جامہ کہاں تک پہنایا ہے۔ فنِ شعر کے میدان میں اس کی کون سی فتوحات ہیں اور وہ اردو شاعری کو کیا کچھ دے گئے۔

مرزا بیدل غالب کے سب سے زیادہ محبوب شاعر ہیں۔ چنانچہ غالب نے ان کے رنگ میں شعر کہنا شروع کیا اور ایک عرصہ تک انہیں کی ہیروی کی مگر وہ اس طرز سے کچھ دیر بعد پیمار ہو گئے۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں :

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا اسد اللہ خاں قیامت ہے

لوگوں نے خدا جانے غالب کے اعتراض سے کہا نیچہ نکالا ہوگا۔ شاید وہ یہ سمجھے ہوں کہ وہ اس درجہ کے فنکار نہیں تھے جس درجہ کے ہمدل تھے۔ لیکن یہ حقیقت نہیں۔ جب وہ ہمدل کے رنگ میں طبع آزمائی کرتے ہیں اور کہتے ہیں :

ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجام گل

نک حہاں زانو نامتل در قضائے خندہ ہے

یہ توصیف نہ چلتا ہے کہ شاعر فکر کی دنیا میں اپنا مقام تلاش کر رہا ہے۔ اسکا اسلوب ابھی تک اس کے فکر سے ہم آہنگ نہیں ہو سکا اور نہ ہی تخیل نے فکر کو وہ رنگینی محسوس ہے جو اس کے اظہار کو دلہن بنا سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب کی شخصیت مرزا ہمدل کی شخصیت سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ غالب فکر و نظر سے تمام گہیاں سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں اور ہمدل اپنے جذبہ کی حرارت سے حسنِ اظہار کی لذت ہدا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود پوری کوشش کے غالب رنگِ ہمدل کو اپنا نہیں سکے۔ لیکن اس سے نہ نہ ضرور چلتا ہے کہ غالب اظہار کی بلندیوں سے دورِ اول ہی سے واقف تھے۔ ہر حال ان کے فن کا یہ امدائی دور ایک پیرے کی نظر ہو گیا اور آج اہل ذوق ہمدل کے سجع میں لکھے ہوئے اشعار سے مطمئن نہیں ہیں۔ حالانکہ ان اشعار میں مرزا غالب اسے فکر و نظر کے نہ مٹنے والے آثار چھوڑ گئے ہیں۔

### فکر اور جذبے کا ربط

غالب کی شاعری کا دوسرا اور زیادہ مؤثر دور اس وقت شروع ہوا جب غالب نے فکر اور حدے کی آج کو اسے فن میں مربوط کر لیا۔ یہاں ہنر کر انہیں ایک رومانی انداز نصیب ہوا۔ ذرا اس دور کے اشعار ملاحظہ کیجئے :

وہ نادرہ سانس کی سرمسماں کہاں

اٹھیں اس اب کہ لذتِ حواہِ سحر گئی

نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا

مستی سے ہر نگاہ دہرے رخ پر بکھر گئی

فرداودی کا فرقہ تک بار مٹ گیا

کل تم گئے کہ ہم نہ فیماں گزر گئی

ان اشعار کی مضمون بندی اور جدتِ اظہار کا فائل ہونا بڑا ہے۔ بھر ایک اور مقام پر غالب نے اپنے جذبات کی کس انوکھے انداز میں نرجانی کی ہے :

مر جاؤں نہ کیوں رشک سے جب وہ ننِ نازک

آغوشِ خمِ حلقہ زَنار میں آوے

سب خاک گرباں کا سرہ ہے دلِ نالان  
جب اک نفس الحھا ہوا ہر بار میں آوے

یہ دور ۱۸۲۱ء سے ۱۸۳۴ء تک کا دور قرار دیا گیا ہے۔ اس دور میں شاعر کا اظہار زیادہ ہرجوس ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر انہی انہی ہمد کی معراج تک نہیں پہنچ سکا۔ اس نے فکر کو حدے کی گرمی سے آسا کر دیا ہے۔ لیکن ابھی اس حرارت کا متوازن مصرف معلوم نہیں ہوا۔ میں سے ہمیں نہ حل جانا ہے کہ فنِ غالب کے بین ترکیبی عنصر ہیں۔ زورِ سان، حدبِ فکر، سوختی اظہار۔ حدبِ فکر وہ محور ہے جس پر ان کے سارے فنی عمل کا انحصار ہے۔ نہ سوں عنصر اس دوسرے دور میں نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ اس دور کا غالب ایک رومانی شاعر ہے۔ وہ ہر حرارت کو انہی داب کے نہانے سے ناپتا ہے۔ اسکا اظہار سوج اور ریگن ہے۔

### رمزی اظہار

۱۸۳۴ء سے ۱۸۴۷ء کے درمیان ان کا فن ایک قدم اور آگے بڑھا اور انہوں نے رمزیت کی حدود میں راہ نالی۔ اور جوں جوں وہ گزرتا گیا ان کے ہاں رمزیت پختہ تر ہوتی گئی۔ اس رمزیت کا اتنا نا بھا نہ جوس سرد بڑے کی بجائے باہر سے اندر کی جانب بڑھے لکا اور اس نے سمندر کے اس اندرونی بلاطم کا درجہ حاصل کر لیا، جس کے آگے سطحی لہروں کا سور و عوعا ہج ہوتا ہے اور جو فنکار کو رفعتِ کامل کے بلند مقام سے آٹھ کر دیا ہے۔ حناحہ ہاں صبح کر شاعر نے اسے لیے رمزی تکنیک بیاں کرنا شروع کر دی ہے۔ یہ دامِ سندن، موجِ نگاہ، نفسِ خس، محشرِ خیال، جنتِ نگاہ، فردوسِ گوس، فلمِ صرصر، حوٹارِ بغمہ، سرارہٗ مرآں، آئندہٗ بادِ بہاری، خارِ رسوم و عمرہ ایسی تراکب اسی رمزی اظہار کی وجہ سے ایجاد کی گئیں۔ اسی رمزی تکنیک کے سہارے میں قسم کی واقعیت سامنے لائی گئی۔ احساس کی واقعیت، نفسیاتی واقعیت اور روحانی واقعیت۔ دراز ذیل کے اشعار میں نہ بن قسم کی واقعیت ملاحظہ ہو:

ادب ہے اور بھی کسکس تو کیا کچے  
حیا ہے اور بھی گو مگو تو کیوں کر ہو  
جسے نصب ہو روزِ سیاہ مبرا سا  
وہ شخص دن نہ کہے رات کو نو کون کر ہو  
غلط نہ تھا ہمیں خط پر گان تسلی کا  
نہ مانے دیدہ دیدار جو تو کیوں کر ہو

اور خاص نفسیاتی و امعیب کا نوں اظہار ہونا ہے ۔

ساقی گری کی شرم کرو آج ورہ ہم  
 پر سب بیا ہی لڑے ہیں مے جس قدر ملے  
 تجھ سے نو کجھ کلام نہیں لیکن اے بدم  
 مرا سلام کہو اگر نامہ تر ملے  
 ہم کو بھی ہم دلہائیں کہ مجھوں نے لیا کیا  
 فرصت کشاکش غمِ سہاں سے گر ملے

بیدل نے جو کام صوبی ارباب سے لیا تھا غالب نے وہی کام انہی سوختی اظہار سے لیا ہے ۔

### غالب اور سوختی اظہار

غالب کی سوختی اظہار کو جو مقام حاصل ہے اس کی مثال اردو ادب میں نہیں ملتی ۔ ساعر کننی بڑی تلخ حتموں کو انہی سوخ سانی سے گوارا بنا ہے ۔ وہ نظار ہنسنا ہے ، واعاب کی روس پر طنز کرنا ہے ، سہ خڑانا ہے ، طیش میں آ جانا ہے ، لیکن اس کے سننے میں ایک کرب ہے ، ایک دردِ سہاں ہے ، ایک ریخِ نارسائی ہے ، حنا ہے کہا ہے :

گرفی بھی ہم نہ بری بختی نہ طور تر  
 دیے ہیں بادہ ظرفِ فدح خوار دیکھ کر  
 ☆ ☆ ☆  
 کسوں نہ ہو حشمِ بان محوِ بغافل کسوں نہ ہو  
 معنی اس بہار کو نظارے سے برہیز ہے

اور پھر :

قطع کیجیے نہ بعلق ہم سے  
 کچھ نہیں ہے نو عداوت ہی سہی  
 اب دو اشعار فارسی کے ملاحظہ ہوں :

ے گناہ ہم برِ دیر از من صریح  
 من بہ مستی بسسہ ام احرام را !

☆ ☆ ☆  
 روانِ فدائے نو نام کہ بردہ ای ناصح  
 زہے لطافتِ ذوقے کہ در بیانِ نو نیست

غرض یہ کہ مرزا غالب کی سوختی اظہار کا نہ عالم ہے کہ یاس و حرماں کے بوجھ تلے دب جانے والے جذبات بھی زندہ و متحرک رہتے ہیں۔ اس میں سک نہیں کہ مرزا غالب کے نغمے میں ایک انبساطی نے ہائی جاتی ہے اور وہ منجہ ہے ان کی بشریت سے بخت کا، اگرچہ نہ ان کے ساز کی نسادی لے پرگر نہیں۔

### شعر میں حسرت آئیز بے باکی

مرزا غالب کی زندگی میں ایک دور اسکا بھی آنا ہے جب ان کی طبیعت میں پیہم صدمات لے رہے کہ عصر بیر کر دیا تھا۔ اسی حالت میں طبیعت ہٹ سرخ قبول بن جاتی ہے اور آدمی ان تمام ارباب کو اسے ناطن میں جگہ دینا چلا جاتا ہے۔ اسے عالم میں دو کفیس پیدا ہو جاتی ہیں ایک تو یہ کہ آدمی اکثر حاسوس رہے لگتا ہے۔ جب کبھی بولتا ہے تو نہایت سادہ اور پر معنی زبان بولتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں لے ناری اور فلندراہ احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ حاتمہ اس دور میں مرزا غالب کی بھی یہی حالت ہو گئی تھی۔ ذرا یہ اسعار ملاحظہ ہوں، ان میں جس قدر حسرت آئیز بے باکی نائی جاتی ہے :

کوئی آمد نہ نہیں آئی	کوئی صورت نظر نہیں آئی
موت کا ایک دم معنی ہے	نشد کسوں رات بھر نہیں آئی
ہے لحد اسی ہی باب حو ح ہوں	ورہ کما ناب کر نہیں آئی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم لو بھی	کچھ ہماری خبر نہیں آئی

اور بھر وہ دو غریب بڑھے جس کے مطلعے ہیں :

دلِ ناداں مجھے ہوا لسا ہے آخر اس درد کی دوا کما ہے

☆ ☆ ☆

نوئی دم کر رندہی اور ہے انے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

اس طرح طرزِ دلام کو نعتادوں کی اصطلاح میں ”سہل منہج“ کہا گیا ہے۔ اور سح بوجھے ہو نہ اظہار کی معراج ہے۔

### غالب کے ہاں غزل کی معراج

مرزا غالب جیسا کہ ہم پہلے کہہ آئے ہیں ایک سعوری فنکار ہیں۔ جنہیں اپنی ذات پر پورا پورا اعتماد ہے انہوں نے اپنے فکر و نظر کی حولانی کا بھی اندازہ لگایا ہے اور اردو زبان میں اظہار کی مختلف اصناف کا بھی۔ ان کے دور میں غزل کا

چرچا نہا اور غزل ہی محبوب ترین صنفِ کلام بھی - مرزا غالب کو اس صنف سے یہ کہہ ہے :

بمدرِ ذوق نہیں ظریفِ ننگِ نائے غزل  
کچھ اور جاہے وسعِ مرے ناں کے لیے

گویا شاعر کو یہ یقین ہے کہ اس کے مضامین بہت وسیع ہیں، اس کی نظر بہت عمیق ہے، اس کے تخیل کی پرواز عرس تک پہنچتی ہے۔ غالباً انہیں نہ احساس نہا کہ ان کے فکر کے برو بال اس ننگِ فضا میں مجروح ہو رہے ہیں اور وہ انی پوری ناب نہیں کہہ سکتے۔ بھر بھی بلا خوفِ تردد کہا جاسکتا ہے کہ مرزا غالب نے اپنی شخصیت کی سہر صنفِ غزل پر اس خوبصورتی سے لگا دی ہے کہ وہ ہمیشہ ناباں اور درخشاں رہے گی۔

غالب کی عزل کئی لحاظ سے صنفِ غزل کی معراج ہے۔ اس لیے ہیں کہ غالب نے فکرِ اسماں کی عظمتوں کو چھوا ہے بلکہ اس لیے کہ غالب نے سوں سطحوں (جسمانی، ذہنی اور روحانی) پر کھڑے ہو کر رخِ حجاب کی نقاب کشائی کی ہے۔ وہ جسمانی سطح سے متعلق جو کچھ کہہ گئے ہیں وہ انہیں کا حصہ ہے۔ کس جذبہ سے کہا ہے :

نہند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راس اس کی ہیں  
حس کے سانے پر بری زلفیں پرشیاں ہو گئیں

پھر ذہنی سطح پر جو کچھ انہوں نے دکھا ہے وہ نواک جہانِ فکر سے کم نہیں۔ وہ زندگی کے کسی اہم مرحلے پر رکتے ہیں اور اس کی گہری کشفوں سے اپنے فرائین کو آشنا کرتے ہیں اور جب وہ رومانی سطح پر پہنچتے ہیں تو انہوں نے اپنے اظہار کی لپیٹ میں ان ازلی اور ابدی صداموں کو لے لیا ہے، جو انسان کے تخیل کی پرواز کی آخری حدود میں بھی مشکل سے ملی ہیں اور اسی لیے خود کہا ہے :

یہ مسائلِ بصوفِ یہ ترا بیانِ غالب  
تجھے ہم ولی سمجھے جو نہ مادہ خوار ہونا

غرض یہ کہ انہوں نے اپنی شاعری میں حافظ کے جال اور رومی کے جلال دونوں یکجا کر دیے ہیں۔ اس عظیم کامیابی کا راز یہ ہے کہ غالب نے بو تخیل کی سہل کاریوں میں کھوئے ہیں اور نہ ان پر مرتبے ہیں۔ ان کے ہاں خرد اور تخیل کا ابسا موزوں امتزاج ہے کہ اس سے بڑھ کر کہیں نظر نہیں آتا اور یہی دراصل ان کے فن کی سب سے بڑی اساس ہے۔

## نثر نگاری - خطوط

مرزا غالب نے حسا کہ اس زمانے کا رواج نہا۔ فارسی ہی میں تحریر کا سلسلہ شروع کیا۔ مرزا کے 'کلیات نثر' میں جس میں ان کی فارسی تحریریں یکجا کر دی گئیں ہیں، کئی لحاظ سے بڑے معرکہ کی چیز ہے۔ لکن یہاں غالب فند ناری کے مزے لے کے ناوحد کوئی منفرد حشہ نہیں رکھے۔ ان کی فارسی نثر میں سوکتِ الفاظ بھی ہے، اور بوبِ بیان بھی۔ انہیں انہیں طرزِ اظہار میں سوخی کی جھلک بھی ہے اور ایک آدھ جگہ ان کی سادہ نویسی کے کمال کا نمونہ بھی ملتا ہے۔ مگر عام طور پر وہ برائی ڈگر پر جلسے دکھائی دیتے ہیں اور اسی ندرتِ بیان سے کچھ زیادہ کام نہیں لیتے۔ انہیں فارسی نثر نویسی پر جو قدرت بھی وہ دربار میں پسند کی گئی اور اسی وجہ سے انہیں آلِ سمور کی تاریخ لکھنے کے کام پر معذور کیا گیا۔ 'مہرِ نمِ روز' ان کی بوبِ بیان کا آئینہ ہے۔ ان کے اکثر فارسی خطوط بھی اسی برائی طرز کے تھے اگرچہ غالب نے ان میں نثرِ خیالات کا اظہار بھی کیا ہے۔

در اصل غالب کی نثر نگاری کا کمال ان کے اردو خطوط میں پایا جاتا ہے۔ انہیں پہنچ کر مرزا ناں و اظہار کے تمام گوشوں پر غالب نظر آتے ہیں بلکہ یہاں پہنچ کر انہوں نے ایک انقلابی کردار ادا کیا ہے۔ سلاّ القاب کا طویل سلسلہ تک فلم موقوف کر دیا ہے۔ خطاب کی اسی صورت احسا کی ہے، جسے مکبوب اللہ سامنے بٹھا ہو اور اس سے باتیں ہو رہی ہوں۔ ان کے ہاں سادہ ریاں سرحدناں اور بلند خیالات کے اظہار میں وہ کمال حاصل کر چکی ہے کہ جس کی مثال میں ملتی اور اس پر طرہ یہ کہ شوخی اظہار نے عام معاملات کو بھی گل و گلزار بنا دیا ہے۔ دراصل اردو خطوط کے غالب وہی سہل سمع اسعار کے عائب ہیں جو دو چار لفظوں میں کسی کشف کی تصویر کھینچ لے لے ہیں۔ لوگ محاذات کا بعلو فیّ سے سلاے میں۔ غالب کے خطوط کو دیکھتے ہو محاذات نثر میں بھی نظر آجائے ہیں۔ سرمداری کا نہ کمال ہے کہ پڑھنے والے کی نگاہ اور دہن کو ساتھ ساتھ چلائے۔ یعنی نگاہ پڑے ہی الفاظ اپنے خیال کا خزانہ فاری کے سپرد کر دیں اور ذہن ان کی فہم میں کسی قسم کا بوجھ محسوس نہ کرے۔ غالب کے اردو خطوط کا بھی رنگ ہے۔ انک ترائی طرزِ اظہار ہے، جس کے طفیل کردار جلسے پھرے دکھائی دیتے ہیں۔ بعض دفعہ تو بڑھے والا نہ محسوس کرتا ہے کہ دو آدمیوں میں بات ہو رہی ہے۔ گویا غالب نے وہ اور فاصلہ دونوں کو مٹا دیا ہے اور مکبوب اللہ سے کوسوں دور بیٹھے یوں ہم کلام ہوتے ہیں کہ اس کے بولے بغیر ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس کا ردّ عمل کیا ہو رہا ہے۔

ان خطوط کا اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو ان کے پردے میں اس وقت کے پورے سماج کی زندگی نظر آ رہی ہے ، الفاظ گویا ایک آئینہ ہیں جس کے اندر رسم و رواج ، لباس و پوشش ، قیام و طعام ، نشست و برخاست ، خوشی اور رنج سب جھلکتے ہیں ۔ ہمارا خیال ہے کہ ان سے بہتر ریکارڈ اس دور کی سوسائٹی کا شاید ہی کہیں ملے ۔ غرض یہ کہ غالب کی اردو نثر نگاری نے اردو ادب میں ایک نیا باب کھول دیا ہے ۔

### غالب اور ظرافت

غالب کو حالی نے حیوان ظریف کہا ہے ۔ ہم حالی کے ساتھ اس حد تک ضرور متفق ہیں کہ غالب نے ظرافت کے میدان میں ایک نمایاں کردار ادا کیا ۔ ظرافت ایک بہت اہم چیز ہے یہ محض ہنسی مذاق اور ٹھٹھہ محول ہی تک محدود نہیں ہوتی ۔ یہ نو ظرافت کی ابتدائی اور ادنیٰ قسم کی صورتیں ہیں ۔ حقیقی ظرافت کا منصب تو یہ ہے کہ زندگی کی تلخوں کو گوارا بنا دے ۔ زندگی کے بے سل و بے جوڑ عوامل پر تنقید کرے اور زندگی کی رنگینوں کو رورمرہ کے گرد و عبار سے صاف کر کے پیش کرے ۔ ظرافت کی ایک اصلاعی حشت بھی ہے اور وہ یہ کہ جب روایت کی فرنوقی عباریں حاقق کے قلم سے بن جائیں اور ان سے نئی جاموں کی پرورس کا اسکان ہو تو ظرافت اپنے تیر و نسر لے کر آگے بڑھے اور ان قلعوں پر بھر پور حملہ کرے ۔ یعنی جس بات کی لغویت آب دلال و برہان کے ذریعے ثابت نہیں کر سکتے ، اس پر ہنس دینا اسے گرا دینے کے مترادف ہے ۔ اس معیار کے مطابق مرزا غالب کے ہاں سوخی و ظرافت کی قوت کا ثبوت ملتا ہے ۔ مرزا غالب کے ہاں یہ صفت بڑے پیمانے پر موجود ہے ۔ شوخی اظہار کا تو ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں ، ان کی ظرافت کے چند نمونے یہاں پیش کرتے ہیں :

غافل ان سے طلعتوں کے واسطے      جاننے والا بھی اچھا چاہیے  
چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد      آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

اور پھر اپنے آپ سے مزاح کرتے ہوئے کہتے ہیں :

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا  
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

انہوں نے کئی جگہ بہشت کا تمخسّر اڑایا ہے ۔ فرماتے ہیں :

کیا ہی رضوان سے لڑائی ہو گی      گھر نرا خلد میں گر یاد آیا



اور پھر عارف کا مرثیہ پڑھیے سو صاف ہتہ چلتا ہے کہ ظرافت کے ذریعے موت کے غم کو کس طرح گوارا بنا دیا گیا ہے۔ یہاں بھی سوخ نگاری کام آئی ہے۔ کہتے ہیں :

تم ایسے کھرے کون سے بھی داد و سد کے  
کرنا ملک الموت بھاضا کوئی دن اور

غالب کی ظرافت کے بعض بڑے عمدہ نمونے ان کے اردو خطوط میں خاص طور پر ملیں گے۔ اگر ہاں گنجائش ہوتی تو ہم وضاحت سے دکھا دیے کہ غالب نے الفاظ کے الٹ بھیر سے کس طرح مزاح پیدا کیا ہے۔ انوکھی صورتِ حال کو پس کر کے فاری کو کس طرح گدگدایا ہے۔ عمل کے تضاد سے کس درجہ کی ظرافت پیدا کی ہے۔ اور چیزوں کے علاوہ ان کے اردو خطوط ان کی بلند مقامِ طراوت کے آئینہ دار بھی ہیں۔ ان کے ہر کالم میں چٹکیاں، گدگدیاں اور سوخ اشارے ملتے ہیں۔ غالباً یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ قدرت نے انہیں ایک قوی و فہم و دانس عطا کی تھی، جس کے سہارے انہوں نے سختی و سستی، ریخ و آرام کو ہموار کر دیا، خود کہتے ہیں :

بدانش غم آموزگار من است      خزانِ عزیزاں بہارِ من است

☆      ☆      ☆

زمین جو در بد، نکو زیستن      جگر خوردن و نازہ رو زیستن

## آٹھواں باب

### (الف) اس دور کے دیگر شعراء

انیسویں صدی کے آغاز میں (۱۸۰۳ء کے بعد) ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار بنگال اور بہار سے بڑھ کر صوبہ جابِ مسجدہ (یو۔ پی) تک آہنچا۔ اگرچہ یہ حکومت غیر ملکی تھی اور اس کے استعماری عزائم بالکل واضح نہیں تھے تاہم اس لحاظ سے غیبت توں کہ اس نے ایک مرکزی حکومت قائم کر کے سہالی ہند میں نظم و نسق کو درست کیا، اور مرہٹوں اور سکھوں کی ناخفت و ناراج کو روکا۔ اگرچہ دہلی میں ساہِ عالم اب برائے نام تخت نشین تھے، مگر ان کی موجودگی سے معاشرہ میں ایک تہذیبی آبِ گِیا ہو گیا اور یہ ثقافتی رنگ ۱۸۵۷ء تک قائم رہا۔ یوں دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد زندگی کی ایک معقول وضع بھی بن گئی۔ معاشرے میں فی الحصلہ سکون، نظم اور امن و امان کی صورت پیدا ہوئی۔ ہر طبقے کے اسخاص اطمینان کے ساتھ اپنے اپنے مشغلی میں لگ گئے۔ زراعت کو فروغ ہوا، تجارت میں ترقی ہوئی، علمی و ادبی محفلوں پر رونق آئی اور عوام کی زندگی میں نظام پیدا ہوا۔ ملکی و مالی اصلاحات نافذ ہوئیں۔ شہرِ جمن دوبارہ جاری ہوئی اور سکون و اطمینان کے وہ سرچشمے حوساسی اہری کی آندھوں سے اٹ گئے تھے پھر اہلئے لگے۔ علوم و فنون، صنعت و حرف، درائع معاش اور ان ہام وسائل کو فروغ نصیب ہوا حو تمدن کی ترقی کے صامن ہوئے ہں۔ ایک صدی کے مسلسل ہنگاموں کے بعد اہل ہند نے امن و امان کی صورت دیکھی تو انہیں سہاجی، مجلسی اور مذہبی اصلاح و ترقی کا خیال آیا۔ چنانچہ اس اعتبار سے انیسویں صدی کا نصفِ اول ذہنی نشوونما، علمی عروج اور مذہبی اصلاح کا زرین عہد ہے، جس کی طرف بعد میں سرسید، آزاد، نذیر احمد اور حالی نے جا بجا اشارے کیے ہں۔ مختلف انجمنوں کا قیام، چھاپے خانوں کا رواج، اخباروں کا اجراء، تعلیمی اداروں کا قیام، سہاجی اصلاحوں کی سرگرمیاں اور مذہبی تحریکوں کا وجود، اس احیاءِ ملی کی خبر دیتے ہں جو انیسویں صدی کے نصفِ اول میں نمودار ہوئی۔ فورٹ ولیم کالج (۴ مئی ۱۸۰۰ء)<sup>(۱)</sup>، اور دہلی کالج کا قیام (۱۸۲۵ء)<sup>(۲)</sup> مولانا سید احمد شہید کی تحریکِ جہاد (۱۸۲۶ء)<sup>(۳)</sup>، خانوادۃ ولی اللہی کی مذہبی اور معاشرتی اصلاحیں، راجا رام موہن رائے کی تحریکِ برہمنو سہاج (۱۸۳۰ء) وغیرہ، اس حقیقت کی نشان دہی کرتی ہں

(۱) محمد عتیق صدیقی، گلکرسٹ اور اس کا عہد - ص ۱۵ -

(۲) مولوی عبدالحق، مرحوم دہلی کالج - ص ۱۵-۱۶ -

(۳) غلام رسول مہر، سرت سید احمد شہید - ص ۲۸۶ -

کہ ان دنوں اہل ہند کے ذہن میں حرکت اور حرارت کی روح بھر سے موجزن ہو گئی۔

یوں یو سانی ہند کے اکثر شہر مثلاً آگرہ ، عظم آباد ، بنارس ، تھیب و تمدن کی دولت سے بہرہ مند بھی لیکن دہلی ، بالخصوص لال قلعے کو مرکزی اہمیت حاصل تھی۔ جو لباس ، طور طریقے ، گفتگو ، آداب و رسوم یہاں رائج ہوتے وہ بہت جلد سارے ملک میں پھیل جاتے۔ لال قلعہ کہا تھا 'ہندوب و سائنسگی کا مرکز تھا کہ جو محاورہ نا عرل کی رسم ، نا لباس کا مسس یہاں رائج ہوا وہ اطراف میں قبول ہو گیا۔ قلعے کی رسوم سارے شہر بلکہ پورے ملک کی معاشرے پر اثر ڈالتی تھیں۔ لباس ، طعام ، سواری ، اسباب خانہ داری ، آرائش و رسم ، آداب مجلس و عہدہ میں عوام و خواص سب قلعے کی تقلید کرتے تھے اور یہ بات مسلمانوں تک ہی محدود نہ تھی۔

در اصل ہندو اور مسلمان چھ صدیوں سے ایک ہی برصغیر میں رہنے کی وجہ سے ، اختلاف مذہب کے باوجود ایک دوسرے سے محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔ وضع داری کی بدولت دونوں قوموں میں رواداری پیدا ہو گئی تھی۔ معاشرتی مماثلت نے دونوں قوموں کو اور قریب کر دیا تھا۔ ذی علم اور سمول ہندو گھرانوں کی معاشرے میں اسلامی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ان کی تعلیم بھی مکہ میں اور مسجدوں میں ہوتی تھی۔ اچکن ، دسار ، اور پاجامہ ان کا لباس تھا۔ بول چال ، طرز فکر ، عائد اور آداب مجلسی میں وہ مسلمانوں سے اسے مشابہ ہو گئے تھے کہ نمز کرنا دسوار تھا۔ برکات دین سے عقیدت رکھنا ، کتاب کا آغاز بسم اللہ اور حمد و نعت سے کرنا ، گفتگو میں انشاء اللہ یا سبحان اللہ جیسے کلمات کا استعمال عام تھا۔ مثلاً مومن کے شاگرد حکم سکھانند رام پر مہینے کی گیارھویں تاریخ کو شیخ عبدالقادر جیلانی کی مجلس عرس بڑے اہتمام سے منعقد کرتے تھے<sup>(۱)</sup>۔ غالب کے شاگرد نال مکند بے صبر ، سو نرائن آرام اور مرزا ہر گوہال نقتہ کا اردو اور فارسی کلام ان کی زبان کے علاوہ ان کے عقائد کو بھی ظاہر کرنا ہے۔ آتش کے شاگرد پنڈت دیا سکر نسیم کی مننوی 'گلزار نسیم' کے آغاز میں حمد نعت اور منقبت کا فرض جس طرح ادا ہوا ہے اسے دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ہندو کا کلام ہے یا مسلمان کا :

ہر شاخ میں ہے سکوفہ کاری	عمرہ ہے فلم کا حمد ناری
کرنا ہے یہ دو زبان سے یکسر	حمد حق و مدح پیمبر ص
ہاچ انگلیوں میں یہ حرف زن ہے	یعنی کہ مطیع پنجن ہے

باہر کے سیر تماشوں کے علاوہ گھریلو تفریحات اور ورزش اہل ملک کی صحت مندی اور کسبِ سعادت کی حاسن بھی۔ کبڈی، ورس، سرائی، گنگا، بانک، بنوٹ، سواری، سمشر بازی کا رواج وضع و شریف دونوں میں تھا۔ شطرنج، چومر، داستانیں، سنا، پتنگ بازی، موسمی وغیرہ عام مشغلے تھے۔ رنگین مزاج اسخاص عاسی اور سراب نوشی کا سفل بھی لرنے تھے۔ گندھی سے گلاب، کوٹھی سے سراب اور میوہ فروش سے آم فرض منگانے والے، جائداد کی محصر آمدنی کی سمع کو دونوں سروں سے حلانے والے اور مساعِ بردہ کو روہن کے کھانے میں درج کرے والے رئیس زادے ان دیوں بہت سے تھے جو فصولِ حرجی اور فسی و محور میں بھی مسلا رہتے تھے۔ بڑھے لکھے اور خاندانی اسخاص علوم و ہداولہ مثلاً منطق، فلسفہ، نجوم، بصرف، فقہ، نفسیر اور تاریخ سے سعب لکھے تھے۔ بعض نا کمال کئی کئی علوہ و فنون کے جامع ہوتے تھے۔ چنانچہ حکم موس حان طب، نجوم، حنر اور سطرچ کے ماہر بھی۔ ضاء الدین احمد حان، شیر و رخشاں علمِ تاریخ میں کامل بھی۔ مولوی امام عس صہائی فارسی ادب، لغت، بدیع اور صرف و نحو کے ماہر بھی۔ مولانا فضل حق فلسفہ و منطق کے امام بھی۔ مرزا غالب جسے آزاد مس کو لال شاعری کے علاوہ طب، نجوم، لغت اور بصرف میں دخل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کے کلام میں مختلف علوم کی اصطلاحات بالعموم ملی ہیں۔ علم دوست رئیسوں اور ذی علم سرفاء کے دولت خانے گویا علوم و فنون کا مرکز تھے۔ غالب، موس اور سعب کے گھر ہر علمی جلسے رہے تھے۔ مفتی صدر الدین آردہ کے دیوان خانے میں ہر روز عساء کے بعد مختلف علوم و فنون کے ماہر جمع ہوتے تھے۔ مولانا علامہ رسول مہر نے ابوالکلام آزاد کے حوالے سے لکھا ہے کہ اگر اس دور کا کوئی علم دوست شخص نہ ماہر نہ دہلی کے نا کمال لوگوں کو اندک حکمہ دیکھ لے تو وہ بھی آردہ کے مکان پر دیکھ سکتا تھا۔ سر سد احمد حان نے بھی ’آثار الصنادید‘ کے بابِ چہارم میں لکھا ہے کہ میں جس رور ان کی خدمت میں نہیں جانا، اس دن کو انی عمر سے خارج سمجھا ہوں۔

علوم و فنون میں جس فن نے سب سے زیادہ رواج پایا وہ فنِ شاعری تھا۔ انیسویں صدی میں شاعری کی وہ گرم ناراری ہوئی کہ ہندو، مسلمان، امیر، عریب، ادنیٰ، اعلیٰ، سب شعر کہنے، غزلیں سننے اور مساعروں میں سرک کرنے کے عاسی تھے۔ میر حسن، مصطفیٰ اور قدرت اللہ فاسم نے اپنے تذکروں میں سرفاء اور ذی علم اسخاص کے علاوہ متعدد اہل حرفہ کا ذکر کیا ہے جو دن بھر فکرِ معاس میں مشغول رہنے کے باوجود

(۱) حالی، یادگار غالب - ص ۱۴۷، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۳ء۔

(۲) — ایضاً۔

شعر کہنے کے لیے وفات نکال لیتے تھے۔ کٹو حجام ہے لیکن بقول مصحفی بال سے باریک مضمون باندھتا ہے، میان عاشق مزدور ہے، محمد امان نثار معمار ہے، بدھ سنگھ شگفتہ لوہار ہے، عارف رفوگر ہے وغیرہ<sup>(۱)</sup>۔ ان دنوں گلی کے لونڈے، گھر کی عورتیں بلکہ مائیں، کنہزیں اور طوائفیں بھی شعر گوئی و شعر فہمی کی صلاحیت رکھتی ہیں<sup>(۲)</sup>۔ فقیر سے لے کر نادساہ تک ہر شخص مادہ سخن سے سرخوس تھا۔ فقیر بھیک مانگنے نکلتے نو دعائیں، فکروں کے بجائے مشہور شعروں کا کلام گاتے۔

دہستان لکھنؤ کے شعراء کی یہ خصوصیت اور بھی قابلِ ستائش ہے کہ انہوں نے اپنے کلام میں ملکی معاشرت اور مقامی رنگ کو خوب نمایاں کیا ہے<sup>(۳)</sup>۔ ہمیں معلوم ہو جانا ہے کہ اس عہد میں کون سی سواراں مستعمل تھیں؟ خیالاب و عفاوند کا کیا رنگ تھا؟ سادی غمی کی رسمیں کیا کیا تھیں؟ مردوں بالخصوص عورتوں کا کیا لباس تھا؟ عورتوں میں بھی سادی سدہ خوانین اور دوسیزہ لڑکیوں کے لباس میں جو فرق تھا اس کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً سادی تندہ عورتیں مرصع زیورات اور بش قیمت لباس زیب تن کرتی تھیں لیکن لڑکیاں ہلکا سادہ زیور اور معمولی کپڑے پہنتی تھیں۔ ان کی ناک میں مرصع کمل کی بجائے نیم کا ننکا ہونا تھا۔ انگیا، مسی، پان یا عطر کا استعمال ان کے لیے ممنوع تھا۔ مرد گھوڑے، ہوادار نا بالکی میں سفر کرتے تھے۔ عورتیں ڈولی یا ڈولے یا بالکی میں حلی تھیں۔ ذی رتبہ خوانین کی نالکی کے ساتھ مائیں، خواجہ سرا یا خدمتگار ہوتے تھے۔ معاشرے کے لوازم اپنے بڑھ گئے تھے، کہ جنازے اور کفن میں بھی بڑے اہتمام کے ساتھ تھے۔ ان شعراء کے کلام کا سرسری مطالعہ ہمیں ان تمام باتوں سے آشنا کر دیتا ہے :

بزمِ ماتم مری کیونکر نہ بنے رشکِ چمن  
میرے پھولوں میں کئی غنچہ دہن بیٹھے ہیں  
☆ ☆ ☆  
ڈھونڈتے ہیں وہ کہیں ملتا نہیں میرا مزار  
خشک ہوتی جاتی ہے پھولوں کی چادر ہاتھ میں

### زبان کی وسعت اور صفائی

اگرچہ انیسویں صدی کے عزل گو شعرا حسن و عشق کے پامال مضامین نظم کرتے رہے لیکن اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ زبان منجھتی چلی گئی۔ مثنوی اور مرثیے نے

(۱) قدرت اللہ خان قاسم، مجموعہ، نعر - مقدمہ - طبع لاہور ۱۹۳۲ء۔

(۲) آزاد، آب حیات - ص ۱۰۲، طبع یازدہم۔

(۳) رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو - ص ۲۶۶، اردو ترجمہ لاہور ۱۹۶۰ء۔

واقعات کے اپنے اسلوب نکالے کہ زبان میں بیانیہ شاعری کا بہت بڑا سرمایہ جمع ہو گیا ۔ اس کا ذکر کسی اور مقام پر تفصیل سے آئے گا ۔ سرِ دست صرف غزل کا ذکر مقصود ہے ۔

مرزا غالب فارسی تراکیب کے استعمال ، اندازِ بیان کی ندرت اور جَدّتِ ادا پر مائل تھے ۔ ان کے ہیرووں اور شاگردوں نے قدرناً ان کا رنگ اختیار کیا ۔ مومن بھی فارسی تراکیب اور اندازِ بیان کی نزاکت نیز حذف و ایجاز کے فن میں کامل نہیں ۔ اس طرح ان دونوں استادوں کے یہاں یہ خند خصوصیات مشترک نہیں ۔ لیکن تخیل کی بلند پروازی مرزا غالب کا مخصوص وصف ہے اور معاملہ بندی میں مومن منفرد ہیں ۔ ان دونوں کے شاگردوں نے اپنے اپنے استاد کی خصوصیات کو قائم رکھا ۔ نا ہم ایک اتفاق ایسا ہوا کہ بعض شاگردوں کے کلام میں نہ سب خصوصیات بہ یک وقت کم و بیں جمع ہو گئیں ۔

یعنی مومن کے انتقال (۱۲ مئی ۱۸۵۲ء) کے بعد ان کے بشیر شاگردوں نے مرزا غالب کا داس بھاسا ۔ سفتہ ، سالک اور وحشت اسی زمرے میں ہیں ۔ ان کے کلام میں دونوں استادوں کا رنگ مخلوط ہو گیا ہے ۔ حالی ، میر مہدی مجروح اور عارف اول سے آخر تک مرزا غالب سے مستفید رہے ۔ حالی کی طبعی سادگی نے انہیں سادہ گفتاری و سلاست کی طرف مائل رکھا ۔ زبان کی ترقی اور زمانے کے تقاضے سے یا ذوق کے قبولِ عام سے متاثر ہو کر غالب اور مومن کے شاگردوں نے بھی صفائی زبان پر خاص زور دیا<sup>(۱)</sup> ۔ مجروح اور سفتہ البتہ فارسی تراکیب کے زیادہ سائل ہیں ۔ ذوق زبان کی صفائی اور لطفِ محاورہ کے استاد تھے ۔ ان کے شاگردوں کے کلام میں بھی یہ وصف نمایاں رہا ۔ ان کے مرنے (۱۶ اکتوبر ۱۸۵۴ء) کے بعد ان کے بھی بعض بلامذہ مرزا غالب کے شاگرد ہو گئے ۔ ظہیر اگرچہ رسماً ذوق کے شاگرد تھے نا ہم مومن کی رنگین معاملہ بندی کے عاشق تھے ۔ چنانچہ خود کہتے ہیں :

طرزِ مومن سے نہ آگاہ بھی جب تک کہ ظہیر

سچ تو یہ ہے کہ کبھی رنگِ غزل نے نہ دیا

ان تمام وجوہ سے انیسویں صدی کے وسط میں زبان اور طرزِ بیان کا ایک مخلوط انداز بن گیا جو غالب ، مومن اور ذوق کے شاگردوں کی انفرادیت کے باوجود قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے ۔ انہوں نے اکثر غزلیں اساتذہ کی زمینوں میں کہی ہیں ۔ ذیل کے انتخاب سے ان شعراء کے اسلوبِ بیان ، زبان اور دیگر خصوصیات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے :

شبیثہ

وہ طرزِ فکر ہم کو خوش آتی ہے شبیثہ

معنی شگفتہ ، لفظ خوش انداز ، صاف ہو

انور

کعبہ نو مل جائے لبِ شیریں سے زہر کھانے کی اجازت ہی سہی

☆ ☆ ☆

تسکین

اے دل یہ نرا خاک میں ملتا ہے بے اثر وہ کر جو اس کی طبعِ مکندر میں گھر کرے

☆ ☆ ☆

مجروح

رندی و مستی و میخواری و شاہد بازی فرصِ عمر تو کم اور مجھے کم ۴

☆ ☆ ☆

حالی

ان کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

دبستانِ لکھنؤ کے شعراء کو رنا کی صفائی ، اصول و قواعد ملحوظ رکھتے اور القاعد

کے نہ کرب استعمال کا خاص سوچ تھا ۔ اگرچہ نسخ کی طرح ۴ مقول رہی ، ہاں تک

کہ دہلی کے اساتذہ یعنی مومن اور غالب بھی اس سے متاثر ہوئے بعد نہ رہ سکے (۱) ،

لیکن ان کی مضمون بندی اور حال باقی کا طریقہ ان کے ساگردوں سے نہ مل سکے ۔ یہی

وجہ ہے کہ ان کے نلامدہ بھی رنا کی صفائی بر مائل ہو گئے ۔ صانع کا سوچ باقی رہا ۔

آس اور ان کے ساگرد صفائی رنا ، بے ساحگی اور نابیر کو حاصل شعر سمجھتے تھے ۔

ناسخ ، بالخصوص آس کے ساگردوں کی کوسنوں سے رنا بہت سمجھ گئی ۔ ذیل کے سرسری

انتخاب سے نہ سب خصوصیات واضح ہوں ہیں :

صفائی زبان

صبا

عالمِ تمام بہرِ ماسا ٹھہر گیا وہ جس جگہ ٹھہر گئے ، میلہ ٹھہر گیا

☆ ☆ ☆

ان کی رفتار سے دل کا عجب احوال ہوا زندہ گیا ، پس گیا ، مٹی ہوا ، پامال ہوا

ولد

دیدِ گل کے تجھے بڑ جائیں گے لالے بلبل بڑ گئی گر کسی صیاد کے پالے بلبل

وزیر

چلا ہے اور دل راحت طلب کیا شادمان ہو کر زمینِ کوئے جانان رنج دے گی آسماں ہو کر

### مزاجی خصوصیات اور ذہنی افتاد کے نقوش

ایسویں صدی کے ان شعراء کے کلام میں ان کے ذہنی اور مزاجی نقطہٴ نظر کا اظہار بالعموم ہوتا ہے۔ مغلیہ سلطنت کے نباء ہو جانے سے جاگیرداری نظام پر ضرب پڑی لیکن اس کے اثرات برابر باقی رہے۔ اکثر شعراء کے کلام میں جو کم و بیش جاگیردار طبقے کے افراد ہیں، طبقاتی برتری، رئیسانہ تعین اور اندازِ فکر کے نقوش ملتے ہیں چنانچہ اکثر غزلوں کے مضامین ریاست و امارت کے اس ٹھانڈے کے آئینہ دار ہیں جس میں ان شعراء کی رنگین جوانی بسر ہوئی تھی۔ غریب طبقے کے شعراء بھی رسماً رئیسوں کے شبستانِ عس اور حریمِ عشرت کے تصور میں اس انداز کے اشعار کہہ جاتے ہیں۔ جاگیرداری نظام میں خوشحال طبقے کو عشرت کوسی اور کامرائی کے مواقع بہ کثرت ملتے ہیں۔ طوائف، کنہزیں، داستائیں، خانگیاں، سامانِ تجمل کی افراط، طبقاتی برتری، رئیسانہ اندازِ زندگی کا تصور ان کے مزاح میں رچ جاتا ہے اور ان کے کلام میں نمودار ہوتا ہے۔ اس کے باوجود وضعداری کے نقاصے سے مذہب اور دین داری کا رنگ بھی قائم رہتا ہے۔ مثلاً:

امام ظاہر و باطن، امیر صوب و معنی  
(غالب) علی ولی اسد اللہ جانشینِ نبی

☆ ☆ ☆

اس کی اسب میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند  
(غالب) واسطے جس سہ کے غالب گنبدِ لے در کھلا

☆ ☆ ☆

کہنے کو یوں جہاں میں ہزاروں ہیں یار دوست  
(اسیر) مشکل کے وقت ایک ہے پروردگار دوست

☆ ☆ ☆

کربلا سے سفرِ گلشنِ جنت ہے منیر  
(منیر) الفتِ حضرتِ شبیر لیے پھرتی ہے

### سیاسی شعور

سکون و طمانیت اور عیش و کامرائی کے ہنگاموں میں ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے اس سیاسی غلبے کو بہت کم محسوس کیا جو انگریزی سامراج نے اپنی گرفت سے حاصل کیا تھا۔ عوام الناس کی طرح اکثر شعراء انگریزی کی سیاسی عظمت اور سائنسی اور مشینی معجزات سے مرعوب ہو کر ان کے مداح و معترف تھے۔ تاہم سید احمد شہید



کی تحریک جہاد سے متاثر ہو کر نرساہی رملے کے عضبات اور جاگیرداروں سے محروم ہو جانے کے باعث بعض اسخاص ، مثلاً مومن انگریزوں کی حکومت سے ناخوس بھیے<sup>(۱)</sup>۔ لیکن حب ۱۸۵۷ء کے ہنگامے ے مسلمانوں کے رہے سے انتدار کو بھی ساء کردیا اور انگریزوں نے صرف مسلمانوں کو عذر کا ذمہ دار قرار دے کر ان پر لرہ حز مطالبہ نوڑے بوساسی غفلت کے پردے آنکھوں کے سامنے سے بنے ، اور غالب جسے انگریز دوست نے بھی انگریزوں کی خون آسامی اور اہل وطن کی ساہی بر آسوہائے۔ اس جائزے سے ساند یہ اندازہ لگنا مسکل نہ ہوگا کہ ان سعراء کے کلام میں معاشرتی حالات ، اہل ملک کی طسعموں کا انداز ، عوام و حواص کے مشاغل ، آداب و رسوم اور ساسی سعور کی واضح بصویریں بھی سی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ دور اٹھارھویں صدی سے بالکل مخلف ہے۔ جس میں زندگی کے مختلف بھلوؤں کے نفسے اننی صفائی اور اس کرب سے ہیں ملے۔ چنانچہ اسسویں صدی کے ان دلی سعراء کا طرہ امتیاز یہی وصف ہے کہ اگرچہ ان کے کلام میں حسن و عس کی داستان دالعموم صداہ و خلوص سے محروم ہے، نا ہم عصر بوکے نقاضوں نر سہجی اور ساسی رجحانات کی بدولت ان کی ساعری میں زندگی کی نص بھڑکتی محسوس ہوتی ہے۔ ان کے کلام میں میر و مصحفی کا سا سوز و گداز نہیں ہے ، لیکن ان کا قوسی اور سہجی سعور بے سار ہے۔ اسی لیے ان کے اسعار ہیں اسسویں صدی کے معاشرتی اور ساسی ، احوال کی جھلک بہت نمایاں نظر آتی ہے۔ غالب اور دوو کے ساگردوں میں کوئی بھی اسسا نہیں جو اپنے اساد کے فن کا صحیح نائندہ ہو۔ ناہم مومن کے بعض سا گرد یعنی اصعر علی خان نسیم ، میر حسن نسکن اور غلام مولا فلو اپنے اساد سے کا ملا ہمرنگ ہیں اور انہی ساگردوں کی بدولت مومن کے خلوص اور رنگس و سہدب معاملہ سدی کی رواب امیر اللہ سلیم سے ہوئی ہوئی حسرت سوبانی نک آئی ہے۔ اس یک حہتی کی وحہ یہ ہے کہ مومن کے ساگرد ان کے فن یعنی وقوعہ گوئی اور معاملہ سدی کی تقلد کرنے کے علاوہ مزاجی افاد اور ذہنی ہم آہنگی کے اعتبار سے بھی اپنے اساد کے قدم نہ قدم چلتے ہیں۔ سفسہ ، وحش ، سورس ، سکھانند رام ، غلام مولا فلو ، نسکن ، آہی وغیرہ حدبات کی سدت ، شومن مزاجی ، حسن پرستی ، جاگیردارانہ تعس اور بعض علوم سداولہ سے غیر معمولی سف رفکتے ہوئے مومن کے پورے مقلد ہیں۔

مرزا غالب کے ساگردوں کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ مرزا کا بچین اور نوجوانی ناز و نعمت میں گذری۔ جوانی میں انہیں عم رورگار سے سابعہ پڑا اور رئیسانہ زندگی ، وضعداری ،

(۱) مومن ، دیوان فارسی - ص ۲۷۱ ، مطبع سلطانی ۱۲۷۱ھ -  
ابن عیسویاں پہ لبہ رساند — جان من و جان آفرینش

احبابِ لوازی، اور میخواری کے اخراجات پورے کرنے کے لیے انہیں بہت پریشان رہنا پڑا۔ فروری ۱۸۲۸ء میں انہوں نے کلکتہ پہنچ کر پنشن کا مقدمہ دائر کیا، جو کوئی بیس سال کی تک و دو کے بعد ناکامی و ناامیدی پر مستح ہوا۔ ۱۸۳۷ء میں انہیں قند فرنگ کی مصیبت سہنی پڑی۔ غدر کے مصائب سہے۔ المختصر غمِ زمانہ نے ان کے نشاطِ عشق کی مستی جھاڑ دی اور زندگی کے عجربات اور مختلف آفاقی حہمتوں کو انہوں نے اپنے کلام کا مستقل موضوع بنا لیا۔ مرزا غالب کے شاگردوں نے انہی زندگی میں اسے نشب و فراز نہیں دیکھے۔ اس لیے مضامین کا وہ سوع اور وہ آقامت جو غالب کے کلام کا نایاں جوہر ہیں، شاگردوں کے اسعار میں بہت کم نظر آتے ہیں<sup>(۱)</sup>۔

یہ ایسے ہمہ نلامدہ غالب بعض معاملات میں اپنے اساد کی تقلید کا حق ادا کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض اسخاص مثلاً پرگوبال مسہ اور ساہراہہ سسر الدین بوفی (سلطان ٹیو کا یونا) سب سے فارسی کے عاشق ہیں اور صرف فارسی سحر کرتے ہیں۔ تقریباً یہی کیفیت حواہر سگھ حوہر اور محمد حسین تما مراد آبادی کی ہے۔ صاء الدین خان شیر، سالک اور مجروح نے بھی فارسی میں عرائس لکھی ہیں۔ نواب سفتہ نے حشرقی تخلص سے فارسی دیوان برسمب دیا تھا اور حج سے واپس آنے کے بعد اپنا سفر نامہ ’رہ آورد‘ کے نام سے فارسی میں لکھا تھا۔

مرزا غالب کی سی فکر انگیزی، حال اوروری، تحسّل کی پرواز، اسخاب الفاظ کا سلیقہ اور بنوع مضامین ایسی چیزیں ہیں جن کی بیرونی ہر شخص کا کہ نہیں<sup>(۲)</sup>۔ لہذا غالب کے نلامدہ ان چیزوں میں ان کی بیرونی کرنے سے قاصر ہیں۔ البتہ غالب کی زمناں میں عزلیں لکھنے اور غالب کے مضامین کو ٹھوڑے بہت فرو سے نظم کر دینے کی کوشش ان لوگوں نے ضرور کی اور اس میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔

دبستان لکھنؤ کے اسانہ کی بھی یہی صورت ہے۔ ناسخ کا کوئی شاگرد تحسّل باقی، شکوہ الفاظ اور مضمون بندی میں ان کا شاگرد رسد نہ بن سکا۔ لیکن آتش کے شاگردوں میں، وزیر علی صبا، دیا شنکر نسیم اور سید محمد خان رند نے آتش کی خصوصیات یعنی گرمی، گفتار، صفائی، بندش کی چستی اور خلوصِ عشق کو قائم رکھا۔

(۱) مالک رام، تلامذہ غالب - ص ۶۳، ۶۸ - لکھنؤ سمن - ص ۱۸، ۱۹ -

(۲) یہاں شاید یہ کہنا بھی مناسب ہو کہ غالب کے تلامذہ میں نہ تو مرزا کی سی کیف آور فکریت تھی اور نہ ظواہر سے گذر کر حقائق تک پہنچنے کی بصیرت۔ دراصل یہ جوہر بہت کم شعراء میں ملتا ہے۔۔۔۔۔ مدیر عمومی۔

## (ب) اس دور کے دیگر شعراء - تلامذہ غالب

حالی

خواجہ الطاف حسین اینِ خواجہ ایرد بحس - ۱۸۳۷ء تا ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء<sup>(۱)</sup>  
 فنِ شعر میں مرزا غالب اور نواب سیفہ سے مستفیض ہوئے - غدر کے بعد سات سال  
 تک نواب شیفتہ کے صاحبزادوں کی انالقی بر جہانگیر آباد میں مامور ہوئے - نواب کے مرنے  
 کے بعد گورنمنٹ ہک ڈپو لاہور میں ملازم ہوئے اور انجمن پنجاب کے مساعروں  
 (مناظموں ۱۸۷۴ء) میں سرک ہو کر جدید طرز کی نظمیں، مثلاً حب وطن، برکھاوت، نشاط  
 امید وغیرہ لکھیں - سرسید کی تحریک سے 'مسدس مد و جزر اسلام' لکھا (۱۸۷۹ء) جو  
 روانی، صفائی اور زورِ بیان اور بر حلوص نادر کا عمدہ نمونہ ہے - سر میں 'مقدمہ شعر و  
 شاعری'، 'حیاتِ سعدی'، 'نادر گارِ غالب'، 'حیاتِ جاوید'، 'مجالس النساء' ان سے  
 یادگار ہیں -

دیوانِ غزلیات میں رسمی اور روایتی نغزل ہے - البتہ بعض عربی مثلاً 'خوبتر کہاں'  
 'نظر کہاں' یا 'گھر کی صورت'، 'در کی صورت' بہت برجستہ ہیں - عام جوہر ان کے  
 کلام کا سادگی، واقعیت اور حقیقت پسندی ہے جو چند اسعار سے واضح ہو سکتا ہے :

عشق سننے نہی جسے ہم وہ بھی ہے ساد

خود بخود دل میں ہے اک شخص سایا جانا

☆ ☆ ☆

منے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں ہام

گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ بھا

☆ ☆ ☆

اب بھاگتے ہیں سادہ زلفِ ہاں سے ہم

کچھ! دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

☆ ☆ ☆

بیقراری بھی سب امیدِ ملاقات کے ساتھ

اب وہ اگلی سی درازی شبِ ہجران میں نہیں

☆ ☆ ☆

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا

ہم محوِ نالہ جرسِ کاروان رہے

(۱) عبدالغنی، گل رعنا - ص ۴۷۲ - اعظم گڑھ ۱۸۵۳ء - صالحہ عابد حسین، یادگار حالی - ص ۱۸

لیکن ان کا حقیقی میدان اصلاحی شاعری ہے ، جس میں ان کا دردِ دل اور جذبہٴ ایقان پورے خلوص سے نمودار ہوا ہے ۔ مسدّس کے علاوہ بعض نظمیں مثلاً 'مناجاتِ بیوہ' 'چپ کی داد' بہت ہی ہر درد ہیں اور ان میں صنفِ نازک کی حمایت و وکالت کا حق خوب خوب ادا کیا گیا ہے ۔ 'شکوہٴ ہند' میں حبِ وطن اور ملتِ اسلامیہ سے گہرا انہماک ظاہر ہونا ہے ۔

## ذکی

سبذ ذکرِیا حانِ ابنِ سید محمود خان دہلوی ۱۸۳۹ء تا ۱۹۰۳ء فارسی ، عربی ، منطق ریاضی اور طب میں دخل تھا ۔ فنِ شعر میں غالب اور صہبائی سے استفادہ کیا ۔ غدر میں دہلی سے نکلے ۔ آخر میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو گئے تھے ۔ ملازم کے سلسلے میں میرٹھ ، گورکھپور ، بریلی اور بدایوں کی سیر کی ہے ۔ غالب کی براکیب اور اندازِ بیان کے عاسق تھے ۔ کلام میں دسوار پسندی کے باوجود سلاسل کا رنگ موجود ہے ۔

وہ گرمِ خواب ہوں گے اس آہ و بکا میں کیا ؟  
دردِ سکست دل نہیں میری صدا میں کیا ؟  
ہم حان و دل تو ندرِ غمِ عشی کر چکے  
حیران ہیں لٹائیں گے راہِ وفا میں کیا ؟  
آلودہٴ کدوربِ باطن ہے ہر نفس  
منہ اے ذکی دکھاؤ گے بزمِ صفا میں کیا ؟



بدگامی یار کے حق میں دلِ مجبور حیف !  
وہ خدا ناکردہ کیوں اغیار کی محفل میں ہو

## مجرع

میر مہدی خلف میر حسین فگار دہلوی ۔ مرزا غالب کے بہت ہی عزیز شاگردوں میں سے تھے ۔ 'اردوئے معلّیٰ' کے خطوط سے اس معجب کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔ ان کی جوانی دہلی کے چہچہروں میں بسر ہوئی ۔ غدر کے بعد پانی پت چلے گئے ۔ پھر راجا شیو دھیان سنگھ کے پاس الور میں کچھ وقت گزارا ۔ بعد ازاں حامد علی خان رئیسِ رام پور کی عنایت سے بہ آرام زندگی گزاری اور ۱۹۰۲ء میں فوت ہوئے ۔

ان کی زبان صاف ہے لیکن غالب کی سی فارسی براکیب بھی موجود ہیں۔ کلام میں دلکشی یا نازکی کی کمی ہے، پختگی البتہ ہے۔ کچھ اسعار ملاحظہ ہوں :

تھی وہ مجنوں کے دم ہی نک رونق      خاک اڑتی ہے اب بیاباں میں  
 محفل طرازیوں وہ کہاں ، اب نوکام ہے      گھر میں بڑے ہوئے در و دیوار دیکھنا  
 نہ سوچتی ہے رہائی نہ موت آتی ہے      نہ مہرناں ہے فسم نہ مہرناں صیاد

سالک

فرمان علی بیگ ابنِ نواب عالم بیگ۔ (دسمبر ۱۸۲۵ء تا نومبر ۱۸۸۰ء)۔  
 حدر آباد دکن میں پیدا ہوئے<sup>(۱)</sup>۔ سوونما اور تعلیم دہلی میں پائی۔ مومن کے  
 شاگرد ہوئے۔ ان کے انتقال کے بعد مرزا غالب سے رجوع کیا۔ بہت ذہین ،  
 ذکی اور نرم مشور تھے۔

عذر کے ہنگامے میں الور چلے گئے پھر حدر آباد میں سر رسہ دار محکمہ تعلیم  
 ہوئے۔ نواب عماد الملک کے سرپرستی میں ایک رسالہ 'مخزن الفوائد' نکالے رہے جو بالعموم  
 تاریخی مضامین پر مشتمل ہوتا تھا۔ کلام میں مومن کی معاملہ بندی اور غالب کے اندازِ بیان  
 کا ملا جلا رنگ ہے۔ ۱۸۷۱ء تک ان کے دیوان یعنی 'ہنجار سالک' ، 'مغزنہ سالک'،  
 اور 'دیوان سالک' چھپ چکے تھے۔ مجلسِ ترقی ادب لاہور نے ۱۹۶۶ء میں کلاں  
 چھاپا ہے۔ انکے چند اسعار درج ذیل ہیں :

کس اے سپہر تجھ سے بھی رکھتے ہو سہل نہیں  
 وہ خواہشیں کہ رکھتے بھی اس سوفا سے ہم

☆ ☆ ☆  
 اعتبارِ نگہِ ناز ہے کیا کا ان کو  
 فل کو آتے ہیں اور باہ میں سمندر نہیں

☆ ☆ ☆  
 دل وہ کافر ہے کہ مجھ کو نہ دنا چن کبھی  
 بیوفا ہو بھی اسے نے کے بشاں ہو گا

☆ ☆ ☆  
 کچھ ہو پر ان کو جانبِ اغیار دیکھنا  
 اک بار منع کیجیے تو سو بار دیکھنا

## رخشاں

نواب ضیاء الدین احمد خاں نیئر و رخشاں ابنِ نواب احمد بخش خاں رئیس فیروز پور جھڑکہ لوہارو - حوس معاس ، عیس کوس ، سختی آدمی تھے - علومِ متداولہ بالخصوص تاریخ سے خاص سنف تھا <sup>(۱)</sup> - مسٹر ایلٹ کو تاریخِ ہند کی تکمیل میں مدد دی تھی - ۳ اکتوبر ۱۸۸۵ء کو فوت ہوئے <sup>(۲)</sup> - اسعار میں لدست کا رنگ اور روایتی بغزل کے اوصاف موجود ہیں - دن اسعار ملاحظہ ہوں :

بوالہوس اور بھی مرنے کی کریں گے خواہس  
لے کے گل بر پہ نیئر کی نہ آیا کچھے

☆ ☆ ☆

چاں نکسر میرا گریساں ہے  
دل کا محضر مرا گریباں ہے  
آج سے سے سہ کس کا ملا  
کہ معطر مرا گریساں ہے

☆ ☆ ☆

## عارف

زین العابدین خاں ابنِ نواب غلام حسین خان مسرور (۱۸۱۸ء تا اپریل ۱۸۵۲ء) مرزا غالب کی سوی کے بھانجے اور غالب کے عزیز ساگرد تھے - دو بٹے بامر علی خاں اور حسین علی خاں اپنی نادگار چھوڑ کر جوان مرگ ہوئے <sup>(۳)</sup> جس پر غالب نے مشہور درد ناک مرثیہ لکھا ع

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور

کلام میں نزاکت ، حسن اور دلکشی کا امتزاج ہے - مرزا قادر بخش صابر کی رائے ہے کہ ”رنگینی“ سخن سے کاغذ ہمرنگ گل اور دلہیزی کلام سے فلم منقارِ بلبل ہے - اصنافِ سخن پر قدرت اور انواعِ کلام پر اقتدار ہے - غزل ، قصیدے ، مخمس و رباعی پر

(۱) سر سید احمد خاں ، آثار الصنادید ، باب چہارم - ص ۸۳ ، لکھنؤ ۱۸۹۰ء -

(۲) بشیر الدین احمد ، واقعات دارالحکومت ، ج ۲ - ص ۴۴۲ ، دہلی ۱۹۱۹ء -

(۳) غلام رسول مہر ، (مرتب) مکاتیبِ غالب - ص ۶۴ - لاہور ۱۹۶۲ء -

مشتعل دیوانِ ضخیم اس سے یادگار ہے (۱)۔ لالہ سری رام لکھتے ہیں کہ ان کے غیر  
مطبوعہ کلیات میں بیس ہزار شعر بھیے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں :

سخت سرمائے ہیں اتنا نہ سمجھتا تھا انہیں چھیڑتا تھا تو کوئی شکوہ بیجا کرتا

☆ ☆ ☆

سوخی وہ بھری ہے کہ ذرا جا نہیں پاتی دُشوار ہے آنا بری آنکھوں میں حیا کا

☆ ☆ ☆

دے چکا ہے مرے بیمار کو عیسیٰ نو جواب لبِ جاں بخش مرے دیکھیے کیا کہتے ہیں

☆ ☆ ☆

ہم کسی میں مجھے ہوتی ہے غنیمت وہ بھی کوئی جس وقت مرے سر پہ بلا آتی ہے

☆ ☆ ☆

بہ عکس ہوا کرتے ہیں سب کام ہمارے اس واسطے مرنے کی نینا نہیں کرتے

☆ ☆ ☆

جگر و دل کوئی پتھر کا کہاں سے لائے اب تو بیٹھا نہیں جانا مرے بیمار کے پاس

## (ج) دہلی کے دیگر شعراء

## مرزا خضر سلطان خضر

مرزا خضر سلطان خضر ابن بہادر ساء ظفر ، مرزا غالب سے مشورہ سخن کرتے تھے ۔  
۲۳ ستمبر ۱۸۵۷ء کو فتحاب انگریزوں نے خاندان شاہی کے دیگر افراد سمیت انہیں بھی  
مقبرہ ہایوں سے گرفتار کیا اور گولی مار دی<sup>(۱)</sup> ۔

نمونہ کلام سے جو ذیل میں درج ہے اندازہ ہونا ہے کہ اپنے استاد کے مضامین  
اور خیالات کو صاف زبان میں ادا کرتے ہیں :

گلی سے کون خوش ہو مگر حسنِ انفاق  
جو نیری خو بھی وہی مرا مدعا ہوا

☆ ☆ ☆

مانا کہ ستم تم نہیں کرتے ہو کسی پر  
غیروں پہ کرم ہو یہ ستم بھی نہیں تھوڑا

☆ ☆ ☆

کہتے ہو ”وہ بھی ہوس پیشہ ہے جیسا نو ہے“ ۔  
مجھ سے اک چھڑ ہوئی ، سکھو عدو کا نہ ہوا

☆ ☆ ☆

نہ کہہ سکتے ہیں کچھ اپنی ، نہ سن سکتے ہیں کچھ نیری  
ہمیں اس وقت میں اے بیوفا دیکھا تو کیا دیکھا

## مفتی صدر الدین خاں آزرده

مفتی صدر الدین خاں آزرده ابن شیخ لطف اللہ شاگرد نصیر مجرم ۱۲۰۳/۱۲۸۹ء تا  
۱۶ جولائی ۱۲۸۵/۱۸۶۸ء<sup>(۲)</sup>۔ مختلف علوم و فنون کے جامع اور نادر روزگار ہستی تھے۔ خوش  
معاش، خوش سلوک ، خلقی مجتہد ، صاحب تدبیر ، حکام رس آدمی تھے۔ جنرل آکٹرلونی  
کے نفسِ ناطقہ تھے اور راجپوتانہ کی ریاستوں کو مطیع کرنے میں انہوں نے بہت کام کیا ۔

(۱) سری رام ، خمغانہ جاوید ، جلد سوم - ص ۲۵ - ۲۶

(۲) سری رام ، خمغانہ جاوید اول ص ۵۳ - مالک رام تلامذہ غالب ص ۱۰۳ -



غریبوں کے سرپرست تھے ، طالب علموں پر سخی ، دوسوں کے ساتھ مہربان اور سرکار انگلشیہ میں محترم ، عرصہ بہت کاسب ، ذبیحہ بزرگ تھے ۔ غدر کے ہنگامے میں یہ بھی گرفتار ہوئے ۔ جائداد ضبط ہوئی ۔ بہت کوس کے بعد نصف جائداد واگذار ہوئی ۔ حکیم عبدالحئی ان کو جامع کمالاٹ لہتے ہیں<sup>(۱)</sup> ۔ ان کی عظمت کی دلیل یہ ہے کہ ان کے اساد فضل امام اور سادہ عبدالعزیز جسے بزرگ تھے اور شاگردوں میں نواب صدیق حسن خاں ، مفتی سعد اللہ ، سر سدا احمد خاں ، فضل الحسن اور ابولکلام آزاد کے والد تھے ۔ سر سدا ان کا نام لکھنے سے پہلے انک صفحے میں ان کے القاب لکھ کر ع ہزار بار بشوم دہن ز مسک و گلاب ، کی آرزو کرتے ہیں<sup>(۲)</sup> ۔

علم و فضل اور خوس اخلاق و نواضع کے باعث ان کے دیوان خانے میں ہر شام دہلی کے اہل کمال کا ہجوم رہا تھا ۔ ہر ہفتے مساعروں کراتے تھے ۔ کلام میں پختگی ، لطافت، نہ داری ، صحت زبان اور دلفریبی کا جوہر ہے ۔ ان کے چند اسعار ملاحظہ ہوں :

مصر میں آج تجھے دیکھ کے اٹھائے ہیں سادہ لوحی سے جو یوسف کے خریدار ہوئے

☆ ☆ ☆

کابل اس فرہ زہاد سے اٹھا نہ کوئی کچھ ہوئے تو ہی رندان قدح خوار ہوئے

☆ ☆ ☆

میں اور ذوقِ بادہ کشی ، لے گئی مجھے یہ کم نگاہان بری نرمِ سراب میں

☆ ☆ ☆

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں اک جان کا زیاں ہے سو اس زیاں نہیں

☆ ☆ ☆

مکھڑا وہ غصب زلفِ سیاہ فام وہ کافر کما خاک جیے کوئی ، سب اسی سحر اسی

☆ ☆ ☆

آزردہ مر کے کوچہ جانان میں رہ گیا دی بھی دعا کسی نے کہ جست میں گھر ملے

تسکین

میر حسین دہلوی خلف میر حیدر - ۱۸۰۳ء/۱۲۱۸ھ تا اگست ۱۸۵۲ء/ ۱۷ شوال ۱۲۶۸ھ درسیات میں صہبائی سے اور شاعری میں مومن سے تلمذ تھا ۔ شیفتہ نے 'گلشنِ بے خار' میں ان کے اسلوبِ گفتار کی اور عبدالحئی نے 'گلِ رعنا' میں ان کی

(۱) عبدالحئی ، گل رعنا - ص ۱۳۳ ، اعظم گڑھ ۱۹۵۰ء

(۲) سر سید ، آثارالصنادید ، باب چہارم - ص ۷۱ ، لکھنؤ ۱۸۹۰ء

طرزِ ادا ، معاملہ بندی ، شوخی اور صفائی کی تعریف کی ہے ۔ تلاشِ معاش میں لکھنؤ گئے ، پھر رامپور میں نواب ناظم کے ملازم ہو گئے ۔ وہیں فوت ہوئے ۔ کلام مومن سے ہمرنگ ہے (۱) ۔ ذیل میں ان کے چند شعر دیے جاتے ہیں :

تسکین نے نام لے کے نرا وقتِ مرگ آہ کا حانے کا کہا تھا کسی نے سنا نہیں

☆ ☆ ☆

تسکین کروں کیا دلِ مضطر کا علاج آہ کمبخت کو مر کر بھی ہو آرام نہ آیا

☆ ☆ ☆

نیغِ نگاہِ یار اچٹے لگی تھی ہر برسوں گذر گئے مجھے آزار کھینچتے

☆ ☆ ☆

جس وقت نظر بڑتی ہے اس سوخ بر سکس میں کیا کہوں حی میں مرے کیا کیا نہیں آنا

☆ ☆ ☆

اب یہ حالت ہے کہ ان سا بدرد مرے سخن کی دعا مانگے ہے

☆ ☆ ☆

ابھی اس راہ سے کوئی گا ہے کہی دیتی ہے سوخی نقشِ با کی

ممنون

میر نظام الدین ممنون دہلوی خلف ملک الشعراء میر الدین مستن سونی پتی ۔ طبع خدا داد کی رہنمائی سے فنِ شعر میں کمال حاصل کیا ۔ اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں ان کی شاعری کا غلغلہ بلند ہوا ۔ والد کی طرح خود بھی سرکارِ انگلشیہ میں رسوخ رکھتے تھے ۔ اجمیر میں صدرالصدور رہے ۔ پھر ضعیفی کی بنا پر دہلی میں خانہ نشین ہو گئے ۔ ۱۸۴۴ء (۱۲۶۰ھ) میں فوت ہوئے (۲) ۔ کلام میں رنگین معاملہ بندی ، صفائی ، منانت ، پختگی اور برشتگی نے عجب لطف پیدا کیا ہے ۔ ان امور میں وہ مومن کے پیشرو ہیں ۔ شعر ملاحظہ ہوں :

کس بے ادب کو عرضِ ہوس پر لگہ میں تھی

آنکھ اس نے بزم میں نہ اٹھائی تمام شب

☆ ☆ ☆

ممنون قضا نے ہم کو دیا کیا بغیرِ دل

سو وہ بھی نذرِ کابش و تشویش ہو گیا

☆ ☆ ☆

(۱) عبدالعفی ، گل رعنا - ص ۳۲۷ - شیفہ ، گلشن بے جار - ص ۱۳۸ ، کراچی ۱۹۶۶ء

(۲) عبدالعفی ، گل رعنا - ص ۲۸۴

دعا میں زیرِ لب آہستہ آہستہ اسے دوں ہوں  
جو یاد آنا ہے لب تک آکر رک جانا وہ گالی کا

☆ ☆ ☆

دل میں کما کما ہوسِ عرضِ تمنا بھی و لے  
یری جتون کا وہ ڈھب مانعِ تقریر رہا

☆ ☆ ☆

تفاوتِ قاصدِ یارو فاسد میں ہے کسا ممنوں  
وہی فتنہ ہے لکس یاں ذرا سامعے میں ڈھلتا ہے

☆ ☆ ☆

یہ نہ جانا بھا کہ اس محل میں دل رہ جائے گا  
ہم یہ سمجھے بھی چلے آئیں گے دم بھر دیکھ کر

☆ ☆ ☆

کون آئے ہے کہ سننے میں بیدار ہو گئیں  
صد آرزوئے خفتہ صدائے قدم کے ساتھ

☆ ☆ ☆

دل گرمیاں وہ ہم سے کہاں اب کہ آج کل  
ہنگامہ محبتِ اغار گرم ہے

ہمیش

حکم آغا جان دہلوی - خوش طبع ، خوش ہوس ، سگفتہ مزاج بزرگ بھی - آزاد  
نے 'آبِ حیات' میں ان کی خوش طبعی کا حال تفصیل سے لکھا ہے<sup>(۱)</sup> - مساعروں میں ان  
کا اپنے انک چیلے عبدالرحمن بد بد کو ساتھ لے کر آنا ہزار فریحوں کے برابر تھا -  
مرزا قادر بخش صابر کے بقول وہ صنائع کے استعمال ، محاورہ بندی اور صفائی زبان میں کامل  
تھے<sup>(۲)</sup> - قطب الدین باطن بھی یہی لکھنے میں<sup>(۳)</sup> - کلام کا رنگ یہ ہے :

بس ادب ذوقِ طبعان ہو چکے ہیں سوربور  
ہاتھ اس قابل کے خوں میں سب کے سب ساوون نلک

☆ ☆ ☆

(۱) آزاد ، آبِ حیات - ص ۴۵۵ لاہور - طبع یازدہم -

(۲) صابر ، گلستانِ سخن ، حصہ دوم - ص ۲۴۷ - مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۵ء

(۳) باطن ، گلستانِ بے خزاں - ص ۱۶۹ - نولکشور ۱۹۲۹ء -

مانا کہ ستم کرتے ہیں معشوق مگر آپ جو مجھ پہ روا رکھتے ہیں اسلئے نہیں ہوتا  
کہتا ہے کوئی شعلہؔ جوالہ کوئی برق اس دل پہ گاہ لوگوں کو کیا کیا نہیں ہونا



اک زلف کا بل ہو ہو کہوں، سینکڑوں بل ہیں پیسانی سے ابرو ہلک ابرو سے کمر نک

### قلق

حکیم غلام مولا فلق ، (م - ۱۵ جولائی ۱۸۸۰ء) تعلیم و درست کے مرحلے دہلی میں  
طے کیے۔ فنِ شعر میں مومن کے شاگرد تھے۔ حکیم مومن خاں نے اس شاگرد کی تربیت پر  
بہت توجہ کی تھی۔ مولانا حالی لکھتے ہیں کہ استاد کے انداز میں انہوں نے وہ یختگی  
حاصل کی تھی کہ حاضرینِ مشاعرہ حیران رہ جاتے تھے<sup>(۱)</sup>۔ مومن کی سی متین و مہذب  
معاملہ بندی، عشقِ مجازی کی کسک، نارسا تراکب اور کلام کے بعض اجزا کو  
حذف کر حانا ان کا سیوہ ہے۔ دیوان میں غزلوں کے علاوہ جو مرثیے، ترجیع بند اور  
واسوخت ہیں سب میں مومن کا رنگ ہے۔ نمونے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

زور آزمائی کرتے ہیں بے طاقتی سے ہم انہی ہی بارِ دوس ہیں واماندگی سے ہم  
کیا اسے ہی دلیل تھے پہلے بھی چاہ سے احوال انا بوجھتے ہیں آپ ہی سے ہم  
ڈالو بھی خاک غیر کی صورت پہ تم کہیں مرجائیں ناکہ رسک میں دب کر اسی سے ہم  
م ہو نہ اپنے بس میں نہ ہم اپنے ضبط میں مجبور ہم ہو غیر سے، ناچار جی سے ہم  
ہے رحم کی جگہ، حوکجہ انصاف دل میں ہو داس برا نکڑتے ہیں کس سادگی سے ہم

رسے میں عمر رفتہ گئی جھوڑ کر قلق

اب اپنے بارِ دوس ہیں واماندگی سے ہم

## (د) لکھنؤ کے شعراء

صبا

میر وزیر علی ابن بندہ علی لکھنوی، فارسی کی اچھی تعلیم یافتہ تھی۔ آتش سے مشورہ سخن کرے تھے۔ کلام میں صحتِ زبان، صفائی، لطفِ سخن اور بندش کی چستی انہیں ان کے معاصروں سے ممتاز کرتی ہے<sup>(۱)</sup>۔ ۱۸۵۳ء (۱۲۷۱ھ) میں فوت ہوئے۔ یہ چند اشعار ان کے اندازِ سخن کو واضح کر سکتے ہیں:

دل میں اک درد اٹھا، آنکھوں میں آنسو بھر آئے  
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانے کا یاد آیا

☆ ☆ ☆

کوچہ عشق کی راہیں کوئی ہم سے بوجھے  
خضر کیا جانیں غریب اگلے زمانے والے

☆ ☆ ☆

کس پاس سے کہتا ہوں میں ان سے دمِ رخصت  
لو جاؤ بس اللہ نگہبان تمہارا

☆ ☆ ☆

واغظ کے میں ضرور ڈرانے سے ڈر گیا  
جامِ سراب لائے بھی ساقی کدھر کا

☆ ☆ ☆

ہمارا دل انہی کے پاس نکلا، ہم نے پہچانا  
گواہی دی زمانے بھر نے اک عالم نے پہچانا

وزیر

خواجہ محمد وزیر ابن خواجہ محمد فقیر لکھنوی۔ فارسی، عربی، عروض اور قافیہ میں اچھا دخل تھا۔ ناسخ کے ساگرد تھے۔ گوشہ نشینی اور اعمال و فتوح و نسخہ کا شوق تھا۔ ان کی شاعری میں لکھنؤ کی لطافت، نزاکتِ خیال، رعایتِ لفظی اور زبان کی درستی تو ہے، لیکن وہ تاثیر اور حسن سے عاری ہے۔ اس وجہ سے عبدالحی ان کی شاعری

(۱) عبدالحی، گل رعنا - ص ۲۵۵ - اعظم گڑھ - عبدالسلام ندوی، شعر الہند حصہ اول - ص ۲۷۱

کو حسین لیکن بے روح لاش سے شبیہ دیتے ہیں<sup>(۱)</sup> - ۱۸۶۰ء (۱۲۷۷ھ) میں فوت ہوئے۔  
شعر ملاحظہ ہوں :

کہئے یارانِ عدم کیا گذری کحولِ گور سے فرمائے گا

☆ ☆ ☆

چلا ہے اور دل راحت طلب کیا شادماں ہو کر  
زمینِ کوئے جاناں رخ دے گی آسماں ہو کر

☆ ☆ ☆

کیا قتل اس نے غیروں کو موئے ہم رسک کے مارے  
احل بھی دوستو آئی نصبِ دسماں ہو کر

ولد

(۱۷۹۷ء تا ۱۸۵۷ء) - نواب سید محمد خاں ابنِ غیاث الدین حو برہان الملک  
سعادت خاں کے بھانجے تھے۔ فض آناد میں میر خلیف سے مشورۂ شعر کرتے تھے<sup>(۲)</sup>۔  
۱۸۲۳ء میں لکھنؤ آگئے تو آس کے ساگرد ہوئے۔ صحتِ زبان اور بلندیِ خیال  
میں صبا سے پچھے ہیں، لیکن صفائی، جستی، بندس اور نائیر کا رنگ ان کے کلام  
میں ضرور ہے۔ کچھ شعر دیکھئے :

چھوڑا فقس سے نب ہمیں صناد ہوئے آہ جب موسمِ بہار چمن سے نکل گیا

☆ ☆ ☆

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں نو ہائے گل پکار، میں چلاؤں ہائے دل

☆ ☆ ☆

بہار آئے الہی چمن پری ہو جائے یہ زرد زرد ہر اک سنے ہری ہری ہو جائے

☆ ☆ ☆

نہ پھیروں گا منہ، ہوں وہ جانباز عاشق اگر نیغ پر نیغ قاتل پڑے گی

خلش اس مژہ کی یہی ہے جو دل سے مجھے سانس لینی بھی مشکل پڑے گی

چمک حسن کی جو یہی ہے نو اک دن تری دھوم او ماہِ کامل پڑے گی

چڑھاؤں گا کل گورِ مجنوں پہ اے رند نظر جب وہ لیلِ سائل پڑے گی

☆ ☆ ☆

اگر کا ہے گاں، شک ہے ملا گیری کا رنگ لایا ہے دوپٹہ ترا میلا ہو کر

(۱) عبدالعفی، گل رعنا - ص ۳۷۲ - عبدالسلام ندوی، شعر الہند حصہ اول - ص ۲۸۱ -

(۲) سری رام، خمغانہ جاوید، ج ۳ - ص ۵۱۸، دہلی ۱۹۱۷ء - عبدالعفی گل رعنا، ص ۳۷۸ -

## میر دوست علی خلیل

میر دوست علی ، آتش کے دوست ، شاگرد اور ہمدم تھے ۔ آتش کے مرنے کے بعد یہی ان کی بیوہ اور بچوں کی کفالت کرتے رہے ۔ صفائی و روانی جو تلامذہ آتش کا خاص وصف ہے ، ان کے کلام میں بھی ہے ، لیکن کہیں کہیں ثقل الفاظ ، دقیق استعارے اور صنائع کی افراط کلام کو بھٹا بنا دیتی ہے ۔ جسے :

کبھی دیکھا جو ابلتی ہوئی مے کو خم سے  
جوس اپنی بھی جواں کا ہمیں یاد آیا

☆ ☆ ☆

بزم سے یار نے یہ کہہ کے نکالا ہم کو  
اٹھسے گھر جائیے دم لے چکے سستائے بہت

☆ ☆ ☆

چمن چمن یہ نسیمِ سحر پکار آئی  
خزاں نے کوچ کیا بلبلو بہار آئی

## نسیم

پنڈت دیا شنکر کول ولد گنگا پرشاد - ۱۸۱۱ء تا ۱۸۴۳ء - سرکارِ اودھ میں فوجِ ساہی کے وکیل اور محاسب تھے - ۲۷ برس کی عمر میں ’گلزارِ نسیم‘ جیسی شہرہ آفاق مثنوی کہی ، جو آرائشِ لفظ اور حسنِ معانی کا شاہکار ہے ۔ آزاد کے بقول ”اس کے پیچ میں وہ بانکپن کی مروڑ ہیں ، جو بانکی پریزادیں آڑا دوہنہ اوڑھ کر دکھاتی ہیں ۔ اس کی باریکیوں کو سب سمجھیں یا نہ سمجھیں لیکن شوق سے پڑھتے ہیں اور جتنی سمجھ میں آتی ہے اسی پر لوٹے جاتے ہیں“ ۔ غزل گوئی میں اپنے استاد آتش کی خصوصیات یعنی صفائی ، چستی اور تاثیر سے بہرہ مند ہیں ۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :

منت دلا کسی کی نہ اصلا اٹھائیے      مر جائیے نہ نازِ مسیحا اٹھائیے  
چاہ اپنی مانتا نہیں وہ بے یقین اگر      قرآن کا جامہ پہنچے ، گنگا اٹھائیے

☆ ☆ ☆

گر نہ جیتے جی مرے کام آئے گی      عاقبت دنیا مری بخشائے گی  
جاں نکل جائے گی بن سے اے نسیم      کل کو بوئے گل ہوا بتلائے گی

☆ ☆ ☆

زنجیرِ جنوں کڑی نہ ہڑیو دیوانے کا پاؤں درمیاں ہے  
ذّرے کا بھی چمکے گا ستارہ قائم جو زمین و آسماں ہے

## وشک

میر علی اوسط ، ناسخ کے خاص شاگرد تھے۔ مضمون بندی میں تو نہیں لیکن اصلاحِ زبان ، پابندیِ قواعد اور الفاظ کی بہتات میں استاد سے بھی آگے تھے۔ اگرچہ اصلاحِ زبان کے بعض نظروہ اردو کے محسن ہیں لیکن قواعد کی پابندی ، ہر قافیے کو نظم کرنے کا سو فی اور ہر گوئی کی دھن نے انکی ساعری کو غارت کر دیا۔ چنانچہ تازگی مضمون اور دل آویزی سے ان کا کلام خالی ہے <sup>(۱)</sup>۔ کربلائے معلیٰ حا کر ۱۸۶۷ء (۱۲۸۳ھ) میں فوت ہوئے۔ کلام کا رنگ یہ ہے :

ے رسک رمیوں سے ملاقات نکالی طارۂ جاناں کی عجب گہات نکالی

☆ ☆ ☆

کابینگی جسم اگر یوں ہی رہے گی ہم نو بھی ہارا بنِ لاعر نہ ملے گا

☆ ☆ ☆

ہوا کیا وصف چنتے نے کمر پائی اگر پتلی ہمارے ہونٹ پتلے ، انگلیاں پتلی ، کمر پتلی

## برق

مرزا محمد رضا ، واجد علی شاہ اختر کے مصاحب ، ندیم ، استاد اور یارِ وفادار تھے۔ ۱۸۵۶ء میں انتزاعِ سلطنت پر اپنے ولی نعمت کے ساتھ جلا وطن ہو کر مشیا برج کلکتہ چلے گئے اور چند ماہ بعد وہیں ۱۸ اکتوبر ۱۸۵۶ء مطابق ۱۸ صفر ۱۲۷۳ھ کو جاں بحق تسلیم کی۔ ان کا یہ شعر ان کے حسبِ حال ہو گیا۔

برق جو کہتے تھے آخر وہی کر کے اٹھے جان دی آپ کے دروازے پہ مر کے اٹھے

ناسخ کے شاگرد تھے لیکن کلام میں تکلف یا تصنع کے بجائے بے ساختگی ، چستی بندش اور آتش کی سی گرمی ہے ، مثلاً :

اودی کرتی ، لال چکن اور اس پہ سنہری گوٹ لگی

ابر سے لکلا چاند کا ٹکڑا ، برق کے دل کو چوٹ لگی

☆ ☆ ☆



شکوہ میں نے جو کیا جائے سکایت یہ نہیں  
جس سے ہوتی ہے امید اس سے گلہ ہوتا ہے

☆ ☆ ☆

اذان دی کعبے میں ، ناقوس دیر میں ہونکا  
کہاں کہاں نرا عاشق تجھے بکار آیا

☆ ☆ ☆

قیس کا نام نہ لو ، ذکرِ جنوں جانے دو  
دیکھ لینا مجھے تم موسمِ گل آنے دو

بھر

امداد علی خلف سخ امام بخش - ۱۸۱۰ تا ۱۸۸۳ء - ناسخ کے شاگرد تھے - ناہم  
ثقافت و غرائب اور الجھاؤ سے بچ کر سلاست ، صفائی ، رنگی اور بے ساختہ بن بر مائل  
تھے - قادر بخش صابر ان کی مصموں آفرینی کا مداح ہے - عمر کا بستر حصہ چھوٹی بگم  
لکھنو کی سرکار میں اور غدر کے بعد کچھ عرصہ کلب علی خاں کے دربار میں گزارا - پھر  
بڑی التجا سے لکھنو واس آنے کی اجازت لی اور یہیں کی خاک کا بیوند ہوئے -  
کلام کا رنگ یہ ہے :

دوپٹے کو آگے سے دہرا نہ اوڑھو نمودار چیزیں جھپٹے سے حاصل  
مسم کھاؤ ان کی جنہیں چاہتے ہو مرے سر کی سوگند کھائے سے حاصل

☆ ☆ ☆

حور بن کر مرے کشتے کی مضا آتی ہے دامنِ بیغ سے جست کی ہوا آتی ہے

☆ ☆ ☆

بتو خدا پہ نہ رکھو معاملہ دل کا بھلا برا ہیں ہو جائے فیصلہ دل کا

منیر

اسمعیل حسین شکوہ آبادی شاگردِ ناسخ - ۱۸۱۳ء تا ۱۸۹۱ء بہت فصیح  
البیان ، قادر الکلام ، زود گو تھے (۱) - مزاج میں رنگینی تھی - کسی طوائف کے قتل کی  
تہمت یا پاداش میں ۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۵ء تک انڈمان میں قید رہے - نواب کلب علی خاں

کی سعی و سفارش سے رہا ہو کر رام پور آئے اور وابستہ دربار ہوئے<sup>(۱)</sup>۔ کلام میں صفائی، روانی اور قادر البیانی کا وصف ہے۔ الفاظ کے معنوی رابطے قائم کرنے اور ان سے مضمون آفرینی میں مشغول ہیں۔ مشکل زمینوں اور بے ڈھب قافیوں کو نظم کرنے میں ماہر ہیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

لہئے ہوئے رہتے مری گردن سے ابد تک  
دو ہاتھ اگر آپ کی دلوں کے ہوتے  
دل کرتے نہ یوں آپ کے گسوئے معبر  
ٹھکے میں اگر طبلہ عطار کے ہوتے

☆ ☆ ☆  
اگر بخیر کروں گا چاک دل کا ریح ناؤں گا  
بنے گی نیر غرق سوزنِ ندیر جنکی میں  
☆ ☆ ☆  
نہیں ہونا کبھی اس یوسف ثانی کا گزر  
چشمِ یعقوب کا جالا تو میرے گھر میں نہیں

آباد

سہدی حسن خلف، غلام جعفر خاں - شاگردِ ناسخ - ولادت ۱۸۱۳ء - یابندِ وضع، خوش معاش، فارغ السال، زود مشق، پرگو آدمی تھے<sup>(۲)</sup>۔ ناسخ اور آتش کے ساتھ ہم طرح غزلیں کہی ہیں۔ کلام میں لکھنؤ کے عام انداز کے باوجود اخلاق و حکمت کے نکتے بھی ہیں۔ مثلاً:

روشنی ہائی سخاوت سے جہاں میں نام ہے  
ہر درم گویا چراغِ مرقدِ حاتم ہوا  
☆ ☆ ☆  
جنبِ دل نے آج کوئے یار میں پہنچا دیا  
جیتے جی میں گلشنِ جنت میں داخل ہو گیا

اسیر

مظفر علی ابنِ مدد علی ساکن امیٹھی ضلع لکھنؤ - شاگردِ محصنی ۱۸۰۲ء تا ۱۸۸۱ء - نصیر الدین حیدر اور واجد علی شاہ کے متوسل تھے - جب واجد علی شاہ

(۱) حیدر علی - تحقیقی مقالہ ایم اے - سنیر - ص ۳۶، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۶۶ء -

(۲) مری رام، خمخانہ جاوید، ج ۱ - ص ۱ - لاہور ۱۹۰۸ء -

معزول ہوئے تو یہ رام پور آ کر یوسف علی خاں ناظم اور بعد ازاں کلب علی خاں کے دربار سے وابستہ رہے۔ قواعد، عروض، ہرگوئی اور قادر البیانی میں کامل تھے۔ چہ دیوان لکھے تھے<sup>(۱)</sup>۔ امیر مینائی، احمد علی سونو اور ریاض ان کے شاگرد تھے<sup>(۲)</sup>۔ کلام میں پختگی اور متانت ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں :

صبر منظور ہے دیدارِ بتاں سے چندے  
اس میں کیا کہتے ہو اے دیدہ و دل تم مجھ کو

☆ ☆ ☆

بتکدے کی میں سیر کر آیا واں خدا ہی خدا نظر آیا

☆ ☆ ☆

یادِ ایام کہہ رہتے تھے کھنچے یار سے ہم  
اب یہ عالم ہے کہ جھکنے لگے اغیار سے ہم

☆ ☆ ☆

یہ خیال نہا ہمیں دمبدم کہ بہار دیکھیں گے اب کی ہم  
جو چھٹے اسیرِ قفس سے ہم ہو سنا خزاں کے دن آگئے

☆ ☆ ☆

ذکی

شیخ مہدی علی خاں خلف کرامت علی لکھنوی، شاگردِ ناسخ۔ مراد آباد میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ، دہلی، انبالہ، سہارنپور اور حیدر آباد دکن میں وقت گزارا ہے۔ نواب محمد سعید خاں سے بعلی اور غازی الدین حیدر سے دوستی رہا ہے۔ آپ زود فکر، شیریں کلام اور صنّاع تھے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو :

کھلا کیہلنے میں گل کے مدعا رخصت کا گلشن سے  
صدائے الفراق آئی جو ٹوٹا زخم کا ٹانکا  
سمجھ کر ساقِ دریا دل ان ہانوں کے چھالوں کو  
زباں سوکھی دکھاتا ہے ہر اک کانٹا یاباں کا

☆ ☆ ☆

(۱) امیر مینائی، انتخابِ یادگار - ص ۱۲۵ - ۱۸۱۸ء

(۲) عبدالحمی، گل رعنا - ص ۱۹۷ -

صیاد نے خبر بھی نہ لی مرغِ دل کی حیف آخر تڑپ تڑپ کے تہِ دام رہ گیا

### امانت

سید آغا حسن خلیف میر آغا لکھنوی - ۱۸۱۵ء تا ۱۸۵۸ء - تیز مشق ، ہر گو اور صنعت کار تھے - رعایتِ لفظی کو اس کثرت سے اور بعض جگہ اس خوبی سے برتا ہے کہ شبلی انہیں اس سریت کا پیغمبر کہتے ہیں - 'خزائن الفصاحت' ، 'گلدستہ امانت' ، 'اندر مہا' اور مرانی و سلام کا مجموعہ ان کی تصنیف<sup>(۱)</sup> ہیں - کلام کا انداز یہ ہے :

لبِ جاں بجنس کی الفت میں لب پر جان آئی ہے  
مریضِ عشق مرنا ہے مسبحا کی دہائی ہے

☆ ☆ ☆  
کیا انگہا کو چست اس نے نوشب کو ہو گئی روشن  
کٹوری کے کنول میں سمع انگشتِ حنائی کی

☆ ☆ ☆  
بخشی ہے نزاکت یہ مرے گل کو خدا نے  
کنگھی کبھی کی سر میں ہو شل ہو گئے شانے  
صد شکر کہ سودا نہ ہوا زلفِ بتاں کا  
اس پیچ میں ڈالا نہ امانت کو خدا نے

### شوق

نصرت حسین نواب مرزا شوق لکھنوی - شاگرد آتش - طبیب واجد علی شاہ - زبان کی صفائی ، روز مرہ کی لطافت اور روانی میں سمرائے لکھنؤ میں سب سے ممتاز ہیں - اپنی مثنویوں بالخصوص 'زہرِ عشق' کی بدولت ہمت نام پایا ، لیکن حالی لکھتے ہیں کہ نور کے فرشتے سے ظلمت کا کام لیا ہے<sup>(۲)</sup> - عبدالماجد دریا بادی نے اس رائے کی مدلل تردید کر دی ہے<sup>(۳)</sup> - صفائی زبان اور روانی کلام کا نہ عالم ہے کہ میر حسن کی مثنوی منزلوں پیچھے رہ گئی ہے - غزل میں بھی یہی صفائی ہے :

موت سے کس کو رستگاری ہے آج وہ کل ہماری باری ہے  
صبحدم طائرانِ خوش الحان پڑھتے ہیں کل من علہا فان  
☆ ☆ ☆

(۱) سری رام ، خمغانہ جاوید ، ج ۱ - ص ۱۰۴  
(۲) سری رام ، خمغانہ جاوید ، ج ۱ - ص ۳۰۱  
(۳) مقدمہ شعر و شاعری - ص ۱۵۵ دہلی ۱۹۱۵ء

اب کوئی اس میں کیا دلیل کرے جس کو چاہے خدا ذلیل کرے

☆ ☆ ☆

سو رخ پر ہوا سے ہلتے ہیں چلیے اب دونوں وقت ملتے ہیں

☆ ☆ ☆

سبز نخلِ کلِ جوانی بھا حسنِ یوسف فقط کہانی بھا

☆ ☆ ☆

فابو میں نہیں ہیں وہ ہمارے کئی دن سے

پہرنے ہیں انہیں غیر ابھارے کئی دن سے

کس کسہ کا کل کا کسا سوگ مری جان

گہسو بھی نہیں تم نے سنوارے کئی دن سے

اختر

نواب واحد علی شاہ خلف امجد علی شاہ - ۱۸۶۷ء تا ۲۱ ستمبر ۱۸۸۷ء اول اول ہوش مندی سے حکومت کی ، لکھی بعد ازاں راگ رنگ اور غنچ و عسرب میں بڑ گئے - انگریزوں نے بد نظمی کا الزام لگا کر ۳۱ جنوری ۱۸۵۶ء کو معزول کر کے مٹیا برج کلکتہ میں رکھا - وہاں بھی خوس باسی ، درخرچی اور حسن کاری کا رنگ دکھایا اور مٹیا برج کو لکھنؤ کا نمونہ بنا دیا<sup>(۱)</sup> -

موسیقی ، ساست ، عروض اور شاعری میں ان کی چالیس تصانیف ہیں - مثنویوں میں ذاتی حالات نظم کئے ہیں - کلام میں دبستانِ لکھنؤ کی رنگینی ، صنعت کاری ، تعیش اور پرگوئی کا رنگ ہے :

الہی نور کا پتلا بنا دے میری مٹی کو

بتوں کے واسطے پتھر کا کر دے فلب کو ، جی کو

عبث انگیا سے اپنا سینہ پر نور ڈھانپا ہے

حبابوں نے دکھایا صاف اس پیرے کی تفتی کو

☆ ☆ ☆

تری یاد کا دل میں وہ جوش ہے غمِ دین و دنیا فراموش ہے

☆ ☆ ☆

یہی ستویس سب و روز ہے بنگالے میں

لکھنؤ پھر بھی دکھائے گا مقدر میرا

## کتابیات

آراد	آبِ حیات	لاہور، طبع یاز دہم، ۱۹۴۹ء
ابوالسّیث صدیقی	لکھنؤ کا دبستانِ ساعری	اردو مرکز، ۱۹۶۶ء
انت	واسوخت	مجلسِ برقی ادب لاہور ۱۹۶۳ء
باطن، قطب الدین	گلستانِ ے خزاں	نولکشور پریس ۱۸۷۳ء
شیر الدین احمد	واضع دار الحکومت دہلی	مسنی پریس دہلی ۱۹۱۹ء
حالی	معینہٴ سرو ساعری	دہلی ۱۹۱۵ء
حالی	یادگارِ غالب	مجلسِ برقی ادب لاہور ۱۹۶۳ء
رام بابو سکسینہ	نارخ ادب اردو	لاہور ۱۹۶۰ء
رسوا	اسراؤ جان ادا	مکتبہ معین الادب ۱۹۶۸ء
سر سید احمد خاں	آثار الصنادید	دہلی ۱۹۰۴ء
سر سار	فسانہٴ آراد	نولکشور لکھنؤ ۱۹۰۸ء
سری رام	حمخانہٴ حاوید	لاہور و دہلی ۱۹۰۸ء
سودا	کتاب	نولکشور لکھنؤ ۱۹۳۷ء
سلی	موازنہٴ انس و دیر	آگرہ ۱۹۲۵ء
صابر	گلستانِ سخن	نولکشور ۱۸۷۳ء
عبدالسلام	سعرالہند	اعظم گڑھ ۱۹۴۹ء
عبدالحنی	گلِ رعنا	اعظم گڑھ ۱۹۵۰ء
عبدالحق	مرحوم دہلی کالج	انجمن برقی اردو ہند ۱۹۳۵ء
عرس	حبابِ مومن	دہلی ۱۹۳۱ء
غالب	کلیاتِ فارسی	نولکشور لکھنؤ ۱۹۲۵ء
غالب	اردوئے معلیٰ	لاہور ۱۹۱۸ء
فیض الدین	نظمِ آخر	دہلی ۱۸۹۱ء
فاسم	مجموعہٴ نغز	لاہور ۱۹۳۳ء
قلق	گلستان	مطبع انصاری دہلی ۱۸۸۳ء
گارساں دی ناسی	خطبات (مترجم)	انجمن برقی اردو ہند ۱۹۳۵ء
محمد عتیق صدیقی	گلکرسٹ اور اس کا عہد	علی گڑھ ۱۹۶۰ء
مومن	دیوانِ فارسی	مطبع سلطانی دہلی ۱۹۷۱ء
مہر غلام رسول	سیرۃ سید احمد شہید	لاہور ۱۹۵۲ء
مہر غلام، رسول	غالب	لاہور ۱۹۵۱ء

لذیر احمد	توبہ النصوح	برق پریم دہلی ۱۹۳۶ء
وزیر حسن	دلی کا آخری دیدار	دہلی ۱۹۳۵ء
نورالحسن ہاشمی	دلی کا دبستانِ شاعری	انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۴۲ء
یوسف حسین ڈاکٹر	اردو غزل	حیدر آباد ۱۹۵۷ء

- 1, *Encyclopedia Britannica. Vol. VIII, New York 1961.*
2. Percival Spear. *Twilight of the Mughals, Cambridge 1951.*
3. Sleeman. *Rambles & Recollections, London 1893.*
4. Tara Chand Dr. *Influence of Islam on Indian Culture. Allahabad, 1956.*

## نواں باب

(الف) میر بہر علی ایس

اردو ادب کی اکثر اصناف کی طرح مرثیہ گوئی کا آغاز بھی دکن میں ہوا<sup>(۱)</sup>۔ بیجا پور اور گولکنڈے کے سلاطین سب سے بھی۔ لہذا ان کے عہد میں اس صنف نے بہت فروغ پایا۔ سولہویں صدی کے آخر میں اس صنف سخن کی معمولیت کا یہ حال تھا کہ اورنگ زیب عالمگیر کے سپاہی جب دکن میں رہ کر اپنے وطن سہلی ہند کو واپس جاتے تو انہیں دکنی شعراء کے مرثیے زبانی یاد ہوتے، جنہیں وہ وطن میں سنایا کرتے<sup>(۲)</sup>۔ اس طرح شمالی ہند میں مرثیہ گوئی کا رواج بڑھا۔ اٹھارویں صدی کی ابتدا کے مرثیہ نگار شعراء میں سکندر، گدا اور مسکن کے نام زیادہ معروف ہیں۔ ان کے بعد میر تقی میر اور مرزا سودا نے فنی حنیف سے اس طرف توجہ کی۔ بلکہ مرزا سودا نے انہی کلمات کے آخر میں تنقیدی جائزے کے ضمن میں مرثیہ گو مسکن کو مشکل ترین صنف قرار دیا اور مرثیہ لکھنے والوں کو ہدایت کی کہ اصولِ فنِ ساعری کو ملحوظ رکھیں اور ”محض برائے گریہ“ عوام اپنے نہیں ماموخذ نہ کریں<sup>(۳)</sup>۔

انیسویں صدی کے آغاز میں میر مظفر حسین ضمیر اور میر مستحسن خلیق نے اس فن کو لطافت و عظم سے ہمکنار کیا۔ مرثیے کی پشیم سب سے مسدس قرار پا چکی تھی، جو مطالب کو بمصیل سے بیان کرنے یا کسی موضوع کو وسعت اور قوت سے پیش کرنے کے لیے مناسب ہٹ ہے۔ میر ضمیر نے دہلی کے نکسالی زبان استعمال کی اور واعیات کرپلا کو دلکش صورت میں بیس کیا۔ انہوں نے مرثیے میں چہرہ، سراپا، آمد، مبارز طلبی، معرکہ آرائی اور منظر نگاری کی جدتیں کیں۔ میر خلیق کے ہاں، لطفِ زبان، تاثیر اور خلوص ایسی صفات تھیں جو ان کے کلام میں ہزار حسن پیدا کر دیتی ہیں۔ ذیل کے دو بند ان استادوں کے اسلوب اور فنی تکنیک کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں :

سپیدہ صبح کا جب دن میں آشکار ہوا      میانِ لشکرِ کیں سورِ کارزار ہوا  
ہر اک ادھر بھی مسلح رقیب و یار ہوا      سوارِ دوسِ رسولِ خدا سوار ہوا

(۱) عبدالسلام، شعرا ہند، جلد دوم - ص ۱۲۸ - اعظم گڑھ ۱۹۵۴ء

(۲) میر حسن، تذکرہ شعراء - ص ۱۲۳ - علی گڑھ ۱۹۲۲ء

(۳) سودا، کلیات، جلد ۲ - ص ۴۴۴ - لکھنؤ ۱۹۳۲ء - شیخ چاند - ص ۲۸۱ - کراچی ۱۹۶۳ء



علمِ عدو نے جو میدان میں آن کھول دیا  
نشانِ مرنضوی نے نشان کھول دیا (ضمیر)

☆ ☆ ☆

کھر سے جب بہرِ سفر سیدِ عالم نکلے سر جھکائے ہوئے با دیدہٗ پرہم نکلے  
خویش و احباب کمر باندہ کے باہم نکلے روکے فرمایا کہ اس شہر سے اب ہم نکلے

رات سے گریہٗ رہرا کی صدا آتی ہے  
دیکھیں قسمت ہمیں کس دست میں لے حلی ہے (خلیق)

ان بزرگوں نے مرثیہ گوئی کو انک با وقار سطح پر پہنچا دیا اور ان کے شاگردوں  
یعنی دبیر اور انیس نے بیانیہ شاعری، یعنی منظر نگاری، واقعہ نگاری اور جذبات نگاری کے  
اعلیٰ شاہکار پیش کیے۔

انیس ۱۸۰۱ء اور ۱۸۰۵ء کے درمیان بمقام فیض آباد پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم  
گھر میں اپنی والدہ سے پائی۔ مولوی نجف علی سے درسیات کی اور مولوی حیدر علی سے  
عربی کی تحصیل کی۔ فتنہٴ شعر بالخصوص مرثیہ گوئی میں اپنے والد میر خلیق سے استفادہ  
کیا۔ اول اول غزلیں کہا کرتے تھے۔ حزنِ تخلص بھا۔ پھر شیخ ناسخ کے فرمانے  
سے انیس تخلص رکھا، اور باپ کی ہدایت سے غزل کو سلام کتا<sup>(۱)</sup>۔ جب ضعفی نے  
خلیق کو گوسہ نشین کیا تو ہمہ تن مرثیہ گوئی کی طرف موجہ ہو گئے اور ساری عمر  
اسی مشغلے میں گزار دی۔ ۹ دسمبر ۱۸۷۴ء بہ عارضہٴ سہ فوب ہوئے۔ عمر کا حاصل  
تقریباً دو لاکھ اشعار تھے<sup>(۲)</sup>۔ جن میں تقریباً پچاس ہزار اشعار چھ جلدوں میں جہت چکے  
ہیں۔ باقی سرمایہٴ اقرباء کی بے توجہی سے تلف ہو گیا۔

میر انیس نہاں اودہ احمد علی اور واجد علی کے زمانے میں تھے۔ انیس کے مزاج  
میں خاندانی روایات کے زیر اثر رکھ رکھاؤ، سراف، متانہ اور عزت نفس موجود تھی۔  
معینہ اصولوں کو ضعیفی تک قائم رکھا۔ مزاج میں غیرت و استغنا کا عنصر غالب تھا۔  
اس لیے خود داری نے دربار تک جانے کی اجازت نہ دی۔ البتہ قدر دانوں کی فرمائش سے  
عظیم آباد، الہ آباد، بنارس اور حیدر آباد دکن بھی گئے۔

میر انیس کشیدہ قامت، خوش اندام، گندمی رنگ، سٹول ورزشی جسم کے جوان  
تھے اور ایسے کہ بڑھاپے میں بھی منبر پر بیٹھتے تو جوانی کا عالم دکھاتے تھے۔ نوجوانی  
میں فیض آباد کے امیر زادوں کی صحبت میں سپہگری کا فن سیکھا تھا۔ ورزش کے پابند

(۱) آزاد، آبِ حیات - ص ۵۴۲ - لاہور ۱۹۴۸ء  
(۲) احمد علی اشہری، حیاتِ انیس - ص ۲۶ - آگرہ ۱۹۲۴ء

تھے۔ لکھنؤ آکر میر کاظم علی سے ہانک، پٹے اور لکڑی کے ہاتھ سیکھے۔ لیکن ان فنون کی تکمیل ان کے بٹے امیر علی سے کی۔ اس میں بوی و سعداری اور اصولِ شرافت کا اتنا خیال رکھتے تھے کہ ننگے بدن مشق نہ کرتے تھے۔ بلکہ اس مقصد کے لیے ہلکا پہلا چست لباس سلوا لیا تھا<sup>(۱)</sup>۔ مرثیہ خوانی کا فن اس خاندان میں موروثی تھا۔ اس خانوادے کے اکثر باکمال خلوت میں قد آدم آئینہ سامنے رکھ کر خواندگی کی مشق کرتے اور اپنے عیب و ہنر کو خود پرکھتے تھے<sup>(۲)</sup>۔ خلوصِ فن، ریاض اور ذوقِ سلیم نے ان کے تحت اللفظ مرثیہ خوانی میں وہ جوہر پیدا کر دیے تھے کہ ادھر وہ سبر پر پہنچے اور ادھر اہل مجلس کی پوری بوجہ ان کی طرف منعطف ہو گئی۔ شمس العلماء ذکاء اللہ خاں اللہ آباد والی مجلس میں، ان کی شاعری اور مرثیہ خوانی کا بیان یوں کرتے ہیں :

”میں بھی دھوپ میں کھڑا ہو کر دور سے سننے لگا۔ یہ معلوم ہونا تھا کہ میر پر ایک کل کی کڑیا بیٹھی ہوئی لڑکوں پر جادو کر رہی ہے۔ میرے کپڑے سینے سے تر ہو گئے۔ اور پاؤں خون اترنے سے سل ہو گئے۔ لیکن جب تک میر انس کی صورت دیکھتا اور ان کا مرثیہ سنتا رہا مجھے کوئی بات محسوس نہ ہوئی۔ میر نے اس سے پہلے کبھی ایسا خوش بیان نہیں سنا اور نہ کسی کے ادائے بیان سے یہ مافوق العادب اثر پیدا ہوتے دیکھا۔“<sup>(۳)</sup>

لکھنؤ کے امراء نے میر صاحب کی بہت قدر دانی اور ناز برداری کی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد وہ صحبتیں برہم ہو گئیں تو ۱۸۵۹ء میں نواب قاسم علی خاں کی طلب پر عظیم آباد (پٹنہ) گئے۔ پھر ۱۸۷۱ء میں رجب علی ارسطو جاہ کے بیٹے مولوی سرف حسین کی تحریک سے نواب تھور جنگ نے حیدر آباد دکن بلایا<sup>(۴)</sup>۔ وہاں ساندھار مجلسیں ہوئیں لیکن لکھنؤ سے سخن شناس سامعین نہ ملے۔ لہذا اس سفر سے خوس نہ ہوئے۔ نازک مزاجی کا یہ عالم تھا کہ پڑھے میں جب کبھی کوئی بلیغ مصرع زبان سے ادا ہوتا تو مرثیہ توڑ کر زانو پر رکھ لیتے اور حسرت سے کہتے کہ ”ہائے لکھنؤ تجھے کہاں سے لاؤں“۔ اس عالم میں سعداری کا یہ حال تھا کہ جب نواب آسمان جاہ بہادر نے اپنے ہاں مجلس پڑھنے کے لیے بلایا تو محض اس لیے انکار کر دیا کہ موصوف کی سرکار میں درباری دستار

(۱) مہدی حسن احسن لکھنوی، واقعات انیس - ص ۳۰ - لکھنؤ ۱۹۲۵ء - امجد علی اشہری،

حیات انیس - ص ۲۲ و ۲۳ - آگرہ ۱۹۲۴ء -

(۲) آزاد، آب حیات - ص ۵۴۹ - لاہور ۱۹۴۸ء

(۳) امجد علی اشہری، حیات انیس - ص ۳۲ -

(۴) مہدی حسن احسن، واقعات انیس - ص ۱۲۸ -

پہن کر جانا لازمی شرط تھی۔ اور انیس اپنی پنج گوشہ ٹوپی اتار کر دستار پہننے کے لیے تیار نہ تھے<sup>(۱)</sup>۔

میر صاحب کی یہ نازک مزاجی آج کل کچھ عجب معلوم ہو گی۔ لیکن ان کے کمالِ فن اور اس زمانے کے جوہر شناس لوگوں کا خیال کریں تو تعجب نہیں ہونا۔ لکھنؤ کے اکثر لوگ سخن سنج تھے۔ امراء و در دانی کے معاملے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ بسترِ اہل سہرِ خوش عقدہ محبتانِ اہلِ بست تھے۔ شعہ، سنہی اور ہنود سب کے سب مجالس میں شرکت کر کے تحتِ اَلْفِظِ خوانی، سوزِ خوانی اور مرثیہ گو شاعر کے کلام سے محظوظ ہوتے اور اس طرح ساعری، موسیقی اور خوش لہجگی کے ذوق کی تسکین کرتے۔ شاعر کے ہر نکتے، ہر بلغِ اسارے اور صنائع و بدائع کی باریکیوں پر نکتہ دان سامعین سے محسین کا اظہار ہوتا۔ ساعری، لغاب، معانی و بیان اور فصاحت و بلاغت سے عوام نک کو انا لگاؤ تھا کہ اگر ناخواندہ اسخاص کو بھی اساتذہ کے اشعار نوکِ زبان ہوتے تھے۔

لکھنؤ اس زمانے میں اپنی خوش باسی، خوش وضعی اور اہل سہر کی نکتہ سنجی کی بدولت علوم و فنون، بالخصوص مرثیہ گوئی کا مرکز بن گیا تھا۔ انیس کے سخن فہموں میں کوئی تصویر کاری، فصاحت و بلاغت اور لطفِ زبان کی تعریف کرنا تو کوئی مرزا دبیر کے شوکتِ الفاظ، مضمونِ آفرینی اور صنائع و بدائع پر جھومسا۔ اسی وجہ سے انیسے اور دبیریے دو گروہ بن گئے تھے۔ میر صاحب اور مرزا صاحب نے تو کبھی ایک دوسرے سے الجھنے کا خیال تک نہیں کیا۔ لیکن ان کے ہواہ خواہ بڑی گرما گرم بحثیں کیا کرتے اور میر صاحب کو مرزا صاحب پر، مرزا صاحب کو میر صاحب پر ترجیح دینے میں زور لگاتے۔ انیسے دبیر کے معنی الفاظ اور پیچیدہ و غیر فصیح ترکیبوں پر اعتراض کرتے۔ دبیریے جواب دیتے کہ یہ اہلِ علم کی باتیں ہیں، تم کیا جانو؟ جو طنطنہ اور قبولِ عام ہمارے اسناد کو حاصل ہے، میر صاحب اس سے بالکل محروم ہیں۔ جواب میں انیسے کہتے کہ صفائیِ زبان اور ادائے مطلب اصل چیز ہے، عربی فارسی کے مشکل الفاظ جمع کر دینے سے کما حاصل<sup>۱</sup> مرزا صاحب کے کلام میں سے ہمارے استاد کی اس بیت کا جواب تو نکال دو :

یہ جھڑیاں نہیں ہاتھوں پہ ضعفِ پیری نے چنا ہے جامہٴ اصلی کی آستینوں کو  
دبیریے کہتے کہ میر انیس سے سو سال پہلے میر تقی میر کہہ چکے ہیں کہ :

ہیں ضعف سے جھریاں بدن پر ہستی جامے کو چن رہی ہے

حضرت یہ مال مسروقہ ہے اس کا جواب ہم کیوں دیں۔ انیسے بھر چند شعر پڑھ دیتے :

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار خبر کرو مرے خرمین کے خوشہ چینوں کو  
خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو  
دیریوں کے سرگروہ مسیر فوراً جواب دینے :

جلی کٹی مرے استاد سے کرے جو کوئی نو پھونک دوں مع خرمین میں خوشہ چینوں کو  
جنہیں ہے پھوٹنے کا ڈر وہ خود بھائیں گے مری بلا سے لگے ٹھیس آبگینوں کو  
ہزار بار سزا پا کے منہ نہ چڑھتے ہیں  
مشیر کیا کہوں احمق اللہ زمینوں کو<sup>(۱)</sup>

کبھی کبھی برس برس مجلس بھی نوک جھونک ہو جاتی۔ لیکن متانت کے ساتھ۔  
ایک مرتبہ میر انیس نے گھوڑے کی سبک روی کی تعریف میں یہ مصرع پڑھا :  
ہمال نہ ہوں پھول ، جو گلزار پہ دوڑے

کوئی دیریا فوراً بول اٹھا ”سبحان اللہ۔ نہ دوڑے (پہ دوڑے) کیا خوب  
بر محل ہے“ کسی مجلس میں دیر نے یہ مصرع پڑھا :  
بھرِ نبی کے گوہرِ یکتا حسین ہیں

انیسے نے فوراً گرفت کی کہ ”نہایت خوب۔ بھرے نبی ! و اللہ سامعہ موجِ کوثر میں  
ڈوب گیا“ کیا صفائی ہے ، گنچے نبی ، ماشاء اللہ مرزا صاحب نے بھر اصلاح کر کے  
پڑھا۔

کانِ نبی کے گوہرِ نکتا حسین ہیں

انیسے نے بھر چٹکی لی ”چشمِ بدور ، کانے نبی ، کہا خوب فرمایا ہے“<sup>(۲)</sup>

میر مونس نے ایک سلام کہا تھا ، بہتر چاندنی ، سنور چاندنی۔ دیر کے ایک  
شاگرد قدیر نے اس زمین میں سلام کہا تو ان کے کسی دوست نے اس نصرفِ بے جا پر  
یوں چوٹ کی :

آپ کے گھر میں تھی کب اے بندہ پرور چاندنی

میر مونس کی چرا لائے ہو جا کر چاندنی<sup>(۳)</sup>

(۱) مرفواز حسین خیبر ، سبع مثالی - ص ۳۹ - نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۳۰ء

(۲) جعفر علی خان اثر ، میر انیس کی مرثیہ نگاری - ص ۱۲ لکھنؤ۔

ان باریک بینیوں اور اعتراضوں سے مرثیہ گوئی کو بہت عروج نصیب ہوا۔ علاوہ ازیں غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کے ادوار میں (۱۸۱۳ء - ۱۸۳۷ء) اودھ کے علاقے میں مقابلتاً امن تھا اور لوگ آسودہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اس لیے آرائش و زیبائش کے علاوہ زندگی میں بہت سی نفاستوں کا اضافہ ہوا۔ مگر ساتھ ہی نکتہ کا رنگ آگیا۔ معاشرتی امور اور آدابِ زندگی میں نزاکتیں پیدا کی گئیں۔ نشست و برخاست، گفتگو، ملاقات، لباس، طعام، غرض ہر بات میں وہ نراس خراس ہوتی کہ لکھنؤ ہی ان دنوں مغلیہ تہذیب کا آخری مرکز سمجھا جانا تھا۔ خوشحالی، فارغ البالی اور سخن شناسی کے اس ماحول میں انیس کے فن کی اتنی قدر ہوئی کہ انہیں بادشاہوں کے دربار کی طرف رخ کرنے کی ضرورت ہی پس نہ آئی۔

انیس کے مرثیوں میں واقعات نگاری کے مرقعے، جذبات کی تصویریں، کردار نگاری کے نقشے، تصویر کاری کے اعلیٰ نمونے کثرت سے ہیں۔ اور انتہائی باریک بین نقاد کو بھی ”ان کے باب میں جال سخن باقی نہیں رہتی“<sup>(۱)</sup>۔ رزمہ عناصر کا جلال، رجز خوانی کا ہمہ، ذخیرۃ الفاظ کی وسعت، قوب بیان کا دبدبہ، جذبات و واقعات کی مرقع کشی، یہ سب عناصر ان کے فن کے امتیازی نشان ہیں۔

### والعہ نگاری

یہ بیانیہ شاعری کا ایک اہم جزو ہے۔ اردو زبان کا بڑا سرمایہ غزل، مثنوی اور قصیدہ ہیں۔ یہاں یہ کہنا درست ہوگا کہ دنیا کی بڑی رزمہ نظموں میں واقعہ نگاری کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ اردو میں کیونکہ سب سے زیادہ جگہ غزل کو دی جاتی ہے، اس لیے شبلی نے غزل کو بنیاد بنا کر واقعہ نگاری میں کم مائیگی کی شکایت کی ہے<sup>(۲)</sup>۔ اور غالباً اس نکتہ کو نظر انداز کر دیا ہے کہ غزل کا کام واقعہ نگاری کرنا ہی نہیں۔ یہ خوبی تو مثنوی یا مرثیہ ہی میں پوری طرح دیکھی جا سکتی ہے۔

اس کمی کی نلافی مرثیہ میں میر انیس نے کی، جنہوں نے ہزاروں واقعات بڑی سہولت اور قدرت سے بیان کر دیے۔ اس معاملے میں میر صاحب کا کمال یہ ہے کہ کسی واقعے کو نظم کرتے وقت وہ اسکی تمام ضروری جزئیات کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ ان کی قوت مشاہدہ متعلقہ اشخاص کے کردار، سیرت اور جذبات کا ایسا صحیح اندازہ کر لیتی ہے کہ بیان میں ان سب چیزوں کو شامل کر کے وہ واقعے کی سچی تصویر

(۱) افضل حسین ثابت، حیات دہلی - جلد ۲ - ص ۱۱۹ - لاہور ۱۹۱۵ء

(۲) مسعود حسن رضوی، شاہکار الیس - ص ۵۴ - لکھنؤ ۱۹۵۶ء

کہینچ دیتے ہیں<sup>(۱)</sup>۔ مثلاً امام حسین کے رفیقوں کا مرنے مارنے پر آمادہ ہو جانا ایک معمولی واقعہ ہو جاتا۔ لیکن انیس نے انہیں نلواریں ٹیک کر اٹھتے ہوئے دکھایا ہے۔ جو ان کے عزم بالجزم اور غیظ و غضب کو آنکھوں کے سامنے مجسم کر دیتا ہے :

تیار حان دینے پر چھوٹے بڑے ہوئے

نلواریں ٹیک ٹیک کے سب اٹھ کھڑے ہوئے

یا مثلاً حضرت عباس کا گھوڑا جب ذرا اونچا اڑ جاتا تھا تو ان کی نظر گھاٹ کے پھرے داروں سے لڑ جاتی تھی :

برچھیوں اڑتا تھا دب دب کے فرس رانوں سے

آنکھ لڑ جاتی تھی دریا کے نگہبانوں سے

حضرت عباس نے لڑ بھڑ کر اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا ہے ناکہ پیاسے بچوں کے لیے مشکیزہ بھر لیں۔ غرب کے تقاصے سے نہ خود ہای پیتے ہیں، نہ گھوڑے کو پینے دیتے ہیں۔ اس کشمکش میں وفادار جانور جو مضطربانہ حرکتیں کرتا ہے۔ ان کا بیان سنئے :

دو دن سے بے زباں پہ جو بھا آب و دانہ بند دریا کو ہنہانے کے لگا دیکھنے سمد  
پر بار کانپنا تھا سمشا بھا بد چمکارتے تھے حضرت عباس ارجمند

نڑبانا بھا جگر کو جو شور آشار کا

گردن بھرا کے دیکھتا تھا منہ سوار کا

واقعہ نگاری کے نہ سب نمونے بہت عمدہ ہیں، لیکن میر صاحب کا اصلی کمال اس وقت کھلتا ہے، جب کسی طویل واقعے کی تفصیلات مسلسل بیان کر رہے ہوں۔ ایسے مقامات پر مضمون کے ربط و تسلسل، جزئیات کی ہوسنگی اور بیان کے انتظام کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ ہر بات اگلی بات سے پیوست ہوتی چلی آتی ہے۔ ابک دو مثالوں سے یہ خصوصیت واضح ہو سکتی ہے۔ مثلاً گرمی کی شدت میں امام حسین کے قافلے کا صحرائے عرب کی چلچلاتی دھوپ میں سفر کرنا، انس نے یوں نظم کیا ہے کہ واقعہ نگاری پر مصوری کا گمان ہوتا ہے :

وہ گرمیوں کے دن وہ پہاڑوں کی راہ سخت پانی نہ منزلوں، نہ کہیں سایہ درخت  
ڈوبے ہوئے ہسینوں میں ہیں غازیوں کے رخت سنولا گئے ہیں رنگِ جوانانِ نیک بخت

راکب عبائیں چاند سے چہروں پہ ڈالے ہیں

تونسے ہوئے سمند زبائیں نکالے ہیں

وہ دن ہیں جن دنوں کوئی کرتا نہیں سفر صحرا کے جانور بھی نہیں چھوڑتے ہیں گھر  
ریج مسافرت میں ہیں سلطانِ بحر و بر لبِ برگِ گل سے خشک ہیں چہرہ عرق میں تر

آتی ہے خاک اڑ کے یمین و سار سے  
گسوٹے مشکبار اٹے ہیں غبار سے

اسی قافلے کا کربلا میں فراب کے کسارے خیمہ زن ہونا ، موجِ مخالف کا آنا اور  
انہیں وہاں سے ہٹانے کی کوشش کرنا ، امام حسین کے بھائی جناب عباس کا دشمنوں سے  
لڑنے مرنے پر آمادہ ہونا ، بہت سے ذیلی واقعات پر مشتمل ہے ۔ جنہیں ذر میں بیان  
کرنے کے لیے بھی اہتمام و انتظام کی ضرورت ہے ۔ اس نے ان واقعات کو ربط و نسلسل  
اور فادرا لکلامی کے ساتھ بون بان کیا ہے :

ابرا یہ کہہ کہ کشتیؑ اس کا نا خدا جنے سوار بھی وہ ہوئے سب پیادہ نا  
حضرت نے مسکرا کے یہ ہر ایک سے کہا دیکھو نوکا ترائی ہے ، کسا نہر ، کیا فضا

اکبر شگفتہ ہو گئے صحرا کو دیکھ کر  
عباس جھومنے لگے دریا کو دیکھ کر

تھا فکر میں خموس دو عالم کا ناجدار کھلوار ہے نہی خیموں کو عباسِ ذی وفار  
ناگہ اٹھا شہال کی جانب سے اک غبار رایب سہا سرخ نظر آئے دن چار

مڑ کر کہا حبيب نے بہ رنگ اور ہے  
بولا کوئی یہ شام کے لشکر کا طور ہے

ہم گھاٹ روکنے کے لیے آئے ہیں ادھر ہے آج نسب کو داخلہؑ شمر کی خبر  
سنتے ہی یہ ترائی میں گونجا وہ شیرِ نر نیوری جڑھا کے بیغ کے قبضے پہ کی نظر

کم نہا نہ ہمہ اسد کردگار سے  
نکلا ڈکارنا ہوا ضبغم کچھار سے

### جذبات نگاری

فَن شاعری میں تصویر کاری کے علاوہ جذبات نگاری کو بڑی قومیت حاصل ہے ۔  
کیونکہ وہ احساسات جو دل کی گہرائیوں میں مخفی ہوتے ہیں ، ان کی تصویر کھینچنا  
نسبتاً مشکل ہے ۔ بعض نقادوں نے اسی لیے شاعری کو جذبات نگاری تک محدود کر دیا  
ہے ۔ شبلی نعمانی اسی چیز پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ”انیس کی شاعری کا اصلی

جوہر جذبات نگاری میں کھلتا ہے اور یہیں ان کی شاعری ہمعصروں سے بالکل الگ ہو جاتی ہے“ (۱)۔ مندرجہ ذیل مثالوں سے انیس کی یہ خصوصیت واضح ہو گی :

(۱) سفر کے وقت امام حسین کا اپنی سہار بیٹی کو وطن میں چھوڑنا اور اس کی بے قراری و جذبات کی شدت کے لحاظ سے یہ مقام اتنا درد ناک ہے کہ شبلی نے ’موازنہ‘ انیس‘ میں پورے آٹھ صفحے کا اقتباس درج کیا ہے۔ جناب صغرا کا اصرار اور ان کے مجبور والدین کا انکار بے حد دلخراش ہے :

کیا خلق میں لوگو کوئی ہوا نہیں بیمار ہے کونسی نصیر کہ سب ہو گئے بیزار  
زندہ ہوں، نہ مردے کی طرح ہو گئی دسوار کیوں بھاگے ہیں سب ، مجھے ہے کون سا آزار

حیرت میں ہوں ناعب مجھے کھلتا نہیں اس کا  
وہ آنکھ چرا لیا ہے منہ نکلتی ہوں جس کا

منہ نکسے لگی ماں کا وہ بیمار بہ صد غم چتون سے عیاں تھا کہ چلب آپ ، موئے ہم  
ماں کہتی بھی بخار ہیں بی بی سہ عالم میرے نوکلجے نہ جھری چلتی ہے اس دم

وہ درد ہے جس درد سے جارہ نہیں صغریٰ  
مدیر سے کچھ زور ہمارا نہیں صغریٰ

جذبات کی مصوری میں میر انیس کا خاص وصف یہ ہے کہ وہ ہر شخص کی عمر ، مزاج اور کردار کے مطابق تصویر جذبات کھینچتے ہیں۔ ایک ہی جذبہ مختلف اشخاص پر مختلف اثرات پیدا کرتا ہے اور با کمال فن کار کا فرض ہے کہ وہ اس نازک فرف کو پوری سہارت سے دکھائے۔ انیس نے یہ باریکیاں ملحوظ رکھی ہیں۔ مختلف اشخاص کا مرنا بظاہر ایک ہی باب ہے لیکن نزع کے وقت ہر شخص کی کیفیت جدا گانہ ہوتی ہے۔ حضرت حسرت نے اپنی جان امام حسین پر قربان کر دی۔ مرتے وقت امام حسین ان کا سر اپنی گود میں رکھے رہے۔ جناب حر کی دلی مراد یہی تھی۔ لہذا انہوں نے اطمینان کے ساتھ جان دی۔ اس نفس مطمئنہ کے مرنے کا نقشہ انیس نے یوں کھینچا ہے :

طائر روح نے پرواز کی طوبیٰ کی طرف  
پتلیاں رہ گئیں پھر کر نہ والا کی طرف !

اس کے برخلاف حضرت عباس مرتے وقت وفور جذبات کے ہاتھوں بے قرار ہیں۔ پیاسے بچوں سے پانی کا وعدہ کر کے نکلتے تھے ، لیکن مشکیزہ بھر کر لاتے وقت مارے گئے۔ محرومی و نا کلامی کا احساس اتنا شدید تھا کہ مرتے وقت حسرت سے خیموں کی جانب دیکھ رہے تھے اور اطمینان و سکون کے بجائے ان کے دل پر اند وہ و اضطراب طاری تھا جس کا



نقشہ انیس نے یوں کھینچا ہے :

گر کر کبھی اٹھے کبھی رکھا زمیں پہ سر      آہلا کبھی لہو تو سنبھالا کبھی جگر  
حسرت سے کی خدام کی جانب کبھی نظر      کروٹ کبھی تڑپ کے ادھر لی کبھی ادھر  
اٹھ بیٹھے جب نو زخموں سے برجھی کے بھل کرے  
تیر اور بن میں گڑ گئے حب منہ کے بل کرے

ایک ماں (جناب زینب) اپنے دو سٹوں کی لاسوں پر فریاد کرتی ہے - یہاں غم کی شدت کے سبب فریاد کی لے بہت سر ہو گئی ہے اور بقول حکم عبدالحی گریہ و بکا کی وہ کیفیت پیدا ہو گئی ہے جو امام حسین کے اہل خاندان کے سامان نہیں ہے - ناہم جذبات نگاری بہت عمدہ ہے :

کس منہ سے دیکھوں خاک میں چہرے اٹے ہوئے  
الجھے ہیں مرے ہاتھ کے گسوٹے ہوئے  
سینے فگار چاند سے نارو کٹے ہوئے  
بے ہے کفن بنے یہی کڑے بھٹے ہوئے  
نے کچھ نرک نہ بچ سہدوں کو چاہے  
مرنا اسی طرح سے سعیدوں کو چاہے

امام عالی مقام کا اپنے جوان مرگ بٹے اکبر سے سرتے وقت بایں کرنا یہی دلگداز واقعہ ہے - انیس نے باپ بٹے کے جذبات کی تصویر کشی بہت کامیابی سے کی ہے - ہاں بھی جناب اکبر کی فکر بندی کا اظہار کیا ہے - لیکن نشوونما کی نہ تصویر جناب عباس کی نشوونما سے بالکل مختلف ہے - کیوں کہ علی اکبر کے بعد امام حسین کا کوئی رفیق باقی نہ رہا تھا :

اکبر نے آنکھ کھول کر دیکھا رخ پدر      چہرے پہ اشک آنکھوں سے ٹپکے ادھر ادھر  
فرمایا شہ نے زانو پہ رکھ کر سر پسر      روتے ہو کس کے واسطے اے غیرتِ قمر  
یاں سے اٹھا کے آلِ بیمار میں لے چلیں  
غم ماں کا ہو نو آؤ تمہیں گھر میں لے چلیں

کی عرض مہلت انی کہاں اے شہِ امم      اب کیجے قبلہ رو کہ نکلتا ہے تن سے دم  
دولت ملی کہ دیکھ لیے آپ کے قدم      غیر از غمِ فراق نہیں اور کوئی غم  
ساتھ آئے تھے جو جاننے والے وہ دور ہیں  
روتا ہوں اس لیے کہ اکیلے حضور ہیں

## کردار نگاری

مختلف اشخاص کے کردار پیش کرتے وقت فنکار کا فرض یہ ہے کہ وہ ان کو جو کچھ کہا ہوا ، کرنا ہوا دکھائے یا ان کی حرکات و سکنات کا حو بیان خود کرتے وہ ان کے مزاج ، مرتبے ، عمر اور طبقے کے مطابق ہو۔ بلاغت کا نفاضا بھی ہے کہ فنکار کسی شخص کے متعلق جو کچھ کہے وہ اس کی سیرت کے ساتھ مطابقت رکھتا ہو۔ داستانِ کربلا کے افراد سنکڑوں ہیں۔ انیس نے ان کے افعال ، مکالمے اور حرکات وغیرہ کی نقاسی میں ان کے مزاج ، سیرت ، عمر اور مرتبے کی بڑی رعایت رکھی ہے۔ یہی وہ خوبی ہے جس کی داد ان کے لکھنوی سامعین دے کہہ کر دیتے تھے کہ میر صاحب ”فروںِ مراتب کا بہت لحاظ رکھے ہیں“۔

کسمن بھی سکھ کا محل سے باہر نکلنے کی خواہش میں اپنے جعہ کو یہ طعنہ دینا کہ : ع

م ہو ہوا میں ہو مری حالت خراب ہے

ثابت کرنا ہے کہ اس کو بھوں کی اس نفسیات کا خوب علم تھا کہ وہ اپنے بڑوں سے کام لینے کے لیے ایسے ہی غیر انگیز طعنے دیتے ہیں۔ اسی طرح امام حسن کا حضرت عباس کی مرضی کے خلاف انہیں لڑائی سے روک دینا ، جناب عباس کی جگجو اور غیور طبیعت کی عکاسی کرتا ہے ، جو امام کے حکم سے ناچار ہو کر اپنے جوشِ طبیعت کو دبائے پر مجبور ہو گئے تھے :

آقا نے دی جو اپنے سر پاک کی قسم بس تھر تھرا کے رہ گیا وہ صاحبِ کرم  
ہر تھی شکن جبین پہ ، نہ ہونا تھا غمظ کم چپ ہو گئے ، قرب جو آئے شہِ اسم

گردن جھکا دی نا نہ ادب میں خلل پڑے

قطرے لہو کے آنکھوں سے لیکن نکل پڑے

عمرو سعد اموی فوج کے کمانڈر کا حشر سے مکالمہ اس کے تحکم آمیز مزاج کا آئینہ دار ہے :  
من چکا ہوں کہ نو مضطر ہے کئی رانوں سے الفِ شان ٹپکتی ہے تری باتوں سے

## منظر نگاری

تصویر کاری کے ایک اور پہلو یعنی منظر نگاری کی چند مثالیں بھی دیکھیے کہ  
نیچرل شاعری میں منظر نگاری کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ صبح کا سماں :

وہ سرخشی شفق کی ادھر چرخ پر بہار وہ نارور درخت وہ صحرا وہ سبزہ زار  
شبم کے وہ گلوں پہ گہر ہائے آبدار پھولوں سے سب بھرا ہوا دامنِ کوہسار

نامے کھلے ہوئے وہ گلوں کی سمیم کے  
آتے نہی سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

چلنا وہ بادِ صبح کے جھونکوں کا دمبدم مرغانِ باغ کی وہ خوس الحانباں بہم  
وہ آب و تابِ نہر وہ موجوں کا سج و خم سردی ہوا میں ہر نہ زندہ نہ بہت کم

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا  
نہا موسوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

اس کے ہر عکس صحرائے عرب کی تہی دوپہر کا نقشہ دیکھے حس میں تصویر کاری کے  
ساتھ کچھ کچھ تخیل کی رنگ آمیزی بھی ہے :

کوسوں کسی سجر میں نہ گل بھی نہ برگ و نار اک ایک محل محل رہا بھا صوبِ حنار  
ہنستا نہا کوئی گل نہ سہکنا نہا سبزہ زار کائٹا ہوئی تھی سوکھ کے ہر ساخِ نار دار

گرمی یہ بھی کہ ریست سے دل سب کے سرد بھی  
سے بھی مثل چہرہ مد فوہ ورد بھی

آبِ رواں سے منہ نہ اٹھاتے بھی جانور جنگل میں چھپے پھرے بھی طائر ادھر ادھر  
مردم تھی سب پردوں کے اندر عرو میں ہر خس خانہ مرہ سے نکلی نہ بھی نظر

اڑتی بھی خاک، خشک نہا جسمہ حباب کا  
کھولا ہوا نہا دھوپ سے پانی فراہ کا

یہی منظر نگاری جب اور ترقی کرتی ہے تو سادہ مناظر سے گزر کر مرکب تصویریں  
کھینچتی ہے۔ میدانِ جنگ میں صفوں کا بڑھنا، ہزاؤں اسخاص کا اکیلے مبطِ علی پر  
حملہ کرنا اور اس مردِ مجاہد کا زخم پر زخم کھانا، لو کا چلنا، غبار کا اڑنا، یہ سب  
چیزیں مل کر مرکب تصویریں بن جاتی ہیں اور انیس منظر نگاری کو مرقع کشی میں  
تبدیل کر دیتے ہیں، مثلاً :

ہے تابشِ خور سے عرق افشاں رخِ گلفام لب خشک ہیں پانی کا میسر نہیں اک جام  
لو چلتی ہے، خاک اڑتی ہے، ہے ظہر کا ہنگام پیاسے پہ چلی آتی ہے امڈی سپہِ شام

پہ شوقِ شہادت ہے شہنشاہِ زمن کو  
بوچھار سے تیروں کی بجائے نہیں تن کو

### رزمیہ عناصر

مرع کشی کے ذریعے شاعر صرف نگاہ کو نہیں بلکہ تمام حواسِ خمسہ کو متاثر کرتا ہے۔ میدانِ جنگ کی مرع کشی میں انیس کو خاص مہارت حاصل ہے۔ صفوں کا موجوں کی طرح بڑھنا، ہزاروں نیزوں اور ڈھالوں کا بہ یک وقت اٹھنا، کہانوں کا کڑکنا، تلواروں کی لچک، برچھیوں کی چمک، جنگی باجوں کا بادلوں کی طرح گرجنا، مبارز طلب بہادروں کے نعرے، پہلوانوں کی ہبٹا ہو، نقاروں کا شور، دلاوروں کی رجز خوانی، حملہ آوروں کا ہمہمہ، یہ سب ایسی چیزیں ہیں کہ ان کی تصویر کھینچنے کے لیے بڑا سلیقہ درکار ہے۔ میر انیس نے اسے بڑی کامیابی سے ادا کیا ہے :

حد سے فزوں ہے کثرتِ افواجِ نابکار      نیزے بہ نیزہ، بیغ پہ ہے تیغِ آبدار  
ہر سمت ہے سناں نہ سناں سکلِ نوکِ خار      ہر صف میں ہے سیر پہ سیر مثلِ لالہ زار  
بیکان بہم ہیں جسے ہوں گل بے کھلے ہوئے  
گوسوں سے ہیں کہانوں کے گونے ملے ہوئے

ہر صف میں برچھیاں بھی ہزاروں لچکتی ہیں      نوکیں وہ تیز ہیں کہ دلوں میں کھٹکتی ہیں  
نیزے ملے ہوئے ہیں سانسِ چمکتی ہیں      ترکس کھلے ہوئے ہیں کہانیں کھڑکتی ہیں  
سنگیں دلوں نے ہاسیوں میں پتھر اٹھائے ہیں  
بیغوں کے ساتھ گوزِ گراں سر اٹھائے ہیں

انیس کی اس مرع نگاری کی بدولت رزمیہ عناصر کا بیان اردو شاعری میں ایک نئی جہت پیدا کر دیتا ہے۔ زرہ پونس پہلوانوں کی رجز خوانی، ان کے اسلحے کا کھڑکنا، گھوڑوں کا ہوا کی طرح اڑنا، مخالف صفوں کا باہم ٹکرانا، دو حریفوں کے جنگی دانو پیچ، مختلف ہتھیاروں سے حریف پر وار کرنا یا وار کو بھانا، یہ اس قسم کی تفصیلات ہیں کہ اگر مرثیہ گو شعراء اپنے کلام میں انہیں داخل نہ کرتے تو ہمارا ادب صحیح رزمیہ شاعری سے محروم رہ جاتا۔ انیس نے ان تمام معاملات کو بڑی مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جس کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے جوانی میں فنِ سپہگری کی جو مشق کی تھی وہ شاعری میں ان کے کام آئی۔ مثلاً ایک شاہی پہلوان کا ٹھانڈا دیکھیے۔ یہ خیال رہے کہ انیس نے امام حسین کے حریفوں کی مہارتِ فن اور شجاعت کی تصویر کھینچنے میں فنی دیانت کو ہاتھ سے نہیں دیا اور سپاہیانہ اوصاف خارج نہیں ہونے دیے، کیونکہ یہی بلاغت کا تقاضا تھا :

بالا قد و کلفت و تنومند و خیرہ سر      روئیں تن و سیاہ دروں، آہیں کمر  
ناوک پیام مرگ کے، ترکش اجل کا گھر      تیغیں ہزار ٹوٹ گئیں جس پہ وہ سپر

دل میں ہدی ، طبیعت بد میں بگاڑ نہا  
گھوڑے پہ نہا شفی کہ ہوا پر پہاڑ نہا

ظالم نے ڈھال دوش سے لی اور کمر سے تیغ بدلا تھا اس نے ٹھاٹھ کہ چمکی ادھر سے تیغ  
دو چار بار ڈوب کے نکلی سیر سے تیغ جلنے میں گھنٹی بڑھتی نہی کس کس ہنر سے نیغ

چنگاریاں آڑیں جو سناں سے لڑی سناں  
دو اڑدے گئے تھے نکالے ہوئے زباں

فتون جنگ کی تفصیل کے علاوہ انیس نے اسلحہ بالخصوص تلوار کے وصف اور  
گھوڑے کی تعریف میں فتنی مہارب کا پورا ثبوت دیا ہے ۔ ان مانات میں ، مبالغہ سہی لیکن  
حقیقت نگاری اور صحیح فتنی تفصیل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا ۔ تلوار کی تعریف اس  
سے زیادہ اور کیا ہوگی :

اسراف کا بناؤ رئیسوں کی سان ہے شاہوں کی آرو ہے ساہی کی جان ہے  
ایک جگہ حضرت علیؑ کی تلوار کو مولا علیؑ مریضی کی ذوالفقار سے نسبہ  
دے کر اس کی حلاکت آفرینی کا بیان کیا ہے :

جوہر وہی ، برش کا وہی طور ، خم وہی تیزی وہی غضب کی ، وہی گھاٹ ، دم وہی  
چلنا اسی طرح کا ، چمک دمدم وہی رنگت زمردی وہی ، ہانی من سم وہی  
اکبر سے بھی وغا میں کچھ آگے بڑھی ہوئی  
جس دن سے آری سان سے رن پر چڑھی ہوئی

گھوڑے کی تفصیل نگاری میں بھی انیس نے اسی فن کاری سے کام لیا ہے اور اس  
کی خوش اندامی ، نبز رفتاری اور اشارہ فہمی کے بیان کے علاوہ اس کی جلد ، ایال اور  
گردن کے خم کا جس طرح بیان کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اچھے اسب شناس  
بھی تھے :

باریک جلد وہ کہ نظر آئے بن کا خون گنڈے کو دیکھ کر مہ نو ہووے سرنگوں  
رفتار میں وہ سحر کہ پریوں کو ہو جنوں غنچے بھی کچھ بڑے ہیں ، کنوٹی کو کیا کہوں !

گر ہل گئی ہوا سے ذرا باگ ، آڑ گیا  
پتلی سوار کی نہ پھری تھی کہ مڑ گیا

وہ جست و خیز و سرعت و چالاکيؑ سمند سانچے میں تھے ڈھلے ہوئے سب اس کے جوڑ بند  
سم فرص ماہتاب سے روشن ہزار چند نازک مزاج ، شوخ ، سیہ چشم ، سر بلند

ننگی سے آسماں کی خفا یہ سمند ہے  
کیونکہ اڑے، ہری ہے کہ شیشے میں بند ہے

لڑائی میں حضرت فاسم کے گھوڑے کا غیظ اور ہیجان اس طرح بیان ہوا ہے کہ  
جنگی گھوڑے کے جوش و خروش کی تصویر نظر کے سامنے پھر جاتی ہے :

مانند شیر غظ میں آیا وہ پیلتن آنکھیں ابل پڑیں صفت آہوئے ختن  
ماری زمیں پہ تاب کہ لرزا تمام بن غل بڑگیا کہ گھوڑے پہ بھی لو چڑھا ہے رن

مخیں زمیں کی اس کے نگاہوں سے ہل گئیں  
دونوں کنویاں بھی کھڑی ہو کے مل گئیں

میر صاحب نے کہیں عرل کی روایات و علامات کو بھی مرثیوں میں برنا ہے  
جس سے انک طرح کی سنگتگی پیدا ہو گئی ہے ۔ گھوڑے کو ہری سے اور تلوار کو لیلیٰ،  
ناگن اور بجلی سے سسپہ دی ہے ۔ اس طرح دغزل یسند طبیعتوں کو سامانِ آسودگی مہیا  
کر دیا ہے ، لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ نہ رجحان مرثیے کی روح کے خلاف ہے ۔ مثلاً  
تلوار کے نیام سے کھسچے کا بنا کہیں کہیں دغزل سے لبریز ہے :

کاٹھی سے اس طرح ہوئی وہ سعلہ جو جدا جیسے کنارِ شوق سے ہو خو برو جدا  
مہتاب سے شعاع جدا ، گل سے بو جدا سینے سے دم جدا ، رگِ جاں سے لہو جدا

گرجا حورعد ، ابر سے بجلی نکل پڑی  
عمل میں دم جو گھٹ گیا، لیلیٰ نکل پڑی

مگر جنابِ علی اکبر کے گھوڑے کا بیان دغزل کی رہنمائی سے بھی ماورا ہے :

ہو گل کی نسیمِ سحری لے کے چلی ہے غل نہا کہ سلیاں کو ہری لے کے چلی ہے  
شاعری کے بنیادی عناصر کے دوش بدوش انیس کے مرثیوں میں تشبیہ و استعارہ کی ندرت ،  
بندش کی چستی ، روزِ مہرہ کا لطف اور بے ساختہ صنائع بدائع بھی موجود ہیں ۔ چند  
تشبیہیں پیش کی جاتی ہیں ۔ تلوار کے بے دریغ گردن کاٹ دینے کی اور کسی دیو پیکر  
پهلوان کے میدان میں آنے کی تشبیہ ملاحظہ ہو :

سب نشہ غرورِ جوانی اتر گیا تلوار تھی کہ حلق سے پانی اتر گیا !



آمد شقی کی تھی کہ رواں رودِ نیل تھا ! بیٹ میں تھا جو دیو تو پیکل میں پیل تھا

### ہندش کی چستی

ہانی تھا آگ ، گرمی روزِ حساب نہی ماہی جو سیخِ موج نک آئی کباب نہی  
 نہ جائے برفی کی چسک نہی یا سرر کی لپک ☆ ☆ ☆  
 ذرا جو آنکھ جھپک کر کھلی ، شباب نہ نہا

صنّاع

حسنِ نعلل :

پیاسی جو تھی سپاہِ خدا نین رات کی ساحل سے سر ٹکتی بہیں موجیں فرات کی  
 ابہام

کسی کی ایک طرح پر بسر ہوئی نہ انیس عروجِ مہر بھی دیکھا ہو دوہر دیکھا  
 اللہ رے نرے سخن کی نائیر انیس رو دیے ہیں مثلِ سمع جلنے والے ☆ ☆ ☆  
 ابہامِ تناسب

گلدستہ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں اک پھول کا مضمون ہو سو سورنگ سے باندھوں  
 یہ سب چیزیں جنہیں سبلی نعتی نے ساعری کا زیور کہا ہے ، اپنی جگہ بہ خوب  
 ہیں ، لیکن در اصل میر انیس کی عظمت کی بنیاد ان کے زورِ کلام ، بیان ، واقعات اور  
 تصویر کاری پر قائم ہے ۔ ان اوصاف کے علاوہ ایک اور خوبی جو ان کی عظمت میں  
 اضافہ کرتی ہے وہ ان کا موضوعِ سخن ہے ۔ انہوں نے اپنی فوجِ ساعری کو داستانِ حرم  
 لکھنے میں صرف کیا ۔ امام علیہ السلام اور ان کے وفا دار رفیقوں کے مکالمات ، گفتگو  
 اور کردار ہمیں حق پرستی ، جان بازی اور صداقت و شجاعت کا درس دیتی ہیں ۔ ذیل کے  
 اشعار اس اعتبار سے بہت ہی قابلِ قدر ہیں :

لیکن جہاں سے آج گزرنا ہی خوب ہے عزت بہ بات آئے نو مرنا ہی خوب ہے  
 ایک بوڑھے مجاہد کی سرفروشی کی یہ تصویر کتنی جرأت آموز ہے :

ابرو جھکے جو پڑتے تھے آنکھوں پہ بار بار رومال پھاڑ کر انہیں باندھا تھا استوار  
 آنکھوں سے شیر نر کی جلالت بھی آسکار گویا کہ تھی نیام میں حیدر کی ذوالفقار

جلدی چلے جو چند قدم جھول جھوم کے  
 رعشہ وداع ہو گیا ، ہاتھوں کو چوم کے

امام حسین کے رفیقوں کی شجاعت ، ایمان و یقین اور آنا پر جان قربان کر دینے کا جذبہ  
ملاحظہ ہو :

پیشانیوں پہ جلوہ نما اخترِ سجود دیکھیں جو ان کا نور نو مدسی پڑھیں درود  
رخ سے عیاں جلال و جوانمردی و نمود شیدائے آل ، نیفتہ واجب الوجود  
جنہ کی شاہِ دیں کو دعا دے کے مر گئے  
ایمان کے آئینے کو جلا دے کے مر گئے

انکسار ، بے نباتی عالم ، تسلیم و رضا ، غیرت و خود داری کی تعلیم ملاحظہ ہو :

رہی غرور سے نفرت سناہ کاروں کو قلم کی طرح جلے جب تو سر جھکا کے چلے  
انیس دم کا بھروسا نہیں ٹھہر جاؤ چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

☆ ☆ ☆

دوزخ سے دور رہے ہیں ساکنِ ہنس کے کعبہ کبھی جھکا نہیں آگے کنشہ کے

اخلاق اقدار کی یہ نمائندگی مرثیوں کی عظم میں اضافہ کرتی ہے ۔ اس نے بغزل کی عربیانی  
و فحاشی کو روکا اور ساعری میں متانت اور وفار کے عناصر پڑھائے ۔

اردو ادب میں مرثیوں کے وجود نے درباری ساعری کی پیدا کردہ بے سند فضا  
اور مخرب اخلاق بغزل کا رخ بدل دیا ۔ اور اس کی جگہ اخلاقِ عالیہ اور صفاتِ حمیدہ  
کی تعلیم کے موضوعات نے لے لی ۔ علاوہ ازیں مرثیہ کے ساتھ ساتھ سلام ، نوحہ جیسی  
دوسری اصنافِ سخن میں بھی نئی چیزوں کا اضافہ ہوا ۔

انیس کے کلام پر بعض اسخاص نے اعتراض بھی کیے ہیں ۔ محمد احسن فاروق کا  
خیال ہے کہ میر صاحب اور مرزا دبیر نے عربی معاشرت کے بجائے ہندی معاشرت کے  
فحشے کھینچے ہیں ۔ عربی خواتین اور عرب بچوں کو ہندوستانی لباس اور زیورات پہنے  
دکھایا ہے<sup>(۱)</sup> ۔ جو خلافِ فطرت ہے ۔ حامد اللہ افسر کا جواب یہ ہے کہ ہندی سامعین  
کو متاثر کرنے کے لیے ہندی معاشرت اور ماحول کی نمائندگی ضروری تھی<sup>(۲)</sup> ۔ یہ جواب  
صحیح ہے ۔ مثلاً شہیدوں کی لاشوں کی یہ تصویر جس میں ہندوستانی رسوم ، لباس اور  
زیور کا ذکر ہے ، یقیناً اسی لیے پر تاثیر ہے کہ اس میں مقامی معاشرت کا رنگ ہمارے

(۱) مرثیہ نگار اور میر انیس - ص ۲۸ - کراچی ۱۹۵۹ء

(۲) آزاد ، فسانہ عجائب - ص ۸ - لکھنؤ ۱۹۲۶ء



لیے زیادہ چشم آشنا ہے :

زخمِ جگر یہ ہاتھ کسی کا دہرا ہوا دستِ بریدہ میں کہیں کنگنا بندھا ہوا

☆ ☆ ☆

بچہ پڑا ہے ایک ستارہ سا خاک پر کرنا بھی ہنسلیاں بھی ، سلوکا بھی خوں میں تر

☆ ☆ ☆

سرخ لہو سے حلق کے ، سبِ ذہن میں ہے باجھوں میں سب ہے دودھ ، انگوٹھا دہن میں ہے

☆ ☆ ☆

---

(۱) پھر بھی اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ المہ لڑیلا عرب معاشرے سے تعلق رکھتا ہے اور حقیقت نگاری اس بات کی متقاضی ہے کہ لباس ، آرائش ، بلکہ حرکات و سکنات ، طرز گفتگو ، انداز تحمل ، صبر ، استغنا اور اس آپنی وقار کا نقشہ کھینچ دیا جانا جو اہل بیت کے افراد کے شاہان شان تھا اور جس کی ساری دنیا ان سے متوقع بھی . . . . . مدیہ

## (ب) مرزا سلامت علی دبیر

(۲۹ اگست ۱۸۰۳ء تا ۸ مارچ ۱۸۷۵ء) دلی میں پیدا ہوئے۔ چھ سات برس کی عمر نہی کہ اپنے والد مرزا غلام حسین کے ساتھ لکھنؤ آگئے۔ مولوی غلام ضامن اور مرزا کاظم علی اخباری سے عربی فارسی کی تعلیم پائی<sup>(۱)</sup>، جس کی سنگینی و بلاغت کا اثر ان کی شاعری پر بڑا اور شوکت الفاظ کے رنگ میں جلوہ گر ہوا۔ میر مظفر حسین ضمیر ان دنوں بہت مقبول مرثیہ گو تھے۔ دبیر نوجوانی ہی میں غزل کے کوچے سے نکل آئے اور ضمیر کے ساگرد ہو گئے۔ ہندو برس کی عمر سے مرثیے لکھنے لگے۔ بقول آزاد جو کچھ استاد سے پایا اسے بہت بلند اور روشن کر کے دکھایا۔

دبیر کسندہ فاست، نوسند آدمی تھے۔ ان کے پڑھنے میں وہ خوش ادائی نہ تھی جو میر انیس کا خاص حصہ تھی، لیکن ان کی یاٹ دار آواز، شوکت الفاظ کا ہمہہ مضامین خیالی کی بلندی اور گریہ انگیز، عقیدت آسز روایتوں کی کثرت، سامعین کے دل کو بے احسار کھینچتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نوجوانی ہی میں اچھے مرثیہ گو مشہور ہو گئے تھے۔ مرزا رجب علی بیگ سرور نے فسانہ عجائب میں لکھنؤ کے اہل کمال کا ذکر کرتے ہوئے دبیر کا نام درج کیا ہے<sup>(۲)</sup>، جن کی عمر اس وقت کم و بس ۲۵ سال ہوگی۔ سرور نے انیس کا نام نہیں لکھا۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ اس وقت تک انہیں نہرہ عام کا خلعت نہیں ملا تھا۔ دبیر کو غازی الدین حیدر، شاہ اودھ، ملکہ زمانی بیگم اور نصیر الدین حیدر اپنی خاص مجلس میں مرثیہ پڑھنے کے لیے بلاتے تھے۔ ملکہ زمانی کی سرکار سے انہیں گرانقدر مشاہدے کے علاوہ سالانہ انعامات بھی ملتے جو انہیں فکرِ معاش سے فارغ رکھتے تھے۔ مرزا صاحب اپنا وقت مرثیہ گوئی اور عبادت میں صرف کرتے تھے۔ مزاج میں مسافر نوازی، انکسار اور سخاوت بھی، مگر ان کے علاوہ ان کی شخصیت میں ایک خاص عظمت، شان، شوکت اور وقار بھی ملتا ہے، جس کا اندازہ ان کی درج ذیل مشہور و معروف رباعی سے بخوبی ہو سکتا ہے:

مداحِ امیر ابنِ امیر آنا ہے دربار میں ساہوں کے فقیر آنا ہے  
مشتاقِ سخنِ خلقِ چلی آتی ہے لو مرثیہ پڑھنے کو دبیر آنا ہے

ان تمام وجوہ سے اہل لکھنؤ کی اکثریت انہیں پسند کرتی تھی۔

(۱) خبر لکھنوی، سبج مثالی - ص ۱۴ - لکھنؤ ۱۹۳۰ء

(۲) آزاد، محمد حسین، فسانہ عجائب - ص ۸ لکھنؤ ۱۹۶۲ء

جب تک لکھنؤ میں ساہی کا باغ ساداب رہا ، مرزا کبھی وہاں سے نہ نکلے ۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد انیس کی طرح دبیر نے بھی عظام آباد ، آگرہ اور کانپور کا سفر کیا ، جہاں انہوں نے بہت یادگار مجلسیں پڑھیں ۔ آخر عمر میں آنکھیں خراب ہو گئی تھیں ۔ ان دنوں معزول نواب واجد علی شاہ مشا برح کلکتہ میں مقیم تھے ۔ مرزا صاحب کو بلوا کر ایک جرمن ڈاکٹر سے ان کی آنکھ نوالی ، جس سے بصر بحال ہو گئی ۔ لیکن اسی سال مرزا صاحب کو اسے برادر گرامی نظیر کی موت اور اپنے حریف جلیل میر انیس کی وفات کا صدمہ اٹھانا پڑا ۔ چند ماہ بعد خود بھی باغِ خلد کو سدھار گئے ۔ پچاس ساٹھ سال میں تقریباً تین ہزار مرثیے کہے ۔ دوسرے مام کی سس جلدوں میں اس سرمائے کا محض ایک حصہ ہے<sup>(۱)</sup> ۔ ان کے بیٹے مرزا محمد جعفر اوح نے مرثیہ گوئی کی میراث سنبھالی ۔

دبیر کے کلام کا خاص جوہر زورِ بیان ، شوکتِ الفاظ ، بلندیِ غزل ، ایجادِ مضامین اور صنائع کا استعمال ہے ۔ گریہ انگیز غلط روایں (جن میں بالعموم عرب اور ہند کی معاصر کے نفوس ہیں) انہوں نے انیس سے بہت زیادہ نظم کی ہیں ۔ لیکن واقعہ نگاری میں ربط و سلسل اور سوسنگی مضمون جو انیس کا خاص جوہر ہے ، ان کے ہاں اس قدر نہیں چمکا ۔ یہ بھی بڑی حد تک صحیح ہے کہ کردار نگاری کی نزاکتیں ، بلاغتِ لے مضامین ، تصویر کاری کا حسن اور واقعات و جذبات کے وہ مرقعے جو انیس نے بظاہر کمال بے ساختگی سے سس کسے ہیں ، دبیر مغفور سے ممکن نہیں ہوئے ۔ لیکن غزل کی بلند پروازی ، علمی اصطلاحات ، عربی فقرات کی تضمین اور ایجادِ مضامین کے زور سور میں وہ بے مثل ہیں ۔ یہ ان کی خاص مملکت ہے ۔ وہ ہر واقعے کو بیان کرنے میں تشبیہ ، استعارے اور تلمیح و صنائع کا استعمال بے دریغ کرتے ہیں ۔ اس سے اسعار کی شان و شوکت بڑھ جاتی ہے ۔ لیکن بعض اوقات ان کی باریک نفسی اتنی دقیق ہوتی ہے کہ مضامین باریکی سے تاریکی میں جا پڑتے ہیں اور انہیں سمجھنے کے لیے ذہن کو کاوش کرنی پڑتی ہے ۔ زبان کی صفائی اور نسلِ مطالب میں بھی وہ اپنے اسناد میر ضمیر سے بہت پیچھے ہیں ۔

اس محاکمے کے ساتھ یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ مرزا صاحب کے مضامین میں لطافت ، فکر انگیزی اور خیال افروزی کے اوصاف بھی موحود ہیں ، مثلاً گھوڑے کی تیز رفتاری کے بیان میں اپنے اپنے مضمون کو دلیل سے یوں ثابت کرتے ہیں<sup>(۲)</sup> :

طے ہر قدم ہر ایک مہینے کی راہ تھی      رویت ہلالِ نعل کی اس پر گواہ تھی

(۱) خیبر ، ص ۳۵ - لکھنؤ ۱۹۳۰ء ، ثابت ، حیات دبیر - ص ۱۰۲ - لاہور ۱۹۱۵ء

(۲) نظیر الحسن ، العیزان - ص ۵۱ - لکھنؤ ۱۹۱۲ء

(۳) سری رام ، خمخالہ - سوم - ص ۱۵۷ - دہلی ۱۹۱۷ء

الفاظ پر معانی کی عبارت قائم کرنا دبستانِ لکھنؤ کی عام خصوصیت ہے۔ مرزا صاحب بھی لفظوں سے ایجادِ مضامین و معانی کا کمال دکھاتے تھے۔ اپنی مضمون آفرینی اور نلاس کا ثبوت دینے کے لیے فطری منکسر المزاجی کے باوجود ایک مجلس میں سامعین سے ارشاد کیا کہ اس نا جز نے ہلوار کی تعریف میں ایک مصرع کہا ہے :

اس تیغ کا اربابِ توارخ میں غل ہے

آپ صاحبان سے دوسرا مصرع لگانے کی فرمائش نہیں کرنا ، فقط مضمون بنا دیجیے۔ جب حاضری کا سکوت دیر تک قائم رہا تو پوری یہ نڑھی۔

اس تیغ کا اربابِ توارخ میں غل ہے

یہ مصرعِ تارخِ وفاتِ جزو کل ہے<sup>(۱)</sup>

(ہلوار کو مصرعِ موزوں سے تشبیہ دیتے ہیں۔ مرزا صاحب نے اس کی جانستائی کے لحاظ سے اسے مصرعِ تارخِ وفات بنا دیا ہے)۔

یہاں یہ گمان نہ گذرے کہ مرزا صاحب کو مضمون کی نلاس میں کاوش کرنی پڑتی تھی۔ نہیں یہ وصف ان کے مزاج کا جزو تھا۔ مناظر کی تصویر کھینچنے میں وہ حقیقی تصویر کاری کے بجائے درجے تخیل کی پرواز ، صنائع کی مہارت اور خلاق طبع کی بدولت مضامینِ نازہ کا انبار لگاتے چلے جاتے ہیں ، مثلاً دیکھئے صبح کا سماں :

پیدا شعاعِ مہر کی معارض جب ہوئی پنہاں درازی درِ طاؤس سب ہوئی  
اور قطع زلفِ لیلیٰ زوہِ لب ہوئی مجنوں صفت بے سحر چاک سب ہوئی

فکرِ رفو بھی چرخِ ہنر مند کے لیے  
دن چار ٹکڑے ہو گیا ہوند کے لیے (یعنی چارپہر)

نکلا افق سے عابدِ روشن ضمیر صبح محرابِ آسمان ہوئی جلوہ پذیر صبح  
کھولا سبیدی نے جو مصلائے پیر صبح بھر سجدہ گاہ بن گیا مہرِ منیر صبح

کرتی بھی شبِ غروب کا سجدہ وود کو  
سب سے ہفت عضو بنے تھے سجود کے

مرثیہ کے اس بند سے نہ صرف مناظر کی تصویر کشی میں حقیقی تصویر کاری کی خوبی نظر آتی ہے ، بلکہ اس میں جن تشبیہات و استعارات سے کام لیا گیا ہے ، اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس دور کے سامعین بھی پڑھے لکھے طبقہ سے تعلق رکھتے ہوں گے۔

کیونکہ اتنی باریکیاں ایک چڑھا لکھا ذہن ہی سمجھ سکتا ہے۔ اسی طرح یہ بند بھی صبح کا منظر کس خوبی سے پس کرتا ہے :

بڑھ کر نقبِ نور پکارا سحر سحر      ذروں میں نورِ مہر در آیا قصر قصر  
فرماں نجوم و بدر کو بہنچا بدر بدر      لوٹا سحر نے معدنِ شبنم گہر گہر  
برقع جو اٹھ گیا تھا رخِ آفتاب کا  
پردہ بھا فاس صبحِ ملمع نقاب کا

انصاف اس بات کا بھی طالب ہے کہ اس بات کا اعتراف کیا جائے کہ ان کے ہاں مناظر کی تصویر کشی میں اصلیت کا کافی رنگ ملتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں وہ میر انیس کے ہم پلہ ہوتے ہیں۔ مناظر کی ان تصویروں کے علاوہ مرزا صاحب نے بلوار اور گھوڑے کی تعریف میں بھی پروازِ خیال اور ایجادِ مضامین کا بہت ثبوت دیا ہے۔ کچھ شک نہیں کہ ان کی طبیعت میں خلاقی کا عنصر بہت غالب تھا۔ اسی بنا پر امداد امام اترنے انہیں خلاقی معافی کہا ہے<sup>(۱)</sup>۔ ایسے مواقع پر مضمون آفرینی کے دوس بدوس علمی معلومات کے حوالے بے مکان آئے ہیں، ملاحظہ ہو :

نکلی غلافِ نور سے نسرِ جوہری      یا آکے دسب بوسِ سلماں ہڈی دری  
یا حجلے سے عروس نے کی جلوہ گستری      نا بھی وہ ساخِ مصرعِ طوبیٰ ہری بھری  
اس ہاتھ سے مرادیں بھیں جو جو وہ مل گئیں  
باچھیں خوشی سے سغ کے قبضے کی کھل گئیں  
چہروں پہ مردنی کی طرح بیخ جھا گئی      ہر استخوان میں مثلِ لبِ دو سا گئی  
اعجازِ خاکساریٰ حیدر دکھا گئی      مانندِ خاکِ ناروں کے ن جلا گئی  
سب کے گلوں سے ملی نہی لکڑی رکی ہوئی  
جوہر یہ بھی کہ بوجھ سے خود بھی جھکی ہوئی

☆ ☆ ☆

چمکا وہ ہلال، ابروئے یوسف کا کنویں سے      نا برفی جدا ہوگئی بادل کے دھوئیں سے

☆ ☆ ☆

بادل کی طرح، جوہرِ سمشیر جو چھائے      سایے نے تڑپ کر، دہلِ رعد بجائے  
گھوڑے کی تعریف :

رہوار کے آگے کوئی جادو نہیں چلنا      سائے کے برابر کوئی آہو نہیں چلنا  
سانہ اس کے فلکِ وقتِ تگاہو نہیں چلنا      اس چال بہ صرصر کا بھی قابو نہیں چلنا

اطفال سبق اپنا رواں بڑھ نہیں سکتے  
آگے قدمِ عمرِ رواں بڑھ نہیں سکتے

اگرچہ ان اشعار کی مضمون آفرینیاں بہت دلچسپ ہیں ، لیکن یہ شبہ پڑتا ہے کہ دبیر غالباً کسی گھوڑے کی تعریف نہیں لکھ رہے ، بلکہ رفتار کی کسی علامت سے بحث کر رہے ہیں ۔ مگر چونکہ شاعر کا مقصد ایک کیفیت کا ایسا بیان ہوتا ہے جو شاعر پر لکھتے وقت طاری نہی کہ جس سے سامع یا قاری پر وہی کیفیت یا تاثر طاری ہو جائے ، اس لیے مرزا دبیر کے ایسے کلام کو محض خیال آرائی پر محمول کرنا بھی درست نہ ہوگا ۔ دبیر کے مداح ان کی شوکتِ الفاظ ، پروازِ خیال اور بلندیِ مضامین کی تعریف کر کے رہ جاتے ہیں ۔ ایسے نقاد یا مداح ہم کم ہیں جنہوں نے دبیر کی حقیقی شاعری کی نشان دہی کی ہو ۔ واقعہ یہ ہے کہ صنائعِ بدائع اور خلاقِ مضمون سے ہٹ کر جب کبھی دبیر جذبات کی مصوری کرتے نا کسی واقعے کی تصویر کھینچتے ہیں ، تو وہاں ان کے بیان میں اعلیٰ درجے کی سادگی اور صحیح تاثر ، بلکہ صداقتِ اظہار کے شاہکار بھی نظر آتے ہیں ۔ کردار اور جذبات کی مصوری کے چند نمونے یہ مطلب روشن کرنے کے لیے کافی ہوں گے :

جنابِ عباس کی میدانِ جنگ کو روانگی کے وقت ان کے ارباب کی حالت :

عباس جب کہ جانبِ باغِ جناں چلے      سناے یہ لاکھ سان سے لے کر نشان چلے  
زوجہ نے بوجھا اے مرے والی کہاں چلے      بولے جہاں سے اب نہ بھریں گے وہاں چلے  
اب آخری وداع کی باری نہ آئے گی  
آئی ہے سب کی ، لاشِ باری نہ آئے گی

عباس سے سنا جو یہ اس نشہ کام نے      دنیا سیاہ ہو گئی آنکھوں کے سامنے  
اک آہ کی کمر کو پکڑ کر امام نے      بردہ اٹھانا نازوئےِ سناہِ اقام نے

جھک کر ہلالِ برجِ فلک سے نکل گیا  
نورِ نگاہ تھا کہ ہلک سے نکل گیا

اسی طرح حضرت عباس کی میدانِ جنگ میں آمد کا ذکر ایسے ہر شوکتِ الفاظ میں کیا ہے جو ضربِ المثل کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں :

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے      رن ایک طرف جریخِ کہن کانپ رہا ہے  
رستم کا بدن زیرِ کفن کانپ رہا ہے      ہر قصرِ سلاطینِ زمن کانپ رہا ہے

شمشیر بکف دیکھ کے حیدر کے پسر کو  
جبرئیل لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے ہر کو

مذکورہ بالا اشعار میں سادگی ، بندش کی چستی اور محاکات کا حسن موجود ہے ۔  
محاکات کی معراج اور جذبات کی شدت دیکھنے کے لیے ایک مرثیے کا وہ حصہ قابلِ  
توجہ ہے ، جہاں امامِ عالی مقام اپنے شیرِ خوار بچے کو لے کر نکلتے اور دشمنوں سے  
التجا کرتے ہیں کہ اسکی پیاس پر برس کھائیں ۔ جذبات کی اننی باریک نقاشی انیس کے  
کلام میں بھی کہیں کہیں ملتی ہے :

ہاتھوں پہ لے کے اس کو چلے شاہِ انبیا اور سانہ ساتھ گود کو کھولے ہوئے قضا  
لکھا ہے دھوپ نیز بھی اور گرم بھی ہوا اصغر پہ ماں نے ڈال دی اجلی سی اک ردہ

چادر نہ بھی وہ چہرہ پر آب و ناب بر  
ٹکڑا سفید ابر کا تھا آفتاب بر

ہر اک قدم پہ سوچتے تھے سبطِ مصطفیٰ لے نوچلا ہوں فوجِ عمر سے کہوں گا کہ  
نے پانی مانگ آنا ہے مجھ کو نہ التجا منٹ بھی گر کروں گا نو وہ دیں گے کبا بھلا

پانی کے واسطے نہ سنیں گے عدو مری  
بچے کی جان جائے گی اور آبرو مری

پھیری زبان لبوں پہ جو اس نورِ عین نے تھرا کے آسمان کو دکھا حسین نے  
یہی وہ مقام ہے جہاں صاحبِ ’گلِ رعنا‘ کی اس رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ ’’درد  
خیز کنائے اور المناک و دلگداز انداز میں وہ مہرِ انیس سے ممتاز ہیں ۔ یہ بھی صحیح نہیں  
کہ مرزا دبیر زبان کی صفائی ، بندش کی چستی اور مناظرِ قدرت کی صحیح تصویر کھینچنے  
سے عاری ہیں‘‘ (۱) ۔ اس رائے میں صرف اننی ترمیم کی جا سکتی ہے کہ صفائی زبان ،  
چستی بندش اور تصویر کاری کے نمونے مرزا صاحب کے کلام میں ضرور موجود ہیں ،  
لیکن یہ مقابلہ انیس کم ہیں ۔ مرزا صاحب بالعموم آرائسِ کلام اور تجمّلِ الفاظ  
پر مائل نظر آتے ہیں ۔ ہاں جہاں کہیں وہ واقعہ نگاری کی طرف راغب ہو جائیں یا حقیقی  
جذبات کی سچی تصویریں پیش کریں ، وہاں ان کے کلام میں سادگی ، صفائی اور اصلیت  
کا رنگ بہت پر تاثیر ہوتا ہے ۔ مثلاً امام حسین کے بھائی مسلم ابنِ عقیل کا کوفے میں  
پیکس و بے یار پھرنا انہوں نے یوں نظم کیا ہے :

وہ شہرِ ہر آفت وہ تلاطم وہ شبِ نار جلاذ کمیں گہ میں ، دشمن در و دیوار  
ہر گشتہ زمین و فلک و کوچہ و بازار پھرتا تھا وکیلِ شہِ دیں پیکس و بے یار  
بیٹھے کہیں تھک کر تو اجل سر پہ کھڑی بھی  
اک سر پہ زمانے کی بلا ٹوٹ پڑی تھی

امام حسین کی بیٹی صفریٰ مدسے میں اپنے والدین اور ارباء کی جدائی میں یوں فریاد کرتی ہیں :

حضرت کو ہوا ماہِ محرم جو سفر میں اک داعِ بڑا اور بھی صفرا کے جگر میں  
نانی بے کہا مرقی ہوں دوریٰ بدر میں عاسور کی بھی عید نہ ہوگی مرے گھر میں

کسا حابی بھی اسے بھٹڑ حائیں گے بابا  
وہ دن بھی لہی ہو کہ نہر آئیں گے بابا

ایک اور دلگداز مرثیے میں حسنؑ کا مطلع ہے - یوں لہی ہیں :

سفر سے جبکہ نہ سیر کی خبر آئی اسد و سم میں صفریٰ چچا کے گھر آئی

مرزا صاحب نے نہ واقعہِ نظم لیا ہے نہ حبابِ صفریٰ کے مدسے سے اسے والد ماجد کو  
خط لکھا اور یہ طاہر لیا کہ اس مرثیہ اب کی جدائی میں مری عید بہت ہے کیفِ گزری -  
سارا مرثیہ اسادر سور ہے نہ دل نکرے ہوا ہے - اس نہ کا اثر بھولنا ناممکن ہے :

خوشی بھی سب کو مگرہ مرے لب نہ نالے ہے سفر میں سب مرے عدی کے دینے والے بھی

### جنگ کا ہنگامہ ملاحظہ ہو

ناڈہ مثلِ موج بڑھی بوجِ انکِ نازِ کالے نساں بھولے ہوئے سب سناہ کار  
اک سمت کو سناں یہ سناں سلاں سناحسار اور اک طرف سیر نہ سیر سیکر لالہ زار

فرنا ہوئی بادوں میں دنک رسائوں میں

لعبتِ کعبہ سہر میں دورِ حالوں میں

مرزا دبیر کے مں دو سمجھے کے لیے نہ سانس کافی ہیں - ان کے زمانے کے  
ذی علم سامعین ان کے سکونِ الفاظ، رفعتِ محفل اور مضمونِ آفرینی کو پسند کرتے تھے -  
عوام الناس ان کے درد انگیز اور یر نابیر اندازِ بیان کے سداۓ تھے - لیکن تنقیدی ذوق  
بڑھنے کے ساتھ ساتھ مرزا صاحب کی مدد دانی میں کمی آ گئی - آج کل ان کی شوکتِ  
الفاظ کو لفظی سے اور خیالِ آفرینی و صعب گری کو بصح سے تعبیر کیا جانا ہے -  
ڈاکٹر محمد صادق کا قول ہے کہ اب ان کی شاعری تو وہ مقبولیت حاصل نہیں ہے ،  
کیوں کہ ان کی واقعہ نگاری اور منظر کسی میں تصویر کاری کے بجائے محض فریبِ نظر  
کا رنگ ہے " - اس سے ملتی جلتی رائے محمد نجیبؒ ننہا کی ہے ، جو لکھتے ہیں کہ



صاحب کے کلام میں بلاغت کم ہے<sup>(۱)</sup>۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی رائے میں مرزا صب کے مرثیہ دہلی کی داخلیت اور نائیر کے بجائے لکھنؤ کا تعلق و تجمیل کا فرما<sup>(۲)</sup>۔ افسر میرٹھی کا خیال ہے کہ بہتر علمی نے کلام میں ثقالت پیدا کر دی ہے۔

ان اعتراضات کے باوجود دبیر کا پایہ شاعری بہت بلند ہے۔ انہوں نے قادر الکلامی نظم واقعات کی بدولت ہزاری بیانیہ شاعری میں اضافہ کیا اور مضامین نو کے انبار لے دیے۔ رام بابو سکھ کا قول ہے کہ وہ سب مخلص فنکار تھے اور ان کے فن میں سب کی سب صفات ہونہ نہیں لیکن وہ تجمیل الفاظ اور آرائیں اسلوب برائے نثر تھے۔ ان کا بیان کوہستانی نالوں کی ہندی و ہری کی یاد دلا رہا ہے۔ سرمایہ الفاظ کی بہت، تخیل، رفعت اور مضامین کی جدت انہیں انیس کے پہلو میں جگہ دیتی ہے۔ ان دونوں نالوں کا انداز اپنی اپنی جگہ خوب ہے<sup>(۳)</sup>۔ اس سلسلے میں سبلی کا قول سب معقول طر آتا ہے، اگرچہ طرفداران دبیر انہیں دبیر کا دشمن سمجھتے ہیں:

”مختصر یہ کہ خیال آفرینی، دستِ پند و ساعرائے استدلال میں ان کا جواب نہیں۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جہاں ان کا کلام فصاحت و بلاغت کے معیار پر مورا اترتا ہے، وہ نہایت بلند رہا ہو جاتا ہے۔“

(یہاں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ غالباً اس معاصرے میں کیا، ہر معاشرے میں، دو قسم کے نقطہ نگاہ تک وقت رائج ہوتے ہیں اور اسی طرح دو قسم کے سامعین یا قارئین۔ ایک وہ جو صراحت و سادگی نادر اور مداح کو پسند کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو الفاظ کی رعنائی اور سوکھ بیان سے زیادہ لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ایک غالباً جذبہ کے بلا واسطہ اظہار کو ترجیح دیتے ہیں اور دوسرے الفاظ کی گونج اور ان کے حسن کے ساتھ تخیل کی گلکاریوں کو صعب حسہ قرار دیتے ہیں۔ انیس کے ماننے والے سادگی اور صراحت کے دلدادہ تھے اور دبیری لفظوں کی جھنکار اور ان کی صوتی، لغوی، اصطلاحی تعلیقات سے بھی لطف اندوز ہوتے تھے۔ مگر اس سے انکار کرنا انصاف سے بعد ہو گا کہ جہاں تک اثر اندازی کا تعلق ہے اس کا پہلا دبیر پر بھاری رہا تھا۔ . . . مدیر عمومی)

(۱) محمد یحییٰ تنہا، مرآۃ الشعراء - جلد ۱ - ص ۴۷۷ - لاہور ۱۹۵۴ء۔

(۲) ابواللیث صدیقی، لکھنؤ کا دبستان شاعری - ص ۷۶۱ - لاہور ۱۹۶۷ء۔

(3) Saksena, History of Urdu Literature, p. 132, Allababad 1927.

(۴) شبلی نعمانی، موازنہ انیس و دبیر - ص ۲۱۱ - لاہور ۱۹۴۹ء۔

### (ج) مرثیہ نگاری انیس کے بعد

انیس و دیبر کے بعد جس مرثیہ گو کا نام احترام سے لیا جانا ہے وہ میر نواب مونس ہیں۔ ان کے خاندان، تعلیم و تربیت، مراج اور اطوار کا اندازہ کرنے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ میر انیس کے چھوٹے بھائی ہیں۔ انا فری ضرور ہے کہ وہ طبعاً گوشہ نشین اور قناعت پسند تھے۔ اس لیے لکھنوی امراء سے ان کا تعلق نہیں رہا، راجا امیر حسن خاں والی، محمود آباد نے جو ان کے شاگرد تھے، ان کی سرپرستی کی۔ قوتِ شاعری میں وہ انیس سے کچھ کم تھے لیکن صفائیِ زبان، فصاحتِ بیان اور روزِ مرہ کی لطافت میں وہ ان کے شانہ بہ شانہ چلے ہیں<sup>(۱)</sup>۔ ان کے کلام کی چار جلدیں مطبوعہ نول کشور ان کے کمال کی گواہ ہیں۔

میر مونس زود گوئی میں مشہور تھے۔ مرثیہ دہننے کا انداز بھی دلکش تھا، لیکن انیس کی روز افزوں شہرت اور چمک دمک کے سامنے ان کا کمال گہنا کر رہ گیا۔ راجا امیر حسن خاں کی سرکار سے ان کا سالانہ و طبقہ مقرر تھا۔ زندگی کو قناعت کے ساتھ گزار کر ۱۸۷۵ء (۱۲۹۲ھ) میں نہ عارضہ دردِ دل امتثال کیا<sup>(۲)</sup>۔

واقعہ نگاری، تصویرِ مناظر اور حدیث کی مصوری میں وہ انیس کے حریف ہیں۔ بعض مضامین بلکہ مصرعے دونوں بھائیوں کے کلام میں خلط ملط ہو گئے ہیں۔ صفائیِ بیان اور بندش کی چستی وہی ہے۔ مقرر نگاری کی ایک سال سے یہ مطالب واضح ہو سکتا ہے:

آمد وہ آفتاب کی اور وہ سحر کا نور کافور ہو گیا تھا فلک پر قمر کا نور  
بالا تھا نخلِ طور سے ہر اک سحر کا نور پھیلا تھا حاندی کی طرح دنت و در کا نور

غنچوں کے منہ جو صبح نے سب سے دھوئے تھے  
گویا گلوں نے عطر میں چہرے ڈبوئے تھے

بستانِ کربلا کی وہ بو ناس وہ بہار مرغانیِ خوشنوا کا جھکنا وہ بار بار  
کوکو، وہ قمریوں کی وہ طاؤس کی نکار نالے وہ بلسلوں کے وہ سبزہ وہ لالہ زار

کرتے تھے وجد کبکِ دری کوہسار میں  
دن میں غزال محو تھے، ضغم کچھار میں

(۱) ابواللبث صدیقی، لکھنؤ کا داستانِ شاعری - ص ۷۵ - لاہور ۱۹۶۷ء

(۲) تصدق حسین، مراۃ مونس - جلد ۳ - ص ۳۲۰ -

یہی منظر نگاری جب واقعہ نگاری سے مل جاتی ہے تو زیادہ مؤثر ہو جاتی ہے - گرمی کے موسم میں حسنی قافلے کا سفر ملاحظہ ہو :

مثلِ جناح دھوپ سے جلنا ہے ہر سحر بٹھتے ہیں آسمانوں میں طائر کشادہ ہر  
ہر اک جری ہے چہرے پہ روکے ہوئے سر سولا کٹے ہیں فاطمہ رہرا کے سب عمر

جائے ہیں عاری گھوڑوں کی ساگیں لے ہوئے  
عباس سر نہ سہ کے ہیں سانس لے ہوئے

میر انیس نے قافلے کے سفر کا جو سطر دکھایا ہے اس کا مان مہلے ہو چکا ہے -  
مقابلہ کیا جائے تو اندازہ ہو کہ وہ مصمون ، عواہی اور العاط اندر مسترک ہیں - اس سے  
یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہو کہ اظہار میں مونس اپنے بڑے بھائی کے قدم بہ قدم چلے  
ہیں - واقعہ نگاری اور تصویر کاری میں ان کا اسلوب تقریباً وہی ہے جو انیس کا ہے -  
یہاں تک کہ بعض دفعہ انیس کے کلام سے میر کرنا مشکل ہوتا ہے - ملاحظہ ہو ،  
حضر عباس کے نہر در خمی ہو جانے کا واقعہ جو اس پہلو کو واضح کرتا ہے :

جب ہوئے بازوئے عباس فلم دریا ہر گر کے ٹھنڈا ہوا حصر کا علم دریا ہر  
غری خوں ہو گا وہ بحر کرم دریا ہر غل نہا رحمی ہوا سسائے حرم دریا ہر

مسک کو دانوں میں نکلے ہوئے ہوں لانا ہے  
دہن سر میں جس طرح سکار آتا ہے

غنم کی آمد ہے جگر سوزِ عطش سے ہے کباب ہیں حوہ دس ، ٹھہری نہیں ناؤں میں رکاب  
پیا سے بھون کے لیے سننے میں دل ہے سب ہے بھی فکر کہیں مسک سے صانع نہ ہو آب

نہر نسیم حوہ کمانوں سے چلے آتے ہیں  
نا علو کہتے ہیں اور مشک پہ جھک جاتے ہیں

فنونِ جنگ اور حربی دانو گھات کا بیان کرنے میں بھی وہی ممانعت کار فرما ہے :

مارا سقی نے ، بیع علم کر کے ، سر کا ہاتھ اٹھتے ہی ہاتھ ، چل گیا ناں سے کمر کا ہاتھ  
خالی کبھی گا ہے بھلا شیرِ نر کا ہاتھ دو ہو گیا ادھر کا تو نازو ، ادھر کا ہاتھ

گرتے ہی زہی سے وار اجل کا جو چل گیا  
ہونکی بھی لے سکا نہ لعین ، دم نکل گیا

فرما کے بہ ، اٹھائی کہاں نیر جوڑ کے لی ڈھال اس نے سامنے ، رخ اپنا موڑ کے  
 ناوک ادھر ہوا ہوا چلتے کو چھوڑ کے نکلا فضا سے گردن سرکش کو نوڑ کے  
 اس معرکے کے ذکر کتابوں میں رہ گئے  
 ظالم گرا نو پاؤں رکابوں میں رہ گئے

فوج مخالف کے ایک اور ہلوان کی آمد اور حضرت علی ابراہیم سے اس کی حرب و ضرب کی  
 تصویر کاری ملاحظہ ہو :

نہ سن کے وہ ترے سے بڑھا داب درسریک سرس، زباں دراز، چپ انداز، خانہ جنگ  
 چار آئینہ بھی جس بدن میں ، رہ بھی سنگ ماند قلبِ سر سبہ دل ، سپاہ رنگ

معر نہ نہ، طلم کا پکن جڑا ہوا  
 نصے میں سف، ڈاب میں سعا بڑا ہوا

پھرنا تھا اس کا مر لبِ برکی حدھر حدھر ناری وہیں تھا ان کا بھی مانند سپر نہ  
 آنکھیں بھی نہیں لڑی ہوئی، حاس بھی ہمدگر بلوار چل رہی بھی سپا سپ کہ الحدو

سرس وہ عمرو کی، یہ امیر عرب کی نہیں  
 ردو بدل بھی مہر، کی حوئیں عصب کی نہیں

ان اسعار میں بھی انیس کی سی فصاحت موجود ہے۔ جناب عباس کے گھوڑے کی  
 حرکتوں نظم ہوئی ہیں کہ جنگی مرکب کا نقشہ نظر میں بھر جاتا ہے :

گھوڑے کا جھومے ہوئے آنا کہوں میں کہا آنا چبا چبا کے دہانہ کہوں میں کہا  
 حسنِ حرامِ ناز دکھانا کہوں میں کہا سبنے سے بھونہنی کا ملانا کہوں میں کیا

ایک خوبی جس میں وہ اس اور دیر ہی سے نہیں بلکہ تمام مرنہ گویوں سے آگے  
 ہیں، نہ ہے کہ ان کا سلام بہ دلکس ہوتا ہے۔ سلام مرنے سے پہلے بڑھنے کی ہلکی  
 ہلکی چر ہے، حوائیہ نفع مضامین، انتشارِ خیالات اور بحر کے اعتبار سے غزل سے  
 مشابہ ہوتا ہے۔ وجہ سمجھ نہ ہے کہ مطلع میں شاعر جناب سید الشہدا کی روح پر  
 درود و سلام بھیجنا اور انہی آپ کو نیز دیگر مرنے گو شعراء کو ان کا ”سلامی“ کہہ  
 کر خطاب کرنا ہے۔ مونس کو اس صف میں بے حد کلبابی حاصل ہوئی ہے۔ الفاظ کی  
 درو بست اور ردیف کی نشت کا انتظام مونس جس خوبی سے کرتے ہیں، دیدنی ہے :

سلام

عقدہ سلک گوہر اے دیدہ نر کھول دے ابر نیساں پر برس کر اپنے جوہر کھول دے  
 بادِ سرسرون میں گر گیسوئے اکبر کھول دے مشک نافہ حلقہ زلفِ معنر کھول دے

فتح ہاتھ آئی علی سے جب یہ احمد نے کہا ہاں مرے بازو جھپٹ کر بابِ خیبر کھول دے  
ذبح کا مشتاق ہو گا کون ایسا جز حسین ہنس کے جو بند گریباں زیرِ خنجر کھول دے  
تیرگی ظلمات کی کیا تھی، سیاہی اس کی دیکھ گورے بہ گور، آنکھیں اے سکندر کھول دے  
نکتہ داں طالب ہوں مونس سے جو ذکرِ شاہ سے  
اپنے بستے سے ابھی دفتر کے دفتر کھول دے

### حسین مرزا عشق لکھنوی

سالِ ولادت و وفات معلوم نہ ہو سکا - ۱۸۶۶ء تک حباب بھیے - انس کے خاندان  
کے رکن تھے - اس دور میں انیس کا رنگ اس طرح چھانا ہوا تھا کہ اہلِ خاندان اسی  
کی پیروی کرتے تھے - یہ لوگ زبان کی صفائی، روز مرہ کی لطافت، واقعات و مناظر  
کی تصویر کشی اور ناثر کو حاصلِ شعر سمجھتے تھے اور اسی پر نازاں ہو کر یہ  
کہتے تھے کہ :

ہو اگر طبع میں جود ہے کہ موروں ہے  
اس احاطے سے جو باہر ہے وہ ہروں ہے

یہی خصوصیات عشق کے کلام کا سرمایہ ہیں - اس افرو البتہ ہے کہ ان کی زبان  
میں انیس کی سی صفائی نہیں، وہ قدرت نہیں، وہ مصطورانہ صلاحیت نہیں - اس کی تلافی  
عشق نے رنگین مضامین سے کی جن میں ساقی نامے کا انداز ہے - یہی وہ نشاد تھی جس  
پر میر مصطفیٰ عرف پیارے صاحبِ رسبد نے، حو انس کے نواسے بھی، ساقی نامے کی  
عمارت اٹھائی - اوصافِ کلام کا اندازہ کرنے کے لیے یہ شد کافی ہے، جس میں امام علیہ السلام  
کے وقتِ آخر کی تصویر کشی کی گئی ہے :

بالائے خاک بیٹھ گیا اسپِ خوش نگہ رحموں میں خاک نھر گئی حالتِ ہوئی بباہ  
لٹکے زمین پر قدمِ شاہِ دینِ شاہ گردن میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھا علی کا ماہ  
مڑ مڑ کے رخس بکنے لگا اضطراب سے  
طاقت نہ بھی کہ ناؤں نکالیں رکاب سے

ان کا سلام میر مونس کے برابر نہیں لیکن صفائی، روانی اور نشتِ الفاظ کے لحاظ سے اچھا  
ہوتا ہے - چند شعر جہاں لکھے جاتے ہیں :

سلامی اشکِ عم صاف و منتور ایسے ہوئے ہیں نہ موی اسے ہوئے ہیں نہ گوہر ایسے ہوئے ہیں  
ہوا حر شاہ پر صادق، مقتدر ایسے ہوئے ہیں سا دی سے نے راہِ خلد رہبر ایسے ہوئے ہیں

## دسواں باب

(الف) صحافت

### شاہی وقائع نگاری

بہرِ صغیر پاک و ہند میں فارسی اور اردو صحافت کا آغاز شاہی وقائع نگاری سے ہوا ، جس نے دورِ مغلیہ میں انہی برقی کی کہ حکومت اور معاشرہ ، دونوں کے لیے ایک نہایت مفید ادارے کی صورت اختیار کر گئی ۔ سلطنت کے طول و عرض میں حکومت کی طرف سے وقائع نگار اور اخبار نویس مقرر بھیے جو سیاسی ، معاشرتی ، معاشی ، تجارتی اور زرعی خبروں پر مشتمل خبر نامے مرتب کر کے مسلسل سہنشاہ کے نام بھیجے رہتے تھے ۔ ان خبر ناموں کو ”اخبار“ کہا جاتا تھا اور یہ عوام کے لیے اس لحاظ سے مفید رہتے تھے کہ نا انصافی ، بد نظمی ، رسوب سانی اور غلط قسم کے حاکموں کے ظلم کی خبریں بادشاہ تک پہنچ جاتی تھیں اور وہ فوراً ان خرابیوں کی روک تھام کا بندوبست کر لیتا تھا ۔ اہم اخبارات دربار میں پڑھے جاتے تھے ۔ شکایات کے ازالے کے لیے وہیں احکامات جاری ہو جاتے تھے اور دربار میں جو کچھ سنایا جاتا اس کی رو داد دور دراز متبعینہ سرداروں اور امیروں کے مستعمل نمائندے مرتب کر لیتے اور انہی آقاؤں کو بھیج دیتے تھے ۔ بڑی بڑی فتوحات کی خبروں کا اعلان یوں ہوتا کہ چاروں طرف ہرکارے دوڑا دیے جاتے تھے ۔ وہ جس جس سہر میں خبر پہنچاتے اسے نقارے کی چوٹ سے عوام تک پہنچا دیا جاتا تھا ۔ بعض اوقات مساجد میں بھی اعلان کر دیا جاتا تھا ۔ خبروں کی صحت کے یقین کے لیے اہم ہدایر اختیار کی جاتی تھیں ۔ ایک ہوا اعلیٰ ہائے کے افراد کو اخبار نویس بنایا جاتا ، دوسرے انہیں اچھا مشاہرہ دیا جاتا ، تیسرے ان کی تقریبات اور ہر طرفی سہنشاہ کے ہاتھ میں ہوتی ، چوتھے خفیہ نویسوں کی بھیجی ہوئی اطلاعات سے اخبار نویسوں کی دی ہوئی معلومات کا موازنہ کیا جاتا تھا اور پانچویں ، غلط کار اخبار نویسوں کو عبرت ناک سزائیں دی جاتی تھیں<sup>(۱)</sup>

### ملی اخبارات

جب سلطنت مغلیہ کا شیرازہ بکھرنے لگا اور کئی آزاد ریاستیں وجود میں آ گئیں تو ان میں بھی وقائع نگاری کے ادارے قائم ہوئے ۔ لیکن ان کی کارکردگی میں ہرانی بات نہ رہی ۔ برطانوی راج کے آنے سے یہ ادارے درہم برہم ہو گئے ۔ اور شاہی اخبارات کی

(۱) عبدالسلام خورشید ، نیوز لیٹرز ان دی اورینٹ - (۲) پیرا اس کتاب کی تلخیص ہے)

جگہ نجی قلمی اخبارات نے لے لی، جو ۱۸۵۷ء تک مطبوعہ اخباروں کے دوش بدوش چلتے رہے۔ ۱۸۳۶ء میں گورنر جنرل آک لینڈ اور گورنر جنرل کی کنونسل کے رکن میکالے نے دو الگ الگ دستاویزات میں اس رائے کا اظہار کیا کہ قلمی اخبارات کا اثر مطبوعہ اخباروں سے کہیں زیادہ ہے اور نہ برطانوی راج کے خلاف نفرت بھیلانے میں پیش پیش ہیں<sup>(۱)</sup>۔ ایک حدید مؤرخ کے بیان کے مطابق اسے قلمی اخباروں کا سلسلہ ۱۸۵۷ء تک جاری رہا اور انہوں نے جب آزادی کو کامیاب بنانے میں نمایاں حصہ لیا۔ پھر حال جب آزادی کی ناکامی کے بعد نجی قلمی اخباروں کی سلسلہ ہمیشہ کے لیے الٹ گئی<sup>(۲)</sup>۔

### اردو کا پہلا اخبار

اردو کا سب سے پہلا اخبار کب نکلا؟ اس سلسلے میں محمد سعید عبدالخالق کا یہ بیان دلچسپی سے خالی نہیں:

”فوجی اخبار بنگلور کے ایک عمر رسیدہ بزرگ اسے مرحوم دادا کی روایت سے بیان کرتے ہیں کہ ٹیپو سلطان نے حوسکاری مطبع قائم کیا تھا اس سے اس کے حکم سے ایک سرکاری ہفتہ وار اخبار سائے ہونا تھا، جس کی قسم اس کی فوج ایک محدود ہوتی تھی۔ اخبار میں فوجی خبروں اور احکام وغیرہ کے علاوہ انگریزوں کی شکایت اور فرانسسوں کی تعریف ہوتی تھی۔ یہ مطبع ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد ضبط کر لیا گیا اور جہاں کہیں اس اخبار کے صفحے دستیاب ہوئے۔ انہیں تلف کر دیا“<sup>(۳)</sup>۔

یہ بات ایسی نہیں کہ اس پر آسانی سے یقین کر لیا جائے کیونکہ ٹیپو سلطان کے عہد کے بارے میں جتنی کتابیں ماضی میں لکھی گئیں، ان میں سے کسی میں اس اخبار کا ذکر نہیں ملتا۔ اس کی کوئی کاپی بھی دستیاب نہیں ہوئی۔ پھر نہ ”عمر رسیدہ بزرگ“ کا نام دیا گیا، نہ ان کے ”مرحوم دادا“ کا۔ اس لیے بیان کی صحت اور مصدق کے بارے میں کچھ کہنا آسان نہیں معلوم ہوتا۔ بہر حال نہ بھی ممکن ہے کہ نہ نوئی قلمی خبر نامہ فوج کے اعلیٰ افسروں میں تقسیم ہونا ہو، نہ اسے روایت عہد عالمگیری کے بارے میں بھی بیان کی جاتی ہے۔ اس جب تک حمی نوب مہیا نہ ہو ہم اس اخبار کے وجود کی تصدیق نہیں کر سکتے۔

(۱) ایس سی سانہال، کلکتہ ریویو۔ ص ۱۴ تا ۱۶

(۲) عبداللہ یوسف علی، انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ۔ ص ۲۵۴

(۳) محمد سعید عبدالخالق، میسور میں اردو۔ باب پنجم۔ ص ۷۲ تا ۸۹

## جامِ جہاں نما

مؤرخین صحافت عام طور پر یہ کہتے ہیں کہ ۱۸۲۲ء میں فارسی کا پہلا اخبار 'جامِ جہاں نما' کلکتے سے جاری ہوا۔ اگلے سال اس کا اردو ضمیمہ جاری ہوا جو ہائج سال بعد بند ہو گیا اور اردو کا پہلا مکمل اخبار 'دہلی اردو اخبار' تھا جو ۱۸۳۶ء میں دہلی سے نکلا، لیکن نئی تخلیق کی روشنی میں یہ بیان نادرست ثابت ہو چکا ہے۔ 'جامِ جہاں نما' فارسی کا نہیں، اردو کا پہلا اخبار تھا۔ چند ہفتے بعد اس کی زبان فارسی ہو گئی۔ ایک سال بعد اس کا اردو ضمیمہ نکلا۔ پس 'دہلی اردو اخبار' اردو کا پہلا نہیں دوسرا اخبار تھا۔

اس بیان کے جواز میں ہم مندرجہ ذیل سواہد پیش کرتے ہیں :

۱۔ کلکتہ منتہلی جرنل رقم طراز ہے :

”آج صبح ایک نیا اخبار 'ہندوستانی رنا' میں جاری ہوا۔۔۔ یہ اخبار کوارٹر سائز کے تین ورق پر مشتمل ہے اور اس کا نام 'جامِ جہاں نما' ہے۔ پہلا شمارہ بدھ کے دن ۲۷ مارچ کو شائع ہوا“<sup>(۱)</sup>

یاد رہے کہ اس زمانے میں اردو زبان کو 'ہندوستانی رنا' بھی کہا جاتا تھا۔

۲۔ اس کے ایک مہینے بعد راجہ رام موہن رائے نے 'کلکتہ جرنل' میں 'مرآۃ الاخبار' کے نام سے ایک فارسی اخبار کے احرار کا جو اعلان شائع کیا اس میں درج تھا کہ :

”اس ملک میں بہت سے اخبار چھپتے ہیں لیکن فارسی کو کوئی اخبار ابھی تک نہیں نکلا“<sup>(۲)</sup>

اگر 'جامِ جہاں نما' فارسی کا اخبار ہوتا تو یہ اعلان میں ہو سکتا تھا۔

۳۔ اس کے دو ہفتے بعد 'کلکتہ جرنل' نے خبر دی کہ جس ہندوستانی اخبار کے

اب تک چھ شمارے چھپ چکے ہیں، اس کی زبان میں عمریب اہم تبدیلی ہونے والی ہے<sup>(۳)</sup>

(۱) کلکتہ منتہلی جرنل، ۱۸۲۲ء جلد اول ص ۳۸۵

(۲) کلکتہ جرنل، جلد دوم، نمبر ۹۸، ۲۳ اپریل ۱۸۲۲ء ص ۷۸۳

(۳) ایضاً ۸ مئی ۱۸۲۲ء



۴۔ اس کے بعد ’کلکتہ منتہلی جرنل‘ میں ایک خط درج ہوا جس میں لکھنے والے نے فارسی اخبار ’جام جہاں نما‘ کا حوالہ دیا<sup>(۱)</sup>

چنانچہ یہ ثابت ہو گیا کہ جون ۱۸۲۲ء تک اس کی زبان فارسی ہو چکی تھی۔

’جام جہاں نما‘ کو اس لحاظ سے بھی اردو کا پہلا اخبار قرار دیا جا سکتا ہے کہ مئی ۱۸۲۳ء میں اس کا ایک اردو ضمیمہ نکلتے لگا<sup>(۲)</sup> جو ۲۳ جنوری ۱۸۲۸ء کو بند ہو گیا<sup>(۳)</sup>۔ احراء کا مقصد یہ تھا کہ ’یورپی معاونین کے لئے اسے زیادہ دلچسپ، پر لطف اور ہر از معلومات بنایا جاسکے‘<sup>(۴)</sup> اور بدلتے کی وجہ یہ بھی کہ، قلمرو شناس۔ اردو زبان سے ذوق میں رکھتے۔ اور وہ فارسی محروم جاتے ہیں<sup>(۵)</sup>

اس اخبار کے حوالہ سے حاصل ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو ضمیمہ نین ادوار سے گزرا۔ پہلے دور میں خبریں دی جاتی تھیں۔ دوسرے دور میں تاریخ انگلستان بالاقساط درج ہوتی اور دوسرے دور میں تاریخ عالمگیری کا اردو ترجمہ پس کیا گیا۔ پہلے دور کے ذرائع خبر رسائی میں ان علمی اخبارات سے بھی خبریں اخذ کی جاتی تھیں۔ ان خبروں سے اس دور کی دیسی ریاستوں کے حکمرانوں کی بوالعقول اور عیس پرستیوں کا حال معلوم ہوتا ہے۔ معاشرے کی خرابیوں کا ذکر ملتا ہے اور یہ بہ چلتا ہے کہ برطانوی راج کے گہرے دیسی ریاستوں میں کس طرح مداخلت کرتے تھے<sup>(۶)</sup>۔

### اردو صحافت کا بالاعادہ آغاز

اردو صحافت کا باقاعدہ آغاز ۱۸۳۶ء میں مولوی محمد نادر کے اخبار ’دہلی اردو اخبار‘ سے ہوا اور چند سال کے اندر اندر دہلی کے علاوہ آگرہ، لکھنؤ، مدراس، بنارس، بمبئی، بریلی، علی گڑھ اور پاکستان کے علاقوں، یعنی لاہور، ملتان، سیالکوٹ، گوجرانوالہ، راولپنڈی اور گجرات سے اخبار نکل آئے۔ اس بیز رفتار برق کے اسباب یہ تھے :

- 
- (۱) کلکتہ منتہلی جرنل، ۱۸۲۲ء جلد اول ص ۶۶۱
  - (۲) محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار - ص ۱۶۰
  - (۳) امداد صابری، جام جہاں نما ۲۳ جنوری ۱۸۲۸ء ’تاریخ صحافت اردو‘ جلد اول ص ۵۴
  - (۴) امداد صابری، جام جہاں نما ۲۹ دسمبر ص ۷۳ - ۷۴ - ۱۸۲۳ء
  - (۵) امداد صابری، جام جہاں نما ۲۳ جنوری ۱۸۲۸ء ص ۵۴ - ۵۵
  - (۶) یہ نتائج ان معلومات اور اقتباسات سے اخذ کیے گئے ہیں جو ’ہندوستانی اخبار نویسی‘ (محمد عتیق صدیقی) اور تاریخ صحافت اردو جلد اول (امداد صابری) کے متعلقہ ابواب میں موجود ہیں۔

اول : ۱۸۳۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے فارسی کی جگہ اردو کو عدالتی زبان بنا لیا ۔

دوم : ۱۸۳۵ء کے قانونِ صحافت نے صحافت سے پابندیوں کا خاتمہ کر دیا ، نتیجہ یہ ہوا کہ دیسی زبانوں میں اخبارات بے دھڑک نکلنے لگے ۔

سوم : لیتھو کی طباعت رائج ہوئی ، جو ایک نو سستی پڑتی تھی ، دوسرے خوشنویسوں کی نستعلیق کتاب نسخ ٹائپ کے مقابلے پر زیادہ آسانی کے ساتھ پڑھی جا سکتی تھی ۔

چہارم : حکومت مغربی علوم کی اساعب کے لیے اخبارات کو ذریعہ بنانا چاہتی تھی چنانچہ جا بجا افسروں اور سکولوں کے لیے بعض اخباروں کو بڑی تعداد میں خریدا گیا جس سے اخباروں کو معاشی سہارا مل گیا ۔

### دہلی اردو اخبار

’دہلی اردو اخبار‘ کے نانی مولوی محمد ناصر عالمہ و فاضل بزرگ تھے ۔ تینوں کے بلند پایہ مجتہد تھے ۔ ابتدا میں دہلی کالج کے مدرس تھے ۔ پھر مختلف اچھے اچھے سرکاری عہدوں پر فائز رہے ۔ ذوقِ شاعری سے گہرے تعلقات کی بنا پر انہیں شاہی دربار تک رسائی حاصل تھی اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں وہ بہادر شاہ ظفر کے مسیروں میں شامل تھے<sup>(۱)</sup> ۔ موصوف کا نام ساڈ ہی اخبار پر آنا<sup>(۲)</sup> ۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ سرکاری ملازمت کے دوران نجی طور پر ترجمہ مرسلہ کر لیا کرتے تھے ۔ ’دہلی اردو اخبار‘ کی زندگی کے آخری چار سالوں میں مولوی محمد ناصر ادارت سے الگ ہو گئے تھے اور یہ کام انہوں نے اپنے فرزند مولانا محمد حسن آزاد کو سونپ رکھا تھا اور وہی اخبار کے پرنٹر اور پبلشر تھے<sup>(۳)</sup> ۔

’دہلی اردو اخبار‘ ۲۰/۳۰ء کی تطبیق پر چھپا تھا ۔ صفحہ اول پر دو مستقل عنوان تھے ۔ ایک ’حضور والا‘ دوسرا ’صاحب‘ ۔ ’حضور والا‘ کے عنوان سے بہادر شاہ ظفر کا روز نامہ درج کیا جاتا تھا ، جو قلمیہ معلیٰ کا شاہی وقائع نگار مہیا کرتا تھا اور ’صاحب کلاں‘ کے زیرِ عنوان کمپنی کی حکومت کی سرگرمیوں کی روداد قلم بند کی

(۱) اسد احمد جہاوری ، تاریخ صحافت اردو جلد اول - ص ۱۵۸ - ۱۶۸

(۲) محمد عتیق صدیقی ، ہندوستانی اخبار نویسی - ص ۶۹ - ۲۶۸

(۳) ایضاً - ص ۲۷۵

جاتی تھی۔ اس اخبار میں خبروں کا بڑا ذریعہ وہ خبر نامے تھے جو مختلف درباروں اور ریاستوں کے وقائع نگار مرتب کیا کرتے تھے۔ دوسرے اخبار نے بعض شہروں میں اعزازی نامہ نگار مقرر کر رکھے تھے۔ دہلی کی مقامی خبریں بہت محنت سے حاصل کی جاتی تھیں۔ اس اخبار کی ایک خصوصیت یہ بھی کہ صرف سیاسی ہی نہیں، یہ تعلیمی، تمدنی اور مجلسی زندگی سے تعلق رکھنے والی خبریں بھی چھاپا کرتا تھا۔

اس زمانے کی روایت کے مطابق ادارے باقاعدگی سے نہیں چھپے تھے، البتہ جہاں ادارہ نگار مناسب سمجھتا وہ خبر کے آخر میں اخبار کا نام جلی حرف سے نکھ کر اس کے بعد بصرہ کر دیتا تھا۔ انگریز کے راج میں اگرچہ صحافت کی آزادی زیادہ نہیں تھی لیکن اس اخبار کے بصرے نظم و نسق کی خرابیوں پر شدید نکتہ چینی کے حامل ہوتے تھے اور اجنبی راج کی بعض بالیسوں پر بھی تنقید کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ قلعہ معلیٰ کی اندرونی ساس بر بھی نکتہ چینی کی جاتی تھی<sup>(۱)</sup>۔

دہلی اردو اخبار میں علمی اور ادبی سرگرمیوں کا خاص ذکر ہوتا تھا۔ بہادر شاہ ظفر، نواب زین محل، دوو اور دوسرے شعراء کا کلام چھپتا تھا۔ ذوو سے دوستی کی بنا پر غالب کی مخالف کی حاوی تھی، چنانچہ غالب کی گرفتاری پر معاندانہ رنگ میں بصرہ بھی کیا گیا۔

### مظہرالحق

مولوی محمد باقر کا دوسرا اخبار 'مظہرالحق' تھا، جو ۱۸۲۸ء سے ۱۸۴۳ء تک جاری رہا۔ اس پر بھی ان کا نام نہیں ہوتا تھا۔ یہ اخبار شعبہ فرقے کا نرجان خاص تھا اور کبھی کبھی 'دہلی اردو اخبار' سے بعض مضامین نقل کر لیا کرتا تھا۔

### سید الاخبار

دہلی کا دوسرا اردو اخبار 'سید الاخبار' تھا جو ۱۸۳۷ء میں نکلا۔ اس کے بانی اور مدیر مولوی سید محمد تھے جو سر سید احمد خاں کے بھائی تھے۔ موصوف وکیل تھے۔ اس لیے اس اخبار میں قانونی مسائل پر خصوصی مضامین چھپتے تھے۔ ۱۸۴۶ء میں مولوی سید محمد عین جوانی میں انتقال کر گئے۔ اس کے بعد نام کو نو کوئی اور ایڈیٹر

(۱) صحافت پاکستان و ہند میں، عبدالسلام خورشید، ۱۰۸-۱۰۳ (جہاں متعلقہ اقتباسات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے)

(۲) ایضاً۔ ص ۱۰۷-۱۰۸

نہا لیکن اصل ادارت سید احمد خاں کرتے تھے۔ چونکہ سید احمد خاں سے غالب کی دوستی بھی اس لیے 'سید الاخبار' سے انہیں انس نہا۔ چنانچہ انہوں نے ایک مکتوب میں اخبار کی تعریف بھی کی۔ اس اخبار کی بڑی اہمیت یہ ہے کہ سر سید نے اپنی صحافت کا آغاز اسی سے کیا۔

### صادق الاخبار

دہلی سے 'صادق الاخبار' کے نام سے کچھ اخبار نکلے۔ پہلا اخبار کب جاری ہوا؟ یہ معلوم نہیں۔ البتہ اتنا معلوم ہے کہ یہ ۱۸۴۷ء میں زندہ تھا۔ دوسرا اخبار ۱۸۵۴ء میں نکلا جس کے مدیر سید جمال الدین خاں تھے۔ بہادر شاہ ظفر کے خلاف مقدمے میں اسی اخبار کے اقتباسات نیس ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے جو دستاویزات موجود ہیں ان میں ایک فرمان کے ذریعے سید جمال الدین خاں کو ایک اور اخبار نکالنے کی اجازت دی گئی، لیکن یہ معلوم نہیں کہ وہ اخبار نکلا بھی تھا یا نہیں۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ جو 'صادق الاخبار' ۱۸۵۷ء میں موجود تھا اس کی اشاعت خاصی وسیع تھی۔

### گل رعنا

مولوی کریم الدین نے غالباً ۱۸۴۵ء میں ایک رسالہ جاری کیا جس کا نام 'گل رعنا' یا 'کریم الاخبار' تھا۔ دو نام رکھنے کا رواج اس زمانے کے بہت سے انگریزی اخبارات میں موجود تھا، لیکن اردو میں دو ناموں کے ایک رسالے کی غالباً یہی واحد مثال ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ اردو میں پہلا گلدستہ تھا۔ گلدستہ اردو صحافت کی اصطلاح میں اس رسالے کو کہتے تھے جس میں نثر نہیں، صرف شعر طبع ہوتے تھے اور عام طور پر مشاعروں کا طرحی کلام جمع کر دیا جاتا تھا۔

### طبع مجلات صحافت

اردو کا پہلا رسالہ 'خبر خواہ ہند' تھا جو ۱۸۳۷ء میں مرزا پور سے ہادری آر۔ سی مانہر کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ یہ انگریزی اور رومن اردو میں صرف مضامین

- 
- (۱) الطاف حسین حالی، حیات جاوید - ص ۷۷  
 (۲) امد اللہ خان غالب، کلیات نثر فارسی - ص ۱۷۴  
 (۳) محمد عتیق صدیقی، ہندوستانی اخبار نویس - ص ۲۸۳ - ۲۸۶  
 (۴) ایضاً - ص ۲۸۶ - ۲۸۷

پیش کرتا تھا<sup>(۱)</sup>۔ اسکی اصل فائلیں تو موجود نہیں ہیں لیکن مضامین کا مجموعہ موجود ہے۔ بہر حال مجلاتی صحافت دہلی میں ’قرآن السعدین‘ سے شروع ہوئی جو دلی کالج کے پرنسپل شہر انگر نے ۱۸۴۵ء میں جاری کیا وہ خود لکھتے ہیں کہ :

”۱۸۴۵ء میں میں نے دلی میں بینی مگزین کی طرز پر ایک با تصویر موقت رسالے کی بنا ڈالی۔ اس کا نام ’قرآن السعدین‘ تھا ، گویا مشرق اور مغرب مشتری اور زہرہ نے جن کا قرآن اس رسالے میں ہوا تھا۔ یہ اپنی قسم کی پہلی کوشش تھی۔ گیارہ برس بعد میں جب ہندوستان سے رخصت ہوا تو یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ اس کی تقلید میں بارہ سے زیادہ رسالے نکل رہے تھے<sup>(۲)</sup>۔ گارساں دتاسی کے الفاظ میں ’قرآن السعدین‘ ”ایک با تصویر اخبار ہے جس میں سائنس ، ادب اور سیاست سے بحث ہوتی ہے۔ . . . اس کا مقصد اپنے ہم وطنوں میں مغربی خیالات کی اشاعت ہے۔ ہفتے میں ایک بار سائے ہوتا ہے“<sup>(۳)</sup>

مجلات صحافت کے نشو و ارتقا میں ماسٹر رام چندر کی خدمات نظر انداز کرنا مشکل ہے۔ موصوف دلی کالج کے استاد ، ریاضی کے ماہر اور مسہور مصنف تھے۔ انہوں نے ’فوائد الناظرین‘ کے نام سے ۱۸۴۵ء میں ایک بندہ روہ با تصویر علمی اور ناویخی اخبار جاری کیا جو کافی عرصہ جاری رہا۔ اس میں خبریں بھی دی جاتی تھیں لیکن مضامین زیادہ ہوتے تھے۔ انہی صاحب نے ۱۸۴۷ء میں ’محب بند‘ کے نام سے ایک علمی و ادبی ماہ نامہ جاری کیا جو چھوٹی قطع کے چھپن صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس میں ادب ، سائنس ، جغرافیہ ، تاریخ ، تعلیم اور دوسرے موضوعات پر مقالے چھپتے تھے۔

مجلات صحافت کے سلسلے میں پنجاب کے رسائل کا کردار خاص طور پر نمایاں ہے۔ ۱۸۵۳ء میں منشی دیوان چند نے ’پائے لے بہا‘ کے نام سے ایک بندہ روزہ رسالہ لاہور سے جاری کیا۔ جس میں سائنسی اور تعلیمی موضوعات پر مضمون درج ہوتے تھے۔ ۱۸۵۴ء میں لاہور سے ایک تعلیمی رسالہ ’معلم بند‘ کے نام سے شروع ہوا ، لیکن پنجاب کا بہترین رسالہ ’خورشید پنجاب‘ تھا۔ جو ۱۸۵۶ء میں لاہور سے نکلا اور جس کا ایک نامکمل فائل پنجاب یونیورسٹی میں موجود ہے۔ اس رسالے میں عام رسالوں

(۱) ہمد عتیق صدیقی ، ہندوستانی اخبار نویسی - ص ۲۸۰ - ۲۷۹

(۲) ہوالہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی - ڈاکٹر شہر انگر (مقالہ) دلی کالج مگزین (قدیم دلی کالج

لمبر) ص ۱۴۶ -

(۳) خطبات گارساں دتاسی ص ۳۱ -

(۴) محمد عتیق صدیقی ، ہندوستانی اخبار نویسی - ص ۳۲۷ - ۳۲۷

کی نقطہ کی چھپن صفحات ہوتے تھے۔ اس میں یوں نو اخلاق 'علمی' تاریخی اور جغرافیائی اور مختلف السوع دوسرے موضوعات سے تعلق رکھنے والے مضامین جگہ ہاتے تھے، لیکن سائنسی موضوعات بر مقالات اس کا طرہ امتیاز تھے۔ ان کی زبان سادہ اور انداز بیان سلیس ہے۔ مثلاً کرہ ہوائی میں ہوا کے دباؤ، موسم کی تبدیلی، بارش اور نار برق کے نظام کا حال بیان ہاں وہاں کیا گیا ہے، لیکن بیان کی خوب صورتی کہیں بھی صحت معلومات پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ اس رسالے کی انک اور اہمیت یہ بھی کہ اس میں اردو کو ذریعہ 'علم' بنانے پر زور دیا جانا تھا<sup>(۱)</sup>۔

### کوہ نور

اب ہم لاہور کے اخبارات کی طرف آتے ہیں۔ ان میں 'کوہ نور' کو اولیت حاصل ہے۔ یہ ۱۴ جنوری ۱۸۵۰ء کو جاری ہوا اور یہ لاہور کا پہلا اردو اخبار تھا۔ اس کے نانی منشی پر سکھ رائے تھے جو ۱۸۱۶ء میں سکندر آباد (ابر پردیش) میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اردو اور فارسی زبان میں دسترس حاصل کی اور چونتیس سال کی عمر میں لاہور آ کر مطبع 'کوہ نور قائم کیا'۔<sup>(۲)</sup> سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ موصوف نے صحافت کے لیے لاہور کا انتخاب کیوں کیا؟ اس کا جواب گارساں دناسی نے یوں دیا ہے کہ مطبع 'کوہ نور پنجاب بورڈ آف ایڈمنسٹریشن (اس وقت کی حکومت کا نام) کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی سے قائم ہوا اور 'کوہ نور' حکومت انگلشیہ کے اہتمام اور سرپرستی میں جاری ہوا<sup>(۳)</sup>۔ نٹ راجن نے ۱۸۵۳ء کی ایک سرکاری رپورٹ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ یہ اخبار حکومت کے بنائے ہوئے اصول پر چلایا جانا تھا اور اسے سرکاری سرپرستی حاصل تھی<sup>(۴)</sup>۔ منشی پر سکھ رائے کو اتنی دور سے بلانے کا یہ ظاہر یہ مقصد معلوم ہوتا ہے کہ برطانوی حکومت یہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی ناقابل اعتماد شخص ہاں سے اخبار نکال لے۔ چند سال منشی پر سکھ رائے کی انگریزوں کے ساتھ گاڑھی چھنتی رہی، لیکن مارچ ۱۸۵۶ء میں انہیں ازالہ حیثیت عرفی کے ایک مقدمے میں دین سال کے لیے جیل میں ڈال دیا گیا<sup>(۵)</sup>، مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان پر اصل الزام کیا تھا۔ رہائی کے بعد وہ پھر معزز حیثیت حاصل کر گئے اور ان کا شمار لاہور کے رؤسا میں ہوتا تھا۔

(۱) عبدالسلام خورشید، صحافت پاکستان و ہند میں - ص ۱۴۳ - ۱۳۸۔  
(۲) شیخ محمد اسماعیل ہانی بی، لاہور کا سب سے پہلا اخبار (مقالہ) - 'امروز' ۱۴ اگست ۱۹۵۵ء

ص ۱۸۔

(3) Histoire De La Littérature Et Hindoustanie, Vol. I Garcine De Tassay  
P. R. 579-80

(۴) ہسٹری آف جرنلزم ان الڈیا - جے نٹ راجن - ص ۵۴ - ۵۳۔

(۵) 'کوہ نور' ۱۱ مارچ ۱۸۵۶ء۔

منشی ہر سکھ رائے نے ابتدائی دور میں ہرچے کی ادارت خود کی ، لیکن جب مصروفیات بڑھ گئیں تو یہ کام دوسروں کے سپرد کر دیا ۔ گارسان دناسی کا بیان ہے کہ پہلے ایڈیٹر سورج بہان تھے جو کئی کتابیں انگریزی سے اردو میں منتقل کر چکے تھے ۔ ان کے علاوہ غلام محمد ، پرتی ہنڈت ، جمنہ ہر شاد کے نام بھی اسی سلسلہ میں لیے گئے ہیں<sup>(۱)</sup>۔

’کوہ نور‘ کی تقطیع ۱۲/۸ اچھی تھی ۔ پہلے چھ صفحے ہوتے تھے پھر سولہ تک پہنچ گئے ۔ اس میں سرکاری اعلانات اور احکام ، صوبائی اور مقامی خبریں ، ملکی اور غیر ملکی خبریں ، معلوماتی اور ادبی مضامین ، غزلیں بلکہ نعتیں بھی چھپا کرتی تھیں ۔ ۱۸۵۱ء کے فائل میں مختلف النوع خبریں ملتی ہیں ، مثلاً ملبریا کی وبا ، ہلک پشاش گاہوں کی تعمیر ، چاند گرہن کے بعد خوفناک زلزلے ، اناج کے برج ، موسمی اطلاعات ، سوڈا واٹر کی پہلی مرنبہ بیاری ، سکولوں کا قیام ، جرائم کی کفیب ، کانوں کی دریافت ، سکھ دربار کے نوادر کی فروخت ، لیڈن کی فائٹس میں نجوم کا گلوب بھیجنے کی بحویر ، لاہور میں سارٹی کلچرل سوسائٹی کا قیام ، عدالتی مقدمے ، ایک عالم دین ، خواجہ شاہ سلیمان کا انتقال ، ایک برطانوی فوجی کو اپنے دیسی ساتھی کے قتل کی نادانسی میں سزائے موت ، کلکتہ کے ایک شخص کا دعویٰ کہ وہ غبارے میں ابرے گا ، جنوبی ہند میں ہارسوں اور مسلمانوں کے درمیان فساد ، صوبوں کی بحث وغیرہ<sup>(۲)</sup>۔

۱۸۵۶ء کا فائل دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ احبار کا معیار بلند ہو گیا تھا ۔ اب مقامی اور صوبائی خبریں زیادہ تفصیل سے اور جامعیت سے دی جانے لگیں ، غیر ملکی خبروں کا معیار بھی بہتر ہو گیا اور ایران اور افغانستان کی خبروں پر زیادہ توجہ دی گئی ۔ افغانستان میں ’کوہ نور‘ کا خاص نامہ نگار معیم تھا جو فارسی زبان میں مکتوب بھیجا کرتا تھا اور یہ مکتوب مجنسہ غیر ترجمے کے چھاپ دیا جاتا تھا ۔ سیاست ، تاریخ جغرافیہ ، مذہب ، معاشرہ اور قانون کے موضوعات پر مضامین دیے جاتے تھے ۔ لطائف اور غزلیات بھی جگہ پاتی تھیں ۔ اشتہارات زیادہ تر سرکاری ہوتے تھے ۔ بہر حال تجارتی اشتہارات بالخصوص کتابوں کے اشتہار بھی درج ہوتے تھے ۔ ۱۸۵۶ء کے فائل کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ ادارتی تبصروں میں غیر معمولی جرأت سے کام لیا گیا ۔ یہ الگ بات ہے کہ ’زمانے کے رواج کے مطابق تنقید کے ساتھ ساتھ تعریف کا روغن تاز بھی ہوتا تھا ۔ ۲۹ اپریل ۱۸۵۶ء کے شمارے میں ’آزادی‘ مطابع‘ کے عنوان سے ایک شذیرے میں

(۱) Histoire : Garcin De Taasy : Vol. III : P. 183 Vol. I PP. 520-80

(۲) شیو نارائن ، دی کوہ نور اف ۱۸۵۱ء - پنجاب یونیورسٹی ہسٹاریکل سوسائٹی جرنل جلد

توقع کی گئی کہ ”آزادی“ صحافت کو کچلنے کے لیے قانون نہیں نافذ کیا جائے گا ، ورنہ سب کو ضرر ہے اور پھر اخبار اور چھاپے کی کچھ ہستی نہ رہے گی“۔ اسی سال ضلع کے نظم و ضبط پر ایک مفصل مضمون میں حکام کی بد دیانتی ، بد نظمی ، خویش پروری اور دفتری تاخیر پر شدید نکتہ چینی کی گئی۔ ادھر سے جتنی خبریں درج کی گئیں ، ان میں بار بار یہ اشارہ کیا گیا کہ لوگوں میں انگریزوں کے خلاف بے چینی موجود ہے۔ ۸ اپریل کے شمارے میں اردو کو درجہٴ نعلیم بنانے کی شد و مد سے حمایت کی گئی<sup>(۱)</sup>۔

’کوہِ نور‘ کا معیار اپنے ہم عصروں سے کہیں زیادہ بلند تھا۔ ہر سال یہ اپنے تمام مضامین اور خبروں کا ایک انڈیکس دیا کرتا تھا۔ صفحات نمبر مسلسل دیے جاتے تھے۔ اس کی اساعت ۳۴۸ تک پہنچ گئی<sup>(۲)</sup>۔ یہ وہ اساعت تھی جو اس وقت تک زبانوں کے کسی اخبار کو نصیب نہ ہوئی۔ اتنی زیادہ اساعت کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس کا معیار بلند تھا اور دوسری یہ کہ اس کی بہت سی کاپیاں حکومت خرید کر افسروں اور سکولوں میں تقسیم کرتی تھی۔

### دربائے نور

’کوہِ نور‘ کے اجراء کے چند ماہ بعد لاہور سے ’دربائے نور‘ جاری ہوا۔ اس کی تقطیع ’کوہِ نور‘ سے بڑی تھی۔ اس کے مالک فقیر سراج الدین اور مدیر نسہسوار الدین تھے۔ پھر مبین الدین حسن ادارت پر فائز ہوئے اور اس کے بعد منشی مہدی حسین خان اس اخبار کی ادارت کرتے رہے۔ اس اخبار کی اساعت ایک سو سے کچھ زیادہ تھی ، جو اس لحاظ سے مناسب تھی کہ یہ ایک کاملاً آزاد اخبار تھا اور حکومت کی سرپرستی سے کاپیاً محروم۔ اسی وجہ سے یہ زیادہ دیر جاری نہ رہ سکا۔

### مغربی پاکستان کے دوسرے اخبارات

مغربی پاکستان کے اور شہروں سے بھی اخبارات نکلتے تھے ، مثلاً پشاور سے ’منضائی‘ ، گوجرانوالہ سے ’گلزارِ پنجاب‘ ، گجرات سے ’مطلع الانوار‘ ، راولپنڈی سے ’سہیلِ پنجاب‘۔ لیکن لاہور کے علاوہ دو شہر صحافت کے اہم مرکز بنے۔ ایک سیالکوٹ ، دوسرا ملتان۔ سیالکوٹ سے منشی دیوان چند نے یکے بعد دیگرے کئی اخبار نکالے۔ مثلاً ’چشمہ فیض‘ ، ’خورشیدِ عالم‘ ، ’نور علی نور‘ اور ’وکتوریا پیپر‘۔

۱ عبدالسلام خورشید ، صحافت پاکستان و ہند میں - ص ۱۱۵-۱۱۸

۲ خطباتِ گارسان دتاسی - ص ۲۰۱



مؤخر الذکر ۱۹۲۵ء تک جاری رہا لیکن زیادہ شہرت 'چشمہ' فیض' نے حاصل کی۔ اسے بھی سرکاری امداد حاصل تھی۔ اس کا رنگ ڈھنگ 'کوہِ نور' کا سا تھا، لیکن معیار ویسا نہیں تھا۔ 'کوہِ نور' اور 'چشمہ' میں طویل عرصے تک چٹمکیں چلتی رہیں، جن میں ذاتی رفاقت کے سانس کاروباری رفاقت کا فرما بھی۔ ایک اصولی جھگڑا بھی تھا کہ 'کوہِ نور' اردو کو ذریعہٴ تعلیم بنانے کا حامی تھا اور 'چشمہ' فاض' مخالف۔ ایک مرحلے پر منشی نولکسور نے دونوں میں مقابلہ کروا دی، لیکن کچھ عرصہ بعد دوبارہ جھگڑا شروع ہو گیا۔

۱۸۵۲ء کے آغاز میں ملتان میں 'ریاضِ نور' جاری ہوا۔ اس کے مدیر منشی مہدی حسین خان بھی جو اس سے پہلے 'دریائے نور' میں کام کرتے تھے۔ ۱۸۵۶ء میں انہوں نے ایک تحصیل دار کے خلاف ایک مضمون چھاپا جس کی یاد اس میں سات سال کی سزا پائی، مگر جلد ہی رہا ہو گئے اور لکھنؤ جا گئے۔ 'ریاضِ نور' کے مقابلے پر فیر غلام نصیر الدین نے 'سواع السمس' جاری کیا۔ دونوں میں حتمی بھی ہوئیں۔ پھر حال 'سواع السمس' سلعہٴ مسعجل نایب ہوا۔

### ہندوستان کے دوسرے اخبار

دہلی کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے شہروں سے بھی بے شمار اخبار نکلتے۔ آگرہ سے 'صدر الاخبار' (بعد میں اس کا نام 'اخبار الحقائق' رکھا گیا) 'زبدہ الاخبار'، 'اسد الاخبار'، 'مطلع الاخبار'، 'قطب الاخبار'، 'اخبار الواح'، 'نور الابصار'، 'سفیرِ آگرہ'، 'اخبارِ حسینی'، 'مطلع العلوم'، 'اسرف الاخبار'، 'نہت الارواح'، اور 'مفید الغلائق'۔ ان میں 'قطب الاخبار' اس لیے اہمیت کا حامل تھا کہ یہ ایک خالص اسلامی اخبار تھا جو خروں کے ساتھ ساتھ دینی موضوعات پر مضامین چھاپتا تھا۔ 'سفیرِ آگرہ'، اس لیے اہم ہے کہ اسے منشی نولکسور نے جاری کیا۔

لکھنؤ سے 'لکھنؤ اخبار'، 'مخزن الاخبار'، 'طلسم لکھنؤ'، اور 'سحرِ سامری' جاری ہوئے۔ مؤخر الذکر دو اخباروں میں نظم و نسق پر نکتہ چینی کی جاتی تھی۔ ان دونوں اخباروں کی زبان مقفی و مسجع تھی۔ مدارس سے 'اعظم الاخبار'، 'آفتابِ عالم تاب'، 'دشیر الاخبار'، 'طلسمِ حیرت' اور 'جامع الاخبار' جاری رہے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مدارس کے تمام اخبار مسلمانوں نے نکالے۔ دہلی کے زیادہ تر اخبار مسلمانوں کی ملکیت میں نکلتے، لیکن باقی شہروں سے اردو اخبار زیادہ تر ہندوؤں نے جاری کیے اور مدارس کے

علاوہ امرتسر، لدھیانہ، بنارس، نملہ، بمبئی، بریلی، علی گڑھ اور دوسرے شہروں سے بھی اخبار نکلتے رہے<sup>(۱)</sup>

۱۸۵۷ء سے پہلے اردو صحافت<sup>(۲)</sup>

اردو اخباروں کی اساعتیں محدود تھیں۔ مختلف اخباروں کی اشاعت کے بارے میں جو سرکاری اعداد و شمار ملے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اشاعتیں ۲۷ سے ۳۴۹ کے درمیان تھیں۔ ’سبداخبار‘ (دہلی) کی اشاعت ۱۸۴۴ء میں یکم اپریل اور ۱۸۴۸ء میں اناسی پرچے چھپتے تھے۔ ’صادق الاخبار‘ کی اشاعت ۱۸۵۷ء میں دو سو نوک پہنچ گئی، لیکن عام طور پر بہت کم بھی۔ ’کوہ نور‘ کی اشاعت ۱۸۵۰ء میں دو سو ستائیس اور ۱۸۵۴ء میں تین سو اچاس بھی۔ اس سے زیادہ اشاعت کسی اردو اخبار کو نصیب نہ ہوئی۔ اشاعتیں محدود ہونے کی ایک وجہ تو یہ بھی کہ صحافت ایک نئی چیز بھی اور اخبار بینی کا ذوق کم تھا۔ دوسری وجہ یہ بھی کہ اخبار کی قیمت بہت زیادہ تھی۔ ایک پرچہ چار آنے سے آٹھ آنے تک کے عوض ملتا تھا۔ اخبار سٹال پر نہیں بکے تھے۔ کم از کم ماہانہ چندہ ادا کرنا پڑتا تھا اگر اس زمانے کے نرخوں کا جائزہ لیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ صرف دولت مند لوگ اخبار خرید سکتے تھے۔ بہر حال اس کا مطلب یہ نہیں کہ اردو اخبار عوام تک نہیں پہنچتے تھے۔ حکومت سکولوں کے لیے جو اخبار خریدتی تھی انہیں عام لوگ بھی پڑھ لیتے تھے۔ اردو اخبارات کے خریداروں میں اسے انگریز افسروں کی خاص تعداد شامل بھی جو اردو زبان کے علم کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ اردو اخباروں کے معاشی پہلو کو جانچنے کے لیے بعض اخباروں کے اخراجات اور آمدنی کے گوسواروں کا مطالعہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ جس اخبار کو چالیس ماہانہ خریدار حاصل تھے وہ اپنا خرچ پورا کر لیتا تھا۔

بعض اخبارات کے مواد کا سائنسی تجزیہ کیا گیا تو یہ معلوم ہوا کہ اسٹی فی صد خبریں سیاسی اور جنگی واقعات سے تعلق رکھتی تھیں۔ مقامی اور قومی خبروں میں تعلیمی خبروں کو اولیت دی جاتی تھی۔ خبر رساں ادارے تو موجود نہیں تھے لیکن اس کے

(۱) ’مغربی پاکستان کے دوسرے اخبار‘ اور ’ہندوستان کے دوسرے اخبار‘ کے عنوان سے جو معلومات دی گئی ہیں ان کے بے شمار حوالے ہیں، جنہیں یہاں دینا ممکن نہیں تفصیل کے لیے عبدالسلام خورشید کی ’صحافت پاکستان و ہند میں دیکھیے۔‘

(۲) اشاعتوں کے اعداد و شمار کی تفصیلات کے لیے عبدالسلام خورشید ’صحافت پاکستان و ہند میں‘ کا مطالعہ کیجیے۔

۱۔ مختلف درباروں کے سرکاری وقائع نگاروں کے مربب کیے ہوئے علمی اخبارات یا خبرنامے۔

۲. انگریزی اخبارات میں سائے سادہ غیر ملکی خبریں -

۳۔ ہم عصر اردو اور فارسی اخبارات سے اخذ کردہ خبریں -

۳۔ نامہ نگاروں کی بھیجی ہوئی اطلاعات۔

اردو اخبارات کا ایک اور مہلو خصوصی اہمیت رکھتا تھا۔ ان کے مالک ہندو ہوتے یا مسلمان، اخبار میں فرقہ وارانہ عصب عموماً نہیں ملتا تھا۔ ہندو اخبار اسلام پر مضامین بھی چھاپا کرتے تھے۔ ان سب اخباروں نے علمی سادہ ناس میں بہت بڑا کردار ادا کیا کیونکہ تقریباً ہر اخبار مغربی علوم، ایجادات، جغرافیہ، تاریخ اور ادب پر مضامین سن کر لیا تھا۔ اس سے لوگوں کے ذہن روشن ہوئے اور زاویہ نگاہ وسیع ہوا۔ اصلاحِ معاشہ اور تعلیم پر خاص زور دیا گیا جس سے لوگوں میں نہ دوں پیدا ہوا کہ وہ قدیم علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم میں بھی دسرس حاصل کریں۔ جہاں تک رائے عامہ کی ترجیح کا تعلق ہے، یہ کسی حد تک ضرور ہوئی بھی لیکن زیادہ نہیں۔ اس کی وجہ یہ بھی کہ صحافت اصولاً نوآباد تھی لیکن عبر ملکی راج کی انتظامیہ کا خوف دامن گر گیا تھا اور بہت سی کہنے والی ناس قلم بر آئی آئی رک جاتی تھیں۔ مہر حال انہی بات واضح ہے کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے سال ڈیڑھ سال پہلے ہی عوام میں جو اضطراب پیدا ہو رہا تھا اس کی طرف اردو اخباروں میں واضح اشارے ملتے ہیں اور لاہور، دہلی اور لکھنؤ کے بعض اخباروں میں نو خاص تلخ باتیں لکھی ہوئی ملتی ہیں۔

## ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں صحافت کا کردار

ابھی انقلاب برپا نہیں ہوا تھا کہ بعض انگریزی اخبارات نے دیسی اخباروں کی 'اشتعال انگیزی' کے خلاف آواز بلند کرنا شروع کر دی۔ لاہور کے ہفت روزہ 'دی پنجابی' نے لکھا :

”ہمیں معلوم ہوا ہے کہ مٹ سے دیسی اخبار ہماری فوج کے دیسی سپاہیوں میں بانٹے جاتے ہیں۔۔۔۔۔ لیکن جب کوئی دیسی اخبار مذہبی جذبے سے سرشار ہوتا ہے تو اس کی نوعیت بدتر ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔ ہم ایسا لکھنے پر اس لیے

مجبور ہوئے ہیں کہ ہماری توجہ لکھنؤ کے ایک ایسے دیسی اخبار کی طرف دلائی گئی ہے جو ہماری فوج میں پڑھا جاتا ہے اور اس نے بیرک پور کے ہنگاموں کی خبریں اس انداز سے پیش کی ہیں جن سے شرارت کا امکان ہے۔“ (۱)

جب ۱۸۵۷ء کا انقلاب برپا ہوا تو ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے اخبارات کی آزادی سلب کرنے کی غرض سے وہ صحافتی قانون نافذ کیا، جسے تاریخ صحافت میں قانونِ زبان بندی (Gagging Act) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے ماتحت ہر چھاپے خانے کے لئے لائسنس لیا ضروری ہو گیا اور حکومت کو اختیار مل گیا کہ وہ جس اخبار کو چاہے بند کر دے۔ اور جس اخبار پر چاہے سنسر شپ کی پابندی لگا دے۔ یہ قانون دیسی اور انگریزی دونوں قسم کے اخباروں پر حاوی تھا۔ لارڈ کیننگ نے اس کے جواز میں جو تقریر کی اس میں بتایا گیا کہ بچھلے چند ہفتوں میں دیسی اخباروں نے خبریں مہیا کرنے کی آڑ میں دیسی باشندوں میں بغاوت کے جذبات پیدا کر دیے ہیں اور یہ کام نہایت مستعدی، چالاکی اور عیاری سے کیا گیا ہے۔ انہوں نے یورپی صحافت کی وفاداری کو ہٹ سنا ہے لیکن یہ بھی کہا کہ ہم نے دیسی اور یورپی صحافت، دونوں کے لئے اس غرض سے قانون نافذ کیا ہے کہ بعض اوقات انگریزی اخباروں میں یہ ظاہر ہے ضرور چیزیں چھپتی ہیں لیکن جب ان کا ترجمہ دیسی اخبار میں چھپتا ہے تو وہ خطرناک نوعیت کی حامل ہو جاتی ہیں۔ (۲)

اس قانون کو انگریزی اخبارات نے خوش آمدید کہا لیکن ساتھ ہی یہ احتجاج کیا کہ انگریزی اخبارات کو کسوں اس قانون کی زد میں لایا گیا ہے۔ اس قانون کے ماتحت دو انگریزی اخباروں کے لائسنس ضبط کر لئے گئے۔ دونوں دیسی باشندوں کے کنٹرول میں تھے۔ دو انگریزی اخباروں کو انتباہ کیا گیا، دو فارسی اخباروں کے خلاف مقدمہ چلایا گیا اور ان کے ایڈیٹر ڈسچارج ہو گئے۔ کلکتہ کے فارسی اخبار ’گلشنِ نوبہار‘ کا لائسنس ضبط کر لیا گیا اور چھاپے خانے پر بھی قبضہ کر لیا گیا۔ رہے مغربی پاکستان کے اخبار تو ان کے خلاف قانون نافذ کرنے سے پہلے ہی کارروائی کر لی گئی، مثلاً :

- ۱۔ پشاور کے اخبار ’مرتضائی‘ کے ایڈیٹر کو غلط خبر چھاپنے پر گرفتار کر لیا گیا۔

- ۲۔ لاہور کے تمام اردو اخباروں پر سنسر شپ کی پابندی لگ گئی۔
- ۳۔ سبالکوٹ کا ایک چھاپہ خانہ ضبط کر لیا گیا اور ’چشمہ فیض‘ کو حکم

(۱) دی پنجاہ، لاہور مارچ ۱۸۵۷ء۔  
(۲) جے نٹ راجن، ہسٹری آف جرنلزم ان انڈیا - ص ۶۷۔

دیا گیا کہ وہ اگر جاری رہنا چاہتا ہے تو لاہور منتقل ہو جائے، کیونکہ سیالکوٹ میں سنسر شپ کا بندوبست نہیں۔

۴۔ ’چشمہ فیض‘ لاہور آکر ’چشمہ خورشید‘ کے نام سے نکلنے لگا اور اس پر سنسر شپ کی پابندی لگ گئی۔

۵۔ ملتان کے ’ریاض نو‘ کو بھی سنسر کا پابند کر دیا گیا اور بعد میں اس کا چھاپہ خانہ ضبط کر لیا گیا<sup>(۱)</sup>

اس کے برعکس اینگلو انڈین اخباروں کو دیسی باسندوں بالخصوص مسلمانوں کے خلاف استعمال انگیزی کے لئے کھلا جھوٹ دیا گیا۔ نمون کے طور پر چند اقتباس ملاحظہ ہوں :

”دلی کو مسبار کر کے زمین سے ملا دینا ضروری ہے۔۔۔۔۔ ہمیں افسوس ہے کہ جن دیہات سے ہاری نعشیں برآمد ہوئی ہیں، انہیں اس لیے برباد نہیں کیا جانا کہ مالہ وصول ہونا رہے۔ اگر یہ صورت دلی میں ہوئی تو ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مسلمان یہاں برابر آباد رہیں گے اور عظمتِ ہارنہ کی یادگاروں کو دیکھ کر احبابِ اسلام کی غرض سے بھر سازسوں میں مصروف ہو جائیں گے۔ (لاہور کرانیکل)<sup>(۲)</sup>

’دی پنجابی‘ نے مطالبہ کیا کہ دلی میں ”افسوں اور مقامی دستے کے فوجیوں کی سہولت کے لیے جامع مسجد کو گرجا بنا دیا جائے“<sup>(۳)</sup>۔ ’لاہور کرانیکل‘ نے ’ہاری پالیسی‘ کے عنوان سے ایک ادارہ چھاپا جس میں کہا کہ مذہبی معاملے میں ہاری غیر جانب دارانہ پالیسی نا کام رہی ہے اور نہ ناکامی قدرتی ہے کون کہ مقامی باشندے اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم اپنے اداروں، اپنی مذہب، اپنی تعلیم اور اپنے ادب کو اپنے مذہب سے الگ نہیں کر سکتے۔ اس طرح ہاری ”نوازی پالیسی“ بھی نا کام رہی ہے جس کا مقصد یہ تھا کہ عمدگی اور ہونہاری سے ہندوؤں کے خلاف مسلمانوں کو اور مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کو کھڑا کیا جائے۔ ہاری تعلیمی پالیسی، جس میں بائبل کی تعلیم شامل نہیں تھی، ناکام رہی ہے۔ اب اور کوئی پالیسی باقی نہیں رہی۔ صرف ایک پالیسی ہے اور وہ ہے مسیحی پالیسی۔ اس ملک پر ایک مسیحی فوج کا قبضہ ہونا چاہیے جس میں مقامی باسندوں کو عیسائی بنا کر بھرتی کیا جائے سکولوں اور کالجوں

(۱) پنجاب میوٹنی رپورٹ۔

(۲) لاہور کرانیکل، ۱۸ نومبر ۱۸۵۷ء

(۳) دی پنجابی، ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء

میں بائبل کی تعلیم لازمی قرار دی جائے۔ اس ملک پر صرف عیسائیوں کی حکومت ہو۔ اس مضمون میں یہ تجویز بھی پیش ہوئی کہ جن شہروں میں بغاوت برپا ہوئی ان کو اجتماعی سزا دی جائے۔ شمال مغربی صوبجات اور بنگال کے اٹھارہ سے ساٹھ سال تک کی عمر کے تمام مسلمانوں پر بیس روپے سے پچاس روپے تک سالانہ ٹیکس دس سال کے لیے لگا دیا جائے۔ تمام باغی سپاہیوں کو ساری عمر کے لیے جلا وطن کر کے ان سے مزدوروں کی طرح کام لیا جائے اور یہ نہ ہو تو انہیں غلام بنا کر بیع ڈالا جائے۔<sup>(۱)</sup>

دہلی کے اخبار آزاد تھے کیونکہ وہاں بہادر شاہ ظفر کی حکومت تھی۔ ان اخباروں نے انقلاب کی تازہ ترین خبریں عوام تک پہنچائیں اور ان کا حوصلہ بلند رکھا۔ حب تلنگوں نے مطلق العنانی پھیلائی، لوگوں کو ننگ کیا اور ناجروں نے چور بازار گرم کیا تو دہلی اردو اخبار نے اس کے خلاف زبردست احتجاج کیا اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ عوام کو اس برپادی سے بچائے۔<sup>(۲)</sup>

۱۲ جولائی ۱۸۵۷ء کو بہادر شاہ ظفر کی فرمائش پر 'دہلی اردو اخبار' کا نام 'الظفر' رکھ دیا گیا۔ اس کا آخری درجہ ۱۳ ستمبر کو چھپا۔ ۲۰ ستمبر کو دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا اور وہاں کے سارے اخبار بند ہو گئے۔ اس کے بعد دارو گیر کی مہم چلی۔ 'دہلی اردو اخبار' کے مالک مولوی محمد باقر کو دہلی کالج کے رنسل ٹیلر کے قتل کے الزام میں گولی سے آڑا دیا گیا۔ اسی اخبار کے مدیر (مولانا) محمد حسین آزاد کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوئے اور وہ طویل مدد تک روہوس رہے۔ 'صادق الاخبار' کے مدیر جمیل الدین کو بین سال مدد کی سزا ہوئی۔<sup>(۳)</sup>

دہلی کے اخباروں کے کردار کے سلسلے میں کچھ مواد بہادر شاہ ظفر کے خلاف مقدمے کی روداد سے بھی ملتا ہے۔ عدالت میں 'دہلی اردو اخبار'، 'صادق الاخبار' اور 'خلاصۃ الاخبار' کے اقتباس پیش کیے گئے۔ سرہیو فلس مشکاف نے اس رائے کا اظہار کیا کہ ہر دیسی اخبار کا ایک ایک نامہ نگار کابل میں متعین تھا۔ شمالی طاقتوں سے مواصلات کا سلسلہ مستقل طور پر قائم تھا اور ہفت روزہ اخبار میں ایران و انگلستان کی جنگ کی اطلاعات باقاعدہ چھپا کرتی تھیں۔<sup>(۴)</sup>

فوجی عدالت میں وکیل استغاثہ میجر ایف جے ہرنیٹ (Harriot) نے اپنے طویل بیان میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ۱۸۵۷ء کا انقلاب جن وجوہ کی بنا پر برپا ہوا

(۱) لاہور کرائیکل - ۲۶ ستمبر ۱۸۵۷ء -

(۲) دہلی اردو اخبار - ۲۴ مئی ۱۸۵۷ء (بحوالہ عتیق صدیقی) -

(۳) عبدالسلام خورشید، صحافت پاکستان و ہند میں - ص - ۱۷۳ - ۱۷۶

(۴) ٹرائل آف بہادر شاہ - ۱۲۳ -

اس میں قلعہ، معلیٰ اور صحافت کے درمیان سازش بھی کار فرما تھی۔ انقلاب سے پہلے کے اخباری اقتباسات کا حوالہ دے ہوئے وکیل استغاثہ نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اخبارات نے آنے والے انقلاب کے لیے زمین بار کی۔ مثلاً 'صادق الاخبار' نے جنوری کے مہینے میں یہ خبر درج کی کہ روس اور ترکی انگریزوں کے خلاف جنگ میں ایران کی مدد کریں گے اور شہنشاہ روس نے چار لاکھ سپاہیوں پر مشتمل فوج اس مہم کے لیے بار کی ہے۔ اسی اخبار نے بتایا کہ شاہ ایران نے فصلہ کر لیا ہے کہ کون کون سے درباری کو بمبئی، کلکتہ اور پونا کی گورنری سوبی جائے اور اس نے وعدہ کیا ہے کہ بہادر شاہ ہندوسان بھر کا بادشاہ ہوگا۔ مارچ میں اس اخبار نے جبر چھاپی کہ نو سو ایرانی افسر اور سپاہی ہندوسان میں داخل ہو چکے ہیں اور نانسو افسر اور سپاہی نو بھیس بدل کر خوددہلی میں موجود ہیں۔ وکیل استغاثہ نے یہ تسلیم کرے سے انکار کر دیا کہ قلعہ، معلیٰ اور صحافت کے درمیان کوئی سازش نہیں ہوئی اور حو کچھ ہوا اتفاق سے ہوگا۔<sup>(۱)</sup>

### صحافت سے مسلمانوں کی بے دخلی

۱۸۵۷ء کے انقلاب نے مسلمانوں کو صحافت سے عملاً بے دخل کر دیا۔ اس کے ثبوت میں ہم نٹ راجن کی کتاب سے بین اقتباس سن کرے ہیں جو بعض سرکاری دستاویزات پر مبنی ہیں :

”انقلاب برپا ہونے ہی سے سال مغربی صوبجات کے زیادہ تر اردو اخبار بند ہو گئے۔“<sup>(۲)</sup>



”بہت سے اردو اخبار معاویہ کے دوران میں بند ہو گئے تھے۔ ان کی جگہ نئے اخبار نکل آئے جن کی ادارت کے فرائض ہندوؤں کے ہاتھ میں تھے۔“<sup>(۳)</sup>



”۱۸۵۳ء میں اردو اخبارات کی تعداد ہشتس نہی۔ ۱۸۵۸ء کی فہرست میں صرف بارہ اخبار رہ گئے۔ ان میں چھ برائے اخبار تھے اور چھ نئے۔ ان بارہ اخباروں میں سے صرف ایک اخبار کی ادارت کسی مسلمان کے سپرد نہی۔“<sup>(۴)</sup>

(۱) ٹرائل آف بہادر شاہ - ص ۱۱۲۳

(۲) جے نٹ - راجن، ہسٹری آف جرنلزم ان انڈیا - ص ۶۸ -

(۳) ایضاً ص ۷۳ -

(۴) ایضاً ص ۵۴ -

## نتائج

اس ساری بحث سے اردو صحافت کے پہلے دور کے بارے میں مندرجہ ذیل نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں :

۱۔ دیسی زبانوں میں سب سے پہلے بنگالی زبان میں اخبار نکلے - اس کے بعد اردو میں اور پھر فارسی میں -

۲۔ اردو صحافت ۱۸۳۵ء کے قانونِ صحافت سے پہلے شعلہٴ مستعجل ثابت ہوئی اور فارسی صحافت نے بہت ترقی کی۔ اس کی وجہ یہ بھی کہ سرکاری سرپرستی کے باوجود اردو زبان کو قبولِ عام حاصل نہیں تھا -

۳۔ قانونِ ، صحافت ۱۸۳۵ء ، لینہو طریقِ طباعت کے اجراء ، اردو کو عدالت کی زبان قرار دینے کے حکم اور سرکاری سرپرستی نے اردو صحافت کی ترقی کے لئے زمین ہموار کی -

۴۔ اردو صحافت کا سب سے بڑا مرکز دہلی تھا - جہاں مولوی محمد باقر ، محمد حسین آزاد ، سید احمد خاں ، ماسٹر رام چندر اور مولوی کریم الدین جسے اہلِ دانش نے اس کی آبیاری کی اور اسے خبروں کی فراہمی ہی کا نہیں بلکہ علم و ادب کی توسیع کا بھی وسیلہ بنایا -

۵۔ پنجاب میں منسی ہر سکھ رائے اور منسی دیوان چند نے بہت سے اخبار اور رسالے نکالے اور انہیں حکومت کی عملی سرپرستی حاصل رہی - آگرہ کی اردو صحافت کو بھی سرکاری امداد حاصل تھی -

۶۔ اردو اخباروں نے عوام کو مغربی علوم سے روشناس کرایا - علم و ادب کو فروغ دیا - عوامی جذبات اور احساسات کی نرجانی کا فرض ادا کیا - نظم و نسق پر وقتاً فوقتاً نکتہ چینی کی اور اصلاحِ معاشرہ اور تعلیم کے لیے نمایاں کردار ادا کیا -

۷۔ انقلاب ۱۸۵۷ء سے ایک آدھ سال پہلے اردو اخباروں نے غیر ملکی راج کے خلاف عوامی بے چینی کی کسی حد تک ضرور عکاسی کی -

۸۔ ۱۸۵۸ء کے قانونِ زیاں بندی نے بہت سے اخباروں کی بندش کا سامان فراہم کیا ، باقی پر سنسر شب لگ گیا اور بہت سے اخبار محض خوف سے بند ہو گئے اور ایک نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان صحافت سے عملاً بے دخل ہو گئے -

۹۔ صحافیوں نے انقلاب سے پہلے اور انقلاب کے بعد بڑی بڑی قربانیاں دیں -



## کتابیات

## اردو زبان میں

۱۔ عبد اللہ یوسف علی ، انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ :  
الہ آباد ۱۹۴۶ء

۲۔ امداد صابری دہلی ، تاریخ صحافتِ اردو (جلد اول) ۱۹۵۳ء۔

۳۔ الطاف حسین حالی ، حبابِ حاوید ، اورنگ آباد ۱۹۳۹ء۔

۴۔ گارسان دناسی ، خطبات ، اورنگ آباد ۱۹۳۵ء۔

۵۔ ڈاکٹر شہر انگر (مقالہ) : ڈاکٹر عبد الستار صدیقی دہلی کالج میگزین - مدیم

دلی کالج نمبر دہلی ۱۹۳۵ء

۶۔ عبد السلام خورشید ، صحافتِ پاکستان و ہند میں ، لاہور ۱۹۶۳ء۔

۷۔ ”کوه نور“ (فائل) لاہور ۱۸۵۶ء۔

۸۔ (مقالہ ، شیخ محمد اسماعیل نانی نئی ، لاہور کا سب سے پہلا اخبار ”امروز“

۱۴ اگست ۱۹۵۵ء۔

۹۔ محمد سعید عبدالخالق ، مبسور میں اردو۔

۱۰۔ محمد عنبر صدیقی ، ہندوستانی اخبار نویسی ، علی گڑھ ۱۹۵۷ء۔

## انگریزی زبان میں

11. Calcutta Monthly Journal, 1822.

12. Calcutta Journal, 1822.

13. J. Natarajan : History of Journalism in India : Dehli, 1955.

14. Journalism History of, in India (a series of articles) ;  
S.C. Sanial : Calcutta Review, 1907-1911.

15. Lahore Chonicle (File) :

16. Dr. Abdus Salam Khurshid : Newsletters in Orient : Assen  
(Holland), 1956.

17. Punjab Mutiny Report.

18. The Punjabee (file) : Lahore, 1857.

19. The Koh-i-Noor of 1851 (article) : Punjab University His-  
torical Society Journal, Vol. IV, No. 1 : Lahore, 1916.

20. Trial of Bahadur Shah (Selections from the Records of the  
Government of the Punjab and its Dependencies) New Series,  
Vol. VII, 1870.

## فارسی زبان میں

۲۱ - کلیاتِ نثرِ فارسی - اسد اللہ خان غالب - کانپور، ۱۸۷۵ -

## فرانسیسی زبان میں

22. Histoire de la Litterature Hindouie et Hindoustanie :  
Garcin de Tassy : Vol. I-III : Paris, 1870, 1871.

## گیارہواں باب

### تذکرے

اردو ادب سے متعلق جو تذکرے ہیں وہ فارسی میں بھی لکھے ہوئے ہیں اور اردو میں بھی۔ چنانچہ ان کی تقسیم یوں ہو سکتی ہے کہ فارسی میں لکھے ہوئے تذکروں سے الگ بحث کی جائے اور اردو میں لکھے ہوئے تذکرے دکر کیا جائے، مگر شاید اس سے بہتر یہ طریقہ ہو کہ انہیں مطالب کی یکسانیت کے لحاظ سے تقسیم کیا جائے۔ یوں ان کے جائزے سے شاید بہتر نتائج ظاہر ہوں۔ ان پچاس برسوں میں تذکرہ نگاری کے لئے زیادہ تر نو فارسی کو ذریعہ اظہار بنایا گیا ہے۔ لیکن ضخامت اور ارسائی جائزے کے اعتبار سے اردو تذکروں کو اہمیت حاصل ہے۔ اس دور میں تذکرہ نویسی کی فارسی روایات بھی قائم رہیں اور ساتھ ساتھ جواب جواب کے طور پر تذکرے لکھنے کی چپقلشیں بھی چلتی رہیں۔ ان تذکروں میں 'عمدہ منتخبہ'، 'مجموعہ الانحباب'، 'مجموعہ نغز'، 'رباع الفصحاء'، 'تذکرہ عہد حکر'، 'دیوان جہاں'، 'گلشن بے خار'، 'خوش معرکہ'، 'زیبا' اور 'بہارِ خزائن' ایسے تذکرے ہیں جن میں اشعار کے طویل انتخاب درج ہیں۔ ان میں بعض تو اسے ہیں جن میں شعراء کے حالات بہت مختصر ہیں، البتہ بعض تذکروں میں ایسے اسرارے مل جاتے ہیں جن سے شعراء کی شخصیت کے کسی ایک پہلو کی دھندلی سی تصویر بن سکتی ہے۔ بعض میں مرتب نے کلام کے حسن و فح پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن سب کا انداز ایک جیسا ہے۔ یعنی ان سب میں طرزِ تنقید ناتواں ہے۔ اس طرز میں بھی ان کی زبان حائل ہو جاتی ہے جو شبیہوں اور استعاروں سے مرصع ہوتی ہے۔ اس وجہ سے کسی شاعر کے کلام کے مضامین اور اسے شعری جامہ پہنانے میں جن عوامل اور ذہنی، فکری اور وجدانی کیفیات نے حصہ لیا ان کا کوئی واضح تصور قائم نہیں ہو سکا۔ اس کے علاوہ الفاظ اس طرح غیر واضح اور مبہم استعمال کیے جاتے ہیں کہ یہ پتہ نہیں چلتا کہ مرتب شاعر کے کس پہلو کی خوبی بیان کر رہا ہے۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ ایک شاعر دوسرے شاعر سے کس طرح مختلف ہے۔ 'عمدہ منتخبہ'، 'مجموعہ نغز'، 'خوش معرکہ'، 'زیبا' اور 'گلشن بے خار' میں مؤلفین نے ایک آدھ سطر میں اپنی آرا دینے کی کوشش کی ہے۔ جن کی مثالیں ان کے اجمالی ذکر میں دی گئی ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر ان سب میں تاثراتی اندازِ تنقید ہی غالب ہے۔ 'گلدستہ'، 'نازنینان' میں مولوی کریم الدین سبب تالیف

یہ بتاتے ہیں کہ انہیں خیال گذرا کہ ”انتخاب پر قسم کے اشعار کا کرے اور آخر کتاب میں ایک رسالہ بزبانِ اردو علمِ عروض کا لکھ کر کہ جس سے ہر طرح کے اشعار اور بحور، زحافات اور قافیہ اور ردیف کی شناخت ہو سکے۔۔۔“۔ اسی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کے ہاں تذکرے کی کیا اہمیت تھی؟ مولوی کریم الدین کے اسی تذکرے سے ہم مومن کے ضمن میں ان کی رائے دیتے ہیں:

”مومن - شاعر بے نظیر، خاک پا جس کی بابِ شاعری میں اکسیر، لعلِ کانِ سخنوری لے بہا، سخنِ دانی میں گویا یکسا، عالمِ جمیع اصنافِ سخن، واقفِ اسرارِ زمن، جسٹہ‘ فبض اس کے سب دانی و فاصی کلیاب، فنونِ حکمیہ اور احوالِ رات میں گوہرِ نایاب۔“۔  
اس عبارت میں ایک لفظ بھی ان کی شاعری کے محاسن کے متعلق نہیں لکھا گیا۔ اس دور میں تذکروں کی عمومی تنقید کا معیار یہی تھا۔

ان تذکروں کے علاوہ کچھ ایسے تذکرے بھی ہیں جن کے مؤلفین نے ابتدا میں دساحے لکھے ہیں اور شعر کی تاریخ اور فنی محاسن پر بحث کی ہے۔ ان میں ’طبقاتِ سخن‘، ’دسور الفصاح‘، ’گلستانِ سخن‘، ’انتخابِ دواوین‘ اور ’طبقاتِ الشعراءِ ہند‘ میں ایسے ہی دیاجے لکھے گئے ہیں۔ ان میں اردو زبان کی پیدائش، ارباب اور علمِ عروض، قافیہ، علمِ بیان و معانی اور صرفی و نحوی خصوصیات پر بحث کی گئی ہے۔ ان کی تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اس تمام مواد میں جو رنگ، فکر و وجدان کی صنّاعی سے پیدا ہوتا ہے اس کی نشاندہی ان کے ہاں نہیں ملتی۔ معاشی اور معاشری امداد اگرچہ کسی دور میں بھی غیر اہم نہیں رہیں، لیکن انہیں شاعری کا یہ منظر بنانا جدید دور کا اندازِ نقد ہے اور مغربی اثرات کا مرہونِ منت ہے۔ ان سب تذکروں میں سے یہ بات کسی قدر ’طبقاتِ الشعراءِ ہند‘ میں ہے۔ وہ بھی اس لیے کہ مولوی کریم الدین کی رہنمائی فیلن نے کی تھی۔ اور اس کی بنیاد گارساں دناسی کے تذکرے پر رکھی گئی تھی۔ دناسی نے اپنے تذکرے کو تاریخی انداز میں مرتب کیا ہے۔ اس نے زبان کی ابتدا اور رفتارِ ادب کو معاشرے سے ہم آہنگ کر کے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ کریم الدین کے ہاں جو مباحث تذکرے اور تاریخ کے فرق پر ملتے ہیں وہ گارساں دناسی کے مقدمہ سے ماخوذ ہیں، البتہ کہیں کہیں ترجمہ کی وجہ سے عبارت کچھ گنجلک سی ہو گئی ہے۔

’گلدستہ‘ بے خزاں، اور ’گلشنِ ہمیشہ بہار‘، شیفہ کے تذکرے کے جواب میں لکھے گئے۔ اس میں بے اعتدالیوں کا در آنا عجیب نہیں۔ ’گلستانِ بے خزاں‘ کے مقابلے میں ’گلشنِ ہمیشہ بہار‘ میں البتہ مومن کے ذکر کے سوا اندازِ بیان سنجیدہ اور معتدل ہے۔

’سراپا سخن‘ میں سراپا کے متعلق اشعار جمع کر دیے گئے ہیں ، اس سے ایک دوسرے خارجی اور تقریبی رجحان کا اندازہ ہوتا ہے جو لکھنوی اسلوب کی نائندگی کرتا ہے ۔ اب ہم ان تذکروں کا علیحدہ علیحدہ اجالی طور پر جائزہ پیش کرتے ہیں ۔

### عمدہ منتخبہ

یہ تذکرہ اعظم الدولہ میر محمد خان سرور کی تصنیف ہے ۔ جس کا سن وفات ۱۸۳۳ء (۱۲۵۰ھ) ہے<sup>(۱)</sup>۔ قدرت اللہ قاسم ، مولوی کریم الدین اور شیفتہ نے سرور کی شعر گوئی اور مسلم دوستی کی تعریف کی ہے ۔ اس تذکرہ کی ابتدا غالباً ۱۸۰۰-۱۸۰۱ء (۱۲۱۶-۱۵ھ) میں ہوئی ۔ عمدہ منتخبہ کے الفاظ سے بھی ۱۸۰۱ء (۱۲۱۶ھ) سن نکلتا ہے ۔ اسے سال آغاز سمجھنا چاہیئے ۔ سن تکمیل ۱۸۰۴ء (۱۲۱۹ھ) ہے ۔ اس تذکرے کے کئی قلمی نسخے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں ۔ ایک نسخہ ییرس کی نیشنل لائبریری میں ، ایک انڈیا آفس لندن میں اور ایک انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے میں محفوظ ہے ۔ اس نسخے کا سال کتاب ۱۸۰۹ء (۱۲۲۴ھ) ہے اس کے علاوہ ایک قلمی نسخہ نیشنل موزیم کراچی میں بھی موجود ہے<sup>(۲)</sup> ۔

یہ تذکرہ اگرچہ خوب چند ذکاء کے تذکرہ ’عیار الشعراء‘ کی تلخیص ہے ، جو ۱۷۹۳ء (۱۲۰۸ھ) میں شروع ہوا اور جس میں ۱۸۳۱ء (۱۲۴۷ھ) تک برابر اضافے ہوئے رہے ، لیکن بعض خصوصیات ، مثلاً ترتیب و تنقید میں اس سے بہتر ہے ۔ ’عیار الشعراء‘ میں ۱۵۰۰ شعراء کا ذکر ہے جبکہ سرور نے ۹۷۹ شعراء کا تذکرہ کیا ہے ۔ اس کے علاوہ مصنف نے شعراء کے حالات میں عموماً تلائس و جستجو سے کام لیا ہے ۔ اس میں پچھلے تذکروں کی طرح اختصار و ایجاز نہیں ۔ بلکہ یہ تذکرہ زیادہ تفصیلی ہے ۔ تذکرے کی اصل خوبی یہ ہے کہ اس سے اپنے عہد کے چند عمومی رجحانات کا پتہ چلتا ہے ۔ مصنف نے صحت محاورہ پر زور دیا ہے اور غزلہائے طولانی کی مذمت کی ہے اور نمونہ کلام کے طور پر غزل کے علاوہ دوسری اصناف سے بھی مثالیں پیش کی ہیں ۔ اس کے علاوہ مصنف نے کہیں کہیں ضمناً مراختوں اور مشاعروں کی اہمیت کو بھی واضح کیا ہے ۔ جن میں نہ صرف شعراء اپنا کلام سناتے اور داد پاتے ، بلکہ شعر کے حسن و قبح پر بحث بھی کرتے تھے ۔

سرور کے تذکرہ میں جو تنقیدی اشارے ملتے ہیں ان میں سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں ۔ غالب کے متعلق لکھتے ہیں ۔ ”ریختہ در محاورات فارسی موزون کند“ ۔ اس سے

(۱) نثار احمد فاروقی ، عمدہ منتخبہ ۔ ص ۳۶۱

(۲) ڈاکٹر فرمان فتحپوری ، تذکروں کا تذکرہ نمبر ۔ ص ۹۹

غالب کے طرزِ شعرائے فارسی میں شعر کہنے کے رجحان کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اسی طرح احسن کے بارے میں یوں رائے دی ہے۔ ”در ایہام گوئی بسیار راغب والحق کہ دران زمان ہان رائج بود۔“ سرور نے شعراء کی پیدائش و وفات کے سنین کو نہیں دیے، لیکن ایسے اشارے ضرور کیے ہیں جن سے ان کا زمانہ متعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔ مثلاً آزاد کے متعلق لکھا ہے :

”از جرگہ متقدمین معاصر ولی ست“ تذکرہ سرور ق ۴۴ ب

اسی طرح انتظار کے بارے میں اشارہ ہے :

”ہم عصرِ فغان و آبرو ساعرِ عہد احمد شاہ“

شعراء کی سرب نگاری کے متعلق بھی بعض لطیف اشارے ملتے ہیں۔ مثلاً انشا کے متعلق لکھے ہیں :

”بسیار ہنگامہ آرا و شوخ طبع است“

امبر کے بارے میں کہتے ہیں :

”سیاح وضع در علم مجلس مہارتے دارد“

انور کے ضمن میں تحریر کرتے ہیں :

”مردِ لطفہ گو و خوش خلق“

مدرسہ اللہ قاسم اور سلفی نے اپنے تذکروں کی ترتیب میں ’عمدۂ منتخبہ‘ سے فائدہ اٹھایا ہے۔

### مجموعۃ الانتخاب

اس تذکرہ کے مصنف کے نام کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ گارسان دناسی نے ایک جگہ ان کا نام شاہ محمد کمال اور دوسری جگہ کمال الدین حسین لکھا ہے۔ یعنی ’نارنجِ ادبِ ہندوستانی‘ کے دیباچہ میں شاہ محمد کمال اور اپنے ایک مقالے میں کمال الدین حسینی<sup>(۱)</sup>۔ اس کے بر خلاف مصحفی نے اپنے تذکرے میں ان کا نام شاہ کمال الدین حسینی اور تخلص کمال اور وطن فصبہ گڑمانگپور بتایا ہے۔ مصنف نے خود اپنا نام صرف شاہ کمال ہی لکھا ہے۔ یہ تذکرہ ۳-۱۸۰۳ (۱۸۲۱ء) میں مکمل ہوا۔

(۱) گارسان دناسی، اردو کے تذکرے، مترجم ڈاکٹر ریاض الحسن، ص ۳۲-۱۰۳ مطبوعہ رسالہ اردو جنوری ۱۹۵۰ء۔ (بحوالہ نگار تذکروں کا تذکرہ لمبر)

اس تذکرے میں کل ۲۲۶ شعراء کا ذکر آیا ہے۔ چونکہ تذکرے کی تکمیل کے وقت مصنف حیدر آباد دکن میں مقیم ہو گئے تھے، لہذا اس میں شمالی ہند کے علاوہ حیدر آباد دکن کے ان شعراء کا حال بھی آگیا ہے جو اس وقت حیات تھے۔ اس تذکرے کی تصنیف میں بقول مصنف، 'نکات الشعراء'، 'مخزنِ نکات' اور 'تذکرہ ہندی' سے استفادہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس میں زیادہ تر انہی شعراء کا حال ہے جن کا ذکر مہر، قائم اور مصحفی اپنے تذکروں میں کر چکے ہیں۔ البتہ ۵۶ شعراء کے حالات ساہ کمال نے اضافہ کیے ہیں۔ تذکرے کی زبان فارسی ہے اور یہ اردو کے ضخیم ترین تذکروں میں شمار ہوتا ہے۔ قریب قریب ۱۵۶۳ صفحات پر محیط ہے۔ ابتدائی چودہ صفحات میں دیباچہ ہے۔ اس کے بعد حروفِ نہجی کے لحاظ سے شعراء کا تذکرہ ہے۔ شعراء کے حالات بیان کرنے میں کسی جدت کا ثبوت نہیں ملتا۔ وہی پرانی روس ہے جو قدم تذکرہ نگاروں کا شعار رہی ہے۔ یعنی ذکرِ شاعر مختصر، لیکن کلام کا انتخاب بہت طویل۔ تذکرے کی صفاً کا باعث یہی طویل انتخابات ہیں۔ غزل، مرثیہ، ہجو، مخمس، قصیدہ، منوی، غرض ہر صنفِ سخن کی مثال دی گئی ہے، جس میں کہ ساعر نے طبع آزمائی کی۔ یہ تذکرہ اب تک سائے نہیں ہوا۔ البتہ اس پر نصیر الدین ہاشمی کا ایک مفصل مضمون بعنوان 'شعرائے اردو کا ایک نایاب تذکرہ' رسالہ اردو کے جنوری ۱۹۵۶ء کے شمارہ میں سائے ہو چکا ہے۔ اس تذکرے کے فلمی نسخے ایسیٹاک سوسائٹی لندن اور نواب سالار جنگ حیدر آباد کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ ایک نامکمل قلمی نسخہ انجمنِ ترقیِ اردو ہند میں بھی محفوظ ہے<sup>(۱)</sup>۔

### ۳۔ مجموعہ 'نغز'

اس کے مصنف میر فدرت اللہ قاسم ہیں جو انشاء، مصحفی اور جرأت کے ہم عصر تھے۔ اس تذکرہ کی تاریخِ تکمیل ۱۸۰۲ء (۱۲۲۱ھ) ہے۔ اس کا ایک فلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ اسے ۱۹۳۳ء میں پروفیسر محمود شیرانی نے مرتب کیا اور پنجاب یونیورسٹی سے شائع کیا۔ محمود شیرانی مرحوم نے نقابلی مطالعے کے لیے انڈیا آفس لائبریری کا قلمی نسخہ بھی منگوایا تھا۔ ان کی تحقیق کے مطابق پنجاب یونیورسٹی والا نسخہ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

یہ تذکرہ بھی فارسی میں لکھا گیا ہے۔ یہ 'عیار الشعراء' اور 'عمدہ منتخبہ' کے بعد قدیم تذکروں میں سب سے زیادہ ضخیم ہے۔ یہ تذکرہ چھ سو ترانوں شعراء کے حالات و کلام پر مشتمل ہے۔ اس میں شعراء کے حالات تو نسبتاً مختصر ہیں، لیکن انتخابات

(۱) ڈاکٹر فرمان فتح پوری (مرتب)، تذکروں کا تذکرہ نمبر - ص ۱۰۹

خاصے طویل ہیں۔ اس تذکرے میں بعض ایسے واقعات درج کیے گئے ہیں جن سے شعراء کے خیالات اور رجحانات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس میں قدیم دکنی شعراء سے لیکر شاہ عالم ثانی کے عہد تک کے تمام شاعروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ محمد حسین آزاد کی کتاب 'آبِ حیات' کا ایک مآخذ یہ تذکرہ بھی ہے۔ آبِ حیات میں بہت سی آراء اور افوال کے علاوہ مندرجہ ذیل مباحث بھی 'مجموعہ' نغز سے لیے گئے ہیں۔ چونکہ محمد حسن آزاد نے سوائے انک مقام کے کہیں اس کا حوالہ نہیں دیا، لہذا یہ واقعات ان سے منسوب ہو گئے، لیکن حجب اس سے محفل ہے۔ 'آبِ حیات' میں مندرجہ ذیل واقعات کلتاً اس تذکرے سے ماخوذ ہیں :

- ۱۔ ولی اور ناصر علی کے درمیان شاعرانہ معرکے کا قصہ۔
- ۲۔ شاہ مبارک آبرو کے حالات و اسعار۔
- ۳۔ سرف الدین مضمون کا حال اور کلام۔
- ۴۔ آرزو کا کلام اور ان کی ندیہ گوئی۔
- ۵۔ سودا کے شعر کو حدیبی و دسی کہا۔
- ۶۔ مر و میرا کے سلسلے میں انک کو دریا اور دوسرے کو نہر بنانا۔
- ۷۔ سودا کا لطیفہ فائم علی امداد کے ساتھ۔
- ۸۔ بھلا اللہ خان بھلا کے حالات۔
- ۹۔ میر صاحب کی بد دماغی اور تک مراجی کا تذکرہ۔
- ۱۰۔ ولی کے متعلق، "شاعرست از شیطان مشہور تر"، کا حکم لگانا۔
- ۱۱۔ محمد امان نثار کے حالات۔
- ۱۲۔ جراثیم کے ابتدائی حالات اور مرزا محمد تقی خان برقی کے مشاعرے میں دھوم دھام سے غزل پڑھنا۔
- ۱۳۔ میر حسن کے جہ سے حالات۔
- ۱۴۔ ماساء اللہ خان کے پورے حالات۔
- ۱۵۔ انشاء اور عظیم بیگ کا معرکہ۔

### ۴۔ ریاض الفصحاء

یہ تذکرہ مصحفی کا لکھا ہوا ہے۔ 'ریاض الفصحاء' تاریخی نام ہے، جس سے سالِ تصنیف ۱۸۱۵ء (۱۲۳۱ھ) نکلتا ہے۔ مولوی عبد الحق کے نزدیک یہ سالِ آغاز ہے اس کی تکمیل دراصل ۱۸۲۰ء (۱۲۳۶ھ) میں ہوئی۔ یہ تذکرہ ۱۹۳۳ء میں انجمن ترقی اردو



اورنگ آباد دکن کی طرف سے سائے ہو چکا ہے۔ مصحفی کا یہ دوسرا تذکرہ ہے۔ پہلا تذکرہ، 'تذکرہ ہندی' کے نام سے چھپا۔ 'ریاض الفصحاء' میں ان شعراء کا ذکر ہے، جو پہلے تذکرے میں شامل ہونے سے وہ گئے تھے۔ تذکرہ فارسی زبان میں ہے اور پہلے تذکرے کے مقابلے میں بہت ضخیم ہے۔ اس میں کل ۳۲۳ شعراء کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں بالعموم غیر معروف شعراء کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس کی سہیلی ایس بھی رائے نام ہے۔

### ۵۔ تذکرہ بے جگر

اس کے مصنف حیرانی لعل لے جگر ہیں۔ یہ تذکرہ ابھی تک نہیں چھپا۔ اس کا صرف ایک علمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ ہے۔ جس کا ذکر محی الدین قادری اور کلب علی خان فائق رام پوری (۱) نے کیا ہے۔ یہ تذکرہ عہدِ اکبر شاہ ثانی (۱۸۰۶ء) میں لکھا گیا۔

تذکرہ فارسی میں ہے اس میں مدام سے لکر بمعصر شعراء تک کا ذکر کیا گیا ہے۔ تذکرہ نگاروں کی رواناب کے مطابق حالات مختصر اور نمونہ کلام طویل ہے۔ ولی کے حالات یوں درج کرتے ہیں۔

”درحقیقت کسی کہ اس در میدانِ ہندی دوازد آں بود۔ وہ واقعہ شخصے کہ آں رفتہ در جوئے این زبانِ ہندی رسائید پاں بود۔ حوں در اسائے جلوس محمد شاہی، دیوان او نہ دہلی رسد، موروں طمعانِ عالی فکر و عالی نلاسانِ ہم عصر، مثل حام و آبرو و فغان نہ سحرِ ریاس برو و ہم زبان سدند۔“

### ۶۔ دیوانِ جہاں

یہ تذکرہ بینی نرائن کی تالیف ہے۔ اس میں شعراء کے حالات اور تنقیدی آراء کی بجائے انتخابِ اشعار پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ اس لیے تذکرے کی بجائے اسے بیاض کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس میں اکثر شعراء کے نام اور غلصہ پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔ بینی نرائن نے یہ تذکرہ مشہور مسرور روبک کے امانا پر مرتب کیا تھا۔ تذکرہ کے اختتام پر سن ۱۸۱۲ء درج ہے، جسے اس کا سنِ تکمیل سمجھنا چاہیے۔

تذکرے کی زبان فارسی ہے۔ اس کی ابتدا حمد کے سات شعروں سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد سببِ تالیف اور پھر روبک صاحب کی مدح کی گئی ہے۔ اس میں کل ۱۳۵

شعراء کا ذکر ہے۔ شعراء کے کلام کو جمع کرنے میں نلاس و جسٹجو سے کام لیا گیا ہے۔ اس تذکرے میں بعض ایسے شاعر بھی آگئے ہیں جن کا ذکر کہیں اور نہیں ملتا۔ یعنی نرائن جہاں نے اپنا تمام کلام اس میں درج کر دیا ہے۔ گویا یہ تذکرہ 'دیوانِ جہاں' بھی ہے۔ شعراء کا ذکر حروفِ تہجی کی ترتیب سے کیا گیا ہے۔ تذکرے کے آخر میں مختلف شعراء کی رباعیات درج ہیں۔ اس کے علاوہ ضروریات و مطالعات کے عنوان سے بھی کئی شاعروں کے مہرے سے اسعار دیے گئے ہیں۔ آخر میں کلکتہ کے ایک مشاعرہ کی طرحی عزلیں اور معمولت لرنے والے شعراء کا مختصر ذکر بھی موجود ہے۔

۱۹۵۹ء میں کلام الدین احمد نے "کرت سٹڈیز" کے خاص نمبر کے طور پر مطبع لیتھو پریس رسہ شہ سے شائع کیا۔ اس کا علمی نسخہ اشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں محفوظ ہے۔

#### ۷۔ طبقاتِ سخن

یہ تذکرہ شیخ غلام محی الدین عسوی و مبلا مرٹھی کی تصنیف ہے۔ مبلا کے والد شاہ نعمت اللہ فارسی کے صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ مبلا کو صغیر سنی سے شعر گوئی کا سوق نہا۔ اور علمِ صرف و نحو سے خاصی دلچسپی تھی۔ مبلا نے 'طبقاتِ سخن' کے علاوہ 'مثنوی لیلیٰ محسوس' اور اردو کے دو دیوان بھی ترتیب دیے۔

'طبقاتِ سخن' تاریخی نام ہے، جس سے ۱۸۰۷ء (۱۲۲۲ھ) نکلا ہے۔ اس تذکرے کا ایک نسخہ کاندھی فصیح عام کالج ساہجہان پور میں موجود ہے۔ اس نسخے کو ڈاکٹر محمد حسن نے قسط وار 'پہاری زبان' علیگزہ میں ضروری حواشی کے ساتھ شائع کرا دیا تھا۔<sup>(۱)</sup>

تذکرے کی زبان فارسی ہے۔ اس کا پورا نام 'جواہرِ سخن موسوم بہ طبقاتِ سخن' ہے۔ مصنف نے اس تذکرے کو دو طبقوں میں تقسیم کیا ہے پہلا طبقہ ماضی و حال کے شعراء پر مشتمل ہے۔ دوسرے طبقے میں فارسی شعراء کا ذکر ہے، لیکن معلوم ہوا ہے کہ اس تذکرے کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک جتنے نسخے ملے ہیں ان میں فارسی والا حصہ موجود نہیں۔ تذکرے کی ابتدا کے متعلق روشنی ڈالی گئی ہے۔ خسرو کو ہندی غزل کا موجد قرار دیا ہے۔ یہ تذکرہ شاہ عالم آفتاب نے ذکر سے شروع ہوتا ہے اور حروفِ تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ بقول ڈاکٹر

(۱) رسالہ پہاری زبان، علیگزہ ۱۶ جنوری ۱۹۹۰ء تا ۸ اپریل ۱۹۹۰ء (نگار تذکروں کا تذکرہ نمبر)۔

## ۸۔ کشن بے خوار

سیفہ نے معروف سحراء کے حالات کو کسی قدر تفصیل سے لکھے ہیں مگر غیر معروف یا غیر اہم سحراء کا ذکر انک آدھ سطر میں ہی ختم کر دیا ہے۔ مثلاً سراج الدین علی خاں اکبر آبادی کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ”آرزو، محصل سراج الدین علی خاں اکبر آبادیست، حالش از فرط سہر آرزو میدان نسب کہ رامہ مصدی آن شود۔ گاہی با بر یقین بفکر رختہ می پرداخت“ (۳۷)۔

اور اس کے بعد ایک سر کا انتخاب درج کر دیا ہے۔

بہر حال سنیفٹہ نے اپنے معاصرین خصوصاً غالب ، موسن اور ذوق وغیرہ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے تاریخی اور ادبی لحاظ سے یقیناً قابلِ قدر ہے ۔ عموماً سنیفٹہ لگی لپٹی

(۱) ہماری زبان علیگڑھ ۱۶ جنوری ۱۹۶۰ء تا ۸ اپریل ۱۹۶۰ء (نگار تذکروں کا تذکرہ نمبر)

(۱) شیفتہ ، تذکرہ گلشن بے خار - ص ۵۶ - مطبوعہ لوک شورش ۱۹۹۱ء

(۲) شیفتہ، تذکرہ گلشن بے خار - ص ۹ - مطبوعہ نولکشور، ۱۹۱۰ء

رکھے بغیر رائے دیتے ہیں۔ اس سے اختلاف ہو سکتا ہے اور شدید اختلاف کیا بھی کیا ہے مگر یہ ضرور ہے کہ وہ اظہارِ رائے میں آزادی سے کام لیتے ہیں۔ ذیل میں چند شعراء کے بارے میں ان کی آراء ملاحظہ فرمائیں :

**جرات۔** ”سخن بمضامینے کہ میان عاسی و معشوی می گزرد می کرد ، طبعی رسا داست ، آوازہ اس کہ چون طبل دور نرفته از آنست کہ پذیرائی خاطر و گوارائی طبع اوباش و الواط حرف مزده و معہذا بعض اناس بغایب خوش ادا و دلربا آمدہ۔“ (۱)

**جوش۔** ”سعرس صاف و بیغس ، فکرس دلدبر و دلکس و سیوہ گزیدہ اش۔ طرزِ بسندیدہ اس بسندیدہ۔“ (۲)

**ذوق۔** ”طوطی بلاغت اسب و طوطی سکرسان فصاحت جامہ سحر بانی بالالیس راست و دامن آس زبانی از باد نفس شعلہ افزاست۔ رنگینی خمالس جلوہ لالہ و گل نظر می فرائد و سمع فکرس روانہ وار دل می رباید۔ اگر لفظ بنشین در کلامس آند جانفزا بر از ہم عبسی است و اگر حرف پرو و ز سخنس گزرد دلکس بر از حوس آمدی ساہد زسا۔ ہر مصرعس بیریس از ترکس کھان اروان برجستہ و ہر بمس دسمہ اسب دلہا حراسیدہ۔“ (۳)

**مصطفیٰ۔** ”ہر چند بمضامینے سیوہ بسیار گویان اکثر کلامس بر کم ہاید و از لطائف خالی اسب ، اما گزیدہ اشعار او در بغات ربص والا و مرست عالی است۔“ (۴)

**غالب۔** ”طوطی بلند پرواز چمن معانی اسب و بلبل نغمہ بردار گشن سوا بیانی ، پیش بلندی حمالس اوج فلک سسی زمین اسب۔“ (۵)

اسی طرح میر کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں کہ :

**میر۔** ”لطافت با طبعن ہمزاد است۔۔۔۔۔۔ صفحہ خیالس بجلوہ ریزی لالہ عذاران افکار دلاویز جون اندیشہ عانسق قطعہ گزار است۔“ (۶)

اگرچہ نقدی آراء میں شبیہ و استعارے کی زبان استعمال کی گئی ہے ، پھر بھی شعراء کے کلام کے سمجھنے میں کسی قدر مددگار ثابت ہوتی ہے۔ شفتہ کی گرفت عموماً

(۱) شفتہ ، تذکرہ گلشن بے خار۔ ص ۴۷۔ مطبوعہ لول کشور ۱۹۱۰ء

(۲) شفتہ ، تذکرہ گلشن بے خار۔ ص ۵۱۔ مطبوعہ نولکشور ۱۹۱۰ء

(۳) شفتہ ، تذکرہ گلشن بے خار۔ ص ۷۷۔ مطبوعہ نولکشور ۱۹۱۰ء

(۴) شفتہ ، گلشن بے خار۔ ص ۱۷۸۔ مطبوعہ نولکشور ، ۱۹۱۰ء

(۵) شفتہ ، گلشن بے خار۔ ص ۱۳۹۔ مطبوعہ نولکشور ، ۱۹۱۰ء

(۶) شفتہ ، گلشن بے خار۔ ص ۲۱۰۔ مطبوعہ نولکشور ، ۱۹۱۰ء

سخت ہے ، اسی نے ان کے جواب میں مذکرے لکھے گئے۔ مثلاً قطب الدین باطن شاگرد نظیر اکبر آبادی نے مذکرہ 'گلشنِ بے خزاں' اس کے جواب میں لکھا - 'گلشنِ بے خار' کی تنقیدی آراء اور انتخاب اشعار کی عموماً بہت تعریف کی جاتی ہے۔ تنقیدی آراء کے بارے میں نو اظہارِ خیال ہو چکا۔ جہاں تک انتخاب اشعار کا تعلق ہے ، نسبتہ کا میلان مومن کے اندازِ شعری کی طرف ہے اور لاسعوری طور پر ان کے انتخاب میں ہی رنگ جھلکنے لگا ہے۔

#### ۹۔ دستور الفصاحت

اس مذکرے کے مصنف احمد علی خاں یکتا ہیں۔ مذکرے کا نام تاریخی ہے ، جس سے ۱۸۳۴ء اعداد برآمد ہوئے ہیں اور یہی مذکرے کا سالِ تکمیل ہے۔ امتیاز علی خاں عرسی نے اسے مرسل کر کے ۱۹۴۳ء میں پہلی بار ہندوستانی پریس راسپور سے شائع کیا تھا۔ مذکرے کا آغاز ۱۷۹۸ء سے پہلے ہو چکا تھا۔ عرسی کے مہول یکتا نے ۱۸۱۳ء (۱۲۲۹ھ) میں مذکرے پر نظر ثانی کی اور ۱۸۳۴ء (۱۲۴۹ھ) میں اسے مکمل کیا۔

اس مذکرے میں یکتا نے صرف و نحو، عروض و فوائی اور بدیع و بیان وغیرہ کے مباحث بھی شامل کیے ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ سب سے اردو مذکروں پر فائق ہے۔ اس مذکرے کی نسیم سات حصوں میں کی گئی ہے۔ پہلا حصہ مقدمہ ہے اس کے بعد پانچ ابواب ہیں ، جن میں مختلف قواعدِ زبان کے مباحث ہیں اور آخر میں حاتمہ۔ پہلے حصے یعنی مقدمے میں اردو زبان کی بدائیس ، ارتقاء اور ان مراکز کا بیان ہے ، جہاں اس زبان کی نشو و نما ہوئی۔ پہلے باب میں اردو زبان کے قواعد سے بحث ہے جو فارسی سے لیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں اردو زبان کے صرفی اور نسیم میں بحوی احراء پر بحث کی ہے۔ چوتھے میں علمِ عروض و فاقہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پانچویں میں بیان و معانی کا ذکر ہے۔ آخری حصے میں ان شعراء کا کلام اور حالاتِ زندگی دیے گئے ہیں جن کا حوالہ مذکرے کے پہلے حصوں میں آیا ہے۔ اصل میں یہی حصہ اس تالیف کو مذکروں کی صف میں لاتا ہے۔ قدرتی بات ہے کہ مصنف نے اس کتاب کے مباحث کے لیے عربی اور فارسی کتب سے استفادہ کیا ہے۔ مصنف چونکہ خود بھی شاعر تھا اس لیے اس نے کئی مقامات پر اپنے اشعار حوالہ کے طور پر درج کر دیے ہیں۔

شعراء کو بین طبعوں میں نسیم کیا گیا ہے۔ پہلا طبقہ سودا ، میر ، درد ، قائم ، سوز ، اثر ، ناباں ، فغان ، یقین اور حاتم پر مشتمل ہے۔ دوسرے طبقے میں حسرت ، بیدار ، فدوی ، تجلّی ، حیران ، بفا ، بیان ، حسن نثار ، منت ، مصحفی اور رنگین آئے ہیں۔ تیسرے میں جراب ، افسوس ، انشاء ، نوا ، پروانہ ، نسکین ، نصیر ، منتظر ، وقت ،

عصفہر ، غیور ، اور مہر کو جگہ دی گئی ہے ۔ ہر طبع میں شعراء کی تعداد ۱۲ ہے ۔  
چنانچہ کل شعراء جن کا اس تذکرے میں ذکر ہوا ہے ۳۶ ہیں ۔

### ۱۔ مدائح الشعراء

اس کے مصنف عنایت حسن خاں مہجور ، ہیں جو تذکرہ 'گزارِ ابراہیم' کے مرتب ،  
علی ابراہیم کے صاحبزادے ہیں ۔ انہوں نے یہ تذکرہ ۱۸۴۳ء میں مکمل کیا ۔ اس کی زبان  
فارسی ہے ۔ یہ تذکرہ ابھی تک نہیں چھپا ۔ اس کا ایک علمی نسخہ کتب خانہ رامپور  
میں موجود ہے ۔

اس تذکرے میں کل ۶۹ ریختہ گو شعراء کا ذکر کیا گیا ہے ۔ جنہیں حروفِ تہجی  
کی ترتیب سے جگہ دی گئی ہے ۔ شعراء کے حالات مختصراً درج کئے گئے ہیں ۔

### ۱۱۔ گلستانِ سخن

اس تذکرے کا دوسرا نام 'آثار المعاصرین' ہے ۔ 'گلستانِ سخن' تاریخی نام ہے ۔ یہ  
تذکرہ ۱۸۵۴ء (۱۲۷۱ھ) میں شروع ہوا اور ۱۸۵۵ء (۱۲۷۲ھ) میں اس کی تکمیل  
ہوئی ۔ اس تذکرے کے مصنف کے متعلق اختلافِ رائے پایا جاتا ہے ۔ بعض کے نزدیک  
تذکرہ مرزا قادر بخش صابر اور صہبائی کی مشترک تصنیف ہے ، لیکن بعض اسے صرف  
قادر بخش صابر کی کاوشِ فکر کا نسخہ خیال کرتے ہیں ۔ صابر شاہ عالمگیر نانی کی اولاد تھے ۔  
ان کی طبع آغا کار ہی میں سخن مہمی اور سخن طراری کی طرف مائل تھی ۔ یہی وجہ ہے  
کہ صابر نے بڑی منت اور دقتِ نظر سے شعراء کے کلام کا جائزہ لیا ، جیسا کہ اس  
تذکرے کے اصل نام یعنی 'آثار المعاصرین' سے ظاہر ہے ۔ یہ تذکرہ صرف مصنف کے  
معاصر شعراء کے احوال اور انتخابِ بر مبنی ہے ۔ اس میں بھی دہلی کے شعراء پر خاص  
توجہ دی گئی ہے ۔ چنانچہ اس پر یہ اعتراض کسی حد تک درست ہے کہ "اس میں  
صابر نے صرف سرومدانِ دہلی سے کام رکھا ۔ باہر کے لہلہائے ہوئے سمسادوں کو  
وہیں کھڑا رکھا" (۱) ۔

یہ تذکرہ اس اعتبار سے کہ اس میں ایک دور کے ممتاز شعراء کا کلام جمع کر دیا  
گیا ہے ، ایک امتیازی خصوصیت رکھتا ہے ۔ اس سے معاصر ادبی تحریکات کے سمجھنے میں  
آسانی ہوتی ہے اور نقابِی مطالعے کا موقع ملتا ہے ۔ متقدمین اور معاصرین کے موضوعات کے

امنیاز سے ان کے ہاں بدلی ہوئی اقدار اور حالات کا جائزہ لینے کے لیے مواد ملتا ہے۔ اس تذکرے کی برسِ حروفِ تہجی کے اعتبار سے رکھی گئی ہے۔

تذکرے کے شروع میں ایک فاضلانہ مقدمہ ہے جس میں زبان کے اصولوں سے بحث ملتی ہے۔ مثلاً زبان سے کہا مراد ہے؟ اور وہ کس طرح وجود میں آتی ہے؟ فارسی، ہندی اور اردو میں حروفِ تہجی کی کیا کیفیت ہے؟ کون سے حروف کس زبان میں استعمال نہیں ہوتے؟ اس سلسلے میں صابر نے سنسکرت کی کتابوں سے مدد لی ہے اور گمنام برہمنوں کے احوال بھی نقل کیے ہیں۔ زبان کی سبب کے علاوہ کلمات فصیح و غیر فصیح، محاورہ دہلی اور روزمرہ وغیرہ پر بحث کی ہے۔ آخر میں عروض، علم الہوائی اور اسامیٰ شعر مثلاً غزل، قصیدہ، مثنوی، قطعہ وغیرہ کی خصوصیات کو بیان کیا ہے۔ جس سے ان کے ذوقِ سلیم کا بہ چلنا ہے۔ اس کے علاوہ صابر نے غالب اور مومن کے دور کے بہت سے عبرِ معروف شعراء کا کلام بھی درج کیا ہے۔ اس میں کل ناع سو سس ساعروں کا ذکر ہے۔

## ۱۲۔ انتخابِ دواوین

امام بخش صہبائی نے نہ اسحابِ دہلی کالج کے برنسل بورس کے ایما پر ۱۸۴۲ء میں کیا۔ جو اگلے سال یعنی ۱۸۴۳ء میں سائن ہوگا۔ اس کا ایک مطبوعہ نسخہ لمفت نیشنل لائبریری کراچی میں موجود ہے۔ امام بخش صہبائی دہلی کالج میں فارسی کے پروفیسر اور غالب، مومن، ذوق اور مرشد کے ہمعصر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے 'آثار الصنادید' کی اساعبِ اول کی تحریر میں مرشد کی مدد کی تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے علمِ بیان و معانی اور قواعد کی مشہور کتاب 'حدائق البلاغ' کا اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ وہ فارسی کے بہت بڑے عالم سمجھے جاتے تھے۔

امام بخش صہبائی نے ولی سے لے کر ان کے معاصرین تک کے دواوین کا نہایت عمدہ انتخاب کیا۔ انہوں نے اس انتخاب میں تمام اصنافِ سخن کو ملحوظ رکھا ہے۔ انہوں نے صرف غزل کے اسعار ہی نہیں دیے، بلکہ جو شاعر جس صنف میں امنبازی حبشت رکھتا ہے اسی صنف سے اس کا انتخاب دیا ہے اور یہ انتخاب ۱۰، ۱۲ صفحات سے کہیں کم نہیں۔ شعراء کے حالات دوسرے تذکروں کی طرح مختصر ہیں۔ کسی کو آدھے صفحہ سے زائد نہیں دیا، بلکہ معاصرین کے لیے تو صرف چند سطروں پر ہی اکتفا کیا ہے۔ تذکرے کی زبان اردو ہے۔ اس تذکرے میں صہبائی نے جو دیباچہ لکھا ہے وہ خصوصی طور پر قابلِ تعریف ہے۔ انہوں نے اس میں شعر کی تعریف، اس کی تاریخ، وزن، قافیہ، ردیف، عروض اور دوسرے اصنافِ سخن پر مجمل مگر عالمانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ ہر صنفِ سخن کے مخصوص اوزان اور اس میں شہر رکھنے والے شعراء کا کلام بھی دیا ہے۔ اس سلسلے میں انہیں

دوسرے تذکرہ نگاروں پر مقدم حاصل ہے۔ بعد کے اکثر تذکرہ نگاروں نے اس سے استفادہ کیا ہے۔ خصوصاً مولوی اکرم الدین نے اپنے تذکرہ 'گلدستہ' نازنینان کے لیے شعراء کے حالات مکمل طور پر اسی سے لیے ہیں اور کوئی حوالہ نہیں دیا<sup>(۱)</sup>۔

### ۱۳۔ خوں معرکہ' زیبا۔

اس تذکرہ کے مصنف سعاد حان ناصر ہیں۔ تذکرے کے دسواچہ سے یہ چلنا ہے کہ انہوں نے اس کی ابتدا ۱۸۴۴ء (۱۲۶۰ھ) میں اور مکمل ۱۸۴۵ء (۱۲۶۲ھ) میں کی۔ یہ تذکرہ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ نانکی پور پٹنہ میں محفوظ ہے۔ اس پر تاریخ تحریر ۱۸۶۵ء (۱۲۶۲ھ) درج ہے۔ اس کی ایک نقل انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے میں بھی محفوظ ہے<sup>(۲)</sup>۔

'خوس معرکہ' ربما' لو نہ خصوص حاصل ہے۔ تذکرہ اردو میں اس سے قبل اننا ضخیم تذکرہ نہیں لکھا گیا تھا۔ اس میں نہ صرف شعراء کی تعداد زیادہ ہے بلکہ ان کے حالات و انتخابِ نلام میں بھی مفصل تذکرہ لیا گیا ہے۔ اس میں سک میں ہیں کہ دوسرے تذکرہ نگاروں کی طرح سعاد حان ناصر نے بھی اپنے تذکرے کی مکمل میں سب سے پہلے تذکرہ نگاروں سے مدد لی ہے، مثلاً معاصرین سے قبل کے شعراء کے حالات سرور کے 'عمدہ منجہ'، مصحفی کے 'تذکرہ پہلی' اور 'ریاض النصحاء' اور سلسلہ کے 'کس سے خار' سے ماحوذ ہیں۔ لیکن بمعصر شعراء کے سلسلے میں اس نے ذاتی محبت اور دلچسپی سے حالات جمع کئے ہیں۔ ان کے معدنی بعض نئی معلومات ملی ہیں۔ مثلاً میر حسن کے معاصر کا، جو اس کی مشہور مثنوی 'سحر البیان' کی تحریر کا ناعب سا، ہمیں پہلی بار اسی سے یہ چلنا ہے۔ اس میں کل ۷۳۱ شعراء کا ذکر ہے۔ اس کی ترتیب میں ایک خصوصی اہتمام کرنا گیا ہے۔ مصنف نے ہر شاعر کے ساتھ اس کے ساگردوں کا ذکر بھی اسی جگہ کر دیا ہے۔ اس طرح اس کی ترتیب حروفِ ہجی کی بجائے زمانی ہو گئی ہے۔

### ۱۴۔ گلدستہ' نازنینان

یہ صہبائی کے 'انتخاب دواویں' کی طور کا تذکرہ ہے جسے مولوی کریم الدین نے ۱۸۴۵ء (۱۲۶۱ھ) کے آخر میں مکمل کیا اور اس کا تاریخی نام 'گلدستہ' نازنینان رکھا۔ یہ تذکرہ پہلی بار ۱۸۴۵ء (۱۲۶۱ھ) میں مطبع رفاه عام سے چھپا۔ اس کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ یہ تذکرہ اردو میں ہے اور اس میں سیستس (۳۷) شاعروں کا ذکر کیا گیا ہے۔

(۱) رسالہ نگار، تذکرہ نمبر - ص ۱۷۰۔

(۲) ڈاکٹر فرمان فتح پوری (مرتب)، نگار، تذکروں کا تذکرہ نمبر - ص ۱۸۹۔



مولوی کریم الدین نے اس کے دیباچے میں تاریخِ شعر بر روسنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے تذکرے کے آخر میں ایک رسالہ زبانِ اردو علمِ عروض کا لکھنے کا ارادہ بھی ظاہر کیا ہے، لیکن معلوم ہوا ہے کہ وہ لکھ نہ سکے۔ اس سے یہ چلتا ہے وہ صہبائی کے انتخاب کے دواوین سے متاثر تھے، بلکہ ساعری کی اسدا کے متعلق بھی جو کچھ انہوں نے لکھا ہے وہ بھی اسی سے ماخوذ ہے۔ اس کے علاوہ بعض شعراء کے حالات بھی جوں کے توں وہیں سے لیے گئے ہیں۔ حالاتِ زندگی محض اور انتخابِ کلام طویل ہیں۔ انتخابات میں تمام اصنافِ سخن کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

### ۱۵۔ بہارِ بے خزاں

اس تذکرے کو احمد حسن نے ۱۸۴۵ء (۱۲۶۱ھ) میں لکھا۔ یہ تذکرہ اب تک غیر مطبوعہ ہے۔ اس کا ایک فلمی نسخہ ندوہ العلاء لکھنؤ کے ٹیپ خانہ میں موجود ہے۔ یہ نسخہ مولوی عبدالحی مصنف تذکرہ 'گل رعنا' کی ملکیت تھا۔ جسے اس کے بیٹے مولانا عبدالعلی ندوی نے ندوہ کو عاریتاً دیا ہے<sup>(۱)</sup>۔

تذکرے کی زبان فارسی ہے۔ اس میں کل ۸۵ شعراء کا ذکر ہے۔ تربیبِ حروف نہجی کے مطابق رکھی گئی، چونکہ اس میں معروف شعراء کا ذکر ہے، لہذا اسے منتخب اور پسندیدہ شعراء کا تذکرہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ شعراء کے حائز کے نام میں اعتدال اور توازن کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ معاصر شعراء کے سوانح میں اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر حواحد احمد فاروقی نے اسی کتاب 'میر ہی میر'، 'حیات اور شاعری' میں سلسلہ 'معاصر' میراسی سے استفادہ کیا ہے<sup>(۲)</sup>۔

مصنف نے خود اپنے حالات اور نمونہ کلام بھی درج کر دیا ہے۔

### ۱۶۔ طبقات الشعرائے ہند

یہ تذکرہ مولوی کریم الدین اور فیلن کی مشترکہ تصنیف ہے۔ اس کی تدوین ۱۸۴۷ء میں ہوئی اور یہ ۱۸۴۸ء میں طبع ہوا۔ اگرچہ اس کی نشاد 'تاریخِ ادبِ ہندوستانی' مؤلفہ گارسان دناسی پر ہے، تاہم تذکرہ دناسی کے برعکس اس کی ترتیب ادوار و طبقات کے اعتبار سے ہے۔ یہ تذکرہ قدیم فارسی اندازِ تذکرہ نویسی سے مختلف ہے۔ 'طبقات الشعرائے ہند' کے دیباچے سے ظاہر ہوا ہے کہ اس کا مرتب تذکرے اور تاریخ کے فرق سے آگاہ ہے، اس لیے اس نے تاریخِ ادب کی بعض خصوصیات، مثلاً ضبطِ ستین کو ملحوظ

(۱) ڈاکٹر فرمان فتح پوری (مرتب)، نگار۔ تذکروں کا تذکرہ نمبر - ص ۱۷۳

(۲) ایضاً۔

رکھے کی کوسر کی ہے۔ کارساں دناسی کے تذکرے کو نوخیز کرم الدین نے بنیاد بنایا ہے، مگر اس کے علاوہ انہوں نے دیباچے میں ’مجموعہ‘ ’نغز‘ اور ’گلشنِ بے خار‘ سے بھی استفادہ کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کے بقول مولوی کریم الدین نے قاسم کے تذکرے ’مجموعہ‘ ’نغز‘ کو اس ایک مآخذ بتایا ہے، لیکن قرائن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس تذکرے کے علمی نسخے سے بہت کم استفادہ کیا گیا ہے۔ زیادہ تر سفتہ کے تذکرے ’گلشنِ بے خار‘ ہی کو سرِ نظر رکھا گیا ہے<sup>(۱)</sup>۔ اس تذکرے کو دو قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

”قسم اول۔ اس میں حالِ معدّس کا ہے جو بدی الابرگرے پر“۔

”قسم دوم۔ اس میں ان شعراء کا ذکر ہے جو نائی اردو کے بھیے اور انہوں نے اس زبان کی شروع میں کوسرِ بلخ کی ہے“۔

قسم دوم کو چار طبقات میں عسب در دیا گیا ہے۔ دہل میں ابھی کے الفاظ میں ان کی تفصیل دی جاتی ہے :

”طبہ اول۔ اس میں اردو کے مقدّمین ساعروں کا ذکر ہے“۔

”طبہ دوم۔ ان کا ذکر ہے جو مصلحِ اردو اور مرستی اس زبان کے بھیے اور انہوں نے الفاظِ کریمہ کا استعمال تک عام زبانِ رخصت سے موافق کیا“۔

طبہ سوم۔ ”اس میں وہ شاعر ہیں جو طبہ دوم کے ساگرد بھیے ان کو الفاظِ صبیح اور محاوراتِ دلچسپ کے استعمال کرنے کا بہت سوا ہوا“۔

”طبہ چہارم۔ اس طبہ میں وہ شاعر ہیں جو ہم عصر اس سدہ کے ہیں اور ان سے ملاقاتِ سدہ کی ہے، یا آخرِ حا یہ ان کو دیکھا ہے، یا آنکہ ان کا حال سنا ہے اور ملاقات نہیں ہوئی“۔

## ۱۔ - گلستانِ بے خزاں -

یہ تذکرہ حکیم میر تقی الدین باطن ساگرد نظیر اکبر آبادی نے ’گلشنِ بے خار‘ کے جواب میں بہ زبانِ اردو لکھا۔ اس کا تاریخی نام ’نغمہ‘ ’عندلیب‘ ہے جس سے سنِ تحریر ۱۸۴۵ء (۱۲۶۱ھ) نکلتا ہے۔ لیکن تذکرہ کے آخر میں جو قطعات تاریخِ تالیف درج ہیں ان سے ۱۸۴۸ء (۱۲۶۵ھ) آتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ باطن نے یہ تذکرہ

(۱) ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، طبقاتِ شعرائے ہند، مطبوعہ صحیفہ، لاہور جولائی ۱۹۶۷ء

۱۸۳۵ء (۱۲۶۱ھ) میں شروع کیا اور ۱۸۳۸ء ۱۸۳۹ء (۱۲۶۵ھ) میں مکمل کیا۔  
 بظاہر اس تذکرے کی محرک 'گلشنِ حار' سے ہوئی ہے جس میں ناطن کے اساد  
 نظیر اکثر آبادی کے متعلق اخلاقی رائے دی گئی ہے۔ ناطن نے جواب میں نہ صرف یہ  
 کہ نظیر کی از حد تعریف کی ہے بلکہ سب سے پہلے کے گروہ کے بعض شاعروں کی مدحت میں بھی  
 حد اعتدال سے آگے قدم بڑھائے ہیں۔ اس تذکرے کے بارے میں نہ مشہور ہو گیا ہے کہ  
 نہ محض سب سے پہلے کے تذکرے سے متصفیانہ جواب ہے، مگر یہ حال صحیح نہیں۔ تذکروں  
 کی عام روس کے نزدیک اس میں شعراء کے حالات تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ جن میں  
 کئی مفید معلومات بھی آگئی ہیں۔ لہذا ان کے اسباب میں احتیاط تو ملحوظ رکھنا چاہیے  
 ہے، لیکن انہیں انہیں انتقامی جذبے کے تابع محرر میں اعتدال و توازن و معیود  
 ہو گیا ہے۔

#### ۱۸۔ سراپا سخن

یہ تذکرہ سعد محسن علی نے دس برسوں کی محنت کے بعد ۱۸۵۳ء میں مکمل کیا اور  
 مکمل کے آٹھ سال بعد شائع ہوا۔ یہ عام تذکروں سے بالکل مختلف ہے۔ مصنف کا مقصد  
 شعراء کے حالات اور ان کے حالات و اسباب مرثیہ کرنا نہیں تھا، بلکہ انسانی جسم کے  
 تمام اعضاء کی ردیوں میں کیے گئے شعروں کو جمع کرنا تھا۔ چنانچہ اس نے قدمائے  
 لے کر ہمعصر شعراء کے حالات سے بالاس لڑنے کے مختلف اعضاء پر بھی گئی سسکڑوں عربی  
 جمع کردیں اور ان کو سر سے تنوں تک اس طرح مرثیہ کیا۔ سر، دماغ، نال، چوٹی،  
 رلف، کاکل، حس، ابرو، آنکھیں، بالکلیں، ناک، عارض، لب، دندان، زبان، دہن،  
 ذقن، کان، کان کی لو، منہ، گلا، گردن، دوس، ہاتھ، بازو، ٹہپاں، دلاؤ،  
 پہنچا، پھللیاں، انگلیاں، گھائٹاں، نوریں، ناخن، سب، جھانساں، نعل، پہو، دل،  
 روح، سٹ، ناف، سب، لہر، لولہ، سرین، راس، رانو، ساو، ناؤں،  
 ابرو، نلوے۔

شعراء کے حالات میں ان کے اسماء، ولادت، سکونت اور تلمذ کا ذکر کافی سمجھا گیا  
 ہے۔ اس سے زیادہ کوئی تفصیل نہیں ملی۔ اس میں کل ۳۳ شعراء کا کلام آگیا ہے۔

#### ۱۹۔ گلشنِ ہمیشہ بہار

یہ تذکرہ مولوی نصر اللہ احمدی خوشگی کی مصنف ہے۔ اس کا سال تصنیف ڈاکٹر  
 فرمان فتحپوری کے نزدیک ۱۸۳۷ء (۱۲۵۳ھ) اور ڈاکٹر اسلم فرخی کی تحقیق کے مطابق  
 ۱۸۳۱ء (۱۲۵۷ھ) ہے<sup>(۱)</sup>۔ یہ تذکرہ فارسی زبان میں لکھا گیا ہے اور چار سو بیس

شاعروں کے دہر پر مشتمل ہے۔ سبب نالیف سے بہہ چلنا ہے کہ مصنف مصطفیٰ خاں شمسہ کے تذکرے 'گلشنِ لے حار' کے معیارِ سعد سے مطمئن نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے وڈِ عمل کے طور پر یہ تذکرہ لکھا۔ ناطن کی طرح اگرچہ ان کا لب و لہجہ انقاسی نہیں لیکن شمسہ، ان کے اسنادِ مومن اور دوسرے احباب کے ذکر میں کہیں کہیں طنز و تعریض سے کام لیا گیا ہے۔ مصنف احمدی سلسلہ قادریہ نقشبندی کے بزرگ تھے۔ لہذا عام طور پر ان کا انداز سجدہ اور سلجھا ہوا ہے۔ سب کو نیک دعاؤں سے ناد کرتے ہیں۔ سعدی عصر بہ لم ہے۔ ویسا ہر شاعر کی تعریف کی گئی ہے۔

## ۲۰۔ یادگارِ شعراء

'یادگارِ شعراء' کے مصنف مسہور یورس مسسرو ڈاکٹر سپرنگر ہیں۔ وہ ۱۸۴۷ء میں اکسٹرا ریڈنڈنٹ کی حیثیت سے لکھنؤ میں مامور ہوئے اور ان کو شاہِ اودھ کے کتب خانوں کی فہرست تیار کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ دو سال تک یہاں مقیم رہ کر انہوں نے دہلی کالج کے ایک طالب علم علی اللہ نانی سی کی مدد سے دس ہزار کتابوں کی ایک فہرست تیار کی۔ اس فہرست کی پہلی جلد ۱۸۵۴ء میں انگریزی زبان میں شائع ہوئی۔ اس کے پہلے باب میں اردو شعراء کے تذکروں اور شاعروں کا ذکر کیا گیا تھا۔ اسی پہلے باب کو طفیل احمد نے اردو میں ترجمہ کر کے 'یادگارِ شعراء' کا نام دیا۔ یہ ترجمہ ۱۹۴۳ء میں ہندوستانی انسٹیٹیوٹ احمد آباد کی طرف سے مسعود حسن رضوی کی تعریض کے ساتھ شائع ہوا۔ اس میں مددِ دہلِ تذکروں کا تفصیلی ذکر ہوا ہے۔

۱۔ کتاب الشعراء	میر تقی میر
۲۔ تذکرۃ ریحہ گویان	فتح علی حسنی گردیزی
۳۔ محرنِ نکت	فائمہ جاند نوری
۴۔ شزارِ ابراہم	علی ابراہم خان خیل
۵۔ تذکرۃ سوریس	سید غلام حسین سوریس
۶۔ تذکرۃ ہندی	غلام ہمدانی مصحفی
۷۔ تذکرۃ عشقی	عشقی پشروی
۸۔ گلشنِ ہند	مرزا لطف
۹۔ عیار الشعراء	خوب چند ذکا دہلوی
۱۰۔ عمدہ منتخبہ	اعظم الدولہ محمد خاں سرور
۱۱۔ مجموعہٴ نفز	مدرت اللہ فاسم
۱۲۔ طبقاتِ سخن	غلام محی الدین قریشی مبتلا عشق مرٹھی

۱۳ - دیوانِ جہاں	بینی نرائن
۱۴ - گلدستہٴ نشاط	منو لال
۱۵ - گلشنِ بے خار	مصطفیٰ خان سہمہ
۱۶ - گلستانِ بے خزاں	قطب الدین ناٹن
۱۷ - انتخابِ دواویں	مولوی امام بخش صہبائی
۱۸ - گلدستہٴ نازنسان	مولوی کریم الدین
۱۹ - تذکرہٴ سمرائے ہند	مولوی کریم الدین اور قبلن
۲۰ - چمنِ بے نظیر	محمد ابراہیم

اس کے ساتھ سیرنگر نے ان تمام سمرائے کا جو مندرجہ بالا تذکروں میں آئے ہیں ، اسی تذکروں کے حوالوں سے فرداً فرداً ذکر کیا ہے ۔ ہم عصر سمرائے تک ہندوہ سو دو سمرائے مذکور ہیں ۔ حالات بہ مختصر ہیں ۔ اکثر دو ایک سطروں پر ہی اکتفا کیا گیا ہے ۔ بعض جگہ تو صرف نام اور محض ہی دے دیا گیا ہے ۔ ماحداث میں مندرجہ ذیل تذکروں کا حوالہ نہیں دیا گیا ۔

- ۱ - دیوانِ جہاں
- ۲ - گلدستہٴ نشاط
- ۳ - انتخابِ دواویں
- ۴ - چمنِ بے نظیر
- ۵ - گلدستہٴ نازنسان
- ۲ - تذکرہٴ سمرائے ہند

بہ ممکن ہے کہ سیرنگر نے سمرائے کے حالات و انتخابِ کلام میں ان سے براہِ راست مدد نہ لی ہو ، مگر رسالہ نگار کے تذکرہ نمبر کے مرتب ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق اس نے فرانسیسی مسشرق کارساں دناسی کے تذکرے سے مدد ضرور لی ہے ۔

## بارہواں باب

### لسانی خصوصیات

انسویں صدی کے آغاز تک اردو اپنی ارتقاء کی بہت سی منزلیں طے کر چکی تھی۔ زبان ہندوی یا ہندی کا دور اس کا پہلا ابتدائی دور تھا۔ جس میں نہ ایک ملی حلی بولی کی حسرت سے صورت پذیر ہو رہی تھی۔ اس دور میں یہ بولی کسا بھی؟ دسی زبانوں اور فارسی کا ایک ملفوفہ بھی کہ جس میں دونوں ترکیبی عناصر صاف الگ الگ معلوم ہوتے تھے۔ اسی دور کا نمونہ رعبہ کے وہ آثار ہیں، جس میں نصف مصرعہ فارسی اور نصف ہندی یا ایک مصرعہ فارسی اور ایک مصرعہ ہندی ہے۔ حضرت امیر خسرو اور سعدی کا کوروی کا کلام اسی انداز کا ہے۔ پھر دوسرا دور شروع ہوا اس میں یہ آئرس اور آئرس دونوں عناصر کو گھلا ملا کر آہستہ آہستہ یک خانہ نظر آتی ہے اور ہندوی ایک بولی کے دور سے نکل کر زبان کے دور میں داخل ہوتی ہے۔ بنیادی طور پر اس کی اساس ایک عوامی براکرت اپ بھرنس پر قائم ہوئی ہے، لیکن اس کا رنگ روپ فارسی کے اثر سے نکھرتا ہے۔ یہ صورت حال دورِ معلیہ میں پیدا ہوئی ہے اور سالی ہند سے زیادہ دکن میں اس نکھار کے اسباب، ذرائع اور وسائل فراہم ہوتے ہیں۔ نہ داسان کسی اور موقع پر متصل نان ہو چکی۔ ارتقاء کا یہ سلسلہ عام طور پر دورِ ولی تک بھٹلا گیا ہے۔ ولی سے پہلے دکن میں شاعر اور دکن نگار نویہ سے ہوئے لیکن بڑی حد تک ان کی سہرت اور حلقہ اثر دکن تک محدود رہا۔ اور سالی ہند کے کم تذکرہ نگار ان سے واقف ہوئے۔ اس زمانہ پر مقامی اثر ایسا نمایاں تھا کہ بعض تذکرہ نگاروں نے سوائے اردو مسلم کرنے ہی سے انکار کر دیا۔ سب اس کا نہ تھا کہ آہستہ آہستہ دہلی میں اردو کا جو محاورہ ارتقاء پذیر ہوا تھا، وہی اس زمانہ کا معتبر اور مستند محاورہ قرار دانا تھا۔ دہلی میں ولی اور شاہ سعد اللہ گلشن کی ملاقات میں بھی اس کا ذکر ہے۔ شاہ صاحب نے ولی کو دو سنوڑے دیے تھے۔ ایک تو یہ کہ ان مضامین کو جو فارسی میں بڑے ہیں ریختہ میں استعمال کریں اور دوسرے اسے دکھنی محاورہ کو ترک کر کے ریختہ کو محاورہ اردوئے معلیٰ شاہجہان آباد کے مطابق اختیار کریں۔ چنانچہ ولی کا کلام اسکی شہادت دیتا ہے کہ انہوں نے سفرِ دہلی کے بعد اس سنوڑہ کو قبول کر لیا تھا اور کلام کا ایک حصہ نہایت صاف اردوئے معلیٰ شاہجہان آباد کے مطابق ہے۔ یہ گویا ایک شاعر کی پہلی شعوری کوشش تھی جس سے اردو کی لسانی اصلاح کا آغاز ہوا ہے۔

سوال نہ پیدا ہونا ہے کہ اصلاحِ زبان کی ضرورت کیا تھی؟ اسکا معیار کیا تھا؟ اور اس کا نسخہ کیا نکلا؟ ضرورتِ اصلاح کا حال یہ ہے کہ ہر نئی بولی میں بعض مسائل ہونے ہیں۔ ان کو ہم صوبائی، صرفی اور نحوی مسائل کہہ سکتے ہیں۔ جب کوئی بولی یا زبان دو یا دو سے زیادہ زبانوں کے مل ملاپ کو قبول کرتی ہے تو بعض صوبائی مسائل پیدا ہوتے ہیں، مثلاً حوزہ زبان، اساس اور دندادی ہوتی ہے اس کا صوتی نظام الگ ہوسکتا ہے۔ حوزہ زبان نئی داخل اور اثر انداز ہوتی ہے اس کا صوتی نظام اور ہوتا ہے۔ مثلاً اردو کے تراکری عناصر میں ہائے آوارس شامل ہیں۔ یہ بھ بھ ٹھ وغیرہ، فارسی میں ان میں سے کوئی نہیں۔ بعض آوارس جیسے ہارے فہم فواعد ہوسکتے ہیں ہندی کہا ہے۔ مثلاً ٹ ڈ ژ وہ بھی فارسی میں نہیں ہیں۔ عربی اور فارسی کی بعض آوازیں مثلاً حائے حطی اور ہائے ہوز کی ہمز، ب ف و ع و ع وغیرہ آوارس، تراکریوں میں نہیں ہیں۔ ظاہر ہے فارسی بولنے والے ہائے آواروں کو عربی ہائے سے ممتاز کرنے میں دقت محسوس کریں گے۔ اور دندسی زبانوں کے بولنے والے عربی فارسی کی خاص آواروں کی تمیز اور ادا میں دقت محسوس کریں گے۔ اس کا نسخہ یہ ہوتا ہے (اور حوزہ اردوئے قدیم میں موجود ہے) کہ زبان، کا صوتی نظام واضح اور معین نہیں ہوتا۔ الفاظ کا تلفظ دو دو طرح ہوتا ہے، مثلاً بھ بھ بھی اور بھ بھی، حمزات بھی اور حمزات بھی، سا بھی اور نفع بھی۔ کہیں ایسا ہوتا ہے کہ املا میں تو ایسا رہتا ہے لکن تلفظ میں نہ ایسا رہتا۔ مثلاً اب اور عین کا فرق املا میں ہو جے لکن بول حال میں صرف ان لوگوں کے مہاں پانا جانا ہے جو نہ دیکھتے اور نہ ایہامِ فارسی عربی آواروں کو ان کی اصل کے مطابق ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب آپسہ آپسہ زبان کی ایک شکل بن جاتی ہے تو پھر اس افراتفری کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مثلاً د ٹھی دور میں بھ اور بھ اور نفع اور نما میں فرق ملحوظ رکھنا لازمی نہ تھا۔ لکن آئے حل کرنے رحجان معویہ بنا ہے کہ اردو میں داخل الفاظ کا املا اصل کے مطابق ہی رہنا چاہیے، سوائے ان الفاظ کے جہاں صرف استعمال سے اصل املا بالکل ہی مبرور ہو چکا ہے۔

تلم و تس بھی صورت صری اور نحوی سطح پر درپس آتی ہے۔ صرف اور نحو کے قاعدے تو اس وقت بسے ہیں، جب زبان اس مرحلہ پر پہنچ جائے کہ اسے اعجاز حاصل ہو جائے اور اس کے قواعد مرتب کرنے کی ضرورت اور املاں پیدا ہو جائے اور اس وقت بھی اہل زبان ان کی تدوین کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ بلکہ ان کی زبان اور معاشرہ کی سد پر ان اصولوں اور ضوابط کی تدوین ہوتی ہے۔ اسی صدی سے پہلے صری اور نحوی خصوصیات جن پر اسی صدی میں توجہ ہوئی، مختصراً یہ ہیں:

۱۔ مصادر کی عدم شکل مثلاً آؤناں آؤنا، آؤنو آؤنو، آناں آنا، ان میں آخر الذکر آنا کے

علاوہ باقی تمام صورتیں اسی ترتیب کے ساتھ دورِ قدیم سے اٹھارویں صدی کے نصف آخر تک ملتی ہیں۔ ان میں سے بعض بعض علاقوں سے بھی مخصوص ہیں، مثلاً آؤ نو اور آنو دکھنی عمارے کے خلاف ہیں، لیکن آوناں اور آناں دکھنی میں بھی ہیں اور شمالی ہند میں بھی۔

۲۔ افعال کی گردان میں بھی یہی صورت ہے۔ مثلاً آنا سے آٹا اور آیا اول الذکر قدیم تر ہے۔ آخر الذکر نسبتاً جدید، اس میں شدید اور بلا نشدہ دونوں صورتیں ملتی ہیں مثلاً رکھا، رکٹھا، رکھا۔

۳۔ جمع کی علامت اسم کی مختلف حالتوں میں ایک ہی طرح ہے، یعنی ان سے بنتی تھی۔ یہ خیال درست نہیں کہ یہ خصوصیت صرف دکھنی اردو کی ہے<sup>(۱)</sup>۔ مثلاً عورتاں آٹاں بجائے عوریں آئی، عوریاں کون فرمانا، بجائے عوریوں سے فرمایا۔

۴۔ حروف کی سکہیں بھی اردوئے قدیم میں کئی کئی ہیں، مثلاً سین سوں سیتی مستی سینے سینی (سے)، کوں، کو، منیں، منے، مان، مسہ میں، نن نے، اسی طرح کہان کی بجائے کان، جہاں کی جگہ جاں وغیرہ۔

۵۔ جمع کے استعمال میں اسم کے ساتھ صفت اور فعل دونوں کو چاہے مذکر ہو یا مؤنث، جمع لانا، مثلاً اچھے مرداں، اچھاں عوریاں، اچھے مرداں آتے تھے، اچھاں عورناں ایساں بھاں (بھی)۔

۶۔ رجنہ کے سعاء اور مصتفین عام طور پر فارسی کے فعل و حرف بلا تکلف استعمال کرتے تھے۔ بعد میں حاتم اور میر نے اسے بےح بتایا ہے، لیکن ان کے معاصرین کے یہاں اس کی مثالیں بکثرت ہیں۔ شاہ حاتم اس سلسلے میں آبرو کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

وہ جن کا ریختے کی شاعری میں صرف ہے  
ان سے کہتا ہوں کہ بوجھو حرف میرا ژرف ہے  
جو کہ لاوے ریختے میں فارسی کے فعل و حرف  
لغو ہنگیے فعل اس کے ریختے میں حرف ہے

۷۔ ساکن کو متحرک اور متحرک کو ساکن کرنے کی مثالیں اردوئے قدیم میں بکثرت ملتی ہیں۔ اس سلسلے میں جسقدر کوئی کلام مقدم ہے، اسی قدر اس میں یہ صورت نظر آتی ہے۔ آہستہ آہستہ اس باب میں احتیاط شروع ہوتی ہے۔

(۱) جیسا کہ مختار الدین آرزو صاحب نے کربل کتھا ص ۳۸ میں لکھا ہے ”دکنی میں جمع کی علامت ون یا ی ن کی جگہ ان اضافہ کرنے کا رواج بھی ملتا ہے“۔ تعجب ہے کہ اس قول کے بعد ہی وہ خود تسلیم کرتے ہیں کہ کربل کتھا میں بھی اس کی مثالیں دستیاب ہو جاتی ہیں۔



جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے ، شمالی ہند میں دیوانِ ولی کی سہرب سے پہلے اردو نثر و نظم کی حیثیت فارسی کے مقابلہ میں محض نابوی اور بمریعی تھی ۔ اس دور کے جن شعرائے اکابر کا ذکر اردو تذکرہ نگاروں نے کیا ہے ، وہ اصلاً فارسی کے صاحبِ کمال ہیں ۔ مثلاً مرزا مظہر جان جاناں اور سراج الدین علی خان آرزو وعرہ ۔ ان حضرات کا اردو کلام نظم و نثر بہت کم دستیاب ہوا ہے ۔ اس لیے قطعی طور پر نہ اندازہ لگانا دشوار ہے ، کہ ان کا اسلوب کیا تھا اور انہوں نے اردوئے قدیم میں اصلاح کے لیے کن پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھا تھا ۔ سخ جانہ لکھتے ہیں<sup>(۱)</sup> :

”مظہر اور بعض دوسرے شاعروں نے فارسی عنصر کو زیادہ غالب کر دیا ، جو چند شاعروں اور خصوصاً سودا نے اس کے خلاف کوشش کی اور اعدال و توازن پیدا کیا ۔ خود مظہر بھی اس امر کو سمجھ چکے تھے ، حاتمہ ان کا بعد کا کلام بھی نہایت ناکمزہ اور سستہ و رفتہ ہے“ ۔ ایک اور موقع پر یہی مصنف لکھتے ہیں<sup>(۲)</sup> : ”ابہام کی ساد ہندی پر بھی ، اردو میں یہ طرز صرف غزل کے لیے مخصوص نہیں اور دوسرے اصنافِ سخن کے موضوعات کے ادا کرنے کی قوت ، وسعت اور سہولت اس میں موحود نہ تھی ، اس لیے نئے دور کے شاعروں نے ہندی کے عناصر کو کم کر کے اس میں عربی فارسی کی آمسرس شروع کر دی“ ۔

تو گویا اصلاح کی ایک صورت نہ سوجی گئی کہ اردوئے قدیم میں سے ہندی یعنی ہراکرتی عناصر نکال کر ان کی جگہ عربی فارسی الفاظ داخل کر دیئے جائیں ۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ نثر اور نظم دونوں میں ایک ایسی زبان کا رواج ہونے لگا جس پر فارسی یا اردو دونوں میں کسی کا بھی اطلاق نہیں ہو سکتا تھا ۔ حاتمہ خود مظہر کے ریختے کے بارے میں سودا کو یہ لکھنا پڑا<sup>(۳)</sup> ۔

مظہر کا شعر فارسی اور ریختہ کے بحر	سودا نقن جان کہ روڑا ہے باٹ کا
آگاہِ فارسی نو کہیں اس کو ریختہ	واف جو ریختہ کے ذرا ہووے ٹھاٹ کا
سن کر وہ یہ کہے کہ نہیں ریختہ ہے یہ	اور ریختہ بھی ہے نو فیروز سامی لاٹ کا
القصد اس کا حال یہی ہے جو سح کہوں	کسا ہے دھوبی کا کہ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا

حاتم<sup>(۳)</sup> ۵۶-۵۵ء (۱۹۶۹ء) میں دیوانِ زادہ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں : ”و لفظ

- 
- (۲) ڈاکٹر ابو الیث صدیقی (مرتب) دیوانِ زادہ (مسودہ) برائے ترقی اردو بورڈ کراچی ۔ زیرِ طبع  
 (۲) شیخ چاند ، سودا - صفحہ ۳۵۶ - مطبوعہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن ۱۹۳۶ء (۱۳۳۵ھ)  
 (۳) شیخ چاند ، سودا - صفحہ ۳۵۵ - مطبوعہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن ۱۹۳۶ء (۱۳۳۵ھ)  
 (۴) شیخ چاند ، سودا - صفحہ ۲۵۶ - مطبوعہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن ۱۹۳۶ء (۱۳۳۵ھ)

در و بر و از کہ فعل و حرف باشد - بیش از قول شاه مبارک آبرو بندہ در دیوان قدیم خود نداشت۔۔۔۔

بندہ در دیوان قدیم خود تعید دارد و درین ولا از دوازده سال اکثر الفاظ را از نظر انداختہ - لسان عربی و زبان فارسی کہ قریب الفہم و کثیر الاستعمال باشد و روز مرہ دہلی کی میرزایان ہند و فصیحان رند در محاورہ دارند منظور داشتہ ، سوائے آن زبان ہر دیار قابہ ہندی کہ آن را بہاکا گویند موقوف کردہ فقط روز مرہ کہ عام فہم و خاص پسند بود ، اختیار نمودہ - شمعہ ازاں الفاظ کہ تعید دارد بہ بیان می آرد - چنانچہ عربی و فارسی مثلاً نسبیہ را نسبی و صحیح را صحی و بیگانہ را بگانہ و دیوانہ را دوانہ و مانند آن بطور عامہ یا متحرک را ساکن و ساکن را متحرک ، چنانچہ مرض را مرض و عرض را عرض و مانند آن یا الفاظ ہندوی کہ نین و جگ و نب و بسر وغیرہ آنچہ باشد یا الفاظ مار و موا و ازیں قبیل کہ برخود مباحثی لازم آید ، نا سے بجائے سیسے نا آدھر را اودھر و کدھر را کبدھر کہ در آن زیادتی حرف ناست یا بجائے ہرہ و ہیری را بھہ و لفظ بھہ بعضے جا مناسب و بعضے جا غیر مناسب چنانچہ بھہ کو و تھہے بہر است و تھہ چشم نے و بھہ نگاہ نے محاورہ نیست بجائے این بہری چشم نے و ہری نگاہ نے میوان گفت کہ نا خنصار آید ، نا یہاں رایاں و وہاں را واں و ہر انک را ہریک کہ در مخرج ننگ بود یا کسر و فتحہ در قافیہ را فارسی یا 'ر' را ہندی ، چنانچہ گھوڑا و بورا و دھڑ و سر و مانند آن مگر ہائے ہوز را بدل کردن بہ الف کہ از عام نا خاص در محاورہ دارید ، بندہ درین امر بہ متابعت جمہور است - چنانچہ بندہ را بندا و بردہ را بردا و شرمندہ را سرمندا و آنچہ ازیں قبیل باشد۔۔۔

اگرچہ بفول خود نہاد حاتم نے اس لسانی تحریک میں سعوری طور پر حصہ لیا اور ہندی (بھاکا) الفاظ کی جگہ عربی اور فارسی کے (اسوت) عام فہم الفاظ استعمال کرنے کی روش کو تقویت پہنچائی ، لیکن خود ان کے کلام میں بعد میں بھی اس قسم کے الفاظ اور قدیم تراکیب بکثرت ملتی ہیں - بلکہ اس کا سلسلہ ان کے بعد سودا اور میر کے دور تک چلتا ہے -

میر تقی نے 'نکات الشعراء' کے آخر میں فارسی میں ایک مختصر عبارت ریختہ کی مختلف اقسام کے باب میں لکھی ہے - اس میں بھی انہوں نے ریختہ میں فارسی کے فعل و حرف کا استعمال 'قبیح' بتایا ہے ، لیکن ان کے دور کے اکثر شعراء کے یہاں اسی مثالیں بکثرت ملتی ہیں<sup>(۱)</sup>۔

(۱) میر کی زبان کے بارے میں دو مضمون خاص طور پر مطالعہ کے لائق ہیں اور یہ دونوں دلی کالج میگزین (اردو) کے نمبر میں شامل ہیں ، جنہیں نثار احمد فاروق نے مرتب کر کے ۱۹۶۲ء میں گوہ نور پریس لال کنواں دہلی سے شائع کیا تھا - ایک مضمون زبان میر کی خصوصیات پر ڈاکٹر بھولا ناتھ تیواڑی کا ہے ، جو ہندی کے ایک ممتاز مصنف ہیں - دوسرا مضمون 'عہد میر کی زبان' وحید الدین سلیم مرحوم کا ہے - تفصیل کے لیے دیکھیے 'جامع القواعد' ڈاکٹر ابواللیث صدیقی زیر طبع مرکزی اردو بورڈ لاہور -

مثلاً تجھ بن بجائے ہمارے بغیر ، نہیں بجائے کو ، ایکون بجائے ایک ایک ، انہوں کا بجائے ان کا ، جو ، سو بجائے وہ ، کسو بجائے کسی ، جنہوں بجائے جن یا جنہیں ، سہوں بجائے سب ۔ البتہ حو بات خاص طور پر اس تحریک کے سلسلے میں محسوس ہوتی ہے ، وہ جعلی مصدر ہیں جو عربی فارسی الفاظ کی سیاد پر بنائے گئے ہیں ۔ قدم دور میں دکھنی عہد تک اس قسم کے مصادر ساڈ ہی ملتے ہیں ، لکن میر اور ان کے معاصرین کے یہاں اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں ۔ مثلاً خود مر کے یہاں حسب ذیل مثالیں موجود ہیں :

آزمانا ، بختنا ، بخشنا ، بخشوانا ، خرادنا ، سرما نا ، فرمانا ، فولنا ، گرمانا ، گررنا ، گزارنا ، دلنا ، نوازنا ۔

اسی طرح کے مصادر کی تعداد اردو کے کل افعال کی سہار میں نہر بھی بہت بھوڑی ہے ۔ اردو میں جو تراکرتی الاصل ہے ، پراکرتی افعال و مصادر کی کثرت ایک قدرتی لسانی واقعہ ہے ، البتہ ابتدائی افعال مثلاً : ہونا ، کرنا ، دینا ، لانا ، وغیرہ عربی فارسی الفاظ کے ساتھ بکثرت استعمال ہوئے ہیں ۔ یہ الفاظ خواہ مصدر ہوں یا اسم جامد یا حاصل مصدر ، صرف مر کا کلام سانسے رکھیں تو سرسری مطالعہ سے حسب دلیل صوریں نظر آتی ہیں :

مائل ہونا ، نوا کاڑھنا ، طہور ہونا ، ظہور ہونا ، کار پرداز ہونا ، رخصت چاہنا ، فرص ڈھونڈنا ، طاعت پانا ، آرام ہونا ، آرام آنا ، سام کرنا ، بسر کرنا ، سرے حانا ، جسم پڑنا ، آزار کھینچنا ، رنگ بدلنا ، ادا کرنا ، گریزاں ہونا ، نسبت ہونا ، عاشق ہونا ، موزوں کرنا ، نعرہ کرنا ، سر رہنا ، سر کرنا ، نظر آنا ، خمال جھوڑنا ، نمود ہونا ، ملحوظ رکھنا ، رنگ باندھنا ، صلح کرنا ، عجز کرنا ، سر اٹھانا ، مطالعہ کرنا ، سرگرداں ہونا ، سر دینا ، سرما نا ، قرب دینا ، فریب کھانا ، اظہار کرنا ، اختیار کرنا ، دیر کرنا ، گزر ہونا ، فرو لانا ، تمام ہونا ، ختم ہونا ، بس آنا ، سار کرنا ، خبر کرنا ، خبر ہونا ، خبر دینا ، دل دینا ، دل لگانا ، دل لانا ، دل آنا ، حاصل ہونا ، ساد ہونا ، ہم نوا ہونا ، مستاق ہونا ، طالب ہونا ، جسم نوشی کرنا ، سرگوسی کرنا ، خاطر نہیں لانا ، خاطر (میں) سانا ، بنیاد رکھنا ، نگاہ کرنا ، نگاہ ہونا ، نگاہ ڈالنا ، نگاہ چرانا ، نگاہ ملانا ، نگاہ بھر لینا ، منفی ہونا ، آسنا ہونا ، نا مراد ہونا ، با مراد ہونا ، مراد ہونا ، مراد برلانا ، انتظار ہونا ، انتظار کرنا ، بہم پہنچانا ، گم کرنا ، گم ہونا ، شامل ہونا ، شامل کرنا ، محرم ہونا ، واقف ہونا ، آگاہ ہونا ، تلاش کرنا ، جستجو کرنا ، آلودہ ہونا ، طالب ہونا ، خبر آنا ، طلب گار ہونا ، نصیب ہونا ، واکرنا ، وضع کرنا ، نشان ہانا ، سربیک ہونا ، شروع ہونا ، ختم ہونا ، حذر کرنا ، اعتبار کرنا ، اعتبار ہانا ، مقدر کرنا ، بہرہ ور ہونا ، تبسّم کرنا ، وغیرہ ۔

اس فہرست کو میر کے معاصرین کا کلام سامنے رکھ کر اور وسیع کیا جا سکتا ہے

ہے۔ دراصل یہی صورت اصلاحِ زبان کی سب سے اہم ہے کہ جس سے اردو کے سرمایہٴ لسانی میں زبردست اضافہ ہوا۔

اسی سلسلے میں ایک اور رجحان فارسی کے محاورات کا اردو ترجمہ کرنے کا پیدا ہوا۔ اگرچہ اس کی بھی بعض مثالیں دکھنی دور میں ملتی ہیں، لیکن خانِ آرزو، میرزا مظہر جانِ جاناں، حاتم، مبر اور سودا کے عہد میں تو یہ رجحان ایک تحریک کی صورت اختیار کر لینا ہے۔ مثلاً صرف میر اور سودا کے کلام کو سامنے رکھ کر سرسری مطالعہ سے اس قسم کے محاوروں کی ایک فہرست بطور نمونہ تیار ہو سکتی ہے<sup>(۱)</sup> :

بازار گرم ہونا۔ مہام کرنا، گوئے لے جانا، بازی لے جانا، گوس کرنا، بر سرِ سخن آنا، فلم ہونا، سر کرنا، جسم رکھنا، نار پانا، ظلم کھینچنا، نر آنا، نمود کرنا، خوش آنا، کسی کام میں درست ہونا، بو کرنا، خواب (کا) لے جانا، زنجیر کرنا، دردِ سر دینا، سرخرو لانا، رنجہ کرنا، ناب دینا، سر کھینچنا، داع ہونا، وا ہونا، بہم پہنچانا، سر کرنا، طرح کرنا، سرزد ہونا، تماشہ کرنا، ساز کرنا، تعب کھینچنا، راہِ غلط کرنا، بو آنا، خو کرنا، زبان کرنا، گرد آنا، تکلیف کرنا، بروئے کار لانا، فرو ہونا، چشم سننا، گردن مو سے ناریک رکھنا، نسوہ لینا، بہانہ پر ہونا، دامن جھاڑ کر چلنا، جامہ سے نکل پڑنا، فلک کو خبر نہیں، دل ہانٹھ سے جانا، گوس مال دینا، کسی کام کا دھن نہ رکھنا، خوش آنا، جگر آنا، جگر کرنا، حُسمک مارنا، کھال کھینچنا، وغیرہ۔

ایک زبان سے دوسری زبان میں محاورہ کا ترجمہ مشکل ہی نہیں تقریباً ناممکن ہونا ہے، لیکن اردو اور فارسی کے درمیانی رسی نے اس مشکل کو بڑی حد تک دور کر دیا، اور فارسی کے محاوروں کے ترجمے نہایت کثرت سے اردو میں رائج ہو گئے اور ان سے اردو کے سرمایہ میں اضافہ ہوا اور اس کے اسلوبِ نظم و نثر میں وسعت پیدا ہوئی۔ نیز زبان جو اپنے مزاج میں دیسی اور براکرتی عناصر کی کثرت کے باعث ہندی اور ہندوی نے روپ میں تھی اس قدیم روپ سے نکل کر اردوئے معلیٰ کے دور میں داخل ہو گئی۔

ترجموں کے علاوہ فارسی کے براہِ راست اثر کے اضافے کی بھی اس دور میں اور مستقل صورتیں واضح ہوتی ہیں۔ مثلاً فارسی کے اسمائے مفعول کو اردو میں بلا تصرف و ترجمہ شامل کر لیا اور یہ صورت مرکبات تک محدود نہیں، بلکہ بطور مفرد بھی استعمال ہوئی، مثلاً خواہیدہ، کاپیدہ، دریدہ، بالیدہ، نفسیدہ، زائیدہ، خراسیدہ، نشیندہ، نشیندہ، بافیدہ، نالبدہ، شوریدہ۔

(۱) تفصیلات کے لیے دیکھیے وحید الدین سلیم، میر کی زبان، دہلی کالج میگزین میر نمبر - سودا کے

لیے دیکھیے سودا از شیخ چالد

۲۔ اسم مفعول کی طرح فارسی کے بعض اسم فاعل بھی اسی دور میں بجنسہ فارسی سے لیے گئے مثلاً گویندہ ، کشندہ ، بزندہ ، شنوا ، نگران ، روان ، دواں ، کشاں ۔

۳۔ اس دور کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ عربی و فارسی مرکبات کا استعمال آہستہ آہستہ بڑھنا ہوا نظر آتا ہے ۔ اس طرح اردو میں فارسی کی اضافتوں کا استعمال عام ہو گیا اور ہندی اضافتوں کی تکرار سے جو صورت کلام میں پیدا ہوتی تھی ، وہ رفع ہو گئی ۔ اگرچہ آگے چل کر نظم اور نثر دونوں میں یہ صورت پیدا ہو گئی کہ بعض اوقات پورے شعر یا جملے میں سوائے فعل ہندی کے باقی تراکیب فارسی اختیار کر لی گئیں جو اردو کے مزاج کے مطابق نہ تھیں ۔ اس لیے یہ رجحان بہت جلد اعتدال کی طرف رجوع ہو گیا ۔ بہر حال میر و سودا اور ان کے معاصرین کے یہاں محض سرسری مطالعہ سے ہی اس قسم کی تراکیب بکرب مل سکتی ہیں ۔ موئے آس دیدہ ، حلفہ زنجیر ، آتش زیربا ، دامنِ کوہ ، کمرِ کوہ ، فافلہ ، نکہب ، ہنگامہ ، گرم کن ، سر بیجب ، فکر ، سرنشین ، رہ مے خانہ ، بودِ نفس و نگار ، شعلہ ، بر پیچ و تاب ، چراغِ بہ داماں ، خانہ براندا ز چمن ، خاکِ افادہ ویرانہ ، صد سخن آغشته بخون ، بابانِ یکسی و نہائی ، برفِ خرمینِ صد کوہ ، طور ، نک بابانِ ماندگی ، دل آزارِ خلائی ، نیغِ ستم کشیدہ ، ابرو بہم کشیدہ غبر از دوئی ، منتظرِ جشنِ بادِ سحری ، مثالِ نکہبِ گل ، سرگرمِ سرِ گلشن ، موجبِ عیب و سادمانی ، باعثِ لطفِ زندگانی ، سخن ساز بہ سالوسی ، صفحہٴ سینہ پر از حلوہٴ طاؤسی ، سمعِ بردہٴ فانوس ، دہنِ جامِ مے ، شہادِ گاہِ خونِ ریزِ محب ، ہمہ بن جسمِ عکسِ شعاعِ مہر ، طوفانِ بدوس ، یک حرفِ آرزوئے بہ لب نارسدہ ، دل دادہٴ زلفِ رخ بر ، نہ دیدہ قابلِ آغوسِ ستم دیدگان ۔

۴۔ اردوئے قدیم میں جنس غیر حقیقی کا تعین نہیں ہے ۔ اکثر اسماء جو اب مذکر بولے جاتے ہیں ، وہ اس عہد میں مؤنث اور اکثر مؤنث مذکر استعمال ہوتے تھے ۔ مثلاً سبر ، دیدہ ، جراحت ، جان ، سطح ، گسب ، گل گشت ، خلش مذکر استعمال ہوتے تھے اب مؤنث بولے جاتے ہیں ۔ خواب ، گلزار ، مزار ، نشتر ، حشر ، اب مذکر بولے جاتے ہیں ، اس دور میں مؤنث بھی ۔ مہر اور ان کے معاصرین نے اس باب میں قدما کے مقابلہ میں کسی قدر احتیاط ملحوظ رکھی ہے ، لیکن تذکیر و نانث کے اصول مقرر نہیں کیے ، البتہ انشا اللہ خان انشا نے اس پر کسی قدر تفصیل سے بحث کی ہے ۔ اس بحث کا خلاصہ یہ ہے (۱)۔

مذکر اور مؤنث کی کئی قسمیں ہیں ، حقیقی ، سماعی اور تقدیری ۔

”مؤنث حقیقی وہ جنس ہے کہ جس کے مقابلہ میں مذکر جنس حیوان موجود ہو اور اس کے لیے انسانوں میں علامات و القاب مانند بیگم ، خانم ، بی بی ، بی جی ، بہو ، ہمشیرہ ،

اما ، باجی ، پھوپھی ، خالہ ، ممانی ، انتا ، دُدا ، چھوچھو ، وغیرہ اس کی مثال ہیں ۔ بعض الفاظ تبدیلِ حرف و حرکت سے مذکر اور مؤنث ہوتے ہیں ، مثلاً پیارا مذکر ، پیاری مؤنث اسی طرح پنجابی میواتی بنگالی مارواڑی کے مؤنث پنجابن ، مواتن ، بنگالن ، مارواڑن ہوتے ہیں ، لیکن کوئی کلمہ نہیں ، بلکہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ یائے معروف کی جگہ ن علامت نہیں ہوتا ، مثلاً پوری سے مؤنث پوربن نہیں ، بلکہ پوربنی ہونا چاہیے ۔ الفاظ فارسی مثلاً خراسانی و صفہانی میں یائے معروف کی جگہ نون سے مؤنث نہیں بنتا ۔ شیرازن کا نون اگرچہ پنجابی کے قیاس پر درست معلوم ہونا ، ہے لیکن زبان فصحاء نہیں ہے ۔ بلکہ شیرازی کا اطلاق مذکر و مؤنث دونوں پر ہونا ہے ۔ یہ مغل شیرازی ہے یہ مغلانی شیرازی ہے۔“

اس سے یہ لکھ سدا ہوتا ہے کہ اگرچہ مذکر اور نانِبِ عبرِ حمی کے لیے قاعدے مقرر نہیں ہوتے ، لیکن اردو اور فارسی کے مزاج کا امتیاز فصحاء کے سامنے تھا اور جس قاعدے کا اطلاق دیسی الفاظ پر ہوتا تھا ، اس کا اطلاق فارسی الفاظ پر نہیں ہوتا تھا ، اس لیے ہندی الاہل الفاظ نسبتی کے لیے نہ قاعدہ (باستثنائے حند الفاظ) مقرر ہوا کہ یائے نسبتی کو نون سے بدل دیا گیا ۔ اسی طرح دوسرا قاعدہ یہ ہوا کہ یائے نانِبِ مقابل الف مذکر اسکی پہچان ہوئی ٹھان ، ٹھانی ، برہمن ، برہمنی<sup>(۱)</sup> ۔ ایک اور قاعدہ نہ ہوا کہ یائے نانِبِ سے قبل الف اور نون بڑھا دیں ، مثلاً مغل سے مغلانی سند سے سبدانی ۔ ایک اور قاعدہ یہ ہے کہ مذکر سے یائے معروف دور کر کے الف نون اور یائے مجہول کا اضافہ کرتے ہیں مثلاً کھتری سے کھترانی کہ اس میں ت مشدد کو مخفف بھی کر دیے ہیں ۔ اسی طرح سید سے سبدانی میں بھی یائے مشدد کو مخفف کر دیتے ہیں ۔ بعض اوقات مذکر کے آخر میں نون اور یائے معروف لگاتے ہیں ، مثلاً ڈوم سے ڈومنی ۔ ایک اور فرق (خاص طور پر اسمائے معروف میں) نہ ہے کہ حرکتِ ماقبل واؤ مجہول اور حرکتِ ماقبل واؤ معروف سے مذکر مؤنث کی تمیز ہوتی ہے ، مثلاً کلتو (مذکر) کلتو مؤنث اسی طرح نرخم واؤ مجہول کے ساتھ مؤنث پر دلالت کرتی ہے ۔ امیر نام مرد کا اور امرو نام عورت کا ہوگا ۔

اس بحث کے بعد انتہا اللہ خان<sup>(۳)</sup> نے مؤنثِ سماعی کی تفصیلی بحث کی ہے ۔ مؤنثِ سماعی کی پہچان یہ ہے کہ آخر کلمہ میں یائے معروف ہوتی ہے ، سوائے :

۱۔ یائے نسبتی ، مثلاً پنجابی ، پوری وغیرہ ۔

(۱) اصل میں انشاء نے یہ مثال (ص ۱۳۶) اس قاعدے کے ساتھ صحیح نہیں لکھی یہاں یائے تائید کے مقابلے میں الف تذکیر نہیں ہے ۔

(۲) یہی صورت ن کے ساتھ ہوتی ہے امیر مرد کا اور امیرن عورت کا نام ہوتا ہے رحیم مرد کا اور رحیمن عورت کا نام ہوگا ۔

(۳) انشاء ، دریائے لطافت ۔ ص ۱۳۸

۲۔ یائے فاعلی روگی ، بھوگی ، جوگی ، مالی ، وغیرہ ۔

۳۔ جزو علم حیوان مذکور مثلاً بانہی ۔

۴۔ یائے لقی ، مثلاً چودہری ، منشی ۔

۵۔ یائے صفتی کہ صفت موصوف کے تابع ہے ، مثلاً یہ نتھر بھاری بھا اور یہ کٹھری بھاری نہی ۔

۶۔ بعض کلمات جن کے آخر میں یائے معروف ہو اخلاقی ہیں ، مثلاً دہی بھاب میں مذکور اور ہورب میں مؤنث اور اردو میں مشترک ہے ۔ مونی کو بھی بعض لوگ مشترک کہتے ہیں ، لیکن بقول انشا اسکی تذکیر مسموع نہیں ۔ دانی اور ٹھی دونوں مشترک ہیں، گھی در اصل گھبو تھا<sup>(۱)</sup>۔ ان مختصر اصولی بحثوں کے بعد انشا نے حروف پنجی کی ترتیب سے اسائے مؤنث سماعی کی ایک فہرست دی ہے<sup>(۲)</sup>۔ اسکے بعد مؤنث قیاسی کی بحث ہے ۔

غرض انشا اللہ خان انشا نے نہایت تفصیل کے ساتھ اردو کے قواعد صرف و نحو سے بحث کی ہے جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ انکے عہد تک اردو کے قواعد کس حد تک متعین ہو چکے تھے ، اور ان کی کما صورت بھی ۔ ’دریائے لطافت‘ سے ہی یہ باب قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ فارسی کے اس اثر کے باوجود اردو کی ایک اپنی حنیب بھی مستحکم ہو چکی ہے اور اردو کی صحیح کا معیار خود اردو ہے ۔ اس باب میں انشا کا یہ بیان نہایت اہم ہے جو نار بار بس کسا گیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں کہ جو لفظ اردو میں آگیا وہ اردو ہے ، چاہے از روئے اصل کچھ ہو اور جس طرح اردو میں بولا جاتا ہے اسی طرح صحیح اور درست ہے ، اگرچہ از روئے اصل غلط ہو اور اردو میں غلط ہے نو غلط ہے چاہے از روئے اصل صحیح اور درست ہو ۔ یہ بات نہایت اہم ہے اور اس سے ان اعتراضات کا سد باب ہو جاتا ہے کہ اردو صرف چند زبانوں کے اختلاط اور مجموعے کا نام ہے ۔ انیسویں صدی کے آغاز سے پہلے ہی اردو کی اپنی اہمیت متعین ہو چکی تھی اور اسکے قواعد و ضوابط مرتب ہو گئے تھے قواعد کی ان کتابوں کی بحث اسی باب میں آگے آتی ہے ۔

’دریائے لطافت‘<sup>(۳)</sup> سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے آغاز میں اردو کے محاورہ اور صحت کا بھی ایک معیار مقرر ہو گیا تھا اور عام طور پر بقول انشا یہ سمجھا جاتا تھا ”کہ محاورہ اردو عبارت از گویائی اہل اسلام است“ ۔ لیکن اس باب میں اختلاف تھا او ، خود شہر دہلی میں بھی ہر مسلمان شخص کی زبان مستند نہ تھی ، کیونکہ مختلف

(۱) پنجابی میں آج بھی گھیو کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ بعض مؤنث قیاسی یا سماعی ایسے

ہیں جن کی اصلی صورت جو پنجابی میں قائم رہی ۔

(۲) انشا ، دریائے لطافت - ص ۱۴۰ - ۱۴۵

(۳) انشا ، دریائے لطافت - ص ۱۵ و بعد

علاموں میں سننے والوں کی اپنی اپنی خصوصیات نے اردو کے علاقائی محاورے بھی پیدا کر دیے تھے ، مثلاً مغل پورہ کے رہنے والے اردو روزِ مَہرہ نہ قاب سے ملا دیتے تھے ۔ لاہور کو لہور کہتے تھے اور لنگھنا بجائے طے کرنا ۔ جوگا بجائے لائق ، یارہاں بجائے گیارہ ، اور جناور جائے جانور بولتے تھے اور بجائے عوریں بیٹھی تھیں کے عوریاں بیٹھی نہاں کہتے تھے ۔ اسی طرح برائے سہر میں رہنے والے ادھر کو ادھر کدھر کو کدھر بولتے تھے اور نکون جائے نشن کے استعمال کرتے تھے ۔ اس موقع پر انشاء اللہ خاں نے اپنی اور مرزا مظہر جانِ جاناں علیہ الرحمہ کی ملاقات کے موقع پر گفتگو کا جو نمونہ نقل کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں دہلی کے عام مسلمانوں کی زبان اور گفتگو کا انداز لہا تھا<sup>(۱)</sup>۔

اسا لے عرصہ لہا :

”اندانے سن صا سے نا اوائلِ رحاں اور اوائلِ رحاں سے الی آلاں اسساں مالایاں  
تقلل عسہ عالمہ نہ بجدے نہا نہ سلکِ بحریر و بریر میں مسطہم بوسکے ، لہذا لے واسطہ و  
وسلہ حاصر ہوا ہوں“۔

حواں میں ارساں ہونا ہے :

”اچی نکون بھی دو طفلی سے تمہیں سے اسخاص کے سانہ مواست و مجالست  
رہا کی ہے“ اس زمانے میں سہر دہلی میں اردو کی فصاحت کے معیار کی جغرافیائی حدود  
انسا لے اس طرح منعس کی ہو<sup>(۲)</sup>۔

”امامیہ کے در آن مجمع فصحاء اسب فلعہ مبارک ساہی اسب و دو محلہ دیگر یکے بنگلہ  
سید فرور نہ از حانہ مرزا حاتم مرشد حواں موہی نا حویلی اسماعیل خاں صفدر جنگی  
و از انجا نا حویلی ملکہ آفاں حضرت ملکہ رمانہ ست فرح سر بادشاہ نک ضلع محسوب  
است ، بلکہ برد بعضے کابلی دروازہ و بیرون آن نیر نانکیہ شاہ خدا یار و ابن طرف از  
حویلی نواب سسر جنگ مرحوم و حوک نواب سعادت خاں مہادر برہان الملک جنت  
آرامگاہ نا پھانک جس خان داخل آن باشد ۔ لیکن قدرے دریں مقام نامسل است آئجہ  
شک را در آن گنجائش نیست ۔ این اسب کہ نا حویلی ملکہ آفاں فصاحت از درو دیوار  
می بارد و از چتلی ہر نا ترکان دروازہ بک طرف و نا دہلی دروازہ کہ بہ دلی دروازہ  
شہرت دارد یک طرف تا چوک سعد اللہ خان طرف دیگر و حویلی و بازار نواب

(۱) انشا ، دریائے لطافت - ص ۲۲

(۲) انشا ، دریائے لطافت - ص ۱۵ و بعد



امیر خان مرحوم و سہ راہ بیرم خان کہ بہ راہہ مشہور است و محلہ فولاد خان و کوچہ چیلہا جزو دہلی دروازہ است“<sup>(۱)</sup>۔

انشا کی یہ پوری بح نہایت دلچسپ ہے اور اس سے اس عہد میں اردو کی علاقائی خصوصیات کا بھی اندازہ ہو جانا ہے اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ کس بنا پر دہلی کے ایک خاص علاقے کی زبان کو معیاری اور مسند سمجھا جانا تھا اور کبوں۔ دوسرے علاقوں کی زبان اس کے مقابلے میں غیر معیاری قرار پائی بھی، مگر بخوف طوالت اس بح کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

اس دور کی بعض اور لسانی خصوصیات حسب ذیل ہیں :

- ۱۔ ترکیبِ اضافی میں مضاف اور مضاف الہ کے درمیان سے حرفِ اضافہ کا اکثر حذف کرنا، مثلاً انہیں ہے ندگی خواہں، یعنی بندگی کی خواہں۔
- ۲۔ ترکیبِ اضافی میں اگر ایک لفظ ہندی کا ہو تو بھی اضافہ فارسی کو جائز سمجھتے تھے، مثلاً بوسنِ جھنٹ فلمکار، بیڑہ نان۔
- ۳۔ ترکیبِ عطفی میں اگر دو لفظوں کے درمیان حرفِ عطف اور ہندی ہونا تو بھی مرکبِ عطفی میں فارسی اضافہ کو جائز سمجھا جاتا، مثلاً حائے بود اور ناس۔
- ۴۔ اکثر الفاظ جو غلط العام تھے، خاص طور پر عربی فارسی الفاظ، ان کو جائز قرار دیا گیا تھا۔
- ۵۔ حروفِ رابطہ اکثر چھوڑ دیتے تھے۔
- ۶۔ ہندی اور فارسی دونوں کے الفاظ کو بعض اوقات تخفیف سے باندھتے تھے۔
- ۷۔ بعض الفاظ میں حروف کو بڑھا دیتے تھے (یا ہوں کہتے کہ اضافہ سدہ شکل اصل اور مذہم بھی تخفیف کے بعد شکل جدید قرار پائی)، مثلاً افغان بجائے فغان وغیرہ۔
- ۸۔ ساکن کو متحرک اور متحرک کو ساکن کرنے میں مباح نہیں سمجھی جاتی تھی۔

۹۔ لغات کی سختی سے پابندی نہیں کی جاتی تھی۔

۱۰۔ اگرچہ زبان کے ماعدے اور اصول تشکیل پا چکے تھے لیکن انکی پوری طرح پابندی نہیں کرتے تھے اور جن الفاظ کو متروک قرار دیا جانا تھا، اکثر ضرورت کے لیے ان کو بھی استعمال کر لیتے تھے۔

۱۱ - اس عہد میں جو ہندی الفاظ عام تھے اور بعد میں متروک کر دیے گئے ان میں سے چند حسب ذیل ہیں<sup>(۱)</sup> :

پہر (پہن) نہٹ (بہت) پرے (الگ) آگو (آگے) نین (نو) راہ گھیرنا (راہ روکنا) بدلا کرنا (بدلہ لینا) لاگا (لگا) حال سہنا (صدمہ اٹھانا) پون بہنا (ہوا چلنا) متی (ستے) پھتر (پتھر) کسو (کسی) کھو (کبھی) پات (پنہ) ٹک (ذرا) اور (طرف) دیا (چراغ) بستار (شہرہ) نسنا (نسہ) تدھر (ادھر) کنے (پاس) دارو (سراب) لیک (لیکن) نمطہ (طرح) دھا (دس) عشرہ (محرم) - نت (ہمیشہ) نیونا (جھکنا) ایکون (ایک) ابر (اوبر) ہوجے (ہوجیے) نش (نک) -

لیکن ان الفاظ میں سے بعض ابسے ہیں جو اس دور کے بعد کے شعراء کے یہاں بھی مل جاتے ہیں۔ یہی حال بعض محاورات کا ہے، کہ وہ اگلے دور میں متروک قرار پائے لیکن کبھی کبھی وہ بھی استعمال ہوئے ہیں، نہ حشت مجموعی نہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندی یا مقامی اثرات کا یہ دور آخر ہے۔ اگرچہ اس میں بھی فارسی کے اثرات آہستہ آہستہ غالب ہوتے نظر آتے ہیں، لیکن فارسی کا اصل زور اسکے بعد شروع ہونا ہے۔ خاص طور پر دلتی کی بباہی اور برنادی کے بعد جب اردو فارسی کے مقابلہ میں تہذیبی حیثیت اور اہمیت اختیار کر لیتی ہے اس وقت پھر ایک مرتبہ فارسی کی مدد سے اردو کے گسو سنوارے جاتے ہیں۔

میر اور مرزا کے زمانے میں ہی دلتی کی مرکزیت کمزور پڑنے لگتی ہے اور اسکا اصلی سبب دلتی کا سیاسی روال اور انحطاط ہے جس سے قدرتی طور پر تہذیبی ادارے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ شاعروں اور رناندانوں کی سرپرستی درباروں اور رئیسوں کی محفلوں میں ہوتی تھی، یہ مجلسیں ویران ہو گئیں تو ان یا کمالوں نے بھی رختِ سفر باندھا<sup>(۲)</sup>۔ اور ان میں سے اکثر پہلے اودھ میں فیض آباد اور پھر لکھنؤ پہنچے۔ ان میں سراج الدین علی خان آرزو، سودا، سر، میر ضاحک، میر حسن، مصحفی، انشا، جرأت، رنگین، منت، ممنون، جعفر علی حسرت، سوز، حیران، اور نسیم دہلوی جیسے با کمال شامل تھے۔ ان حضرات کی بدولت لکھنؤ میں جہاں شاعری کا ایک مذاق پروان چڑھا، وہاں زبان کو بھی نئی تراش خراش نصیب ہوئی۔ یا تو وہ زمانہ تھا کہ شعرائے دہلی لکھنؤ کے زبان دانوں کو 'صحرائیانِ پورب' کہتے تھے۔ اور کہاں یہ نوبت پہنچی کہ مرزا غالب نے بھی اس پوچ مصرعے کو سن کر :

ع - نہاتا ہے وہ مہہ دریا میں کپڑے حور دھوق ہے

(۱) نور الحسن ہاشمی، دلی کا دبستان شاعری - ص ۳۳ طبع دسمبر سن ۱۹۶۶ء سندھ اردو

اکیڈمی کراچی -

(۲) ابوالیث صدیقی، لکھنؤ کا دبستان شاعری، باب اول - ص ۱۷ تا ۳۳ طبع ۱۹۶۷ء لاہور

یہ کہا تھا کہ نہ معشوں کی کسا تعریف ہوئی کہ اسکا مجلس ہے نہ کھڑے گھاٹ کھڑے دھلانا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی نہ بھی مسلم کا تھا کہ مصمون دلتی والوں کا اور زبان لکھنؤ والوں کی خوب ہے۔ نکھنؤ کی اس زبان کے نماں علمدار ناسخ ہیں<sup>(۱)</sup>۔ بعض حضرات تو ہاں تک دعویٰ کرتے ہیں کہ اردو زبان کی موجودہ شکل ناسخ کی کوششوں کی ہی مرہون منت ہے، اور اگر انہوں نے اسکی اصلاح کی طرف توجہ نہ کی ہوتی، تو نہ زبان ابھی سو سال پہلے ہوئی۔ نہ باب درست نہیں۔ اصلاح کا سلسلہ تو ناسخ سے پہلے شروع ہو چکا تھا اور بعض اصلاحیں جو خود دہلی میں ہوئی ہو چکی تھیں۔ ناسخ نے البتہ ایسے اصولی قواعد اور صواب کی شکل دی۔ صفر بلگرامی نے 'جلوہ خضر' میں عہدِ قدیم سے ناسخ کے دور تک محاورہ اردو کی تبدیلیوں کی ایک فہرست مرتب کی ہے۔ اس فہرست سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ناسخ سے پہلے بھی واضح تبدیلیاں عمل میں آچکی تھیں۔ اور دکھی محاوروں سے ولی تک اور ولی سے مر و سودا کے عہد تک اور مر و سودا کے دور سے اسکا اور مصححی تک تراس حراس اور تبدیلیوں کا نہ سلسلہ برابر جاری تھا۔ اسکا کے دور میں دہلی اور لکھنؤ کی زبان میں کچھ فرو محسوس ہونے لگا تھا۔ کہیں تو وہ فرو الفاظ کی بدکسر و سبب میں خاص طور پر مؤتب سماعی کے باب میں تھا، کہیں محاورہ کا فرو تھا، کہیں صوبی اخلاف تھا، کہیں نہ صورت بھی کہ ایک ہی مفہوم کے لیے دہلی اور لکھنؤ والے الگ الگ الفاظ استعمال کرتے تھے، کہیں نہ اخلاف محاوروں کا تھا۔ ان کی ایک فہرست و انشا نے 'دریائے لطافت' میں دی ہے مثلاً:

### محاورہ لکھنؤ

ہاں  
ناں  
حلال حورں  
کھڑنا  
برگد  
مدار

### محاورہ دہلی

ہیاں  
ہاں  
حلال خوری  
کھڑا  
بر  
آکی

- 
- (۱) ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، لکھنؤ کا دبستان شاعری - ص ۱۷ تا ۳۳ طبع ۱۹۶۷ء لاہور  
(۲) جلوہ خضر جلد ۲ - ص ۳۸ تا ۴۳ نیز دیکھیے نورالحسن ہاشمی، دلی کا دبستان شاعری - ص ۵۸ اور آگے، لکھنؤ کا دبستان شاعری باب ششم ناسخ - ص ۱۰۵ تا ۱۴۸ -  
(۳) فصاحت دہلی و لکھنؤ کے باب میں انشا نے 'دریائے لطافت' میں دلچسپ بحث کی ہے۔ دیکھیے دریائے لطافت - ص ۶۵

## معاورۂ دہلی

دہنی  
ساکھو  
نرکل  
برسون  
چبٹی  
دہا  
بابیہال  
لبادہ  
ونس  
حدا سم  
لڑکٹی  
واہ رے

## معاورۂ لکھنؤ

کڑی  
سال  
نرسل  
ابرسوں  
حوٹھی  
ذابا  
سہیال  
فرغل  
امس  
خدا کی قسم  
لڑکائی (لڑکن)  
واہڑے

صعہر بگرامی نے نسخ کی جن سہندوں کی طرف خاص طور سے اشارہ کیا ہے ان میں اصلاحِ زبان سے متعلق امور حسب ذیل ہیں :

- ۱ - جہاں تک ممکن ہوا ہندی الفاظ کے بجائے فارسی و عربی الفاظ استعمال کیے ۔
- ۲ - تمام مسعمل الفاظ کی تدکیر و تائب کے فاعدے بنائے ۔
- ۳ - سندس کی طرزِ فارسی کے طرز پر قائم کی ۔

۴ - صرف و نحو کو درست کیا ۔ معاویات اور روزمرہ کی جہان بین کی اور اس کے مواعد مرتب کیے ۔ متروکاتِ نسخ کا تفصیلی جائزہ لےنے سے معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے بلاشبہ ان اصلاحات کو صاف کی شکل بخشی اور ان کے بعد کم از کم لکھنؤ میں وہی زبان مسند قرار پائی ، جسکی سند نسخ یا انکے بلا منہ بالخصوص رسک کے یہاں مل سکی تھی ۔ ان میں سے خاص طور پر حسب ذیل قابلِ ذکر ہیں ۔

## ۱ - متروکات

سی (سے) ٹک (ذرا) شبن (کو) سٹن (م) جوں (جسطرح) بن (بعیر) با آنکہ (با وجود نکہ) کبھو (کبھی) کیوں کے (کسطرح) ولے (لیکن مگر) کتوں کے (کتونکر) ایلھر (ادھر) اودھر (ادھر) اس کنے (اس پاس) بیج (میں) بدھر (ادھر) اپر (اوپر) نس پر (اس پر) نمطہ (طرح) نہٹ (مہ) مت اور بن (نہیں) سجن (منم) بت ۔ (محبوب) جائے (جگہ) دیا (چراغ) لوہو (لہو) دوانہ (دیوانہ) بالہ (بالہ) بچارا (بیچارا) لیجے

دیجے کیجے (لیجیے - دیجیے - کیجیے) بھلکاری (پھلام) سر کو فرو لانا (سر کو فرو کرنا) دامن چلنا (دامن مسکنا) خواب سے جانا (خواب آنا) فاصد چلانا (قاصد بھیجنا) پشنا (پھسلنا) آجائے ہے (آجانا ہے) -

۲ - نسخ سے پہلے اکثر علامتِ فاعلی کا 'نے' حذف بھی ہو جاتا تھا - نسخ نے اسکا استعمال لازمی قرار دیا -

۳ - فارسی اور عربی الفاظ ہندسوں اور ترکیبیں اردو میں بڑی کثرت سے داخل کیں - اس کا ایک سبب یہ تھا کہ دلتی کے زوال کے بعد لکھنؤ میں علومِ مہم ، خاص طور پر منطق، فلسفہ وغیرہ کا رواج عام ہو گیا تھا اور علمی اور فنی اصطلاحیں اس حد تک زبانِ زدِ خاص و عام ہو گئی تھیں کہ ان کو اصطلاح کی بجائے عام لغت شمار کرنا چاہیے - یہی سبب ہے کہ بولِ شرر لکھنؤ کے عام آدمی کی روزِ مرہ گفتگو میں ایسی علمی اصطلاحیں بلا تکلف استعمال ہوتی ہیں جن کے استعمال سے دوسرے شہر کے خواص بھی معذور ہوئے ہیں۔ ممکن ہے علمی اصطلاحوں کے باب میں یہ رائے درست نہ ہو ، لیکن لکھنوی شعراء کا کلام اور لکھنوی نثر کے نمونے دونوں اس خیال کی تائید کرتے ہیں - اس کی ایک اچھی مثال سر اسمن کی باغ و بہار اور مرزا رجب علی بگ سرور کی 'فسانہ عجائب' کی عبارت کے موازنہ اور مقابلہ سے مل سکتی ہے - مگر اس کی باغ و بہار دلتی کی نکسالی یا محاورہ ٹھینٹھ بول چال میں لکھی گئی ہے - مرزا رجب علی بگ کی زبان پر تکلف اور بڑی حد تک کتابی ہے - کسانِ زبان میں بول چال کے بعض نمونے (مثلاً مرزا مظہر جانِ جاناں اور انشا اللہ خان کی گفتگو درنئے لطافت میں) دلی میں بھی ملتے ہیں ، لیکن یہ زبان نہ دلی کی عام زبان ہے اور نہ کتابی - لکھنوی شعراء اور نثر نگار اس اعتبار سے ایک نہذیبی مراج کے آئینہ دار ہیں جو ان کا اپنا اسبازی مراج ہے - اس کوشش سے اگرچہ یہ ہوا کہ عام طور پر ہندی کے الفاظ ترک ہو گئے اور فارسی کے اثرات بڑھ گئے ، لیکن اس سلسلے نے بعض اہلِ الاصل الفاظ بھی ترک کر دیے جن کا بدل فارسی میں نہ مل سکا - اس اعتبار سے اسے ایک حد تک ایک منفی لسانی تحریک بھی کہہ سکتے ہیں -

جیسا کہ معلوم ہے سلطنتِ دہلی کے زوال و انحطاط کے بعد جب شعر و شاعری کا مرکز لکھنؤ قرار پایا ، تو بھی دلی میں بعض اکابر اہلِ فن موجود تھے ، جن کا سلسلہ ۱۸۵۷ء تک بلکہ اس کے بعد بھی پہنچتا ہے - ان میں غالب ، مومن ، ذوق و ظفر اور ظفر کے استاد شاہ نصیر شامل ہیں - شاہ نصیر کو تو بعض حضرات دلی کا نسخ بھی کہتے ہیں - غالب نے لکھنؤ کی لسانی برتری کا (اردو کی حد تک) خود اعتراف کیا ہے - اگرچہ غالب کی فارسی ہندی لکھنؤ میں تحریکِ نسخ کا نتیجہ نہیں ہے اور اس کا تعلق

براہِ راست مرزا کے اپنے مزاج اور افتادِ طبیعت اور فارسی زبان، شاعری اور ادب سے ان کے فطری لگاؤ کی بنا پر ہے، تاہم اس سے اردو میں فارسی کی آمیزش اور آویزش کے اس نئے رجحان کو تقویت ملتی ہے اور غالب کے فکر و فن سے متاثر ہونے والے شاعر اور نثر نگار اس رجحان کو مزید تقویت پہنچاتے ہیں۔ یہ کہنا درست نہ ہو گا کہ دہلی کے شعراء پر لکھنؤ کی ان لسانی اصلاحات کا اثر بہت کم ہوا اور برائے محاورے کا استعمال بدستور رہا۔ غالب اور ان کے معاصرین کی زبان وہ پرگز نہیں ہے جو حاتم، سودا اور میر کی بھی۔ یہ درست ہے کہ دلی کی زبان میں یہ تبدیلی صرف ناسخ کی اصلاحات یا لسانی مرکز کی حسرت سے لکھنؤ کی بالا دستی کی سرہون منت نہیں ہے اور زبان کی تبدیلی کے فطری اصولوں کے مطابق غالب و مومن کے دور کی زبان میر و سودا کے عہد کی زبان کے مقابلہ میں جدید تر ہونا ہی چاہیے، لیکن لکھنؤ کا اثر بھی واضح طور پر موجود ہے۔ اس دور کے آخر میں یہ نات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ رامپور میں داغ اور امیر یکجا ہوتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کا اثر قبول کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی لکھتے ہیں<sup>(۱)</sup> :

”ناخویں دور میں داغ آفتابِ دہلی ہیں، لیکن اب دہلی میں ہندوستانِ زبان و قواعد لکھنؤ کا بھی اثر نظر آتا ہے۔ وہ برائی معنوی دہلویت دہلی سے رخصت ہو گئی۔ اس کا نہوڑا جہت جو کچھ اثر باقی رہا، وہ داغ کی والہانہ اور صاف طبعیت کی بدولت قائم رہا۔ زبان البتہ بے حد صاف اور رواں ہو گئی۔ مومن اور غالب کے یہاں کچھ برائے طریقے بھی باقی رہ گئے تھے وہ سب اب متروک ہو گئے۔ داغ ذوق کے شاگرد ہیں، بھر بھی ان کی زبان میں وہ بے مبدی یا بے قاعدگی نہیں ہے جو ناسخ کے اصول کے مطابق، ذوق کے یہاں نظر نہیں آتی۔“

یہی صورتِ حال نثر نگاروں کی تحریروں کے مطالعہ سے واضح ہوتی ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے بقول<sup>(۲)</sup> :

”لکھنؤ نے زبان کی اصلاحِ معین اور صفائی کی بہت اچھی کوشش کی۔ خود دہلی والے آخر کار لکھنؤ کی تقلید کرنے لگے اور وہاں کی نئی نئی تحریکات اور مفید اصلاحات معلوم کرنے کے لیے چشمِ براہ رہتے تھے۔“

دلی کے زوال اور سیاسی انحطاط کے دور میں جس کا ذکر کیا جا چکا ہے، آہستہ آہستہ ایک نئی طاقت ابھر رہی تھی۔ یہ طاقت یورپ سے آنے والے ناجروں کی بھی، جن میں ولندیزی، پرتگالی، فرانسیسی اور برطانوی سب شامل تھے۔ شروع میں ان کی آمد کا مقصد صرف تجارت تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ اس ملک کی سیاسی حالت کو دیکھ کر

افتدار کی ہوس سدا ہوئی اور ایک دوسرے کے مقابلہ کا جذبہ ابھرا۔ اس کشمکش کی داستان طویل اور دلچسپ ہے، لکن ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ اس صورتِ حال نے اردو کو مغربی ممالک کی زبانوں کے الفاظ سے آشنا ہونے کا موقع دیا۔ یرنگالی اور فرانسیسی الفاظ کم آئے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ان ممالک سے آنے والے تاجروں کا دورِ افتدار زمانی اور مکانی دونوں اعتبار سے محدود رہا اور حلد خم ہو گیا، لکن انگریزوں نے بہت حلد ملائی سیاست میں نمایاں حصہ لینا شروع کیا اور بالآخر سرِضلع ہند و پاکستان کی فسمت کے مالک بن گئے اور کم و بس دو سو سال تک یہاں حکومت کی۔ اس دور میں ان کی زبان انگریزی سرکاری، ادبی اور علمی زبان قرار پائی۔ جس کی وجہ سے ہزاروں الفاظ انگریزی کے اردو زبان میں داخل ہو گئے۔ بہت سے نئے موضوعات جو مغربی زبانوں میں تھے اور شاعری اور اساتذہ کے اسلوب جو ان زبانوں سے مخصوص تھے اردو کے شاعروں اور نثر نگاروں کو ان سے استفادہ کا موقع ملا۔ اور بعض علوم و فنون جو دورِ جدید کے علوم و فنون تھے وہ آپسہ آپسہ اردو میں منتقل ہونا شروع ہوئے، جس کی وجہ سے مغربی زبانوں اور بالخصوص انگریزی کی علمی، فنی اور ادبی اصطلاحیں بھی اردو میں رائج ہو گئیں۔

یہ صورتِ حال ۱۸۵۷ء کے بعد زیادہ واضح نظر آتی ہے، لکن ۱۸۵۷ء سے قبل بھی آپسہ آپسہ یہ آداب داخل ہونے معلوم ہوتے ہیں۔ سب اس کا یہ تھا کہ مغرب کی بہت سی حیرت سامانِ محارب میں یہاں آ رہی تھیں اور ان میں سے بعض اپنے ساتھ اسے نام لارہی تھیں۔ بعض دفتری، عدالتی اور تجارتی اصطلاحیں بھی جو رائج ہونے لگی تھیں۔ اس دور کی شاعری اور نثر میں جو ۱۸۰۳ء سے ۱۸۵۷ء تک پھیلا ہوا ہے اس قسم کے الفاظ ملنا شروع ہو جانے ہیں۔

۱۔ عدالتی اور دفتری الفاظ اور اصطلاحات: سلا، لاث صاحب (لارڈ) کمپنی بہادر (اسٹ انڈیا کمپنی) جج، مجسٹریٹ، کونسل، ممبر، پارلیمنٹ، سفیر (Sub poena) سمن (Summon) پولس، پلاٹون (Platoon) کپٹن، بسن، اپیل وغیرہ۔

۲۔ تہذیبی اور مجلسی: کالج، ہسپتال، ٹوٹ، نٹلون، بوٹ، ٹوپ، ہزاری، بالٹی، گملا، پتن، بویل، گودام، وریگی، گزٹ، اڈنٹر، ٹکٹ، ٹاؤن، ڈیوٹی، (جس کو غالب نے ہون ٹوٹی لکھا ہے) ریل، انجن، اسٹیشن، ماسٹر۔ اس طرح کے الفاظ شعراء کے کلام میں کم اور نثر میں کچھ زیادہ ملتے ہیں۔ مرزا غالب کے خطوط میں جو ۱۸۵۷ء کے قریبی زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں اس طرح کے الفاظ نسبتاً زیادہ ملتے ہیں۔ اس زمانے میں دو ادارے ایسے قائم ہوئے جن کی وجہ سے مغربی زبانوں اور بالخصوص انگریزی کے الفاظ کو اردو میں داخل ہونے کا موقع ملا۔ ایک تو کلکتہ کا فورٹ ولیم

کالج تھا ، جہاں شعبہٴ اردو کی روح رواں ڈاکٹر جان گکرسٹ تھے ، ان کی دلچسپی اور نوجہ سے اردو کے اکثر ممتاز شعراء اور مصنفین فورٹ ولیم کالج میں جمع ہو گئے تھے اور یہ لوگ اپنے انگریز شاگردوں کے مطالعہ اور تدریس کے لئے کتابوں کی تالیف ، تصنیف اور ترجمے میں مصروف تھے ۔ اس داستان کی تفصیل کسی اور جگہ بیان کی گئی ہے ، اس لئے یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ۔ دوسرا مشہور ادارہ دلی کالج تھا ، جہاں خاص طور پر مغربی جدید علوم و فنون کو مشرقی زبانوں کے ذریعہ سے بڑھانے کا تجربہ کیا گیا تھا اور اس کی وجہ سے اردو خواں حضرات میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا تھا جس کو انگریزی اور جدید علوم و فنون پر بھی بڑا عبور حاصل تھا ۔ اس حلقہ میں ماسٹر رام چندر داس اور سمس العلماء مولوی ذکا اللہ جیسے اکابر شامل ہیں ۔ اس کالج کا عروج ۱۸۵۷ء سے بہ پہلے ہوا ۔ کالج اور اس کے دارالترجمہ کی بدولت اردو میں علمی اور فنی مصامین ، مباحث اور اسالیب و اصطلاحات کا گراں قدر اضافہ ہو گیا ۔

یہ باب درست ہے کہ اس دور میں انگریزی کا اثر صرف مسعار الفاظ تک محدود ہے ۔ بعض الفاظ سنسکرت سے بھی ہیں جو مسعار کی حد سے نکل کر دخل الفاظ کی حد میں داخل ہو چکے ہیں ۔ یعنی انکا استعمال صرف تعلیم یافتہ طبقے ، ساعروں اور ادیبوں تک محدود نہیں بلکہ عوام کی سطح تک پہنچ گیا ہے خاص طور پر عدالتی اور دفتری ، تجارتی اور کاروباری الفاظ کی ایک خاصی تعداد موحود ہے ، جو عوام میں بڑی رائج ہو چکے ہیں ، ان کو بلاشبہ دخل الفاظ کہا جا سکتا ہے ۔ زبان و بیان اور اسلوبِ انشا برداری پر مغربی بالخصوص انگریزی کے اثرات ۱۸۵۷ء کے بعد ہی واضح ہوئے ہیں اور خاص طور پر مولانا محمد حسین آزاد ، سر سید احمد خان ، حالی ، نذیر احمد اور شبلی کی تحریروں سے اسکا آغاز ہونا ہے ، لیکن اسکی تفصیل اس باب کا موضوع نہیں ہے ۔

انیسویں صدی میں اردو کی قواعد نویسی کی طرف خاص توجہ نظر آتی ہے ۔ اب تک جہاں تک تحقیق ہوا ہے ، مہلا شخص جس نے اردو کی قواعد لکھی وہ جان جوشوا کیٹلر تھا ۔ اس نے غالباً ۱۷۱۵ء میں لاطینی میں اردو کی قواعد لکھی تھیں ، جو ۱۷۳۳ء میں شائع ہوئی ۔ کتاب کا متن لاطینی میں ہے اور ہندوستانی حروف رومن رسم الخط میں لکھے گئے ہیں ۔ اس کے بعد ایک اور مسنری شلز نے بھی غالباً ۱۷۴۳ء یا ۱۷۴۴ء میں ہندوستانی زبان کی ایک اور قواعد لکھی ۔ یہ بھی لاطینی میں تھی اور اسکے دیباچہ میں اس نے جان جوشوا کیٹلر کی قواعد کا ذکر کیا ہے ۔ شلز کی قواعد کا لاطینی سے اردو میں اور اسی زمانہ میں انگریزی ترجمہ بھی ہوا تھا غالباً انگریزی میں اردو کی یہ قدیم ترین قواعد ہے<sup>(۱)</sup> ۔ چونکہ اس زمانے میں یورپ میں بھی دوسری

(۱) اس کا خطی نسخہ الڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے ۔ اس کی مائیکروفلم اور نقل راقم کے پاس ہے اور عنقریب شائع ہو جائے گی ۔



زبانوں کی قواعد لکھنے وقت لاطینی قواعد نویسی کے اصول اور اسکی اصطلاحات استعمال کی جاتی تھیں، لہذا ان مصنفین نے بھی وہی اصول اور وہی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں بعض اور یورپین مصنفین نے قواعد اردو کی تریب و ندوین کی طرف توجہ دی۔ سر جارج گریئر سن نے اپنی مسہور تصنیف 'جائزہ' لسانیہ ہندیہ، Linguistic Survey of India میں لیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک برنگالی اردو قواعد Indostan Portuguese Grammatica ہے، جو لڑین سے ۱۷۷۸ء میں سائے ہوئی تھی۔ انگریزی میں سب سے مسہور قواعد مسٹر ہیڈلے کی بھی جو ۱۷۷۲ء میں سائے ہوئی تھی، اسکا سن نصف ۱۷۶۱ء ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب نے<sup>(۱)</sup> اسکی تفصیل اپنی 'قواعد اردو' میں بیان کی ہے۔ ہیڈلے کی وفات کے بعد مرزا محمد فطرت لکھنوی نے ہیڈلے کی قواعد کے ۱۸۰۲ء والے ایڈیشن کی تصحیح کی بھی اور اس میں اضافے بھی کئے تھے۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے ۱۷۹۰ء میں اردو کا ایک لغت مرتب کیا تھا۔ بعد کے قواعد نویسوں نے اس سے بھی بڑا فائدہ اٹھایا، چنانچہ خود ہیڈلے نے ۱۷۹۷ء میں اپنی قواعد کا جو ایڈیشن سائے کیا اس میں اس لغت کا حوالہ موجود ہے۔ دو اردو کی لغت نویسی اس سے پہلے بھی شروع ہو چکی تھی۔ گلکرسٹ نے<sup>(۲)</sup> اپنے رسالہ میں ایک اور مصنف جے فرگسن (J. Fergusson) کا ذکر کیا ہے، جس نے ۱۷۷۳ء میں لندن سے ہندوستانی زبان کی ایک لغت دو جلدوں میں سائے کی بھی اور اس میں ایک مقالہ ہندوستانی زبان کی قواعد پر بھی دیا۔ گلکرسٹ نے ایک اور مصنف ہنری پیرس کا ذکر کیا ہے جس کی کتاب۔

#### Analysis, Grammar and Dictionary of Hindustani Language.

۱۷۹۱ء میں مدراس سے سائے ہوئی بھی گلکرسٹ خود اس کتاب کو بنیادی طور پر لغت کی کتاب قرار دیتا ہے اور اس نے اس لغت سے کچھ الفاظ اپنے لغت کے ضمیمے میں شامل بھی کیے ہیں۔ بقول گلکرسٹ<sup>(۳)</sup> پیرس نے اس عہد کے دیگر یورپین مصنفین و مؤلفین کے مقابلہ میں زیادہ محنت اور صحت سے کام لیا ہے۔

گلکرسٹ اس دور کے یورپین اردو قواعد اور لغت نویسوں میں غالباً سب سے ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، انکے حالات تفصیل سے کسی اور جگہ بیان کیے گئے ہیں۔ ۱۷۹۵ء میں ان کی انگریزی ہندوستانی لغت A Dictionary - English and Hindoostance سائے ہوئی۔ ۱۷۹۶ء میں انہوں نے ہندوستانی قواعد A Grammar

(۱) مولوی عبدالحق، قواعد اردو - ص ۲۰ شائع کردہ الجمع ترقی اردو کراچی  
(۲) خلیل الرحمن داؤدی، (مرتب) رسالہ گلکرسٹ - ص ۶ شائع کردہ مجلس ترقی ادب لاہور  
(۳) مرتبہ خلیل الرحمن داؤدی، (مرتب) گلکرسٹ - ص ۸ شائع کردہ مجلس ترقی ادب لاہور

of the Hindoostanee Language شائع کی ، جو ان کی مجتوزہ کتاب ہندوستانی لسانیات کی پہلی جلد کا تیسرا حصہ بھی - اسکا پہلا حصہ وہ لغت ہے جسکا ذکر ہوا ، دوسرا حصہ بطور مقدمہ 'قواعد و لغت' ۱۷۹۸ء میں شائع ہوا -

اہل زبان میں انشاء اللہ خان انشا پہلے قابل ذکر نسخہ ہیں ، جو اردو قواعد نویسی کی طرف منوجہ ہوئے - انہوں نے اپنی 'دریائے لطافت' ۱۸۰۷ء مطابق (۱۲۶۲ھ) میں لکھی - گلکرسٹ کی کتاب کی اشاعت کے دس سال کے اندر انہوں نے ایک ایسی کتاب مرتب کر لی ، جس بایہ کی کتاب اس کے بعد بھی اب تک اردو میں نہیں لکھی جا سکی - مولوی عبدالحق صاحب کا یہ کہنا بجا ہے<sup>(۱)</sup> : "سید انشا پہلے شخص ہیں جنہوں نے عربی و فارسی کا تتبع چھوڑ کر اردو زبان کی ہشت و اصلیت پر غور کیا اور اس کے قواعد وضع کیے اور جہاں کہیں تتبع کیا بھی ہے ، سو وہاں زبان کی حیثیت کو نہیں بھولے ہیں" 'دریائے لطافت' میں اردو کی صوتیات ، اس کی علاقائی لسانیات ، اردو کی فصاحت کے معیار ، دہلی اور لکھنؤ کی زبان کے مقابلہ کا مسئلہ ، دہلی کے یوگماں محاورات ، غرض ہر پہلو سے اردو کی ہشت پر اس طرح بحث کی ہے کہ آج بھی اسے بڑھ کر حیرت ہوتی ہے -

انشا کی 'دریائے لطافت' کو لکھے مشکل سے چند سال گزرے تھے ، کہ روشن علی انصاری نے ۱۸۱۰ء میں رسالہ 'صرف و نحو' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی - بعض اور حوالوں سے پتہ چلتا ہے<sup>(۲)</sup> ، کہ سید انشا سے ایک سال پہلے ۱۸۰۶ء میں امانت علی شیدا نے 'صرفِ اردو' کے نام سے ایک کتاب لکھی بھی ، لیکن یہ کتاب جب نک سامنے نہ ہو قطعی فیصلہ دشوار ہے - ۱۸۲۳ء میں ایک اور مصنف محمد ابراہیم نے 'قواعدِ اردو' لکھی تھی - مولوی عبدالحق صاحب کا بیان ہے<sup>(۳)</sup> کہ سرسید احمد خان نے بھی اردو صرف و نحو پر ایک رسالہ لکھا تھا ، جسکا قلمی نسخہ اسلامیہ ہائی سکول اثاؤہ کی لائبریری میں موجود تھا اور کاتب نے کتاب کے آخر میں سنِ کتابت ۱۸۴۰ء مطابق (۱۲۵۶ھ) تحریر کیا تھا - بقول مولوی عبدالحق اس میں صرف و نحو کے معمولی قواعد ہیں اور زیادہ تر مصادر سے بحث کی گئی ہے -

سر سید کے اس رسالہ کی تصنیف کے تین سال بعد مولوی احمد علی دہلوی نے 'فیض کا چشمہ' کے نام سے ایک ابتدائی رسالہ اردو صرف و نحو پر لکھا ، جو دہلی سے ۱۸۴۵ء میں طبع ہوا - یہ بھی ایک معمولی رسالہ ہے اور غالباً طالب علموں کے استفادہ کے لیے لکھا گیا ہے - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک مدرسوں اور

(۱) انشاء اللہ خان انشا ، دریائے لطافت (مقدمہ) - ص ۴ طبع اول الناظر پریس لکھنؤ ۱۹۱۶ء

(۲) مولوی عبدالحق ، قواعد اردو ، (مقدمہ) - ص ۲۶ (۳) تاریخ ادبیات اردو - زیر ترتیب پنجاب

خاکہ یونیورسٹی - جلد سوم بارہواں باب

مکتبوں میں اردو قواعد کی تعلیم و تدریس شروع ہو چکی تھی۔ اسی زمانے میں اس عہد کے مشہور عالم اور شاعر و مصنف امام بخش صہبائی نے جو دہلی کے مشہور دہلی کالج میں پروفیسر بھی تھے اردو صرف و نحو پر ایک کتاب لکھی، جو دہلی سے ۱۸۴۵ء میں شائع ہوئی<sup>(۱)</sup>۔ گارسان دناسی کے بقول اس کے ۱۸۴۵ء کے مطبوعہ نسخے میں ۲۹۸ صفحات تھے اور انگریزی میں اس کا عنوان - *A Grammar of the Urdu Language in Urdu, By Maulvi Imam Bux of the Delhi College.*

نہا۔ گارسان دناسی کی تفصیلات سے پتا چلتا ہے کہ اس کتاب کے دوسرے باب میں الفاظ اور چوبھے میں محاورات اور ضرب الامثال سے بحث کی گئی تھی۔ صہبائی نے ایک اور کتاب 'قاعدہ' اردو کے نام سے بھی لکھی تھی۔ اس کی تفصیلات بھی گارسان دناسی نے ہی فراہم کی ہیں۔ وہ لکھا ہے کہ 'قاعدہ' اردو میں اردو کے حروفِ محبت سے بحث کی گئی تھی اور یہ کتاب صہبائی نے کالج کی ملازمت کے دوران لکھی تھی اور فیس ہے کہ کالج کے طلباء کی تدریس کے لیے لکھی گئی ہوگی۔ انیسویں صدی کے نصفِ اول میں بعض اور یورپین مصنفین نے بھی اردو قواعد نویسی کی طرف توجہ کی ہے، ان میں سے حسب ذیل بطور خاص قابلِ ذکر ہیں :

- ۱۔ جان سکسپٹر۔ اردو گرمر پھلا انڈین ۱۸۱۳ء دوسرا ایڈیشن ۱۸۱۸ء مسرا ۱۸۲۶ء چوبھا ۱۸۴۳ء ناخو ۱۸۵۸ء۔ ان مختلف اساعوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قواعد طالب علموں کے لیے لکھی گئی ہوگی اور خاص مقبول ہوگی۔
- ۲۔ ولیم ٹیٹ۔ مقدمہ زبانِ ہندوستانی، طبع اول ۱۸۱۷ء، دوم ۱۸۲۳ء، سوم ۱۸۳۳ء۔
- ۳۔ گارسان دناسی۔ مقالہ 'قواعدِ اردو' ۱۸۳۸ء۔
- ۴۔ ایس ڈبلیو بری ٹن۔ رسالہ 'قواعدِ ہندوستانی' ۱۸۳۰ء۔
- ۵۔ اسٹیفورڈ ارنٹ۔ 'جدید خود آموز قواعدِ زبانِ اردو' طبع اول ۱۸۳۱ء، طبع دوم ۱۸۴۴ء۔
- ۶۔ ایس اونٹ۔ رسالہ 'قواعدِ اردو' سرسج و اضافہ ڈنکن فارلس طبع ۱۸۴۴ء۔
- ۷۔ ہیملز آر بالن ٹائن۔ 'ہندوستانی گرامر' طبع اول ۱۸۴۴ء، طبع دوم ۱۸۶۸ء۔
- ۸۔ رپورنڈ جی اسمال۔ 'ہندوستانی گرامر' طبع اول ۱۸۴۷ء، طبع دوم ۱۸۵۸ء۔
- ۹۔ جیٹوٹ لوپراخنو۔ 'قواعدِ ہندوستانی'، ۱۸۵۲ء۔

(۱) مولوی عبدالحق نے سن طباعت ۱۸۴۹ء بتایا ہے لیکن گارسان دناسی نے ۱۸۴۵ء میں لکھا ہے اور اس کی پوری تفصیلات دی ہیں۔ دیکھیے تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی اردو ترجمہ لہان نذر و مقالہ پی ایچ ڈی کراچی یونیورسٹی (خطی)

(۲) ۱۸۵۷ء کے بعد قواعد اور لغت نویسوں کا یہاں ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ یہ اگلے باب کا موضوع ہوگا۔

۱۸۵۷ء کے آس پاس طالب علموں کے لیے قواعد کی بیستار کتابیں تالیف ہوئیں۔ تالیف ان کو اس لیے کہنا چاہیے کہ دراصل ہر مصنف نے ایک ہی ڈھانچہ اور ایک ہی انداز اخبار کیا ہے۔ نصرف ہے نو صرف اتنا کہ مختلف مؤلفین نے قواعد کے مختلف حصوں کو زیادہ شرح و تفصیل سے لکھا ہے اور مثالوں میں فرق ہے۔ ایک اور بات جو ان تمام تالیفات میں مشترک ہے یہ ہے، کہ ان سب نے فارسی قواعد کے نمونوں اور اصطلاحوں کو پیش نظر رکھا ہے، جس کی بنیاد خود ایک حد تک عربی صرف پر بھی۔ ان میں سے کسی نے زبان کے آرائی مزاج کو ملحوظ نہیں رکھا۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ اردو کی ابتدا کے بارے میں حقیقت بالکل ابتدائی مدارج میں نہیں اور اردوئے قدیم کا بہت بڑا حصہ عام طور پر مصنفین اور مؤلفین کی دسترس سے باہر تھا، نیز اردو اور برصغیر ہند و پاکستان کی دوسری زبانوں اور بولیوں کے تقابلی مقابلہ کا دور شروع نہیں ہوا تھا۔ اس لیے اردو کی تقابلی قواعد لکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اردو کے قواعد نویسوں کے سامنے اردو کے دو ہی مسد اور معیاری نمونے تھے۔ ایک دلی کی اردوئے معلیٰ اور دوسرے لکھنؤ کی اردو، عام خیال یہ تھا کہ لکھنؤ اور دلی کی زبان میں صرف متروکات کا فرق تھا، اور متروکات کی بجائے قواعد کا حصہ نہیں سمجھی جاتی تھی، نا پھر اسماء کی تذکر و نائیب کا مسئلہ تھا، جنس حقیقی کے باب میں جو سب اردو بولنے والے منفی تھے، لیکن جنس غیر حقیقی جو صرف ویاسی یا سماعی تھی، اس کے باب میں بڑا اختلاف تھا۔ چنانچہ تذکر و نائیب کی بجائے قواعد کی ان کتابوں میں بڑی تفصیل سے دی جاتی تھی۔ بعض قواعد نویسوں نے محاوروں کو بھی اپنی تالیفات میں شامل کر لیا تھا اور بعض نے عروض و بیان و بدیع کو بھی، حالانکہ ان کا تعلق قواعد سے بہت کم ہے۔

ایک اور رجحان جو ان قواعد نویسوں میں مشترک طور پر پایا جاتا ہے، وہ شعراء کے کلام سے سند دینے کا رواج ہے۔ یہ مسئلہ بجائے خود بحث طلب ہے۔ نحو کے باب میں نو شعر سے سند بہت ہی دسوار ہے، کیوں کہ شاعر بحر اور وزن کے اہتمام میں اجزائے کلام کی ترتیب کو عام بول چال کے خلاف ترتیب سے بھی نظم کر دیتا ہے۔ اور اگر اس سے تعفید پیدا نہ ہو تو اسے جائز بھی سمجھتا ہے، لیکن قواعد صرف ادبی اور کتابی زبان کے قواعد تک محدود نہیں ہوتی۔ زبان کا اصلی رنگ روزمرہ گفتگو کی زبان میں ہی ملتا ہے اور ہر زبان کی کتابی اور ادبی زبان میں کسی نہ کسی حد تک تکلف اور اہتمام ضرور پایا جاتا ہے۔ نحو سے قطع نظر اکثر صرفی شکلوں میں بھی ضرورت شعری سے تصرف کر لیا جاتا ہے۔ اس لیے شعر کو بطور سند پیش کرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس کے جواز میں صرف ایک ہی بات کہی جا سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ زبان کی

سب سے بڑی سند خود اہل زبان ہوتے ہیں اور چونکہ اکابر شعراء اہل زبان میں زبان و بیان کے مزاج شناس سمجھے جاتے ہیں ، اس لیے ان کی بات سند مانی جاتی ہے ۔ اور اگر کوئی ترکیب یا صرفی صورت عام رواج یا قیاس کے خلاف بھی ان کے یہاں ملتی ہے تو اسے ان کا تصرف سمجھا جاتا ہے اور ایسے تصرفات کو قابل قبول مانا گیا ہے ۔ زندہ زبانوں میں جو تصرفات اور اضافے ہوتے ہیں وہ اکابر شعراء اور مصنفین کی تحریروں سے ہی قبول عام کی سند حاصل کرتے ہیں ۔ اگر ایسا نہ ہو تو زبان کی ترقی رک جائے اور اس کا سرمایہ محدود ہو کر رہ جائے ۔ جس دور سے ہم بحث کر رہے ہیں وہ اردو کی نشوونما کا ایک اہم عوری دور تھا ۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جس جدید دور کا آغاز ہونا ہے اس کے لیے زبان میں پہلے سے کسی قدر فراخی اور گنجائش کا پیدا ہونا ضروری تھا ۔ اور ان حضرات کی کوششوں سے ہی یہ صورت حال پیدا ہوئی ۔



### کتابیات

( مصنفین کے حوالے جس ترتیب سے مقالہ میں آئے ہیں )

- آرزو ، مختارالدین ۔ کربل کنہا ۔  
چاند ، شیخ ۔ سودا مطبوعہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن ۱۹۳۶ء ( ۵۱۳۳۵ )  
صدیقی ، ابواللیب ۔ دیوان زادہ حاتم زیر طباعت اردو بورڈ کراچی  
فاروقی ، نثار احمد ( مرنب ) ۔ دہلی کالج میگزین کوہ نور پریس دہلی ۱۹۶۲ء  
تیواڑی ، ڈاکٹر بھولا ناتھ ۔ میر کی خصوصیات ۔ دلی کالج میگزین ۱۹۶۲ء  
سلیم ، وحیدالدین ۔ عہد میر کی زبان ۔ دلی کالج میگزین ۱۹۶۲ء  
صدیقی ، ابواللیب ۔ جامع قواعد اردو ۔ زیر اشاعت مرکزی اردو بورڈ لاہور  
انشاء اللہ خان انشا ۔ درجائے لطافت ۔ طبع اول الناظر پریس ۱۹۱۶ء  
نورالحسن ہاشمی ۔ دلی کا دبستان شاعری ۔ طبع کراچی دسمبر ۱۹۲۶ء  
صدیقی ۔ ابواللیب ۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری ۔ طبع لاہور ۱۹۶۷ء  
صفیر بلگرامی ۔ جلوۂ خضر  
زور ، محی الدین قادری ۔ ہندوستانی لسانیات ۔ نسیم بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۶۰ء  
شلن بینجن ۔ قواعد ہندوستانی لاطینی ۔ ترجمہ انگریزی خطی ۔ موجودہ الڈیا آفس  
لائیبری ۔ لندن

گلکرسٹ ، جان - رسالہ گلکرسٹ مہربہ خلیل الرحمان داؤدی - شائع کردہ  
مجلس ترقی ادب لاہور

عبدالحنی ، مولوی - قواعد اردو - شائع کردہ انجمن ترقی اردو - کراچی  
دناسی گارسان - تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی ( فرانسیسی ) ترجمہ و حواشی  
ڈاکٹر لیلیان نذرو - مقالہ پی ایچ ڈی - کراچی یونیورسٹی - خطی

## تیرھواں باب

### متفرق نثر

#### (الف) بچوں کا ادب

اردو میں بچوں کے ادب کا آغاز ان نصابی کتابوں سے ہونا ہے جو بچوں کے لیے لکھی گئیں۔ یہ وہ کتابیں ہیں جو فارسی کے مشہور نصاب، 'نصاب الصبان' کی طرز میں ہیں اور ان کا رشتہ ابو نصر فراہی کے پیار کردہ نصاب سے جا ملتا ہے۔ اردو میں بچوں کے نصاب کا سلسلہ دسویں صدی ہجری یعنی سولہویں صدی عیسوی سے پہلے نظر نہیں آتا۔ اور سولہویں صدی کی یہ کتابیں بھی مکمل طور پر اردو کی نہیں کہلائی جا سکیں۔ یہ فارسی کے بعض اسما، مرکبات اور مختصر مفہوم والے الفاظ کا اردو مترادف بتانے کا کام دیتی ہیں یا یوں کہنا چاہیے کہ ان کتابوں سے مروج فارسی کے ذریعے اردو کی شناخت کا کام لیا جانا تھا۔ اردو میں بچوں کے نصاب کی قدیم ترین کتاب 'خالق باری' ہے، جسے نصابی نقطہ نظر سے کسی حد تک مکمل کہنا چاہیے اور جس کی زبان نسبتاً دوسری مابیل کتابوں کے آسان ہے مثال کے طور پر ان اسعار کو دیکھیے<sup>(۱)</sup> :

خالق باری، سرجن ہار	واحد ایک، ٹڑا کرنار
اسم اللہ، خدا کا نانو	گرما دھوپ، سایہ جھانوا
نیلا پہلا، زرد کبود	ناناں باناں، نار و پود
موت نیرو، زور پران	سارو دزد، حور ہے جان

'خالق باری' سے قبل 'قصیدہ در لغات ہندی' ۱۵۳۹ء (۹۴۶ھ) اور 'مقبول الصبان' ۱۵۸۲ء (۹۹۰ھ) دو اسے رسالے ہیں جن پر بچوں کے نصاب کی معرفت وارد ہو سکتی ہے، لیکن جزوی طور پر، 'قصیدہ در لغات ہندی' دراصل دواؤں کی فہرست ہے جسے حکیم یوسفی نے لکھا۔ یوسفی ہر اب کے باشندے تھے۔ ان کی تصنیف 'ریاض الادویہ' ۱۵۳۹ء (۹۴۶ھ) میں یہ قصیدہ ملتا ہے جس میں حیوانات اور ادویہ کے اردو مترادف درج ہیں۔ 'مقبول الصبان' فارسی الفاظ کا منظوم فرہنگ ہے، جس میں اردو الفاظ کی تشریح کی گئی ہے۔ 'خالق باری' ۱۶۲۱ء (۱۰۳۱ھ) کی تصنیف ہے اور اسے بچوں کے نصاب میں نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے 'خالق باری' کا بیان امیر خسرو کے ذکر میں کیا ہے اور کہا ہے کہ "امیر نے بھٹیاری کے لونڈے کے لیے لکھی اور یہ کئی

بڑی بڑی جلدوں میں تھی“ (۱)۔ مگر حافظ محمود خان سیرانی نے اس نام کی تردید کی ہے اور اسے ضیاء الدین خسرو کی تصنیف بتایا ہے (۲)۔

’نصاب الصبیان فارسی‘ کی طرز کو اردو میں ’خالق باری‘ نے عام کیا۔ اس کی نعل میں بے شمار کتابیں لکھی گئیں جو کم و بیش بن سو برس تک اردو میں بچوں کے نصاب پر مسلط رہیں۔ ان میں نسخ اسحاق لاہوری کی ’فرح الصبیان‘ ۱۶۴۷ء (۱۰۵۷ھ)، میر عبدالصمد واسع کی ’صمد باری‘ ۱۶۴۸ء (۱۰۵۸ھ) اور تجلی کی ’اللہ خدائی‘ ۱۶۵۵ء (۱۰۶۶ھ) بہت مشہور ہیں۔

’نصاب الصبان‘ کا یہ سلسلہ بظاہر غالب کے ’فادر نامہ‘ طبع ۱۸۷۳ء تک آتا ہے، لیکن اصلاً یہ سلسلہ انیسویں صدی کے بالکل شروع میں ٹوٹ چکا تھا۔ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج نے اردو کے مہندوں کے لیے جو نصاب، بیار کیا، اگرچہ اس میں تعلیم بالغان کا پہلو زیادہ نمایاں تھا، تاہم ۱۸۰۲ء کے فاعدے ’اردو کی صرف و نحو‘ مرتبہ بہادر علی حسینی اور ۱۸۰۴ء کے عملی خاکے مرتبہ گلکرسٹ سے بچوں کے نصاب میں نئے رنگ کا تہ چلتا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے اساعتی ادارے نے نصاب کی تدوین، خاص طور پر ابتدائی جامعوں کے نصاب کے وضع کرنے کے لیے انک نئی روس پیدا کر دی تھی۔ فورٹ ولیم کالج کے بعد دلی کالج میں ہندوستانی ادیبوں کے لیے تدوین نصاب کا ایک بڑا میدان ہاتھ آیا جس کے نتائج کے طور پر انجمن اساعتی علوم بذریعہ السنہ ملکی ۱۸۴۴ء یعنی دہلی ورثکار امجوکشن سوسائٹی وجود میں آئی۔ ”اس انجمن کا منشا“ تھا کہ انگریزی سنسکرت، عربی اور فارسی کی اعلیٰ درجے کی کتابیں اردو، بنگالی اور ہندی میں ترجمہ کی جائیں۔ اور سب سے اول دیسی زبان کی درسی کتابیں تیار ہوں۔“ ان کتابوں پر انگریز مصنفین کی علمی تحریک کا اثر ناگزیر تھا جو انہوں نے ایک لگن کے ساتھ ہندوستان میں شروع کی۔ لہذا اب جو بچوں کی کتابوں کا ڈھنگ نکلا، وہ ہندوستان کی قدیم مروج کتابوں سے مختلف تھا۔ ہرانی کتابیں زیادہ تر ذخیرہ الفاظ بڑھانے پر زور دیتی تھیں۔ ان کا مدعا صرف زیادہ سے زیادہ الفاظ کی تدریس تھی۔ انہیں بلحاظ ضرورت نفسیات اطفال کے مطابق تیار نہیں کیا گیا تھا۔ اور وہ بیشتر ان معلومات پر مشتمل تھیں جو عقائد دینی اور لوازمات تمدنی (نشست، برخواست، ادب آداب) کے سمجھنے میں مدد ثابت ہوں۔ اس ذکر اور فکر کے سوا ان میں کوئی بات ایسی نہ تھی جو دنیاوی معاملات پر غور و فکر کی دعوت دے سکے۔ چنانچہ اس رد عمل کے طور پر جو سراسر

(۱) محمد حسین آزاد، آب حیات - ص ۷۱، ۷۶

(۲) عبدالحق، مرحوم دلی کالج - ص ۱۲۲



اتضائے حال کے مطابق نہا ، ایسی درسی کتابیں لکھیں گئیں ، جو دنیاوی امور کی نسبت اطلاع دیتی ہوں۔ یا یوں کہہ لےجئے کہ ان کتابوں سے زندگی کی آگہی کا سبق حاصل ہو۔ لہذا اس رجحان کے خلاف مشہور معلم مسٹر لاری Laurie کا ردِ عمل اس فقرے سے ظاہر ہوتا ہے جو انہوں نے ہلی ہندوستانی کتاب کے دیباچے میں تحریر کیا ہے :

”اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ صرف دنیاوی امور کی نسبت بحث اور اطلاع ہو“ (۱)۔ (ترجمہ)

اردو کے بھی خواہ انگریز مصنفوں کی اس سعی کا احاطہ یہ ہوا کہ اس طرز کی کتابیں لکھی گئیں اور عمدہ و دلچسپ مضامین ، خوبصورت طباعت و اشاعت اور نفسیات اطفال کے عین مطابق ہونے کی وجہ سے مقبول ہوئیں اور ان برائی کتابوں کی مقبولیت کو کم کرنے لگیں ، جن کا بچوں کے نصاب پر تسلط تھا۔ ہر صوبہ کے محکمہ تعلیم نے تعلیم کے جدید اصولوں کے پیسر نظر نئی کتابیں لکھوانے کا اہتمام کیا۔ کلکتہ اور بمبئی میں الفنسٹن ایجوکیشن انسٹی ٹیوشن اور ہنری کنگ کمپنی (۱۸۳۵ء) نے اس سلسلے میں نمایاں قدم اٹھائے اور بچوں کے لیے اعلیٰ درجے کی درسی کتابیں لکھوائیں۔ ہنری کنگ کمپنی کا صدر دفتر لندن میں تھا۔ ذیلی شاخیں کلکتہ اور بمبئی میں قائم تھیں۔ الفنسٹن انسٹی ٹیوشن بھی لندن میں قائم تھی۔ اس کی شاخیں بھی بڑے سہروں میں تھیں۔ ذیل میں ان دونوں اداروں کی بعض مشہور کتابوں کا ذکر کیا جاتا ہے :

**تعلیم نامہ :** ۱۸۳۵ء میں الفنسٹن سوسائٹی نے سائع کیا۔ اسے محمد ابراہیم مہبہ نے لکھا۔ انگریزی طرز کی جو کتابیں اردو میں لکھی گئی ہیں ، ان میں اسے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس وقت کی وجہ یہ ہے کہ بعد میں بچوں کے لیے جو اردو کتابیں لکھی گئیں انہوں نے اس کتاب کو مشعلِ راہ بنایا اور اس خاص تعلیمی نہج کو قبول کیا ، جو تعلیم نامے نے مقرر کی تھی۔ بچوں کی ابتدائی کتابوں میں کتابت ، اشاعت اور انتخاب مضامین کی عمدگی مثالی حثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب میں جمع جوڑ ، ضرب تقسم کے سوالات ، اخلاق حکایتیں اور مولے ہیں۔ صوبہ میسور اور دیگر صوبوں کے محکمہ تعلیم نے کئی سال تک اپنے ٹیکسٹ میں اسے شامل رکھا۔

**انگریزی آموز :** ۱۸۳۹ء میں الفنسٹن کی تحریک پر یہ کتاب بھی محمد ابراہیم مہبہ نے لکھی یہ انگریزی قواعد سکھانے کا نہایت اچھا رسالہ ہے۔ ٹائٹل پر اسے ’ہجے نامہ‘

کہا گیا ہے۔ انگریزی لفظوں کو اردو ہتچے میں لکھ کر ان کی شناخت کرانے کا رواج جو آج تک باقی ہے، اس کتاب نے شروع کیا۔

تعلیم نامہ ہندی : ۱۸۵۳ء میں مذکورہ بالا سوسائٹی نے شائع کیا۔ اس کا مصنف بھی محمد ابراہیم مقبہ ہے۔ پہلا حصہ گنہت رشی نچی کے چھاپے خانے بمبئی سے شائع ہوا۔ دوسرا حصہ مشہور چھاپے خانے، مطبع احمدی مدراس سے چھپا۔ پہلے حصے میں کتاب کی پشت پر مصنف کی طرف سے یہ عبارت رقم ہے :

”لڑکوں کے ہندوستانی سیکھنے و تربیت حاصل کرنے کا، مرنب محمد ابراہیم مقبہ نے چھپوایا۔ بمبئی کی الفنسٹن ایجوکیشن انسٹی ٹیوشن نے یعنی متوطنوں کی تعلیم و تربیت کے انتظام الفنسٹن کے مختار کار صاحبوں نے۔ اس کی دو جلدیں ہیں“

یوٹر لاری نے جو گورنمنٹ برطانیہ کے مدارسِ خاص کے نگران تھے اور بعدہ، سیلون و فراتہ کے ناظمِ تعلیمات ہو گئے، کککے کے اشاعتی ادارے ہنری رس کنگ کمپنی کے مجوں کی خاطر کتابیں لکھیں۔ جو بعض خوبیوں کی بنا پر مقبہ کی کتابوں سے بہتر ہیں۔ ان کتابوں میں مجوں کے مزاح کو مضامین کے انتخاب میں بہت اہمیت دی گئی ہے۔ مسٹر لاری کی یہ کتابیں ابتدائی نصاب کی اہم کڑی ہیں اور ’مسٹر لاری کا سلسلہ‘ بہت سبب کہلاتی ہیں۔ ان کتابوں کو اردو نصاب میں تجرباتی حیثیت حاصل ہے۔ ان میں نئی تجربات کیے گئے ہیں۔ پہلا تو یہ کہ پہلی کتابوں میں اخلاقیات کے مضامین کو ایک ضروری جزو خیال کر کے دین داری کی باتوں پر زور دیا جانا تھا۔ ان کتابوں میں اس روشِ عام کے خلاف دنیاوی باتوں پر زور دیا گیا۔ اور بچوں کے لیے ذہنی تفریح کے وسائل کو نصاب کا حصہ بنایا۔ دوسرے یہ کہ تصویروں کے ذریعے تعلیم پر زور دیا گیا۔ ’جغرافیہ، تاریخ اور دیگر معلوماتی مضامین کو تصویروں کے ذریعے دلکش بنایا۔‘ پہلی ہندوستانی کتاب، (سلسلہ لاری) جسے سید مقبر حسین نے اردو میں منتقل کیا، اسی طرز پر لکھی گئی۔ ایک صفحے پر انگریزی عبارت اور تصاویر ہیں اور سامنے والے مقابل کے صفحے پر اردو عبارت اور تصاویر دی گئی ہیں۔ دیباچہ بھی اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں تحریر ہے۔ اس دیباچے میں بعض فکر انگیز باتیں چھپڑی گئی ہیں۔ جن کا تعلق بچوں کے تعلیمی مسائل سے ہے۔ چنانچہ مصنف ان مسائل اور معاملاتِ علمی کے عام رواج کے لیے اس کتاب کو آزمائش قرار دیتا ہے اور کہتا ہے :

”یہ کتاب دوپہری غرض سے طبع کرائی ہے۔ ایک یہ کہ اس قسم کی کتابوں کی احتیاج رفع ہو۔ نیز یہ کہ دریافت ہو کہ آیا پورا سلسلہ کتب طبع کرانے کے واسطے کافی وجوہ ہیں یا نہیں“ (۱)

انگریز مصنفوں کی تحریک پر ہندوستانی ادیبوں اور معلمین نے بھی بچوں کے لیے کتابیں لکھیں۔ دلی کالج اور دلی کی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی نے اس خیال کو مزید تقویت پہنچائی۔ ایک اور حوصلہ افزا بات یہ ہوئی کہ ان ہندوستانی مصنفین کی کتابیں نہ صرف مدر کی نگاہ سے دیکھی گئیں، بلکہ غیر ملکی کہنوں (جن کا ذکر کیا گیا ہے) نے ان ہندوستانی مصنفین سے فرمائش کی کہ اردو میں بچوں کے لیے کتابیں تصنیف کریں۔ چنانچہ ایجوکیشن سوسائٹی بمبئی نے اس کام میں بہت نام نایا۔ اور یہی نہیں کیا کہ کتابیں لکھوائیں بلکہ انہیں محکمہ تعلیم سے منظور کرا کے نصاب میں بھی شامل کروایا۔ اس ادارے کے ہندوستانی مصنفین میں سب سے زیادہ سہرہ مولوی اسرف علی گلسن آبادی، المعروف سید عبدالفتاح نے پائی۔

شروع شروع میں بچوں کا نصاب مکمل اور منضبط نہیں تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دیسی مدرسوں میں معلم کا کوئی جامع پروگرام نہیں تھا۔ بالخصوص بچوں کے نصاب پر کوئی خاص نوجہ نہیں دی گئی تھی۔ نفسیاتِ اطفال اور ضروریاتِ زندگی کو پس نظر رکھ کر نصاب نیا نہیں کسے جاتے تھے۔ ضروریاتِ زندگی اور نفسیاتِ اطفال کا لحاظ تو در کنار، روایتی طرز کی تعلیم اور کتابوں میں ذرا سی نرم اور بدیلی جو تغیر پذیر معاصر کا لازمہ ہے، گوارا نہیں کی جاتی تھی۔ ساری تعلیمی کوششیں انسان اور املا کی تعلیم تک محدود رہیں۔ بچوں کا قومی ہمعمر کے جس فکری اور ذہنی پہلو سے تعلق ہے، اسے یکسر نظر انداز کر دیا جانا اور اس بات کو فراموش کر دیا جانا نہا کہ بچن کی منزل میں مستقبل کے لیے بڑے سے بڑے قومی اور انفرادی مقاصد کی تکمیل کی جا سکتی ہے۔ سوائے اس جذبے کی ہمعمر کے جو دینی محبت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے کسی اور بلند ارادے کی تحریک و برغیب نہیں دی جاتی تھی۔ البتہ انہی ضرور کیا جانا (اور وہ بھی لا شعوری طور پر) کہ نغمگی کے احساس کو بیدار کر دیا جائے۔

انگریز مصنفوں سے متاثر ہونے والے ہندوستانی ادیبوں نے بچوں کے اردو نصاب کو زندگی سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ اور ان جھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جو نصابی نقطہ نظر سے باہر ہیں۔ مثال کے طور پر کتابوں کی لکھائی جھپٹی، اچھے کاغذ کا استعمال، کتابوں کی ضخامت اور ان کا سائز، یہ ساری چیزیں صوری محاسن میں آتی ہیں، مگر انہیں در اصل معنوی محاسن کا لازمہ ہونا چاہیے۔ ان نئی کتابوں میں یہ خوبیاں بدرجہ اتم

موجود ہیں۔ ان کتابوں کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ بچوں کو انہوں نے زندگی احساس دلایا اور بتایا کہ دنیا زندگی کا موضوع ہے، لہذا ان کے سامنے دنیا کا ایک تصور باندھ کر دکھایا جو عقل کے مطابق اور ضروریات زندگی کے موافق تھا، لیکن امر بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ۱۸۰۰ء کے بعد کی کتابوں نے در پردہ ہمارے شعور کو کم کرنے کی کوششیں شروع کر دی تھیں اور یہ کوششیں اس حد تک ہوئیں بچوں کی کتابوں سے وہ ہر ممکن اشارہ دور رکھنے کی سعی کی گئی جس سے ذہن عقیدے کسی احساس کی طرف منقل ہونا ہو۔ اگرچہ یہ اس انتہا سندی کا ردِ عمل تھا۔ ہمارے بزرگوں نے روا رکھی تھی، لیکن یہ تحریک کامیاب نہ ہو سکی اور تقریباً ۱۸۶۹ء بعد ہندوستانی ادیبوں اور خاص طور پر مسلمان مصنفین نے نہایت عقل مندی سے یہ جان لی اور اپنی کتابوں میں اس امر کا اہتمام کیا کہ بچوں میں دینی شعور باقی رہے اور یہ بات اب تک باقی ہے۔

مختصر یہ کہ قدیم نصاب محض الفاظ کی ٹریننگ تھی۔ ان میں ایک زبان کے الف دوسری زبان میں متعل کر دیئے جاتے تھے۔ گویا ذخیرۃ الفاظ بڑھانے کے سوا ان کتابوں کا کوئی اور مقصد نہ تھا۔ نثر کے مقابلے میں نظم کو زیادہ اہمیت دی گئی تھی۔ بلکہ دونوں کہنا چاہیے کہ نظم میں جو آہنگ اور موسیقی ہے اسے بچوں کے مزاج کے زیادہ قریب پا کر اسے ذریعہ تعلیم قرار دیا جانا تھا۔ اسی سبب سے ابتدائی نصاب تمام کے تمام منظوم ہیں۔ اور یہ بات ٹھیک بھی ہے کیونکہ نثر کے مقابلے میں نظم کانوں کو زیادہ بھلی لگتی ہے۔ اور موثر ہونے کی وجہ سے جلد یاد ہو جاتی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ معصومیت سے بھرے ہوئے جذبات و خیالات کو نہایت سادگی سے بیان کرتی۔ یہی ساری خوبیاں تھیں جن کی بنا پر بچوں کے لیے نثر سے زیادہ نظم کام میں لائی گئی۔

بچوں کا ذہن تفریح کو پسند کرتا ہے۔ شاعری کے وسیلے سے اس تفریح کا اہتمام کیا گیا۔ نثر میں سنجیدگی اور برد باری کے مضامین کا بہت بھاری رہنا ہے۔ اس لیے شاعری کے مقابلے میں کم انسراج قلب کرتی ہے۔ اسی لیے بچوں کے ابتدائی نصاب میں نثر رواج نہ پاسکی۔ ایک وجہ اس کی اور بھی ہے کہ نثر زندگی کی تصویر تفصیلاً سے دیتی ہے اور نظم کے مقابلے میں معانی و مفہوم سے زیادہ آراستہ ہوتی ہے۔ اور نصاب بھرپور زندگی کی ان خوبیوں سے عاری تھے، بلکہ زندگی کا کوئی تصور ان میں موجود نہ تھا۔ اس لیے نثر کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ یہ بات اس لیے بھی صحیح ہے کہ اس زمانے کے حالات کے پیش نظر تعلیم زندگی کی آگہی کا وسیلہ نہ تھی اور زندگی کو سمجھنے کے لیے، علم کی محتاجی جیسی آج ہے، پہلے نہ تھی۔ اب نو زندگی کا ہر را علم کے سینے میں سر بستہ ہے۔ وہ معاشرہ اس ماحول سے مختلف تھا۔ اسی بنا پر بچوں

نصاب کی تدوین کسی خاص فکری انتظام کے تحت ظہور میں نہیں آتی تھی۔ اگر اس کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کتابوں سے صرف یہ معصود پورا کیا گیا تھا :

- ۱۔ ایک زبان کی تعلیم دوسری مروج زبان کے ذریعے دی جائے۔
- ۲۔ نظم کی نائیر سے فائدہ اٹھا کر ذخیرۃ الفاظ بڑھایا جائے۔
- ۳۔ معلومات عام (خصوصاً تمدنی زندگی کی ادنیٰ ضروریات کھانا، پینا، پہنا، اٹھنا، بیٹھنا وغیرہ) سے آگاہ کیا جائے۔

صاف ظاہر ہے کہ یہ نصاب ایک بڑی خوبی سے خالی نہیں اور نہ خوبی وہ اصل ہے جو تمام نصابِ تعلیم کی بنیاد ہے اور جس کے ذریعے بچوں میں زندگی کی آگہی پیدا ہوتی ہے۔ اس خوبی سے ہمارے نصاب ایک طویل عرصے تک محروم رہے۔ اور جب تک انگریزی تعلیم کے اوقات یہاں تک نہیں پہنچے یہ خوبی سدا نہیں ہوئی۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ بچوں کی کتابیں ان کے ذہنی ارتقاء اور عمر کی تدریجی منزلوں کے مطابق علیحدہ علیحدہ لکھی جائیں اور تعین کیا جائے کہ کس عمر تک کے بچوں کے لیے کونسی کتابیں درکار ہیں۔ سن و سال کا تفاوت اعلیٰ درجے کے نصاب کی تدوین میں ہمیشہ پیش نظر رکھا جانا ہے۔ عمر کے تقاضوں کا نہ لحاظ بچوں کے معاملے میں نہایت اہم ہے اور نازک بھی، کیونکہ ان کی ذہنی پرورش زندگی کے انہی نازک سالوں میں ہوتی ہے۔

جن کتابوں کا مطالعہ کیا گیا، یا جن کا حوالہ دیا گیا، ان کی فہرست ذیل میں القبا میں ترتیب کے مطابق دی جاتی ہے۔



### کتابیات

مصنف یا مرتب	نام کتاب	مقام اشاعت
۱۔ رام برشاد	ابتدائی تعلیم کی رام کہانی	شمسی پریس آگرہ ۱۹۰۸ء
۲۔ مدن لال	ابتدائی اسکولوں کی تعلیم	اسرٹ البکٹرک پریس لاہور ۱۹۴۱ء
۳۔ علاء الدین	ابتدائی تعلیمی نفسیات	قومی کتب خانہ ۱۹۵۷ء
۴۔ آزاد	آبِ حیات	غلام علی لاہور ۱۹۵۷ء
۵۔ گنگا پرشاد	اتالیق	ورما پریس لکھنؤ ۱۸۸۶ء
۶۔ آزاد	اردو کی پہلی کتاب	محکمہ تعلیم پنجاب ۱۸۸۶ء

مصنف یا مرتب	نام کتاب	مقام اشاعت
۷ - پیارے لال	اردو کی تیسری کتاب	محکمہ تعلیم پنجاب ۱۸۷۶ء
۸ - مولوی ذکا اللہ	اردو کی پہلی کتاب	محکمہ تعلیم پنجاب ۱۸۸۶ء
۹ - مولوی ذکا اللہ	اردو کی پانچویں کتاب	مطبع مرنضوی دہلی ۱۸۸۸ء
۱۰ - سید ولی حیدر	اردو آموز جدید	سلسلہ تعلیم بہار ۱۹۰۸ء
۱۱ - ڈاکٹر محمود نقوی	اردو کی نثری داستانیں	مقالہ ڈاکٹر ریٹ پنجاب یونیورسٹی
۱۲ - سید محمد قادری	اربابِ نثرِ اردو	مکتبہ ابراہیمہ دکن ۱۹۲۷ء
۱۳ - سید اختر	اسماعیل میرٹھی	معالم ایم - اے پنجاب یونیورسٹی
۱۴ - محمد ابرہیم مقبہ	انگریزی آموز	کوریر ہریس بمبئی ۱۸۳۹ء
۱۵ - منشی فخرالدین	انشائے خرد افروز	مطبع انوار گجرات ۱۸۵۵ء
۱۶ - اخلاص حسین	اصولِ تدریس	اکڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ ک
۱۷ - غلام السبیدین	اصولِ تعلیم	اکڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ ک
۱۸ - سید جعفر حسین	پہلی ہندوستانی کتاب	مسٹر لاری کا سلسلہ کتب ، کا
اور لاری		۱۸۳۵ء
۱۹ - محمد ابرہیم مقبہ	تعلیم نامہ مقبہ	برہم پریس دہلی ۱۸۳۵ء
۲۰ - محمد ابراہیم مقبہ	تعلیم نامہ ہندی	مطبع احمدی مدراس ۱۸۸۹ء
۲۱ - مرتبہ شیرانی	خالق باری	انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۴۴ء
۲۲ - افسر میرٹھی	خیالستانِ اردو	شمس المطالع میرٹھ ۱۹۲۱ء
۲۳ - حامد حسین	داستانِ تاریخِ اردو	لکسمی نرائن اگروال آگرہ ۷ د
قادری		
۲۴ - اجلاس اول ،	روئداد معارف اسلامیہ	لاہور ۱۹۳۳ء
(مجلسِ عامہ)		
۲۵ - افسر میرٹھی	ستارہ اردو	انڈین بک ڈپو سیریز ۱۹۲۱ء
۲۶ - پنجاب پبلک	فہرستِ کتب	لاہور ۱۹۳۶ء
لائبریری		
۲۷ - غالب	فادر نامہ	مطبع سراری دہلی ۱۸۷۳ء
۲۸ - نصیر الدین ہاشمی	کتب خانہ آصفیہ کے	جلد دوم
	مخطوطات کی فہرست	
۲۹ - مولوی عبدالحق	مرحوم دلی کالج	انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۳۳ء

مصنف یا مرتب	نام کتاب	مقام اشاعت
۳۰ - اشرف علی گلشن آبادی	ہندوستانی کی نیسری کتاب	ایجوکیشن سوسائٹی بمبئی ۱۸۸۷ء
۳۱ - ابوالحسنات ندوی درسگاہیں	ہندوستان کی قدیم اسلامی وکیل بک ڈپو امرتسر	۱۹۲۲ء

1. Catalogue of Hindustani manuscripts in India office Library 19th Century, Royal 16, B, XIII (P. U.)
2. Catalogue of Hindustani, Punjabi manuscripts in the library of British Museum, 1899 (P. U.)
3. Imperial Gazettiar of India, Blumhardt Volume XIV (P. U.)

## متفرق نثر

### (ب) عورتوں کا ادب

#### تاریخی پس منظر

۱۸۰۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے سندھیا کے علاقوں پر جو مہم کشی کی ، اس میں انگریزی افواج کا سالار لشکر جنرل لیک تھا ۔ چونکہ شاہ عالم سندھیا کے قبضے میں تھا اس لیے جب جنرل لیک نے دہلی فتح کی تو شاہ عالم کا گورنر جنرل لارڈ ولزلی سے جو معاہدہ ہوا ، اس کے مطابق شاہ عالم انگریزوں کا پنشن گزار ہو گیا ۔ تاہم خطبہ ، خطاب ، القاب اور ادب آداب سب قائم رہے ۔ ۱۸۳۷ء تک جب بہادر شاہ ظفر تخت نشین ہوا ، ایسٹ انڈیا کمپنی عریباً دو ہائی ہندوستان پر قابض ہو چکی تھی ، مگر مغلوں کی برتری کا احساس عوام میں ابھی تک باقی تھا ، اور اس کا سبب ان کی تہذیبی خویاں اور ان کی ماضی کی عظمت بھی ۔ برسرِ صغیر کے مسلمانوں بلکہ ہندوؤں تک میں جو ذوقِ علم و فن ، اخلاق و ادب ، مذہب و نصوف موجود تھا وہ اسی تہذیب کی بدولت تھا ۔ اٹھارویں صدی کے بعض عسروں کے سیاسی انسار کے باوجود ادب اور بالخصوص اردو شاعری اٹھارویں صدی میں ہی پروان چڑھی ۔ اور اگرچہ سولہویں اور سترہویں صدیوں میں قدیم اردو گجرات اور دکن میں اعلیٰ تصنیفاتِ نظم و نثر کی حامل ہو چکی تھی ، مگر شمال میں اٹھارویں صدی کے آغاز تک فارسی ہی کا دور دورہ تھا ۔ لیکن جب شمال یعنی دہلی اور نواح ، لکھنؤ اور ارد گرد کے علاقوں میں بسنے والوں نے اردو کی طرف توجہ کی تو اس میں بھی قائم ، میر ہی میر ، مرزا سودا ، خواجہ میر درد ، خواجہ میر اثر ، خواجہ میر حسن ، نظیر اکبر آبادی اور سد خلیق وغیرہ جیسے با کمال شعراء ظہور میں آ گئے ۔ نثر اگرچہ ابھی تک مرصع انداز میں لکھی جاتی تھی ، مگر اس میں بھی سلیس اور روزمرہ کی زبان استعمال ہونے لگی اور اٹھارویں صدی کے اخیر میں ’عجائب القصص‘ جیسی داستانِ شاہ عالم ثانی نے لکھ ڈالی ۔ اسی طرح ٹھیکہ اردو میں قرآنِ پاک کے تراجم ہونے لگے ۔ یہ کام شاہ ولی اللہ کے دو فرزندوں یعنی شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے سر انجام دیا ۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے لکھنے والے سلیس زبان استعمال کرتے تھے ۔ اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ جب کلکتہ سے ڈاکٹر گلکرسٹ نے ایک اشتہار شائع کیا کہ جو لوگ آسان اور با محاورہ زبان میں نثر کے نمونے پیش کر سکتے ہیں وہ اپنی تصانیف انہیں بھیجیں تو میرا من دہلوی نے ’باغ و بہار‘ لکھکر بھیجی ۔ اندازِ بیان کی جو پختگی ’باغ و بہار‘ میں ملتی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ زبان وہ کئی سالوں سے استعمال کر رہے تھے ۔ اسی طرح یہ بھی لازم آتا ہے کہ وہ تمام مصنفین جو اب فورٹ ولیم کالج سے منسلک ہو گئے اسی قسم کی زبان استعمال کرنے کی



قدرت رکھتے تھے۔ یہ داستانوں اور کہانیوں کی کتابیں جو اب فورٹ ولیم کالج نرائع ہوئیں تمام بترِ صغیر میں پھیل گئیں اور کما عورت اور کما مرد سب ہی ان مطالعہ کرنے لگے۔

عورتوں کے ادب کا محاسبہ کرتے وقت یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس وقت بترِ صغیر کے مسلمان معاشرے بلکہ سارے بترِ صغیر میں تعلیم نسوان کا الگ تصور موجود نہ تھا لڑکوں کو قرآنِ مجید ناظرہ پڑھا دیا جاتا تھا اور معمولی لکھنا پڑھنا جو اس وقت را تھا اور وہ اس غرض سے تھا کہ بوقتِ ضرورت گھر کا حساب کتاب لکھ لیں یا اعز و اقارب سے خط و کتابت کر سکیں۔ اکثر مستورات ان پڑھ تھیں، اگرچہ جو پڑھ لکھتی تھیں وہ شعر بھی کہہ لیتی تھیں۔ چنانچہ حب انیسویں صدی کے نصف اول میں اردو چھاپے خانے قائم ہونا شروع ہوئے اور کہیں کہیں سے اخبار بھی نکلتے شروع ہوئے مثلاً سید محمد باقر ولد مولانا محمد حسین آزاد کا اخبار ’دہلی اردو اخبار‘ ۱۸۳۷ء میں ’دہلی اخبار‘ کے نام سے جاری ہوا۔ ۱۸۴۰ء میں اسکا نام ’دہلی اردو اخبار‘ پڑا، جو اردو پہلا اخبار بصورتِ کتاب کیا جاتا ہے۔ اسی طرح سر سید احمد خاں کے پڑے بھائی سید محمد خاں نے جب اپنا چھاپہ خانہ قائم کیا تو ’سید الاخبار‘ (۱۸۳۷ء) کے نام سے ایک اخبار نرائع کما حسے مرد اور عورتیں دونوں پڑھتے۔ ابھی معاشرہ کا ذہن اس طرف مائل نہیں ہوا تھا کہ عورتوں کے پڑھنے کے لیے اسی کتابیں یا اسے افسانے ہونے چاہیے جن میں مستورات کی زندگی اور ان کے مسائل سے بحث ہو۔ یہ انیسویں صدی کے نصف آخر کی باتیں ہیں۔ تاہم مختلف حوالہ جات سے یہ حلیا ہے کہ چند ایک چھوٹی مو اصلاحی کتابیں طبع ہونی شروع ہو گئیں تھیں۔ مگر پسنر اس کے کہ اس موضوع پر مفصل بحث کی جائے، یہ معین کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں (اس میں لڑکیاں اور بچیاں بھی شامل ہیں) کے ادب کا کیا مفہوم ہے؟ ادب میں ہم دینی، درسی، تفریحی اور اخلاقی کتب کو شامل کرنے کے علاوہ لوک گیتوں، ملبھاروں، لوریوں، جھولنوں، اور پھیلیوں کو بھی شامل ادب سمجھتے ہیں۔ ان میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو سب سے بہ سہ چلی آ رہی ہیں اور تحریر میں نہیں لائی جاسں۔

اس سے پہلے کہ ہم عورتوں کی خواندگی کے متعلق کچھ کہیں، ایک مسئلہ بات کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ بچوں کی تعلیم ماں کی گود سے شروع ہو جاتی ہے۔ اور بچوں بالوں کو چمڑوں کے نام ایک سال کی عمر میں سکھائے جاتے ہیں۔ جو ماں باپ یا انا یا آیا بچوں پر زیادہ محبت کرتی ہیں وہ انہیں زیادہ اسباب دیتی ہیں۔ متعارف کرا دیتی ہیں۔ اسکے بعد وہ دور آتا ہے جب چڑے چڑیا، کتے کتوی، ار چالاک لومڑی کی کہانیاں بچوں اور بچوں کو سنائی جاتی ہیں۔ جب بچہ تین چار سال

لگ بھگ ہو جانا ہے ، تو لوگ کہانیاں جن میں تفریح اور اخلاق کا عنصر موجود ہوتا ہے سنائی جاتی ہیں۔ اس دور میں بچیوں کی تعلیم کا یہ طریقہ رائج نہا کہ غریب طبقہ اپنی بچیوں کو کسی نیک بوڑھی عورت کے گھر پر قرآن شریف پڑھنے کے لیے بھیج دیتا تھا اور متمول حضرات ایسی عورتوں کو اپنے گھر ہی میں مستقل طور پر رکھ لیتے تھے۔ اسی دور کے معاصرے کی عکسی اشرف صبحی نے اپنی کہانیوں ، 'سیدانی بی بی' ، اور 'نیازی خانم' میں کی ہے۔ 'نیازی خانم' میں لکھتے ہیں کہ "اس دور کے معاصرے میں لڑکوں کا باقاعدہ اسکول یا مدرسے جا کر لکھنا پڑھنا تو درکنار اگر لڑکی لکھے پڑھوں کی سی باتیں بھی کرنی ، نو حرافہ اور سہما کا خطاب دانی۔ بڑا ہر مارا تو قرآنِ ناک حتم کر کے 'راہِ نجاب' ، 'کردا' اور 'خالی باری' پڑھ لی وہ بھی ابنا یا بھائی سے اور اگر امیر گھرانہ ہے تو کسی استانی سے 'خالی باری' سے آگے پڑھے اور 'کریمہ بہ بخشائے ہر حال' ما' پڑھ لی"

ان دنوں ہر شریف گھرانے کی لڑکیاں گڑیاں بھی کھیلیں۔ کہے کو نو یہ ایک کھیل تھا ، لیکن اسکو سگھڑانا سکھانے ، سینا پرونا سکھانے کی تعلیم سمجھنا چاہیے۔ رسومات سے آگاہی بھی لڑکیوں کی تعلیم کا ایک جزو ہونا ہے۔ جو کہ وہ گڑیوں ہی کے بیابان سادی کر کے سیکھتیں اور ان کو بہتر اور خوشگوار بنانے کے لیے اپنی فہم و فراست سے کام لیتیں۔

اس دور کے ادب اور زبان کا اندازہ ہمیں ان کے گیتوں گانوں ، ملبھاروں ، زچہ گیریوں ، لوریوں اور یہیلیوں سے ہو سکتا ہے ، جن سے عورتوں کی جدتِ طبع اور عورتوں کی بولی کا پنہ چلتا ہے ، مثلاً منڈھے کا ایک گیت ملاحظہ کیجیے :

ہریت بانس کٹا مورے بابل      نئے کا منڈھا جھوائے رے  
منڈھے اوپر کلس سو ہے      دیکھی راجہ رائے رے

لوریوں کو ادب میں باضابطہ طور پر کبھی شامل نہیں کیا گیا۔ اس لیے ان کی اشاعت کی طرف بھی کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ انیسویں صدی کے آغاز میں قدیم اور مروجہ لوریوں کو مدون کیا گیا۔ ان میں 'لولی نامہ احمد' (۱) ، 'منشی سنی' (۲) اور 'چرخ پر بہار' مشہور ہیں۔ اسکے علاوہ مخدوم اور مشتری نے بھی مقبول لوریاں لکھیں ، مگر ان دونوں کے بارے میں تمام تذکرہ نویس خاموش ہیں۔ مشتری کے نام سے البتہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی عورت تھی۔ 'لولی نامہ احمدی' سے ایک بند بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے :

(۱) منشی ، لولی نامہ احمدی ، مطبع سلطانی حیدرآباد - ص ۳ ، ۴  
(۲) اسد ارباب ، اردو میں بچوں کا ادب (مقالہ ہی - ایچ ڈی) برگ ۱۶ ، ۱۷

اے مرے دلبر ماہِ منور واروں میں تجھ پر گوہر و اختر  
شاہِ نجف کا سایہ ہو سر پر حامی ہوں ییری خاتونِ محشر

آؤ سہاگن جھولا جھلا نے  
نورِ نظر کو اپنے ماں نے<sup>(۱)</sup>

مشتری کی لولی کا ایک بند بطور نمونہ درج ہے :

مشتری حق سے کرتی دعا ہے ہر لحظہ پر دم ، یہ التجا ہے  
نانے کا میرے حافظ خدا ہے جھجھورے ، جھجھو ، جھجھو<sup>(۲)</sup>

### مخدوم

ییری مخدوم بے خود ہو کر لاہوب سرل نک سر کر کر  
گنجِ مخفی میں ناٹے گا دلبر سکیری ہو ہو کی لولی میں گائی<sup>(۳)</sup>

یہ لوریاں اور جھولنے اسے رمانے کی مروجہ زبان میں لکھے گئے ہیں ۔ مسلمانوں کی معاشقہ فضا کا اثر ان کے موضوع پر ہر جگہ نمایاں ہے ۔ بصوف ، معرف اور بعلق الی اللہ کے مضامین بھی ان لوریوں میں عام ملتے ہیں ۔

مشرقی میں یہلبان ، لطفے اور کہانیاں سنانے کا رواج قدیم زمانے سے ہے اور یہ کام عوریں یا گھر کی بڑی بوڑھیاں ہی انجام دیتی ہیں ۔ کہانیاں اپنے نفسانق عمل کی وجہ سے بچوں کے لیے بڑی اہم رکھتی ہیں ۔ ان کے ذریعے برست کا مفہوم ادا کیا جاتا ہے ۔ عورب کا اولین فرض بریتِ اولاد ہے ۔ اس برست سے مراد بریتِ فکر بھی ہے اور نریتِ عمل بھی ۔ بچے کہانیوں کے ذریعے معلوماتِ عامہ ، تاریخِ اسلام اور بیتی ہوئی بے شمار زبانوں سے اس وقت ہی آگاہ ہوتے ہیں ، جب ماں خود ان باتوں سے کام لے ، واقف رکھتی ہو ۔ بچوں کا حافظہ اور ذہان ان ہی کہانیوں کے ذریعہ مکمل ہوتی ہے ۔ ان میں سوال جواب کی فوب پیدا ہوتی ہے اور وہ جان لیتے ہیں کہ کسی بات کو کہنے کے لیے کتنا انداز ہونا چاہیے ۔ انہیں کہانیوں کی بدولت وہ مکالموں اور گفتگو کے طریقے بھی سیکھتے ہیں ۔ ہمارے ہاں آجکل جنی کہانیاں گردش کر رہی ہیں وہ یا تو 'داستانِ امیر حمزہ' یا دوسری بڑی داستانوں سے ماخوذ ہیں ۔ اور اگر غور کیا جائے تو انہیں داستانوں میں اسلامی تہذیب کی تمام روایات پوشیدہ ہوتی ہیں ۔ جو کہانی

(۱) منشی ، لولی نامہ احمدی ، مطبع سلطانی حیدرآباد ۔ ص ۳ ، ۴

(۲) لولی نامہ ، مطبع سلطانی حیدرآباد ۔ ص ۸

(۳) چرخ پر بہار ، مطبع فردوس مدارس ۔ ص ۱۳۳۵

کے واسطے سے ہمارے ذہن میں ابر جاتی ہیں۔ سب سے بڑا کام جو یہ کہانیاں سر انجام دیتی ہیں وہ اسلام کی عظمت کا احساس ہے جو بچوں اور بڑوں کے دلوں میں جا گزیں ہو جانا ہے۔

جس ادب کا اب تک ذکر کیا گیا ہے، بہ عورتوں کا وہ ادب تھا جو سینہ بہ سینہ روایت کی صورت میں چلا آ رہا ہے اور اس کا بہت کم حصہ ضبط تحریر میں آیا ہے۔ اب ہم اس ادب کو لیتے ہیں جو باقاعدہ کتابوں، رسالوں اور اخباروں کی شکل میں چھپ کر منظر عام پر آیا اور نصاب میں بھی شامل ہوا۔

چوتھے یا پانچویں سال میں لڑکے لڑکیوں کی بسم اللہ ہوتی ہے اور پھر حرف شناسی، جتنے اور الفاظ کے جوڑ توڑ سے انہیں متعارف کر کے قرآن مجید انہیں ناظرہ پڑھا یا جاتا ہے۔ یہی پرانا دستور ہے، اور چونکہ عربی اور اردو حروف ایک ہی جیسے ہیں اس لیے ان بچوں کے لیے اردو کی چھوٹی مونی کتابیں پڑھنا مشکل نہیں ہونا ہوگا۔ البتہ بڑی یا بالغ عمر کی عورتوں کے لیے بڑی پابندیاں تھیں۔ اس لیے وہ فقط جوڑی چھپے کسی بھی قسم کے ادب سے استفادہ کر سکتی تھیں۔ اس لیے بھی ادب کی کوئی خدمت کرنے کا موقع ان کے ہاتھ نہ آسکا۔ انیسویں صدی کے آخر تک عورتوں کو سوائے مذہبی موضوعات کے دوسرے علوم کے حاصل کرنے کی اجازت ہی نہ ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ بعض وہ کتابیں جو عورتوں کو پڑھنے کے لیے دی جاتیں، ان میں سے چند حصص حذف کرنے پڑے تھے۔ کیونکہ ایسے حصص یا صفحات عورتوں کی تعلیم کے لیے اخلاقی طور پر یا علمی طور پر موزوں و مناسب نہ تصور ہوتے تھے۔ لکھنا سکھانے سے بھی اکثر گریز کیا جاتا، مبادا کسی غیر مرد سے خط و کتابت کرنے لگیں۔ ان دنوں عورتوں کی تعلیم کا مقصد محض انتظام خانہ داری کو خوش اسلوبی سے انجام دینا تھا۔ یا پھر مذہبی اور اخلاقی رسائل اور کتابیں پڑھنا۔

گھریلو حساب کتاب کے لیے انہوں نے اپنی ہی اصطلاحات وضع کی ہوئی تھیں۔ مہینوں کے انگریزی نام عورتوں کو نہ یاد تھے نہ وہ انہیں استعمال کرتی تھیں۔ وہ قمری مہینوں سے وقت کا حساب لگاتیں۔ کھانے پکانے میں پانی ڈالنا ہوتا تو انگلیوں کے پوروں سے اسے ناپیں اور اگر گھر میں سے اناج نکالنا ہو یا آٹا یا چاول نو مٹھی بھر یا لپ بھر چیز ایک مسلم بیانا تھا۔ کپڑے کی پیمائش کے لیے تو ہر کوئی بالشت یا بازو استعمال کرتا۔ گنتی بیسیوں میں ہوتی۔ دف فلف فاصلہ ناہنے میں ہوتی کیونکہ میلوں یا فرلانگوں سے ہماری مستورات اور خوانین بالکل بے بہرہ تھیں۔ اس کے لیے وہ ایک مقام سے دوسرے مقام تک کے فاصلے کو وہ کرایہ کا بیانا بنا لیتیں۔ اور اسے دگنا یا تگنا یا نصف کر کے کہاروں کو اتنی اجرت دیتی تھیں۔

مثال کے طور پر اودھ کو لیجیے بلکہ اودھ چھوڑ سب مسلمان علاقوں میں یہی حال تھا کہ غریب طبقہ متوسطہ اور امراء کے طبقہ سے وابستہ ہو کر اپنی زندگی عزت و آبرو کے سانہ بسر کرنا تھا۔ اس دور کی لڑکیوں کو سلائی پرانی اور گھریلو کام کاج میں طاق کر دیا جانا تھا، چنانچہ ہانہ ہاؤں جلتے ہو وہ سلائی پرانی کا کام کر کے اپنی ہنر مندی سے زندگی گزاریں، لیکن جب ہانہ ہاؤں تھک جاتے، بینائی سانہ نہ دیتی تو پھر کوئی بھی صاحبِ ثروث انہیں اپنی بچیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے مغلائی کے طور پر رکھ لبتا۔ بڑی ہی صبح کی نماز پڑھ کر بچیوں کو لے بٹھیں۔ قرآن سرف بڑھائیں اور نصیحتیں کریں۔ دوپہر کو سینا، رونا، کاڑھنا اور سنتا سکھائیں۔ سام ہوئی نو باورچی خانے میں جا کر کھانا پکانے کی ترکیبیں بتائیں۔ رات آتی ہو عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر بڑے مزے کی سبق آموز کہانیاں سنائیں۔ کہانیاں ایسی دلچسپ ہوں کہ بعض اوقات بڑے بھی آ شامل ہونے۔ ان کہانیوں میں عموماً بڑے لوگوں کو مار پڑی ہے اور بد طبیعت کرداروں کو شکست ہوتی ہے۔ غریب بلکہ سب سے چھوٹا لڑکا اور سب سے چھوٹی لڑکی سب سے اچھا کام کر دیتی ہے، اس طرح بچوں میں عرب بروری اور ہمدردی کے جذبات بھی پیدا ہو جاتے ہیں، بلکہ اس سے ان کی خود اعتمادی بڑھتی ہے۔

اب کچھ ذکر ان کتابوں کا کیا جانا ہے جو اس دور میں نا اس سے کچھ پہلے عورتوں کے لئے لکھی گئیں یا عورتوں کے لئے موزوں نہیں:

### کربل کتھا

ارو میں عورتوں کے لئے سب سے پہلی کتاب غالباً ’کربل کتھا‘ ہے جو ۱۷۳۲ء میں طبع ہوئی۔ اس کے مصنف فضل علی خان فضلی تھے۔ انہوں نے کتاب اس لئے لکھی کہ مجالس میں جو کربلا کے شہدا کا ذکر ہوا کرنا تھا وہ فارسی زبان میں ہونا تھا اور اس کے سمجھنے سے عورتیں فاصر ہوتیں۔ جیسا کہ وہ خود اپنے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

”جب خلص روضتہ الشہدا کا سونا تا تھا، لیکن معانی اوس کے نساً و عورات کی سمجھ میں نہ آتے تھے اور فقرات پر سوز و گداز اوس کتاب مذکورہ کے سبب لغات فارسی اون کون نہ رلاتے تھے۔ اکثر اوقات بعد کتاب خانی کے سبب یہ مذکور کر کے کہ صد جف و صد ہزار افسوس جو ہم کم نصیب عبارت فارسی نہیں سمجھتے اور رونے کے ثواب سے بے نصیب رہتے۔ ایسا کوئی صاحب شعور ہوئے کہ کسی طرح من و عن ہمیں سمجھا دے اور ہم سے بے سمجھوں کو سمجھا کر رلا دے۔ مجھ احقر کی خاطر میں گزرا کہ اگر ترجمہ اس کتاب کا

برنگینی عبارت و حسن استعارات ہندی فریب الفہم عامہ مومنین و مومنات کیجیے۔“ (۱)

اب نمونہ نثر ملاحظہ ہو :

”اے فرزند جب ، مدینہ میں پہونچے ، سلام میرا دوستوں کو پہونجا ۔ کہو کہ میرے باپ نے یوں فرمایا ہے کہ جب دوکھ میں مبتلا ہو اور مصیبت میں پڑو ، اوس وقت دکھ اور غریبی مبری یاد کیجیو اور جس کا گلا کٹا دیکھو ، میرے حلوں ناحق کٹنے کو یاد کرو اور جب پانی پیو ، آہ یاس میری اور میرے بچوں کی نہ بھولیو“ (۲) ۔

اسی نفسانی پہلو کو مگر نظر رکھکر ضمیر اور خلیق نے مرثیہ میں وہ عناصر داخل کیے جن پر آگے چل کر مرزا دبیر (پ - ۱۸۰۱ء) اور میر انیس (پ - ۱۸۰۳ء) نے اردو مرثیہ کو معراج تک پہنچایا ۔ میر انیس اپنے مرثیوں میں اکثر جگہ نہ صرف عورتوں کی زبان لکھتے ہیں ، بلکہ عورتوں کی سمجھ اور عورتوں پر واقعات کے مائر کو نرہانے کے لیے سرفائے لکھنؤ کا تہذیبی شعار ، اسکے رسم و رواج ، بلکہ کرداروں کے عادات و اطوار اور ان کا روز مرہ بھی عرب کے ماحول میں منتقل کر دیے ہیں ۔ اغلباً اس سے مراد یہ بھی کہ سننے والوں پر واقعت کا اثر زیادہ ہو جائے ۔ یہ مثالیں ہم ’موازنہ انیس و دبیر‘ از مولانا شبلی سے لے رہے ہیں ۔ جب حضرت صغریٰ کو بیماری کی وجہ سے مکہ معظمہ میں چھوڑا گیا تو انہوں نے انی بھوبھی حضرت زینب سے کس طرح فریاد کی :

صغریٰ نے کہا آپ کی بابوں کے میں قربان

تم جان بحالو کہ میں لونڈی ہوں بھوبھی جان

بیٹی ہو علی کی ، مری مشکل کرو آسان

جیتی رہی صغریٰ تو نہ بھولے گی یہ احسان

کچھ باب بجز گریہ و زاری نہیں کرنیں

اماں تو سفارش بھی ہماری نہیں کرنیں

جب حضرت عباس علمدار بانی لینے دریائے فرات پر جاتے ہیں تو حضرت سکینہ انہیں ان الفاظ سے پکارتی ہیں ۔

(۱) فضل علی ، کربل کتھا ، ترتیب مالک رام و مختار الدین احمد - ص ۱۴ ، ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ

(۲) فضل علی فضلی ، کربل کتھا ، ترتیب مالک رام و مختار الدین احمد - ص ۲۰۲ ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ

خیمے میں ہوا غل کہ چلے حضرت عباس  
 سب بولے کہ لو اور بھی سرور ہوئے بے آس  
 گھبرا کے سکینہ نے کہا نب یہ بصد یاس  
 کیا کہے ہو تم ، مجھ کو نو جانے دو چچا پاس  
 منہ شہ سے وہ موڑیں گے نہ مانوں گی کبھی میں  
 عمو مجھے چھوڑیں گے نہ مانوں گی کبھی میں  
 جب یزید کی بیوی قید خانے میں اہل بیت کو دیکھنے چلی نو ایک لونڈی  
 نے قید خانے کے دروازے پر پہنچ کر یہ کہا :

بڑھ کر کسی کنیز نے نب بہ کیا ہاں  
 بی بی ! کوئی اسروں میں زندہ نہیں ہے یاں  
 چلیے محل میں آپ بھلا جائیں گی کہاں  
 فابل نہیں حضور کے جانے کے نہ مکاں  
 گر غش ہوئی نو آپ میں آیا نہ جانے گا  
 ہم سے تو اس خرابے میں جایا نہ جانے گا  
 انہی مثالوں سے ثابت ہوگا ہوگا کہ یہاں شاعر نے دانستہ طور پر عورتوں کا محاورہ  
 استعمال کیا ہے ۔ ظاہر ہے عورتوں کے لیے یہ اشعار بہت ہی مؤثر تھے ۔

### مدارس کا نصابِ تعلیم

عورتوں کے پڑھنے کے لیے جو مواد اس دور میں موجود تھا ، اس سے بحث اسی  
 وقت مکمل ہو سکتی ہے ، جب ہم اس نصاب کا جائزہ لیں جو ان دنوں مکتبوں اور  
 مدارس میں جاری تھا ۔ اس لیے کہ استانیات بھی گھروں میں کم و بیش وہی کتابیں  
 پڑھانے کی کوشش کرتی تھیں جو ان کے مرد یا لڑکے بالے باہر مکاتب و مدارس میں پڑھتے  
 تھے ، اگرچہ شاید انہیں پورے نصاب پر عبور نہیں ہونا تھا ۔ یہ نصاب پچھلے درسِ نظامی  
 کی بگڑی ہوئی صورت تھی اور وہی آج تک اسلامی تعلیم گاہوں میں مروج ہے ۔

ہر ملک اور ہر صوبہ کے نصابِ درس میں ہمیشہ تغیرات ہوتے رہے ۔ تا ہم عربی  
 و فارسی کی چند ایک کتابیں ان تغیرات سے محفوظ رہیں اور وہ اب تک نصاب میں داخل  
 ہیں ۔ مثلاً ابتدا میں 'کریما' ، 'ہند نامہ' فرید الدین عطار ، 'محمود نامہ' اور پھر 'گستان' ،  
 'بوستان' ، 'کشاف' وغیرہ ، مگر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ لڑکیاں یا عورتیں فارسی کی  
 تعلیم اس یا قاعدہ طریقہ پر حاصل کرتی تھیں یا نہیں ۔

پاک و ہند میں گو علوم و فنون کا رواج چھ سو برس سے ہے ، لیکن زیادہ تر منقولات یعنی مذہبی مضامین اور موضوعات بڑھانے کا رواج تھا ۔ عبداللہ دلبی (المتوفی ۱۵۱۶ء) نے سکندر لودھی کے عہد میں ، پہلی دفعہ معقولات کو نصاب میں باقاعدہ طور پر شامل کیا ۔ یہی وجہ ہے کہ صوبہ اودھ اور الہ آباد میں منطق و فلسفہ کو زیادہ فروغ حاصل ہوا ۔ اس بارے میں بھی ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ عورتوں کے لیے کیا منقولات اور کیا معقولات سب ہی اگر لے کر بات نہیں سمجھی جاتی تھی تو یہ ضرور تسلیم کر لیا جانا تھا کہ یہ ناسی ان کے فہم سے نالا بر ہیں ۔ اور خانہ داری کے لیے ان بابوں کا جاننا یا ان کتابوں کا بڑھنا اگر ضرور ہو تو ضروری بھی نہیں ۔ رہا کسی درسگاہ سے فائدہ اٹھانا تو یہ ناممکن تھا ، کیونکہ لڑکوں کا گھر سے باہر نکلنا تو ظاہر ہے کہ بالکل نند تھا ، پھر بھی جہاں ان کتابوں کا ذکر خارج از بحث نہیں جو اتفاقیات زمانہ سے بڑے صغر کے اردو جاننے والوں کے لیے بالواسطہ مہیا ہو گئیں ۔ ہاری مراد ان آساں کتابوں سے ہے جو فورٹ ولیم کالج سے نکلیں ۔

### فورٹ ولیم کالج کی مطبوعات کا نسائی پہلو

انسویں صدی کے نصف اول میں فورٹ ولیم کالج کے تمام کے بعد نووارد انگریزوں کی تعلیم کے لیے بہت سی کتابیں لکھوائی گئیں ، اور ترجمہ ہوئیں ۔ یہ کتابیں ہرانی طرز سے ہٹ کر لکھی گئی تھیں ۔ ان میں ایسی کتابیں بھی ہیں جنہیں محکمہ تعلیم نے بطور نصاب استعمال کیا ۔ اگرچہ ان کتابوں کا مقصد تعلیم نالغاب تھا ، اور عمر زبان جاننے والوں کو ہندوستانی مہذب و تمدن سے آگاہ کرنا تھا ، مگر ان میں کچھ ایسی کتابیں اور رسالے بھی تھے جن میں اردو کے ذریعے مختلف علوم و فنون اور مضامین کی تعلیم دی گئی ہے ۔ البتہ کچھ محض تفریح طبع کے لیے لکھی گئیں ۔ مؤخرالذکر کتابوں میں کہانیاں اور داستانیں ہیں ، اور ان سب کتابوں میں نا بالغوں کی تعلیم و تربیت کا پہلو نمایاں نہیں تو غائب بھی نہیں ، جن کی وجہ سے ہمیں یقین ہے کہ انہیں بچوں کی تفریح اور ندرس کے لیے ضرور استعمال کیا گیا ہوگا ۔ گمان غالب ہے کہ گلکرسٹ کے رسالے جو زبان کے قواعد اور صرف و نحو پر لکھے گئے ، ابتدائی تعلیم کی حیثیت سے بچوں کے نصاب میں شامل کر لیے جاتے ہونگے ۔ اور اگر لڑکے یہ کتابیں بڑھنے تھے تو کوئی عجب نہیں کہ ان کی بہنوں نے بھی ان کتابوں سے استفادہ کیا ہو ۔

یہ کتابیں روزمرہ کی زبان میں ہیں اور ان کا بنیادی عنصر زندگی کا مفہوم سمجھانا ، ہدایت اور عبرت دلانا ہے ۔ ان میں سے اکثر اخلاقی اور سبق آموز حکایتوں اور قصوں پر مشتمل ہیں اور ان میں نسائی کرداروں کو کافی اہمیت حاصل ہے ۔ اور پھر یہ سب



ایسی آسان زبان میں لکھی گئی ہیں کہ انہیں پڑھنے کے لیے کسی اساد کی ضرورت نہ تھی ۔ فورٹ ولیم کالج کے ادسوں ے سادہ نثر نگاری کا جو طریقہ اخبار کیا ، اس سے مالک کی ادبی فضا کافی حد تک متاثر ہوئی ۔ کسایں کثرت سے جھسے لگے ، اور آسان زبان کے سبب وہ ہر شخص کی دلچسپی اور بوجہ کا باعث بنے ۔ لیکن قدیم طرز کی مرصع و رنگین نثر کی کتابیں بھی موجود ہیں ۔ اور اس نثر میں لکھی ہوئی داستانیں مثلاً 'فسانہ' عجائب' وغیرہ بھی فارئین کے لیے باعث دلچسپی ہوتی تھیں ، بلکہ بعض فارئین کو رنگین اسلوب پسند بھی تھا ۔ عورنوں کے لیے یہ کتاب اس لیے دلچسپ بھی کہ داستان کی روح رواں سیکہ مہر نگار ہے اور اس کی چنچل مصاحبتیں ۔ داستان کا زیادہ عمل نسائی کرداروں پر ہی مشتمل ہے ۔ البتہ نو آموزان سے ٹھیک طرح مسفند نہ ہو سکے ہونگے اور اگر سادہ اور صریح اسلوب بیان بہت جلد مالک میں رائج نہ ہو سکا اور اس انداز میں لے سہار کسایں نہ لکھی گئیں تو اسکی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے ، کہ فورٹ ولیم کالج کی مطبوعات چونکہ در اصل نووارد انگریزوں کے لیے لکھوائی گئی تھیں ، اس لیے پہلے پہل ان کے خلاف کچھ تعصب بھی تھا اور پھر کلکتہ کا بعد مکانی بھی اسی عبرت کا سبب ہو سکا ہے ۔ پھر بھی چونکہ عام لکھنے والے دہلی اور بواج کے بھی اس لیے ان کا طرز تحریر پہلے ہی ان وسطی اضلاع میں موجود تھا اور کچھ دیر بعد موصول بھی ہو گا ۔

مناسب ہے کہ نہایت مختصر طور پر ان کتابوں میں سے حد تک کا ذکر ہاں کر دیا جائے کہونکہ یہ عورنوں کی دلچسپی کا باعث بھی ہو سکتی ہیں ۔ ماس کہتا ہے کہ یہ کتابیں پر اس گھر میں موجود ہوتی تھیں جس میں ایک دو عورتیں زیرِ تعلیم ہوں ۔ پھر دو کتابیں گھر میں بہ آسانی مل جائیں ، ان کا مطالعہ گھر کی خوانین بھی کرتی ہونگی ۔ مثال کے طور پر دو حار کتابوں کا ذکر کیا جانا ہے ، تاکہ یہ بات اجاگر ہو سکے کہ نہ قصے ، کہانیاں دفع الوقتی اور تفریح کے لیے ہر خواندہ ماحول میں موجود ہونگی ۔

## باغ و بہار

(قصہ جہار دروس) از میر امن دہلوی (۱۸۰۳ء) گلکرسٹ نے اس قصہ کے بارے میں یہ ہدایت کی تھی کہ اس قصے کو ٹھٹھ ہندوستانی گفتگو میں جو اردو کے لوگ ، ہندو مسلم ، عورت مرد ، لڑکے بالے خاص و عام آس میں بولے چالنے ہیں ترجمہ کیا جائے<sup>(۱)</sup> ۔ ظاہر ہے کہ یہ داستان بے حد مقبول ہوئی اور ہر جگہ پڑھی جانے لگی ۔ ایسے

(۱) محمد عتیق صدیقی ، گلکرسٹ اور اس کا عہد - ص ۲۰۲ گلکرسٹ ایجن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سن اشاعت ۱۹۶۰ء ۔

ہی ان کی کتاب 'گنجِ خوبی' ہے۔ جس میں چالیس اصلاحی موضوعات سے نہایت سلیس زبان میں بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب بھی عورتوں کو ضرور مرغوب ہوگی۔ 'باغ و بہار' کی تقریباً ہر کہانی میں ابو کردار فعال ہے، ما جو کردار عمل کا صحیح محرک ہونا ہے، وہ کوئی سہزادی یا ملکہ ہی ہے۔ پہلے دروس میں سلطانِ دمشق کی بیٹی فعال ہے۔ ایک جگہ اسکی گفتگو سنئے :

”چہ خوش آپ ہارے عاسی ہیں؟ مہنڈی کو بھی زکام ہوا! اے ہمووف، اپنے حوصلے سے زندہ باہیں بنائیں خیالِ خام ہے۔ جھوٹا مہ نڑی نا، بس چپ رہ، یہ نکتمی نات چٹ مہ کر۔ اگر کسی اور نے یہ حرکت لے معنی کی ہوتی۔ ہرور دگار کی سوں، اسکی بوٹاں کٹوا چیلوں کو بانٹتی، ہر کما کروں، سری خدمت یاد آئی ہے، اب اسی میں بھلائی ہے کہ انی راہ لے۔ میری مسم کا دانا پانی ہاری سرکار میں بہیں نلک نہا۔“

دوسرے دروس کی کہانی میں جو کردار سب سے زیادہ کار فرما ہے وہ بادشاہ کی سب سے چھوٹی بیٹی ہے، جو سچ بات کرنے پر جنگل میں چھوڑ دی جاتی ہے اور وہاں اس کی قسم ایسے ایک دفنہ کا سراغ ملتی ہے اور یہ سہزادی پھر داسان کا مرکزی کردار بن کر داستان کو آگے بڑھاتی ہے۔ کہانی کے ایک واقعہ کا حال سنئے :

”اس طور سے بھوڑے روز گدرے۔ ایک دن ملکہ نے نمل سر میں ڈالے اور کنگھی چوٹی کرنے کا قصد کیا۔ جوہی مہاف کھولا، حٹلے میں سے ایک موی کا دانہ گول آب دار نکل پڑا۔ ملکہ نے اس درویش کو دنا اور کہا۔ 'سہر میں سے اسکو بیچ لاؤ'۔ وہ فقر اس گوبر کو سنج کر اسکی مسم پادشاہ زادی کے پاس لے آنا۔ دب ملکہ نے حکم دنا کہ 'انک مکان موافق گذران کے اس جگہ نواؤ'۔ فقیر نے کہا 'اے بیٹی! نیو دیوار کی کھود کر نہوڑی سی متی جمع کرو۔ انک دن میں پانی لا کر گاڑا (گارا) کر کر گھر کی بنیاد درست کر دونگا' :

ان دونوں مثالوں میں زبان عورتوں ہی کی ہے۔ اور ماحول بھی نسائی ہے۔ اسی لیے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ کہانیاں زنانہ ماحول میں بہت مرغوب ہوں گی۔

### اخلاقِ ہندی

از بہادر علی حسینی (۱۸۰۲ء)۔ اس کتاب کو 'نصیحتِ مفید' بھی کہتے ہیں۔ اسے سلیس رواجی ریختے میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ عورتیں نو عورتیں، بچے بھی اسقدر آسان اردو زبان کو بہ آسانی پڑھ سکتے ہیں۔ 'اخلاقِ ہندی' سنسکرت الاصل مختصر اخلاقی حکایات

کا مجموعہ ہے ’کلبہ و دمنہ‘ کے بین مستند ترجمے اردو میں ہائے جانے ہیں ’خرد افروز‘ ’بستانِ حکمت‘، اور ’اخلاقِ ہندی‘<sup>(۱)</sup>۔ اس کی آسان اور سلس زبان کو واضح کرنے کے لئے ایک اقتباس دس کیا جانا ہے :

”ہد ہد نے بھر کٹوے سے کہا کہ بولے فاز سے وہ حرکتِ بد کی کہ کسی نے کسو کے ساتھ ایسی کم کی ہوگی۔ کوا بولا ’اے بادشاہ! عمل مند انہی مطلب کے لئے دمنہ کو وقت بر ملا لیے ہیں۔ حب غرض انہی حاصل ہو چکتی ہے۔ تو اس کو ٹھکانے لگا دیے ہیں‘۔ مگر آپ نے قصہ، منڈک اور ساس کا نہیں سنا۔ ہد ہد نے بوجھا وہ کس طرح ہے۔ کٹوے نے کہا“<sup>(۲)</sup>۔۔۔۔۔ اس کے بعد دوسری کہانی شروع ہو جاتی ہے۔ ملاحظہ ہو کس خوس اسلوبی سے ایک قصہ کو تمام کر کے دوسرے کو شروع کیا جاتا ہے۔

عرض یہ کہ اس کتاب کے قصے ایسے ہیں جن سے بھلی بری بات سب کی نظر میں آ جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کتاب بھی حواندگی اور اسدائی تعلیم کے لئے کار آمد ہے اور اس سے بچے، بڑے، سب ہی مستفید ہو سکتے ہیں۔ حواحدہ فاس کہا ہے کہ یہ کتاب بھی بیشتر گھروں میں موجود ہوگی۔

### تونا کہانی

از سید جہدر بخش حندری (۱۸۰۱ ع)، مجد فادری کے ’طوطی نامے‘، ’تو جس کا مآخذ ’طوطی نامہ‘ از ضیا الدین محسی ہے ”جہدر بخش حندری نے زبانِ ہندی (اردو) محاورہ اردوئے معلیٰ کی نثر میں سلس و خوبصورت الفاظ میں ترجمہ کیا اور اس کا نام ’تونا کہانی‘ رکھا۔“۔ مگر اس کتاب میں چھوٹے چھوٹے قصوں کے درجہ اعلیٰ اخلاقی سبق دیے گئے ہیں۔ اس لئے ہم اسے بھی اس ادب میں شامل کر دیں گے جو عوریں تعلیم و تفریح کے لئے استعمال کر سکتی ہیں، اور ضرور ترقی ہوں گی۔ زبان کا نمونہ ملاحظہ ہو :

”جب آسماں چھپا اور ماہتاب نکلا، سب خجسہ لے ایک جوڑا دھانی گلے میں ڈالا اور ہو ایک حواہر سے اپنے نئیں ستوارا اور مستی کی دھڑی، یانوں کا لکھونا پونٹوں پر جا، نالوں میں ببل ڈال، کسکھی کر، آسین چڑھا، لے اختیار ایک بانک بن سے اٹھی اور بولے کے پاس رخصت لئے گئی اور کہنے لگی کہ اے نوتے! تو مجھے ہر ایک وقت باتوں میں لگا لیتا ہے اور یوں ہی جھوٹے موٹے، بھلا دیتا ہے

(۱) گیان چند، اردو کی نثری داستانیں - ص ۳۸

(۲) میر بہادر علی حسینی، اخلاقِ ہندی - ص ۱۵۴، مرتبہ مجلس ترقی ادب لاہور دسمبر ۱۹۶۳ء

مجھے کچھ مبری خبر نہیں ہے کہ میں دردِ عشق سے مرق ہوں<sup>(۱)</sup>۔  
اس چھوٹے سے اقتباس سے ہی ظاہر ہو گا ہو گا کہ اس قسم کی بیانیہ نثر عورتوں  
و بہت مرغوب ہو گی۔

### نال پھنسی

از مظہر علی خان ولا (۱۸۰۳)۔ اس کتاب میں بیس کہانیاں ہیں، جن کا شجرہ  
سکرت کی قدیم کلاسیکی کتابوں ’کھا سرت ساگر‘ اور ’بوٹ کتھا منجری‘ سے ملتا ہے۔  
سب کہانیوں کو سامان کرنے والا ایک ہی کردار یعنی بتال (ایک بھوت) ہے۔  
کہانیاں ہندی تہذیب و معاشرہ کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اس کا طرزِ بیان نہایت سادہ  
روزہ مرہ سے بہت فریب ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے، اس سے اندازہ ہو  
سکا کہ اس قسم کی کہانیاں عورتوں کو بہت پسند ہوں گی۔  
”نہ ناب دل میں تھان محل میں جا، رانی سے پوچھا کہ تو نے وہ بھل کیا کیا؟  
ان نے کہا میں اسے کھا گئی۔ نب نوراجا نے وہ بھل رانی کو دکھایا۔ وہ دیکھتے  
ہی بھونچکاسی رہ گئی اور کچھ حواب نہ بن آیا۔ بھر راجا نے باہر اس بھل کو  
دھلوا کر کھایا، اور راج ناٹ چھوڑ دوگی بن، اکبلا بن کہے سے بن کو سدھارا،  
بکرم کا راج خالی رہا۔“

اختصار سے کام لے لیں۔ ان کتابوں کے صرف نام درج کیے جاتے ہیں جو کہ  
ریوں کے زیرِ مطالعہ رہ سکتی ہیں اور اغلباً رینی ہونگی<sup>(۱)</sup>۔ ’ہند نامہ‘ (نظم اردو) از  
مہر علی خان ولا<sup>(۲)</sup>، ’قصہ فرورساہ‘ (اردو) از محمد بخش<sup>(۳)</sup>، ’گل بکاؤلی‘ (اردو) از نہال چند  
وری (۱۸۰۴ء)<sup>(۴)</sup>، ’احلاف الہی‘ از غلام اسرف<sup>(۵)</sup>، ’ہند نامہ فریدالدین‘ (نثر) از  
بن الدین<sup>(۶)</sup>، ’داسانِ امیر حمزہ‘ از خلیل اللہ خان اشک (۱۸۰۱ء) وغیرہ وغیرہ۔

اب ہم ان کتابوں کا ذکر کریں گے جو خالصتاً عورتوں کے لیے لکھی گئیں۔ ظاہر رہے  
، ان میں بیسوں ایسی ہوں گی جو مفود ہو چکی ہیں اور کئی ایسی ہیں جو ۱۸۵۷ء  
بعد بھی طبع ہوتی رہیں۔ مگر اب، یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ وہ پہلی بار کب چھپیں۔

### ان الوان

سد حمید الدین بہاری نے ۱۸۰۴ء میں ’خوان الوان‘ کے نام سے ہندوستانی کہانوں  
کتاب نالیف کی جس میں مروجہ کہانوں اور مٹھائیوں کے اجزا اور نکلنے کے طریقوں  
مفصل ذکر کیا گیا ہے۔

(۱) حیدر بخش حیدری، نونا کہانی - ص ۲۶ - مرتبہ مجلس ترقی ادب لاہور ۲۷ طبع ۱۹۶۳ء

## سراج الہدایت

محمد وزیر علی خان نے لکھی اور مطبع سلطانی لاہور سے ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی ۔ یہ کتاب چھوٹے بچے اور بچیوں کے لیے لکھی گئی ہے ۔ افعالِ نیک و بد میں تمیز کرنی سکھانے کے علاوہ عقل و علم و دیگر امورِ حکمت ، قصص ، نواریخ ، اخلاقیات ، ادب اور دلائلِ تعلیم نسوان بھی پس کیے گئے ہیں اور جہالتِ نسوان کے نقصانات سے بھی بچنے کی ہے ۔ مصنف کا خود کا کہنا ہے کہ ” کتاب اس نے بہن دن میں فلم برداشتہ لکھی تھی ۔ اس کتاب میں عورتوں کی نمائندہ عقل النساء خواندہ بیگم ہے ۔ اور مردوں کی طرف سے مردانِ ہند ان کا وکیل بنتا ہے اور ایک مہتممہ منصف خان صاحب بہادر جج عدالتِ انسانی میں پس ہونا ہے ۔ جس میں عمل النساء وکیلِ نسوان عورتوں کی تعلیم کی ضرورت کے لیے اپنے بانبات اور دلائل پس کرتی ہیں اس طرح انہی بچ کا آغاز حضرت آدم کے ساتھ امانِ حواء کی ضرورت سے لے کر سورۃ النساء کے ذریعہ عورتوں کے برابر کے حقوق ثابت کرنے ہوئے بالآخر وہ اس نسجے پر پہنچتی ہیں کہ عورت کے لیے تعلیم اسد ضروری ہے اور اپنے مقدمے میں انہی دلائل کے زور پر کامیاب ہوئی ہے ۔ عقل النساء کی گفتگو نا بچ سے ایک اقتباس بطور نمونہ سن کر جانا ہے :

”طلب العلم فرضتہ علی کل مسلم و مسلمہ فرمودہ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے ۔ بہلا صاحب خدا ناک کی رحم کو دیکھو کہ عمل دے کر یوں بھی ہدایت کر دی کہ علم کا حاصل کرنا فرض ہے ۔ فرض کے معنی تم خود ہی جاسے ہو حکم خدا کو جو مانتے ہو تو خدا سے ڈرو منصفی کرو کجھ میں نہیں کہی کہ تم عورتوں کو پڑھاؤ الا حکم خدا جو فرض ام اس نارے میں نازل ہے ، کتابوں میں دیکھ لے جو فاضل ہے“ (۱)

## قصہ سوداگر

اس داستان کے اصل مصنف کا نام تو معلوم نہیں ہو سکا ۔ البتہ اس قصہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس قصہ کی ترجمہ نہنوبی ہیں اور انہوں نے اس کو ۱۸۵۰ء (۱۲۶۷ھ) میں ترجمہ کیا ۔ اس داستان کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ یہ ایک خانوں کی پہلی ترجمہ شدہ داستان ہے ۔ یہ کتاب دکن میں مرتب ہوئی ۔ اگرچہ نہنوبی کے متعلق کوئی معلومات نہیں مل سکیں ، مگر یہ واضح ہونا ہے کہ ان کو

داستانوں کا سووی بھا اور اسی سووی کے متد نظر انہوں نے اس داستان کو فارسی سے ترجمہ کیا ہے۔ عارب کے نمونے سے اس دور کی عورنوں کی زبان کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے :

”روایہ کرتے ہیں اور لکھنے والے یوں لکھتے ہیں کہ ملک سرنسپ میں ایک سوداگر بھا اور مال و مساع اس کے پاس ایسا بھا کہ اوس زمانہ میں کوئی بیویاری یا مساجن اوس کے برابر نہیں بھا۔ اس بر حق معالی کی عنانت سے چار بیٹے بھے ، ہر ایک حسن و جمال میں بے مثال بھا۔ سب سے چھوٹا بھائی سولہ برس کی عمر میں علم دانائی و علم اوسنادی سے کسب ہوا اور فن سبہ گری میں طاق ہوا۔ اور ایک دم حق معالی کی ناد سے بغافل نہیں رہا بھا۔ اور خوراک سوائے درد کافی کے کچھ نہیں کھانا بھا اور ماں باپ اوس بر بہت جان نثار اور خویش سب چاہے بھے۔ عرص بنوں بھائی اپنے بیوقوفی سے اس کے دشمنی میں بھے اور قابو ڈھونڈے بھے کہ کوئی وقت ایسا ہمیں ملے کہ اس کو نسب و نابود کریں“ (۱)۔

### شاعری

اس دور کی عورنوں کے ادب میں نثر کے علاوہ شاعری کو جو کہ ادب کا ایک اہم جزو ہے شامل کیا جائے ہوئے جا نہ ہوگا۔ اس دور کی کئی ایک شاعرات کا کلام بدکروں میں ملتا ہے۔ اگرچہ اس زمانے میں شریف مستورات کی شاعری مسحسن نہ سمجھی جاتی تھی اور بشیر کلام اور نام ان شاعرات کے ملتے ہیں جو طوائف کے حلقے سے وابستہ تھیں ، لیکن چند ایک خوابیں ایسی بھی ہیں جو اعلیٰ طبقوں اور شریف گھرانوں کی بہو سٹاں تھیں۔ ان شاعرات کے کلام میں مندرجہ ذیل خوبیاں نظر آتی ہیں :

(۱) زبان صاف ، سسنہ اور باعلاوہ ہے (۲) جذبات درد و اثر سے لبریز ہیں (۳) زبان ضلع جگ ، شہبہات و استعارات سے پاک ہے۔ خوانین در اصل شعر مشغلہ کے طور پر کہتا کرتی تھیں۔ اسعار کے ذریعہ وہ اپنی ذہانت اور اپنے علم کا مظاہرہ کر لینی نہیں مثلاً :

بی بی حلیمہ زوجہ ذکی الدین محمد جان (المتوفی ۱۸۲۳ء) کا ایک شعر ملاحظہ ہو (۲) :

بجنا ہوں دل اگر اے ماہ کنتال چاہیے  
چپکے کیوں بیٹھے ہو کہدو ، کیوں نہیں ہاں چاہیے

(۱) وحیدہ نسیم ، اردو زبان اور عورت - ص ۲۰  
(۲) محمد جمیل احمد ، تذکرہ شاعرات اردو - ص ۵۷ ، ناشر قومی کتب خانہ بریلی

ایک اور شاعرہ کا نام سیدۃ النساء اور تخلص حرماں تھا - یہ مولانا فضل حق خیر آبادی م دہلوی کی دختر تھیں - دینی علوم کے علاوہ منطق بھی پڑھا - ایک شعر یادگار ہے (۱) :

دردِ دل ، دردِ جگر ، کاوسِ دل ، کاہنِ جان  
انے آزار ہیں ، اور ایک کلبجہ میرا

نسری ساعرہ جس کا ہم ذکر کرتے ہیں ، کا نام حندری خانم اور تخلص حیدری تھا - یہ بشارت اللہ خان دہلوی مصاحب خاص بادشاہ دہلی کی اہلیہ تھیں - ان کا اسہال ستر برس کی عمر میں ۱۸۵۷ء میں ہوا - ایک شعر بطور نمونہ درج ہے (۲) :

حیدری نام ہے میرا کما خوب  
جو کہ تجھ سے بھرا وہ حندر ہے

### بہارستانِ ناز

یہ تذکرہ پہلی مرتبہ ۱۸۶۴ء میں چھپا اور اسکی دوسری اساعت ۱۸۶۹ء میں ہوئی - اس تذکرے کی دوسری اساعت نک اردو زبان میں ساعرات کا کوئی تذکرہ نائع نہیں ہوا تھا (۳) - اس میں ۱۷۴ ساعرات کا ذکر ہے اور یہ سب اسی دور (۱۸۵۷ - ۱۸۰۳ء) سے تعلق رکھتی ہیں -

ان ساعرات کا ذکر کرنے سے ہماری یہ مراد ہے کہ انک نو عورتوں کو بھی ادب اور شعر و ساعری سے دلچسپی تھی دوسرے ادب ہارے تخلیق کرنا یا پڑھنا ان کا مشغلہ تھا اور اسے ہم کوئی ساجی نقاضا نہیں کہہ سکتے -

(۱) محمد جمیل احمد ، تذکرہ شاعرات اردو - ص ۱۵۸ ناشر قومی کتب خانہ بریلی

(۲) محمد جمیل احمد ، تذکرہ شاعرات اردو - ص ۱۵۸ ناشر قومی کتب خانہ بریلی

(۳) حکیم فضیح الدین ریغ ، بہارستانِ ناز (تذکرہ شاعرات) مرتبہ خلیل الرحمن داؤدی - ص ۴۸

### (ج) سوانح نگاری

سوانح نگاری اور تاریخ میں کچھ مماثلت ہے۔ اس لیے کہ کارلائل جسے مصنفین اس نظریہ کے فائل ہیں کہ اقوام کی تاریخ ان کے عطاء کی تاریخ ہوتی ہے، مگر سوانح نگاری میں نوجہ کا مرکز فرد ہونا ہے۔ کوسس کی جلی ہے کہ بڑے حسن و خوبی کے ساتھ فرد کے اعمال و افعال کو بیان کر کے اس کی شخصیت کو اجاگر کیا جائے۔ اس کوشش میں معاصرہ کی تصویر، ممدوح کا اسی پس منظر، اس کے کردار کے محرکات سب سامنے آ جاتے ہیں۔ تاریخ نویسی میں یہ بات نہیں ہوتی، وہاں ملال و اقوام مرکز نوجہ ہوتی ہیں۔ افسانوی ادب بھی اس سے مختلف ہوتا ہے۔ وہاں افراد فصہ فرضی ہوتے ہیں لیکن سوانح نگاری صرف ان افراد کو زیرِ بحث لاتی ہے جنہوں نے فی الواقعہ دنیا کے اب و کل میں انامِ حیات سر کیے۔ البتہ تاریخ نویسی کی طرح یہاں حق و صداقت کو ضرور ملحوظ رکھا جانا ہے مگر افسانوی ادب کی طرح سوانح نگاری میں اسلوب کی خوبی کو بنیادی حنیب حاصل ہوتی ہے نا کہ مطالعہ کرتے ہوئے دلچسپی قائم رہے۔ اس طرح سوانح نگاری محض حقائق کا مجموعہ بن کر نہیں رہ جاتی، بلکہ ایک اسی داستان ہوتی ہے جس میں زندگی اور توانائی نائی جاتی ہے اور جس کی تاریکی ہمیشہ کے لیے برقرار رہتی ہے۔

زمانہ گزرنے کے ساتھ سوانح نگاری کے متعلق انسان کے تصور میں تبدیلی پیدا ہوتی رہی ہے۔ ادب اور تاریخ کے متعلق ہر زمانے کے بصورات نے اس فن کے ارتقاء میں بڑا کردار انجام دیا ہے۔ پہلے سوانح نگاری بادشاہوں کے کارناموں پر منسلک ہوتی تھی چونکہ مقصود مدح اور تکبیر ہوتا تھا اس لیے صحت و افعال کو نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ پھر صداقت اور افسانہ کی آمیزش سے مالی کردار بس کرنا سوانح نگاری کا مقصود بنا۔ اخلاقی اقدار کی برفع بھی سوانح نگاری کا منہا رہا ہے۔ اولاء اور سہداء کی سیرت اس طرح بیان کی جاتی تھی جس سے خاص قسم کی اخلاقی اور دینی اقدار کی مسئلہ حیثیت نگاہوں کے سامنے آ جاتی تھی۔ بتدریج انسان کی شخصیت کو قابلِ نوجہ تسلیم کیا گیا اور آہستہ آہستہ نفسیات انسانی کا مطالعہ کر کے محرکات کا بلاس کرنا ضروری متصور ہونے لگا۔ اس اندازِ فکر کا انجام کار یہ نتیجہ نکلا کہ اس صنفِ تحریر میں تقدیس اور تحریم کے پردے چاک ہو گئے اور اندر سے وہ انسان نمودار ہوا جو اپنے تمام اچھے برے اوصاف کے ساتھ بیک وقت ہمارے سامنے موجود ہوتا ہے۔ سوانح نگاری کے ان مراحل کے علاوہ اس کی صورتیں بھی مختلف رہی ہیں۔ خود نوشت سوانح عمری، مکالمات، اعترافات، خطوط اور مکاتیب، یادداشتیں، روزنامے، شخصی مرتعے، تذکرے، اجتماعی سوانح نگاری وغیرہ، تمام اس کی مختلف اقسام ہیں۔ ایک کاسباب سوانح نگار کن



صفات کا مالک ہو سکتا ہے ، اس موضوع پر بھی بہت کچھ کہا گیا ہے مگر ہم اپنے مختصر مقالے کو طول نہیں دینا چاہتے ۔

اس فن کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو اول اول بلوٹارک یونانی سوانح نگار (ز۔ ۱۱۹ء) نگاہوں کے سامنے آتا ہے ۔ اس نے بچاس اکابر کے سوانح فلمبند کیے ہیں ۔ جھیالیس کے سلسلہ میں اس نے یہ الزام کیا ہے کہ ایک یونانی کے مقابلے میں ایک رومن کو لے لیا ہے اور پھر ان کے مہتم بالسان کار نامے بیان کر کے سیرت نگاری کرنا ہے ۔ اس تقابلی بیان سے وہ یونان اور روما کے درمیان اتحاد اور موانست کے جذبات پیدا کرنا چاہتا تھا ۔ اس کی اور بھی تصنیفات ہیں لکن اس کی متوازی سیرت نگاری کے اس ساہکار کو بڑی سہر حاصل ہوئی ہے ۔ یورپ کے ادب پر اس کا بہت اثر ہوا ۔ بلوٹارک بڑی عمدگی سے کردار نگاری کرنا ہے اور اخلاقی نتائج اخذ کرنا ہے مگر وہ صحت واقعات کی طرف اتنا دھیان نہیں دیتا ۔ مغرب کا سوانحی ادب بہت ضخیم ہے مگر یہاں فقط ایک سوانح عمری کا ذکر کر دینا کافی ہوگا ۔ کیونکہ وہ اس فن میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے ۔ ۱۷۹۱ء میں جیمز بوسول نے جانسن کی حیات مصنف کی ۔ یہ ایک غر فانی سوانح عمری ہے ۔ سیموئل جانسن اس دور سے تعلق رکھتا ہے جسے ”دورِ عمل“ کہتے ہیں ۔ اس زمانہ میں انسان بر انسان کی حسرت سے بوجہ میں بہت اضافہ ہو چکا تھا ۔ بوسول بڑی ناریک بینی سے جانسن کی گفتگو اور اس کی عادات ، اس کے مصیبات اور اس کی آراء کو معرض تحریر میں لایا ۔ جانسن کے خطوط اور اس کے متعلق حکایات کو بھی استعمال کیا ۔ معمولی سے معمولی جزئیات کو بھی پوری پوری اہمیت دی ۔ عبوب اور فحاشیاں بیان کرنے سے بھی گریز نہیں کیا ، چنانچہ ایک جیتے جاگتے انسان کی تصویر کشی اور جزئیات نگاری اس انداز سے کی کہ پورے دور کی تصویر سامنے آگئی ۔

مشرق میں بھی سوانح نگاری کی تاریخ بڑی طویل اور معنی خیز ہے ۔ قبل از اسلام پہلوی ادب میں ’خدائی نامہ‘ ، ’کارنامک ارتخشتر‘ ، ’پاکان‘ اور ’یانتکار ز ریران‘ اسی قسم کی کتابیں ہیں ۔ یہی بعد میں ’شاهنامہ‘ فردوسی کے منابع بنیں ۔ ایسی کتابوں سے بادشاہوں کی عظمت کا سکہ دلوں پر ٹھکانا مقصود تھا ۔ عربی زبان میں اس نوعیت کی زمانہ قبل از اسلام سے متعلق تصنیف ’الاکلیل‘ ہے ۔ اس کے سوانحی موضوعات بھی بادشاہوں تک محدود ہیں ۔ علاوہ بریں سوانحی مواد مذہبی کتب میں شروع سے چلا آتا ہے ۔ انجیل میں اس کی کافی مقدار ہے اور ہر جگہ سوانح سے استخراج نتائج کا کام لیا گیا ہے ۔ قرآن مجید میں بھی یہی اسلوب کار فرما نظر آتا ہے ۔ البتہ تصاویر میں زیادہ زندگی نظر آتی ہے ۔ اس ضمن میں حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوانحی حالات

خاص خاص مطالب پیش کرنے کے لیے ، بلکہ علامت کے طور پر بھی استعمال کیے گئے ہیں ۔

اسلام کے بعد سوانحی نقطہ نگاہ سے سب سے بڑا کار نامہ ابن ہشام نے انجام دیا ۔ ان کا سال وفات ۸۲۸ء یا ۸۳۴ء بتانا جاتا ہے ۔ انہوں نے ابن اسحاق (وفات ۷۶۷ء یا ۷۷۰ء) کی 'سیرت النبی' صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ تنقیح کے ساتھ مرتب کیا ۔ ابن ہشام نے اپنے بشرو ابن اسحاق کی بعض روایات میں تفصیلات بڑھائیں ۔ نسب ناموں کی تصحیح کی ، اشعار میں اضافے کیے اور یہ بھی واضح کر دیا کہ کون سے سرکس روایت میں ملتے ہیں اور کس میں نہیں ملتے ۔ ابن ہشام نے جزئیات اس عمدگی سے ترتیب دی ہیں کہ رسول کریم (فداء اسی و ابی) کی سیرت آپسہ آپسہ انہی نوری تابناکی سے نگاہوں کے سامنے آ جاتی ہے ۔ عربی زبان میں سوانح کی ایک اور کتاب کو بھی شہرہ دوام حاصل ہے اور وہ ابن خلکان (و - ۱۲۸۲ء) کی وفات ہے اس میں الف ہائی ترتیب سے دنیائے اسلام کے ہر قسم کے ۸۶۵ مناز لوگوں کے سوانحی حالات درج کیے گئے ہیں ۔ ظاہر ہے یہ اجتماعی سوانح نگاری کی قسم ہے ۔ ابن خلکان کا الزام صحت اور احساس ذمہ داری قابلِ داد ہے ۔ اس کا انداز بیان سادہ اور بڑا مہذبانہ ہے ۔ متعدد دلچسپ حکایات نے جہاں ان سوانح عمروں کو حقیقی زندگی کے قریب لا کھڑا کیا ہے وہاں کتاب کو دلکشی کا سامان بھی عطا کیا ہے ۔

مسلمان ایران میں پہنچے تو فارسی ادب وجود میں آیا ۔ فارسی میں انہی سوانح لکھے گئے جن کا شمار آسان نہیں ۔ عربی سے تراجم ہوئے ۔ عربی کی طرح سیر رجال اور فقہی سوانح عمریاں بھی لکھی گئیں ۔ مخصوص انسانی طبقوں یا جماعتوں مثلاً وزراء ، اطباء ، شعراء ، اولیاء کے تذکرے بھی تحریر کیے گئے ۔ 'کشف المحجوب' کا موضوع اگرچہ تصوف ، ہے مگر اس میں بھی سوانحی حقائق و کوائف موجود ہیں ۔ حضرت فرید الدین عطار کا 'تذکرہ الاولیاء' خالصتاً سوانحی تصنیف ہے ۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اس میں اولیاء اللہ کے کشف و کرامات کا ذکر بھی ہے جو محض عقلی و مادی نظریات حیات سے مطابقت نہیں رکھتا ۔ مگر اس قسم کے سوانحی ادب کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے مادی نظریات بے حقیقت معلوم ہوتے ہیں ۔ بورس مغول کے نتیجہ کے طور پر بھی سوانح لکھے گئے ۔ 'جہاں کشائے جوبنی' اپنے ادبی اسلوب اور چنگیزخان کی مدح کے لحاظ سے نمایاں مقام رکھتی ہے ۔ محمد عوفی کے 'تذکرہ شعرائے لباب اللباب' اور دوسری تصنیف 'جوامع الحکایات' کا ذکر بھی بیجا نہیں ۔ سوانحی نقطہ نگاہ سے ان کی اہمیت مسلم ہے ۔ بالخصوص ثانی الذکر اپنے سادہ اسلوب اور راست انداز بیان کی وجہ سے ممتاز ہے ۔ ایران میں صفوی دور میں سوانحی ادب میں بڑا اضافہ ہوا ۔ بزر صغیر پاک و ہند میں بھی

فارسی زبان میں ہر قسم کی سوانحی تصنیفات کی کافی تعداد پیدا ہو گئی۔ خود نوشت سوانح عمریوں میں 'نوزک ناری' اور 'نورک جہانگیری' ہیں۔ ان کتابوں کے لکھنے والے اپنے غیر معمولی منصب کے باعث احساس سے بے نیاز تھے۔ اس لیے انہوں نے بڑی صاف گوئی اور فراخ دلی کا اظہار کیا ہے۔ لہذا دنیائے سوانح نگاری میں یہ کتابیں اپنی نظیر نہیں رکھتیں۔ اجماعی سوانح عمریوں میں 'مآثرِ رحمی'، 'مآثر الامراء' اور 'مآثر الکرام' ہیں۔ شخصِ واحد کے سوانح کے لحاظ سے 'ہاہوں نامہ'، 'اکبر نامہ'، 'مآثرِ عالمگیری' وغیرہ کو بطورِ سال پس کیا جا سکتا ہے۔ 'نوائد الفواد' گفتگو کے ذریعے سوانح کے اندراج کی بہترین مثال ہے، اگرچہ اس کا جذبہ مذہبی اور اخلاقی ہے۔ ملفوظات کے علاوہ اولیائے کرام کے مکتوبات بھی ملتے ہیں۔ اسی طرح شعراء کے تذکروں کی بھی بڑی تعداد ہے۔

اردو زبان کے سوانح نگاروں کے سامنے عربی اور فارسی کے وہ سارے نمونے موجود تھے، مگر معلوم ہوتا ہے، ان سے استفادہ زیادہ ہر نسلی نعمانی نے کیا ہے جہاں تک شعرائے اردو کے تذکروں کا تعلق ہے وہ فارسی کے تذکروں کے سامع میں لکھے گئے۔ اردو میں اس فن کا آغاز دکن سے ہوا ہے۔ جہاں سوانحی اور نیم سوانحی مثنویاں لکھی گئیں۔ ان کا موضوع مذہبی اور سیاسی تھا۔ فیروز دکنی (م - ۱۵۸۰ء) کے 'نوصف نامہ' کو اردو زبان کی سب سے قدیم سوانحِ عمری قرار دیا گیا ہے۔ یہ سیدنا عبدالعادر جبلائی کے منظوم حالات پر مشتمل ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

نو سلطان سلاطین رعیت محی      نو حاکم کہ جگ پر حکومت بھی  
ولی حاو کر ناؤ آب سر لے      دم راکھے مجھ کھاندا ولے

یہ تصانیف مذہب و اخلاق اور تاریخ و سیاس سے زیادہ متاثر ہیں۔ ۱۷۸۳ء میں میر تقی میر نے 'ذکرِ میر' کے نام سے اسے سوانحِ زندگی قلمبند کیے۔ اس کی زبان فارسی ہے، مگر اردو کے ایک عظیم شاعر کی آپ بیتی ہونے کی وجہ سے 'ذکرِ میر' کی اہمیت اردو زبان میں مستحکم ہے۔ میر کی شاعری داخلی تھی مگر ان کی آپ بیتی داخلی اور خارجی دونوں پہلو رکھتی ہے۔ اس کے مطالعہ سے انسان میر کی ذاتی بڑبڑ، بے چینی اور اضطراب سے دو چار ہوتا ہے جو ہمیشہ جوہرِ قابل کا وصف ہوتا ہے۔ ۱۸۰۰ء میں سعادت نار خاں رنگین نے 'مجالسِ رنگین' کو تصنیف کیا۔ اس کتاب کی جنیت ایک یاد داشت، تذکرے یا روز نامے کی سی ہے۔ چونکہ فنِ سوانح نگاری کے جدید رجحانات کے باعث ملاقاتوں اور گفتگوؤں کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے، اس لیے رنگین کی ان '۶۲' مجلسوں کا ذکر بھی ضروری ہے۔ ان میں بہت سے شعراء کے حالات موجود ہیں۔ رنگین نے اس عہد

کے مذاقِ سخن ، رسوم و رواج اور معاشرت وغیرہ پر بھی روشنی ڈالی ہے ۔ ان مجالس کا بہت بڑا وصف یہ ہے کہ مصنف نے سادگی ، صفائی ، بے ریائی اور بیباکی کے ساتھ اپنی حسنِ برستی ، عشقِ بازی اور دلِ بسگیوں کا ذکر کیا ہے اور اس طرح اس کی خوییاں اور خامیاں تمام نگاہوں کے سامنے آ جاتی ہیں ۔ رنگین کی طرف سے حزم و احتیاط ، کسرِ نفسی ، خوس اخلاقی ، ظاہر و باطن کی یکسانی ، دنیا داری کی صلاحیت اور عملی نقطہٴ نظر کا اظہار اسے جدید انسانوں کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے ۔ سعادت یار خاں رنگین کی 'اخبارِ رنگین' بھی غالباً اسی قسم کی چیز ہے ۔ رنگین کی ان تصنیفات کے جلد بعد اور بھی سوانحی کتب سامنے آتی ہیں ۔ جو زیادہ تر انیسویں صدی کے نصف اول میں لکھی گئیں ۔

۱۸۴۷ء میں سر سید احمد خاں نے 'آثار الصنادید' تصنیف کی جو اس دور کی سب سے زیادہ قابلِ قدر سوانحی تصنیف ہے ۔ مگر اس کا ذکر کرنے سے پہلے ہم 'حزنِ اختر' اور 'مذکرہ الکاملین' پر مختصر سا مضمون کر رہے ہیں ۔ یہ دونوں کتب بعد میں لکھی گئی ہیں مگر انہی زیادہ اہم نہیں ۔ اس لیے ان کی طرف سے خالی الذہن ہو جانا مفید رہے گا ۔ 'حزنِ اختر' منوی ہے ۔ یہ ۱۸۴۸ء میں واجد علی شاہ اختر نے تصنیف کی جب وہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں فیلڈ تھے ۔ اس میں انہوں نے اپنے حالات و مصائب بیان کئے ہیں ۔ مواسا عبدالحلیم سرر کے قول کے مطابق یہ منوی واجد علی شاہ کی خود نوشت سوانح عمری کا ایک درد ناک ٹکڑا ہے ۔ یہ نیم شخصی مرقع بادشاہ کی زندگی کے صرف ایک حصہ سے تعلق رکھتا ہے ۔ اس میں مد کے علاوہ رفقاءِ زنداں کا ذکر ہے ۔ مد میں بیگانہ اور منظورِ نظر عورتوں کو نادکشا ہے اور ان سے عجب و غریب فرمائشیں کی ہیں ۔ اس میں اپنے ملازموں کی تعداد اور سہزادوں اور سہزادیوں کی تفصیل دی ہے ۔ بعض خطوط کا مطالب بھی قلمبند کیا ہے ۔ کتاب سے بادشاہ کی شخصیت پر اچھی روشنی پڑتی ہے ، زبان معمولی ہے اور کلام سطحی ۔ البتہ کہیں کہیں درد ناک شعر فلم سے نکل گئے ہیں ۔

'مذکرہ الکاملین' ۱۸۴۹ء کی تصنیف ہے ۔ اس کے مؤلف ماسٹر رام چندر ہیں جو دلی کالج میں ریاضی کے مدرس تھے ۔ آزاد ، نذیر احمد اور ذکاء اللہ ان کے شاگردوں میں سے تھے ۔ انہوں نے ہندو مذہب ترک کر کے عیسائیت اختیار کر لی تھی ۔ بعد میں رفق کر کے وہ پروفیسر ہوئے اور پھر ڈائریکٹر سر رستہٴ تعلیم ہتالہ ہو گئے ۔ مؤلف نہ تو مسلمان تھے اور نہ ہی انہوں نے مشاہیرِ اسلام کے حالات قلمبند کئے ہیں ۔ اس لیے اس کتاب میں مسلمانانِ پاک و ہند کی تہذیب و معاشرت کی عکاسی نہیں ہوتی ۔ اور پھر

رام چندر مصنفین کی صف اول میں بھی شمار نہیں ہوتے۔ مگر چونکہ ان کی کتاب اردو میں ہے اور انہوں نے ’مذکرہ الکلمین‘ میں مشرق و مغرب کے مختلف مشاہیر کے سوانحی حالات درج کیے ہیں، اس لیے ہم اس کا یہاں مختصر سا تعارف کراتے ہیں۔ اس کتاب میں یونان، روما، فرنگستان اور مشرقی ممالک کے فاضلوں اور کاملوں کے حالات شامل کیے گئے ہیں، ترتیب میں تاریخی پہلو نظر انداز کیا گیا ہے۔ بادشاہ، سہ سالار، عالم، فلسفی، شاعر، مذہبی رہا سب طرح کے اکابر اس کتاب میں نظر آتے ہیں۔ مسلمانوں میں سے ابوعلی سنا، نظامی، سعدی، حافظ، عرفی، فردوسی، ابوالفضل، فیضی، خواجہ نظام الدین اولیاء اور امیر خسرو کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ ان ناہوں کی ترتیب وہی ہے جو ’مذکرہ الکلمین‘ میں موجود ہے۔ کسی سوانحی اصول کو مدنظر نہیں رکھا گیا۔ درایب یا روائت کی طرف اعتنا نہیں کی گئی۔ گرامر کی اغلاط بھی موجود ہیں۔ نام معرب کر لیے گئے ہیں، مثلاً ملتن کو ملطض لکھا ہے جو مغالطہ انگیز ہے۔ جملوں کی ساخت میں الجھاؤ ہے۔ ہم نمونہ کے لیے کتاب کے پہلے جملہ پر اکتفا کرتے ہیں :

”واضح ہو کہ ہم اول اس کتاب میں حالات سہنساہان یعنی فیصران رومۃ الکبریٰ کا جن کے حال سے سبب گزرنے زمانہ کے ہندوستانی بالکل ناواقف ہو گئے ہیں لکھتا ہوں کہ رومۃ کبریٰ ایک شہر ہے۔ ملک اطالہ میں اور یہ ملک حصہ فرنگستان کا ہے۔“

اسلام کی طرف اشارہ کرنے کے بعد اس بات کا احوال بھی ضروری ہے کہ رام چندر کے سامنے ایک نیک مقصد تھا۔ ابوعلی سینا کا ذکر کرتے ہوئے اس نے بتایا ہے کہ اکابر کی سوانح عربوں کا کیا فائدہ ہوا ہے، کہتا ہے :

”یہ بات سب عامل اور دانا خوب جانتے ہیں کہ واقف ہونے حالات حکماء اور فاضلوں کے سے آدمیوں کو تحریک واسطے حصول علم اور عمل کے ہوتی ہے۔ جب ہم کسی بڑے فاضل کی تعریف سنتے ہیں تو ہمارا بھی دل یہ چاہتا ہے کہ ہم بھی مانند اوس کے کسی طرح سے ہو جائیں اور اس بات میں حتی الامکان کوشش کرتے ہیں۔“

صاف ظاہر ہے مصنف سوانح نگاری کی افادیت کا فائل تھا اور اس بات کا معترف کہ عظیم انسانوں کی سوانح عربوں کا مطالعہ نہایت عمدہ اور مستحسن جذبات پیدا کرتا ہے۔ انسان کے دل میں خود اعمادی پیدا ہوتی ہے اور اسے اعلیٰ درجے کے مقاصد حاصل

سر سید احمد کی اولین سوانحی تصنیف 'سیرتِ فریدیہ' ہے جو ان کے نانا فرید الدین کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس میں کافی مفید سوانحی معلومات یکجا کی گئی ہیں۔ اس کے بعد ۱۸۴۷ء میں انہوں نے 'آثار الصنادید' لکھی۔ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ اس کے دس سال بعد ہوا جب مغلیہ تہذیب کا اقتدار ختم ہو گیا، مگر سر سید ایسے بالغ نظر انسان نے ۱۸۴۷ء میں ہی دیکھ لیا تھا کہ اب مسلمانوں کی تہذیب زوال پزیر ہے۔ سات سمندر پار سے آ کر ایک قوم بترِ صغیر برِ فاض ہو چکی ہے۔ زمانہ نئی کروٹ لے رہا ہے چنانچہ اگر اُسے ماضی کے آثار محفوظ کر لیے جائیں تو ان سے ایک صحت مند مستقبل کی تعمیر شروع ہو سکتی ہے۔ 'آثار الصنادید' کے بین السطور میں یہی جذبہ کار فرما نظر آتا ہے۔ اور کتاب کو دیکھ کر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سر سید نے ۱۸۵۷ء کے بعد جو کچھ کہا اس کا آغاز وہ ۱۸۴۷ء میں کر چکے تھے۔

مولانا الطاف حسن حالی 'جاوید نامہ' میں یہ لکھتے ہیں کہ :

(آثار الصنادید کے) "اول کے نین باب دیکھ کر سر زمینِ دہلی کی قدیم سان و شوکت اور عظمت کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔"

اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی اس بات کو اچھی طرح محسوس کرتے تھے کہ اس تصنیف میں سر سید نے دہلی کے سائدار ماضی کا نقشہ بدیہی طور پر بیان کر دیا ہے۔ بنا بریں اس کو سہرِ دہلی کی سوانحِ عمری کہنا بجا ہے۔ تمام عاروں اور کتبوں کو زیرِ نظر رکھا جائے اور جملہ مہارس کا مطالعہ کیا جائے تو دہلی کی پوری داستانِ حیات سامنے آ جاتی ہے۔ ہندوؤں کا طویل عہدِ امداد، مسلمانوں کی آمد کے بعد سلاطینِ دہلی اور مغل شہنشاہوں کی حکمرانی کے زمانے اور پھر انگریزوں کی نازہ نازہ آمد کے ایام سب ہی کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ مختلف زمانوں میں اہلِ دہلی جو زبانیں کم و بیش استعمال کرتے رہے ہیں ان کا اندازہ بھی ہونا ہے۔ مثلاً ہندوؤں کے عہود کی زبانیں، مسلمانوں کے زمانے میں عربی اور فارسی، پھر اردو اور بعد میں انگریزی زبانوں کے استعمال کا پتہ ان آثار کو دیکھنے سے بخوبی چلتا ہے۔ جہاں تک عاروں کا تعلق ہے ان میں ہم ہندوؤں کی عارات، ان کے منادر اور رصد خانے بھی دیکھتے ہیں ان میں مسلمانوں کے مدارس، معابر، محلات اور ان کی مساجد ہیں۔ انگریزوں کے ورود کے بعد گرجا گھر، کوٹھیاں اور بنگلے بھی نظر آئے لگتے ہیں۔ بھرقلے، باغات، انہار، حوض اور بازار بھی ہیں۔ یہ تمام ایک زندہ اور پائندہ شہر کی تصویر ہے۔ مسلمانوں کے مقبروں کا حال پڑھا جائے تو صرف یہی مقبرے مسلمانوں کی عظمت کا اعلان کرنے کے لیے کافی ہیں اور انہی سے پتہ چل جاتا ہے کہ مسلمانوں کی تہذیب کس معنویت کی حامل تھی۔ ان تمام کوائف کی بنا پر یہ کہنا درست ہے کہ 'آثار الصنادید' دہلی کی عظمت کا مرقع ہے۔

ان تین ابواب کے علاوہ اس تاریخی کتاب کا چوتھا باب بھی ہے جو اگرچہ دوسری اشاعت میں حذف کر دیا گیا تھا، مگر پہلی میں موجود تھا اور اب بھر کتاب کے جزو لاینفک کے طور پر نظر آتا ہے۔ اس باب میں سر سید احمد نے ان نزرگوں کا ذکر کیا ہے جو ان کے معاصر تھے۔ ان میں مشائخ، عالم، فہمہ، مجذوب، طبیب، فاری، شاعر، خوش نویس، معتمد اور موسیقی دان سب ہی شامل ہیں۔ اہل کمال کا تنوع بتاتا ہے کہ اگرچہ سیاسی لحاظ سے مسلمان کمزور ہو چکے تھے مگر تہذیب و ثقافت کے اعتبار سے مسلمانوں میں زندگی کے آثار اسی طرح موجود تھے۔ ان دنوں اس قدر اہل اللہ، اہل علم اور اہل ہنر کا ہیک وہ موجود ہونا اس حصف کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ زوال بذیر ہونے کے باوجود اسلامی معاشرہ اپنے اندر توانائی رکھتا ہے جسے کام میں لا کر ایک خوشگوار مستقبل کی تعمیر ہو سکتی ہے۔ اور غالباً اس بات کا احساس بعد میں سر سید احمد کے ارادوں میں نفیث پیدا کرنے کا موجب بنا۔ اس لحاظ سے 'آثار الصنادید' کی حنث تاریخی اور علمی ہونے کے علاوہ عمرانی بھی ہے۔ شعراء میں مرزا غالب کا ذکر بھی موجود ہے۔ اور جب اس تعریف کو سامنے رکھا جائے تو سر سید احمد نے 'دیوان غالب' کے طبع ہونے پر لکھی تو واضح ہو جاتا ہے کہ مرزا کے متعلق انہوں نے جن خالاب کا اظہار کیا تھا وہ وہی ہیں جو مختلف بعد نکاروں نے گزشتہ صدی کے دوران بیان کیے ہیں۔ یہ اس باب کا ثبوت بھی ہے کہ سر سید احمد کی سوانح نگاری رسمی نہ تھی بلکہ انہوں نے اس کی بنیاد حق و صداقت پر رکھی تھی اور اسی بات نے ان کی 'آثار الصنادید' کو غیر فانی بنا دیا ہے۔ اس باب کی تصدیق ان قدم و جدید مآخذ و منابع کی فہرست دیکھ کر بھی ہوتی ہے جن کو کام میں لا کر سر سید احمد نے اس کتاب کو مرتب کیا تھا۔ انہوں نے صرف وہ باتیں درج کیں جن کا حتمی ثبوت تلاش کرنے میں وہ کامیاب ہوئے یا روایت کے علاوہ درانت نے بھی انہیں درست کیا۔

اس کتاب کی دوسری اشاعت ۱۸۵۴ء میں ہوئی۔ طبع اول میں زبان کسی حد تک پر نکلت بھی۔ اس کی وجہ یہ بان کی جاتی ہے کہ امام بخش صہبائی کتاب کی سوید کے دوران معاونت کرتے رہے تھے، لیکن ہارا قباس ہے کہ اس کی علمی حیثیت بڑھانے کے لیے سر سید احمد نے خود بہ طرز اختیار کیا تھا۔ اس زمانے میں بتر صغیر کے اہل علم زیادہ تر فارسی نما طرز کو ترجیح دیے تھے۔ غالباً انگریز اہل علم کی بایں میں کر بعد میں انہیں محسوس ہوا کہ تحقیقی کتابوں کا ایسا اسلوب موزوں نہیں، اس لیے طبع دوم میں انہوں نے سادہ اور رواں انداز بیان اخبار کیا، مگر باب جہارم میں مبالغہ اور نکلفات بارہ کا احساس اب بھی ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے سر سید احمد اس باب پر نظریہ ثانی نہیں کر سکے۔ طبع ثانی میں ابواب میں بھی تبدیلیاں کی گئی تھیں۔ مثلاً پہلے

دوسرا باب قلعہٴ معلّے کی عمارات کے حال میں تھا اور بعد میں اس کا یہ عنوان بنا۔ ”دہلی میں ملعون کے بننے اور شہروں کے آباد ہونے کے بیان میں“۔ مواد میں بھی اضافہ ہوا اور نازہ دریاقتوں کو بھی شامل کر لیا گیا۔ اس انشاعت میں سرسید احمد کی فکر بھی ایک نئے موڑ پر نظر آتی ہے۔ اب خوارقِ عادت امور کا ذکر بھی کم کر دیا گیا اور اکثر امور کی تاویل عقلی دلائل کی روشنی میں کر دی گئی ہے۔ اس بات سے بھی دل میں یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ’آثار الصّنادید‘ کی مصنف کے ذریعے سرسید اپنے خیال کے مطابق ملتِ اسلامیہ پاکستان و ہند کو وہ انک نئی زندگی سے روشناس کرانا چاہتے تھے۔ مسائخ کے حالات میں اخلاق و کردار کا بیان ملتا ہے۔ اس سے سواخ نگار کے طور پر سرسید کے تصورات سے ہم آشنا ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک سواخ کی اچھی کتاب کا مقصد اخلاق و کردار کی اہمیت جتنا کر شخصیت کی تعمیر میں مدد کرنا ہے۔

اگرچہ ’آثار الصّنادید‘ کے ضمیمہ جاب کو تذکروں کے ضمن میں بھی شمار کیا جا سکتا ہے، مگر چونکہ سرسید کو ان مشاہیر کے ذکر سے ایک تہذیب کا مراعہ بخش کرنا مقصود تھا اس لیے ہم اسے تاریخ نگاری کا نمونہ بھی تصور کر سکتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ سرسید نے ان تمام عطاء کی شخصیت کے نفسیاتی اور معاشرتی عوامل سے بحث نہیں کی، کمونکہ ابھی تک یہ تصور دنیا میں موجود نہیں تھا مگر مجموعی طور پر ان مختصر سواخ کو انک تہذیبی ناتر کے طور پر ضرور پیش کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہ ہو گا کہ ’آثار الصّنادید‘ پرانے تذکروں اور مابعد کی سواخ عمریوں کے درمیان ایک ایسی کڑی ہے جسے نظر انداز کرنا صحیح نہیں۔ غالباً یہ دعویٰ بھی بالکل بے بنیاد نہیں کہ سبلی نعمانی اور الطاف حسین حالی کی سواخ عمریاں ایک طرح ’آثار الصّنادید‘ کا ثمر ہیں۔



## اس دور کے ادب کا مجموعی جائزہ

اس دور کے ادب کی نمایاں خصوصیت غنگنی نظر اور محرابِ حجاب میں ایک طرح کی بلوغت ہے اور اس نصف صدی کو ہم انک طرح سے انی نہذیب کا آخری نمبر بھی کہہ سکتے ہیں۔ خانقاہ اس کے ادب میں سائنسی و رعنائی، احساسِ برتری و حاشہ سندی، خود داری بلکہ خود نمائی کے اثرات منعکس ہوئے نظر آتے ہیں۔ مگر ایسی آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں جن میں احساسِ ملتی اور سیاسی شعور کا نشان ملا ہے۔ مومن کی مشویٰ، 'بہ مضمون جہاد' اس باب کی شاہد ہے۔ اٹھارہویں صدی میں انک ہی صنف، یعنی ساعری نے فروغ پایا، مگر انیسویں صدی کے نصفِ اول میں نثر، نظم، نقد، سوانح نگاری، ڈراما، صحافت، خطوط نویسی سب ہی اصناف میں ایسا کام ہوا، جس سے اردو ادب میں تنوع اور وسعت کے امکانات بڑھے۔ ہم ان اصناف کا باری باری ذکر کرتے ہیں۔

### نثر

اگرچہ صاف اور سادہ نثر اٹھارہویں صدی میں لکھی جا رہی تھی، مگر جو روانی اور صراحت، فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی وجہ سے اردو نثر میں پیدا ہوئی وہ نہایت ایک نئی چیز ہے اور یہ نہیں کہ یہ نثر بھکی اور بے مزہ تھی، کیونکہ اس میں سہر علی افسوس کا اندازِ سان بھی شامل ہے، جو ان کی 'آرائشِ محفل' میں نظر آتا ہے اور جو محمد حسین آزاد کے اسلوب کی پس روی کرنا ہے۔ اور یہ باب اسی دہستان کے مصنفین پر منحصر نہیں۔ سادہ اسلمعل شہید کی 'مہویب الایمان' اگلا ۱۸۳۵ء کے قریب سائے ہوئی، اس میں بھی زبان و محاورہ کی وہی بر نائز سادگی ہے جو فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کا طفرائے اساز سلم کی جاتی ہے۔ یہ درس ہے کہ لکھنؤ والوں کو ابھی تک مرصع زبان کا چٹخارا سند تھا اور 'فسانہ' عجائب اس پر شاہد ہے، مگر یہ اسلوب دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ اس لیے یہ باب وہی سے کہی جا سکتی ہے کہ اس دور کی ایک ممتاز ادبی خصوصیت وہ سادہ مگر دل نشین نثر ہے جس میں ہر قسم کے مطالب آسانی سے ادا ہو سکتے ہیں اور جو تفہیم میں سہولت پیدا کرتی ہے۔

### سرائی

اس دور کی دوسری نمایاں خصوصیت مرثیہ گوئی کی وہ معراج ہے جو انیس اور دہر

آس عظیم الشان ایثار اور آس نہلکہ انگہر واقعہ سے وہ فائدہ نہ اٹھانا جو اس کا حق تھا اور نہ اس ڈرامے کو مربوط کرکے ، اسباب و عوامل کو انک سانچے میں ڈھال کر وہ کوئی عظیم رزمیہ (ایک) نظم لکھ ناے جو انہیں لکھنا چاہیے تھی ، مگر پھر بھی انہوں نے اس سارے واقع کو نوڑ نوڑ کر کئی جھوٹے چھوٹے ڈرامائی سین ایسے تخلیق کیے جو جزوی طور پر بہت مؤثر ہیں اور بیانیہ ساعری میں کمال کے درجہ تک پہنچتے ہیں ۔ خاص طور پر سسکس کو انہوں نے وہ لعک اور زور عطا کیا کہ یہ صنف ہمیشہ کے لیے لمبی نظموں کے لیے وقف ہو گئی اور اس میں سسکڑوں اعلیٰ درجے کی نظموں لکھی گئیں ۔

### غزل

اردو غزل جو فائیم ، میر ، سودا ، درد جسے اسامادانِ فن کے ہاتھوں پروان چڑھی تھی ، اس دور میں بن واضح اسلوب اختیار کر گئی ۔ یہ اسلوب ہم ذوق ، مومن اور غالب سے منسوب کر سکے ۔ ذوق نے عوام سندانہ مسلک اختیار کیا ۔ وہ زبان اور محاورہ کی خوبی اور عام فہمی پر زیادہ توجہ دیتے رہے ۔ عائر محربات نہ عوام کی سمجھ میں آتے ہیں اور نہ وہ ان سے دلچسپی لیتے ہیں ۔ وہ ایسے اسعار پسند کرتے ہیں جو روزمرہ کے ناثرات کا موزوں اظہار کریں اور فوراً زبان پر جڑ جائیں تاکہ جہاں کہیں موقع ہو انہیں دھرایا جا سکے ۔ ذوق نے عام طور پر معاشرہ کی ضرورت کی اور اسی لیے وہ اپنے زمانے میں بہت مقبول ہوئے ۔ مومن کا اسلوب امیرانہ ہے اس میں عیشِ امروز کا فلسفہ حاری و ساری ہے اور زندگی سے کماحقہ لطف اندوز ہونا ، نفاست و رکھ رکھاؤ ، ہذیب و سائسگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے امکانِ حساب سے بہرہ ور ہونا ان کی اور ان کے نلامذہ کی شاعری کا ماحصل ہے ۔ مسرا اسلوب مرزا غالب کا ہے ۔ یہ انداز دونوں سے مختلف ہے ، اس میں سکون کی جگہ نلاطم ہے ، سطحی بہاؤ کی جگہ گہرائیوں میں غوطہ رنی ہے ، استراحت کی جگہ سینہ کاوی ہے ، آہستہ روی کی جگہ طوفان خیزی ہے ۔ سرسری نظر کی جگہ ژرف نگاہی ہے اور عام تجربات کی جگہ فکر انگیزی ہے ، جو ملتہب ہو کر جذبہ کی شدت اخبار کر لیتی ہے ۔ جہاں ذوق پہلے مصرع میں بیان کیے ہوئے احساس کی نصیذی دوسرے مصرع میں ایک ضرب المثل کے ذریعہ کرتے ہیں ، وہاں مرزا پہلے مصرع میں اظہار شدہ ناثر کو دوسرے میں عمومیت ہی نہیں دیتے بلکہ اسے آفاقت عطا کر دیے ہیں ۔ تجل کی وسعت اور فکر کی شد سے جذبہ کی کیفیت پیدا کرنے کی یہ قدرت اردو شاعری میں مرزا کا عطیہ ہے ۔ اور یہ اس دور کی سب سے نمایاں خصوصیت کہی جا سکتی ہے ۔

## شعر کی غایت

مسائب معلوم ہونا ہے کہ فلسفہٴ شعر یا غایتِ شاعری سے ہاں مختصر سی بحث کر لی جائے۔ اگرچہ مرزا غالب نے شاعری کے افق بھلا دیے، مگر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ شاعری ابھی معاصرے کے مفاصوں کے تابع ہے۔ شاعر کا مطمحہ نظر ابھی تک انبساطِ خاطر ہے نا اپنے مجربات اور انہی نصرت کا اظہار! شاعر زندگی کے مقصد، خلق کی غایت، جبر و اختیار، حرا و سزا پر نصیرہ ضرور کرنا ہے، مگر اس کی نظر ابھی تک عمودی ہے سوازی نہیں۔ وہ اوپر سے نچے کی طرف دیکھتا ہے، برابر کی سطح سے اسے سروکار نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ نظیر اکبر آبادی نے نہ سواری نظر رائج کرنے کی کوسس کی بھی اور 'سجارہ نامہ'، 'آدمی نامہ'، 'رونی نامہ' اور حصر سے حصر موصوعات پر نظمیں لکھ کر اس نے اردو شاعری میں انکے نئی جہت پیدا کرنے کی کوسس بھی کی بھی، مگر اس کی آواز صدا بہ صرا ناپت ہوئی۔ غالباً اس کے پنسے کے لیے کوئی سوا سو سال اور درکار تھے۔ دراصل اس دور کا شاعر زندگی سے سمع ہونا ہی انا حق سمجھتا تھا اور ابھی تک نہ خیال کہ زندگی جہدِ اسب و استحقاقِ نسب، اس کے دہنی افق پر نمودار نہیں ہوا تھا۔ وہ معاصرے کے مفاصوں کو تسلیم نہیں کرنا اور اپنی انفرادی حبیب کو اور نابوں پر مقدم سمجھتا ہے۔

## داستان نویسی

اس دور کی ایک اور خصوصیت داستان نویسی کا وہ رواج ہے جو انیسویں صدی کے نصفِ آخر میں سنکڑوں عظیم داستانوں کا موجب بنا۔ خلیل علی خان اسک نے 'داستانِ امیر حمزہ' کا جو ترجمہ فورٹ ولیم کالج کی وساطت سے کیا اور 'باغ و بہار' اور 'فسانہٴ عجائب' جیسی داستانیں جو محرر میں آئیں، ان سے فرضی مجرباتِ حساب اور نخبیل کے زور سے سجاوٹ و مہور، خروج و عروج، مہم جوئی اور فتح یابی، بطل نرسنی اور کفر سکنی، سب ہی قسم کی ذاتی کماں پوری کر لی جاتی تھیں۔ نہ داستانیں اعلیٰ مطمحہ نظر اور فعالیت کی خواہش اور تلاش کی ضرورت بھی پورا کرتی تھیں۔ جس طرح مراثی میں اہل بیت کے افراد ابطالِ زمن کے طور پر پیش کیے جاتے تھے، اسی طرح سیاسی درماندگی کے اس دور میں داستانوں کے ہیرو، متالی عظمائے مٹی کی شدید ضرورت کو ببلک کے سامنے لاتے تھے۔

## عنائی ڈراما

ایک انگریز ناولسٹ اور نعتیاد (جارج میری ڈیٹھ) کی رائے ہے کہ کامیڈی (یعنی طریبہ ڈراما) آس سوسائٹی میں پیدا نہیں ہو سکتی، جس میں بے عمل جنسی موجود ہو۔ یعنی جہاں

مرد و عورت الگ الگ معاشرتی دائروں میں گھومتے ہوں وہاں اخلاقی، جذباتی اور ذہنی تصادم کے امکانات کم ہوتے ہیں اور انہی ٹکڑوں سے طریقہ ڈرامے کے عناصر پیدا ہوئے ہیں۔ یہ باب المیہ (ٹریجیڈی) برصاوت نہیں آتی۔ چونکہ المیہ میں بنیادی تصادم انسان اور قضا و قدر میں ہونا ہے یا معاشرہ کے 'مسلمات اور ذاتی و اخلاقی اقدار میں، اور اسلامی دنیا میں قدر سے زیادہ جبر کا نظریہ جزو ایمان رہا ہے اس لیے ٹریجیڈی پیدا ہونے کے امکانات بھی اسلامی ماحول میں کم ہو گئے۔ غالباً اسی لیے اسلامی ممالک میں ماسوا موجودہ دور کے، ڈرامے کا ظہور نہیں ہوا۔ واجد علی شاہ آخری شاہِ اودہ کے دربار میں غالباً طوائف اور دخترانِ مسترت کا کافی دخل تھا۔ سبب اس لیے نا واجد علی کا ذوق ہی اس عنائی ڈرامے کا موجد تھا، جو اسات کے 'اندر سہا' اور واجد علی شاہ کے مختلف رہسوں میں نمودار ہوا۔ یہ باب سب کو معلوم ہے کہ ان ڈراموں میں طریقہ عنصر غالب تھا۔ ڈرامے میں خنایب کا عنصر ہمارے ڈرامے کے لیے ایسا لازمی قرار نایا کہ ہماری فلموں میں اب تک ناح اور ڈننے ہی زیادہ مقبول عناصر تصور کیے جاتے ہیں۔

### چھاپے خانے اور صحافت

اسی دور میں چھاپے خانے قائم ہوئے اور کتابوں کی نشر و اشاعت کے علاوہ اخبارات نکلنے شروع ہوئے۔ ان اخبارات میں، اطلاعات کے علاوہ معاشرے کے 'توائف، حالاتِ حاضرہ برصہ اور کچھ ادبی ذوق حسنی خصوصیات شروع ہی سے موجد تھیں۔

### اصولِ خطوط نویسی

اسی نصف صدی میں مرزا نے خطوط نویسی کے وہ اصول وضع کئے جو ان کی 'بج آہنگ' کی پہلی اور دوسری آہنگ میں ملتے ہیں۔ یہ درس ہے کہ وہ بے نکات اور مسکاتہ انداز جو بعد میں مرزا کے خطوط کا جوہر بنا، مرزا کے اس دور کے خطوط (خصوصیت سے فارسی) میں کم ملتا ہے مگر فارسی میں بھی اسے خطوط موجود ہیں جن میں مرزا نے نکات کو ہر طرف کر کے سادھے انداز میں، پر خلوص طور پر اپنے خیالات کا بے ساختگی سے اظہار کیا ہوا ہے۔ اردو خطوط میں ان کا پہلا خط جو ابھی تک دستیاب ہو سکا ہے مئی ۱۸۴۸ء کا لکھا ہوا ہے۔ یہ خط منشی ہرگوپال نفہ کے نام ہے۔ گویا نئی طرز کی خطوط نویسی بھی اسی دور کی پیداوار ہے۔ مثلاً ہرگوپال نفہ کے نام جو خط موجود ہیں ان میں پہلے چھ خطوط کے القاب یہ ہیں: (۱) مہاراج، (۲) بھائی، (۳) بغیر القاب یا مخاطب کے، (۴) کیوں مہاراج، (۵) شفق با التحقیق منشی ہرگوپال نفہ سلامت رہیں، (۶) بندہ پرور۔ اور خطوط کی عبارت میں بھی اسی قسم کی ہدایت اور بے تکلفی ہے۔

## مختصر سوانح

مذکرہ نویسی کا رواج نو بڑی دیر سے جلا آ رہا ہے اور فارسی میں بے شمار مذکرے موجود ہیں اور اردو میں مذکرے اٹھارھویں صدی ہی میں لکھے جانے لگے تھے، مگر 'آثار الصنادید' میں مختصر سوانح کی قسم کی جو تحاریر سرسید احمد خان نے شروع کیں وہ ایک نئی بات تھی۔ برائے مذکروں میں سوانحی حالات نہایت مختصر ہوئے اور شخصیت سے بچ کر صرف مفہود ہوتی تھی۔ سرسید نے سوانحی کوائف کے ساتھ عطاء کی شخصیت پر بحث کرنا ضروری سمجھا اور پھر دیانت سے ان کے کلام یا ان کی تصانیف کی فارسی کی۔ یہ دو بنیادیں صحیح سوانح نویسی کا بنیاد بنیں اور ان کا ظہور بھی اسی دور میں ہوا۔

## تعلیم

اگرچہ دہلی کالج اس دور میں ختم ہو گیا مگر تعلیم کا جو نیا طریقہ، مسرق اور مغربی علوم کا جو امتزاج، ذریعہٴ تعلیم کا جو تجربہ، دہلی کالج کے ذریعے معاشرے کے سامنے پیش کیا گیا، وہ آئندہ کے لیے ہدایت کا ناعب ہوا۔ یوں جیسا کہ 'آثار الصنادید' کے ضمیموں سے ظاہر ہوتا ہے، مساجد اور مدرسوں میں سنکڑوں چھوڑ ہزاروں طلباء، بزرگانِ دین اور علماء سے استفادہ کرتے تھے اور تعلیم کا چرچا عام تھا، بلکہ سر ولیم سلیمین انی مشہور کتاب 'سر و ساحت کی یادیں' میں لکھتا ہے کہ جہاں کہیں اسے مہذب لوگوں سے ملنے کا موقع ملا اور ان سے باتیں ہوئیں، تو اس نے دیکھا کہ نہ لوگ جو مکبوں اور مدرسوں میں تعلیم حاصل کر چکے تھے، کسی صورت مغرب کی ہونورسٹیوں کے فارغ التحصیل لوگوں سے کم علم نہ تھے، بلکہ سمجھ بوجھ، معاملہ فہمی اور ثقافتی معلومات میں بہت سے لوگوں پر فضیلت رکھتے تھے۔

## بچوں اور عورتوں کا ادب

یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ بچوں کے ادب یا عورتوں کے ادب کا مفہوم اس دور میں واضح طور پر منعین ہو گیا تھا مگر یہ بھی غلط نہیں کہ ایسی کتابیں دستیاب ہونے لگی تھیں جن کا مقصد بچوں اور عورتوں کے اذہان تک رسائی تھا۔ خود مرزا غالب کا 'وادر نامہ' اور کئی ایک اصلاحی رسالے ایسے ملتے ہیں جن سے اس قسم کے ادب کی نشاندہی ہوتی ہے۔ 'رسالہٴ سراج الہدایت' جو ۱۸۴۷ء میں چھپا، اسی قسم کی ایک کتاب ہے۔

## لکھنوی اور دہلوی طرزِ سخن

اٹھارھویں صدی میں بہت سے شعراء بلکہ اکثر شعراء نے دہلی سے فیض آباد ، رامپور اور لکھنؤ کی طرف مراجعت اختیار کر لی تھی ، مگر اسی زمانے سے لکھنؤ کے اندازِ سخن اور دہلوی اظہارِ بیان میں فرق پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا ۔ یہ فرق نثر میں بھی نمایاں ہوا اور اس پر جھگڑے بھی ہوئے ۔ مبرا من اور رحب علی سرور ان دونوں اسالیب کے سربراہ تھے ۔ اسی طرح مسنوی 'سحر البیان' اور 'گلزارِ نسیم' میں مقابل ہوا ۔ رفتہ رفتہ لکھنؤ کا معاصر قی نکتہ ، نازک خیالی اور غنیل برستی ایک مسلک بن گیا اور اب ہم اسے ایک دوسرے سے بالکل مختلف مانتے ہیں ۔ لکھنؤ گونا گونا گونا کی طرف زیادہ مائل تھا ، اسی لئے وہاں اندازِ بیان اور حسنِ کلام پر زور دیا جاتا تھا اور دہلی والے خلوصِ جذبات اور دلی کیفیات کے اظہار کو شعر کی جان تصور کرتے تھے ۔ یہ لفظ اور معنی ، نا جسم اور روح ، نا صورت اور سبب کی برائی غنہ اور تکرار ہے ۔ اس سے کسی اندازِ بیان نا مسلک کی محض مفسود نہیں اور نہ ہم ایک انداز کو دوسرے پر ترجیح دینا پسند کرتے ہیں ۔ طبائع اور ماحول میں تطابق بھی ہونا ہے اور تضاد بھی ۔ مرزا غالب کو ان کے ماحول نے بہت حد تک سسانی سے قبول نہیں کیا تھا ، حالانکہ وہ اسی ماحول کی پیداوار تھے جس میں ذوق اور مومن دروان چڑھے ۔ اور غالب کے لفظ اور معنی دونوں میں دقت اور اغلاق پایا جاتا ہے ۔ اور یہی وہ ماحول ہے جس کے دو شعراء یعنی غالب اور ذوق دونوں میں انبذال کا سائنہ نک نہیں ۔ ذوق میں عامیانه س ہے ، سومانہ بن نہیں درآئالکہ مومن جیسے بے شخصیت کے مالک نے انہی کئی مثنویوں میں رکاک اور بازاری بن سے بھی گریز نہیں کیا ۔

## نقدی شعور

'گلشنِ ے خار' ، 'آثار الصنادید' اور دو ایک اور تذکروں کے مطالعہ سے یہ چلتا ہے کہ سمدی شعور نے اس زمانہ میں ایک نئی کروٹ لینی شروع کر دی ہے ۔ تقلید سے انحراف کے آثار بھی موجود ہیں ۔ اس امر کی سہادت سب سے زیادہ مرزا غالب کے کلام میں ملتی ہے ۔ فارسی میں تو ان کی کئی مثنویوں ، کئی قصیدوں ، قطعات اور غزلوں میں عقائد و مسالہات پر بے باک تنقید ملتی ہے مگر سخن سنجی اور سخن فہمی کے سلسلہ میں بھی مرزا کے ارشادات بہت معنی خیز ہیں ۔ جیسا کہ انہوں نے شروع ہی میں کہا دیا تھا :

حسنِ فروغِ سمعِ سخن دور ہے اسد پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

مثلاً قصیدہ گوئی میں مرزا نے جدت پیدا کی اس کا ذکر منشی ہرگوپال تفتہ کے نام اسی خط میں (مورخہ ۷ مئی ۱۸۴۸ء) جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے ، یوں کرتے ہیں :

”میرے قصیدے دیکھو ، شیب کے شعر بہت پاؤ گے اور مدح کے شعر کمتر ۔ ثر میں بھی یہی حال ہے ۔ نواب مصطفیٰ خان کے تذکرے (گلشنِ بے خار) کی تقریظ کو ملاحظہ کرو کہ اون کی مدح کتنی ہے ۔ مرزا رحم الدین بہادر حیا تخلص کے دیوان کے دیباچہ کو دیکھو ، جو نعلیط دیوانِ حافظ کی ، موحبِ فرمائشِ جان جاکوب بہادر کے لکھی ہے ، اوس کو دیکھو کہ فقط ایک بب میں اون کا نام اور اون کی مدح آئی ہے اور باقی ساری نثر میں کچھ اور ہی مطالب ہیں“ ۔

غرض اس اقتباس سے یہ نہی کہ اس دور میں ایک نئے شعور کا آغاز ہو چکا تھا اور اس شعور کی پرورش میں مرزا کا بڑا ہاتھ تھا ۔ دراصل اس دور کو غالب کا دور کہنا مناسب ہے !

## صحت نامہ

اردو ادب جلد سوم (۱۸۰۳ء - ۱۸۵۷ء)

الدرونی سرورق کی آیت کی عبارت ہوں ہے :

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۴	۲۳	پورلی	پوری
۱۴	۶	پڑھائی	پڑھائی
۱۵	۲۴	ارود	اردو
۱۷	۷	لہ	کہ
۱۷	۲۵	پڑھتی	پڑھتی
۱۸	۱	مغری	مغربی
۱۸	۱	پڑھائے	پڑھائے
۱۸	۶	مغری	مغربی
۱۸	۱۰	اس طبقے کی	اس طبقے کی تردید
۱۸	۲۰	دیسویں	دیسویں
۱۸	۲۳-۲۲	چاہے	چاہیے
۱۹	۴	پورلی	پوری
۱۹	۲۴	مغری	مغربی
۲۱	۲۲	نبلیغ	تبلیغ
۲۵	آخری	ہو گئے	ہو گئے
۳۱	۲	تنید	تنبیہ
۳۱	۲۲	مامعیات	سیاسیات

معذرت : پوری کوشش کی گئی ہے کہ اغلاط درست کر دی جائیں۔ مگر تحقیقی کتب میں غلطیاں پھر بھی رہ جاتی ہیں۔ امید ہے قارئین کرام ان اغلاط کو محض ہماری غور گداشت پر محمول نہیں کریں گے۔



( ب )

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۴	۲۴	یورلی	یورلی
۳۵	۱۰	یورل	یورلی
۴۴	۹	اورینٹل	اورینٹل
۵۸	۴	طوز	طرز
۶۷	۲	میں میں	میں
۷۲	۱۴	ٹھراؤ	ٹھہراؤ
۷۳	۲	چائیں	چاہیں
۸۰	۵	”یدِ اخلاقِ ہندی“	ید ”اخلاقِ ہندی“
۸۰	آخری	نیئر	نیئر
۸۸	۱۴	آہتہ آہتہ	آہستہ آہستہ
۸۸	۱۶	ناشاہ	نادشاہ
۹۱	۹	سدف	صرف
۹۳	فٹ نوٹ (۲)	مولوی عبدالحی کالج	مولوی عبدالحی
۱۰۳	فٹ نوٹ (۳)	سردار	سرور
۱۱۰	۱۱	اسر	امیر
۱۱۳	۱۵	فوائد الافکار	فوائد الافکار
۱۳۷	۲۲	عری	عری
۱۳۸	۱	انجن آرا	انجن آرا
۱۴۰	۱۹	لکھنؤی	لکھنوی
۱۴۸	۸	دعوئی	دعوئی
۱۴۴	۵ - فٹ نوٹ (۲)	مرآہ الشعر	مرآہ الشعراء
۱۶۸	۶	بلد	بلند
۱۶۹	۱۱	*۱۸۸۲	*۱۷۸۲
۱۸۴	۲۲	ور	اور
۱۸۵	۶	ور	اور
۱۸۵	۹	اشعا	اشعار
۱۹۳	۱۷	بھی	بھی
۱۹۴	۱۰	نظا	نظر
۱۹۶	۱۲	*۲۲۵۹	*۱۲۵۹

## ( ج )

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۹۹	فٹ نوٹ (۲)	عیش گیاوی	عیش گیاوی
۲۰۰	۱۹	۴۱۸۱۵ (۵۱۲۶۸)	۴۱۸۵۱ (۵۱۲۶۸)
۲۰۳	۳	معاوم	معلوم
۲۰۸	۱۳	ہیں	میں
۲۱۳	۲۴	رفاہ عالم پریس	رفاہ عام پریس
۲۱۵	۲	سخن شعراء	سخن الشعراء
۲۱۶	۱۶	لذائد	لذائد
۲۱۹	آخری	نہی	نہیں
۲۲۰	۲	بے عذر	بے عذر
۲۲۵	۳	۲۶	۴۶
۲۳۸	۱۱ - ۱۳	(۵) (۳)	(۲) (۳)
۲۳۸	فٹ نوٹ (۴) (۵)	زائد غلطی سے چھپ گئے ہیں -	
۲۵۳	۲۳	نہیں ہے -	نہ ہونے -
۲۵۴	۴	زندگی	زندگی
۲۵۷	۹	ویا	گویا
۲۵۷	۲۰	خود بین	خود بین
۲۶۱	۵	اننا	آشنا
۲۶۱	آخری	درسور	درسوز
۲۶۶	۲	ذہن نشیں	ذہن نشین
۲۷۵	فٹ نوٹ (۳)	سرت	سیرت
۲۷۸	۲۵	عزل	غزل
۲۸۸	۷	بد عکس	برعکس
۲۹۱	فٹ نوٹ (۱)	گلشن بے جار	گلشن بے خار
۲۹۷	۱۰	ے	اے
۳۰۱	۱۸	الخصوص	بالخصوص
۳۰۲	۲	یسو	گیسو
صفحہ	سطر	غلط	درست
۳۰۳	۲۸	سیرۃ	سیرت
۳۱۱	۱۳	پنہنائے	پنہنا

( د )

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۱۵	۲۲	الفت شان	الفت شاه
۳۲۰		ایہام	ایہام
۳۲۱	۱۱	نفرل	تغزل
۳۲۲	فٹ نوٹ (۱)	المیہ	المیہ
۳۳۰	۷	بجمل	بجمل
۳۳۶	فٹ نوٹ (۱)	کالکتہ	کالکتہ
۳۴۲	فٹ نوٹ (۴)	۳۲۷-۳۲۷	۳۲۷
۳۴۶	۲۴	مدارس	مدارس
۳۵۴	۱۴	انگریزی	انگریزی
۳۶۵	فٹ نوٹ (۲)	۵۱	۵۱
۳۹۱	۲۲	حوالہ نمبر ۲ کا نشان نہیں ہونا چاہیے	
۳۹۵	۵	۶۱۸۰۷ (۵۱۲۶۲)	
۳۹۶	۱۰	تہجی	تہجی
۳۹۶	۱۲	لفظ اول میں	نصف اول میں (۲)
۴۰۳	۱۵	ہیں	ہے
۴۱۰	۱۱	ولد	والد
۴۱۴	۱۱	بڑے	برے
۴۱۶	۲۸	یا	نا
۴۱۷	۱۷	ستعمال	استعمال
۴۲۱	۱۷ - ۱۸ - ۱۹ - ۲۰	حوالہ جات کے نشانات نمبر ۲ - ۳ - ۴ - ۵ - ۶ - ۷	
		غلط نشان ہیں	
۴۲۴	۱۸	کوئی	کوئی
۴۲۹	۹	لکھی گئیں	لکھی گئیں (۱)
۴۳۴	۲	’میں‘ زائد چھپ گیا ہے -	
۴۳۵	۱۱	کر سکتے	کر سکتے ہیں

